یادِ رفتگاں

جلد دوم

ماہر القادری

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

یادِ رفتگاں

جلد دوم

از

ماہر القادری رحمہ اللہ تعالیٰ

مرتبہ

طالب الہاشمی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ۲۵

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ـ ۰۰۲۵
فون: ۶۹۱۱۶۵۲، ۶۳۱۷۸۵۸ فیکس: ۶۸۲۰۹۷۵
E-Mail : mmipub @ nda.vsnl.net.in

ت

طبع اوّل مارچ ۲۰۰۰ ۱،۰۰۰

قیمت: -/۱۰۰ روپے

YAD-E-RAFTAGAN VOL II (Urdu)
By Mahirul Qadri
Compiled by: Talibul Hashmi
Pages: 480
(Hard Bound With Soft Jacket)
Price : Rs. 100.00

مطبوعہ: اصیلہ آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی ـ ۲

فہرست مضامین

ن

و

ہ

متفرق مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتّب

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے "یادِ رفتگاں" کی دوسری جلد ـــ پہلی جلد کی اشاعت کے چند ہی ماہ کے اندر پیش کرنے کی توفیق بخشی۔ زیرِ نظر جلد میں ان رفتگاں کے تذکرے ہیں جن کے اسمار یا تخلص کا پہلا حرف ع سے یا تک ہے۔ ان کے علاوہ ابن انشاؔ اور جگر مراد آبادی کے بارے میں بھی مولانا ماہر القادریؒ کے تاثرات اس جلد میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ اصولاً ان تاثرات کو پہلی جلد میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن بہ سہوِ نظر (یا ایک حادثہ کی بنا دیر) یہ پہلی جلد میں شامل نہ ہو سکے جس کے لیے میں قارئینِ کرام سے بصد ندامت معذرت خواہ ہوں۔ موضوع کے پیشِ نظر مولانا کا ایک عمومی مضمون "پی، آئی، اے کا خونیں حادثہ" بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

میرا اندازہ تھا کہ "یادِ رفتگاں" تین جلدوں میں مکمل ہو گی لیکن خدا کا شکر ہے کہ تمام مضامین دو جلدوں ہی میں سما گئے۔ مولانا ماہر القادریؒ کی دلی خواہش تھی کہ "یادِ رفتگاں" کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بیشتر مضامین میں اپنے قلم سے ضروری ترمیمات اور اضافے بھی کر دیے تھے افسوس کہ انہیں اپنی زندگی میں "یادِ رفتگاں" کو کتابی صورت میں دیکھنا نصیب نہ ہوا تاہم یہ بات راقم الحروف کے لیے طمانیت کا باعث ہے کہ ان کی وفات کے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نے اسے مولانا مرحوم کی دلی خواہش کو پورا کرنے کی ہمت عطا کی۔

پہلی جلد کے آغاز میں بھی عرض کیا تھا اور اب پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ "یادِ رفتگاں" میں شامل کسی مضمون کا کوئی پہلو "رفتگاں" میں سے کسی کے ورثا کے لیے دل آزاری کا باعث بنے تو اس کے لیے مرتب اور ناشر دونوں بصد ادب معافی کے خواستگار ہیں اور ان سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ مولانا مرحوم کو بھی معاف فرمادیں اور ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

خاکسار : **طالب الہاشمی**

پی اینڈ ٹی کالونی ملتان روڈ لاہور

یکم نومبر ۸۴ء

خان بہادر عالم علی خاں

تقسیم ہند سے قبل جب میں دلی میں مقیم تھا، تو خان بہادر عالم علی خاں کا نام سنا تھا کہ وہ پٹودی اسٹیٹ میں وزیر اعظم ہیں۔ ایک دو بار غالباً کنور مہندر سنگھ بیدی کے یہاں جو اُن دنوں دلی میں مجسٹریٹ تھے، خان بہادر صاحب کو دیکھا بھی تھا مگر اُن سے ملاقات بہاول پور میں ہوئی۔

پاکستان بننے کے چار پانچ سال بعد بہاول پور میں اردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد ہوا، کرنل مقبول صاحب جو ایک زمانہ میں ریاست بہاول پور کے وزیر رہے ہیں انہی کی شاندار کوٹھی میں سب مہمان ٹھہرائے گئے، بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب اس قافلہ کے رہنما تھے۔

مشاعرے کے دوسرے دن بہاول پور سنٹرل جیل دیکھنے کا پروگرام تھا، تمام مہمان شعراء اور اہل قلم مولوی عبدالحق صاحب کی قیادت میں جیل پہنچے، خان بہادر عالم علی خاں محکمہ جیل کے انسپکٹر جنرل تھے انہوں نے ایک ایک وارڈ سب کو لے جاکر دکھایا۔ وہاں کے حالات طریق کار، قیدیوں کی خوراک، رہن سہن، اسیری اور رہائی کی تفصیلات بتائیں پھر ایک شاعر قیدی سے ملوایا جو اپنے رقیب کو قتل کرنے کے الزام میں ماخوذ تھا، خان بہادر صاحب نے بڑی عقیدت اور احترام کے انداز میں فرمایا:

" جب مجھے پتا چلا کہ یہ صاحب شاعر ہیں تو میں نے ان کے لیے جیل میں ہر قسم کی ممکنہ سہولتیں مہیا کر دیں، شاعر بہت بڑا آدمی ہوتا ہے کم سے کم میرے دماغ سے تو اس کا دماغ بڑا ہے۔"

پھر اس شاعر نے اپنے شعر سنائے اور تھوڑی دیر کے لیے جیل خانہ مشاعرہ گاہ بن گیا۔

اُس کے بعد خان بہادر صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مراسلت میں پہل انہی نے کی۔ " فاران " کے خریدار بنے، اپنا مجموعۂ کلام —— مرقع عالم ——

تبصرہ کے لیے بھیجا، تین چار اپنی غزلیں اور نظمیں بھی "فاران" میں اشاعت کے لیے ارسال کیں ان میں سے ان کی بس ایک نظم "فاران" میں چھپ سکی، جو شائع نہیں ہوئیں اُن کا نہ شکوہ کیا اور نہ اشاعت کے لیے اصرار!

دو بار اس پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود دفتر "فاران" میں بھی تشریف لائے اور تیسری منزل پر ہانپتے ہوئے پہنچے! اُن کے خط ایک دو مہینہ کے وقفہ سے برابر آتے رہتے! آخری خط میری اہلیہ کے انتقال پر تعزیت کا خط تھا۔ میں نے جواب میں شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ عید کے بعد میں خود حاضر ہوں گا۔ مگر میں اُن کے ملنے کے لیے پروگرام بناتا ہی رہا کہ اتنے میں روزنامہ "جنگ" میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی — غفرلہٗ اللہ تعالےٰ۔

اب سے تقریباً پچپن سال قبل عالم علی خاں مرحوم کی ملازمت کا آغاز عہدِ انگریزی میں ایک چھوٹے سے عہدے سے ہوا مگر وہ اپنی فرض شناسی اور قابلیت کی بدولت ترقی کرتے چلے گئے۔ ریاست پٹودی میں وزارتِ عظمیٰ کے فرائض اس وقار و خودداری اور قابلیت کے ساتھ انجام دیئے کہ ریاست کو خودکفیل اور ہر طرح سے خوشحال بنادیا، انگریزی حکومت کی طرف سے "خان بہادر" کا خطاب ملا! ریاست بہاول پور میں جب وہ محکمہ جیل کے انسپکٹر جنرل تھے تو بہاول پور سنٹرل جیل کی نگرانی میں اس معجزانہ خوش انتظامی کا ثبوت دیا کہ مختلف صنعتوں کی بدولت جیل خانہ کو ہر سال ڈیڑھ دو لاکھ بچت ہونے لگی۔ غالباً انھی نے بتایا کہ ساری دنیا میں بس ایک ایسا جیل خانہ ہے جہاں کا بجٹ فاضل ہوتا ہے۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بہاول پور نے کارگزاری کے اس صلہ میں انہیں بہت کچھ نوازا۔ خان بہادر صاحب مرحوم کے ہٹتے ہی جیل خانہ کی آمدنی میں کمی ہونے لگی یہاں تک کہ ؎

جہاں سے چلے تھے وہیں آگئے!

بہاول پور کی زمین اور مکانات فروخت کرکے کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی میں اپنے صاحبزادے معظم علی خاں کی کوٹھی سے متصل بڑی شاندار عمارت رہنے کے لیے بنوائی۔ دو سال ہوئے اس نو تعمیر کوٹھی میں سیرت کا جلسہ کیا مجھے اس میں بلایا۔ موجودہ نواب بہاول پور جو اُن دنوں اپنے والدِ محترم کی وفات سے پہلے ولی عہد اور مرکزی اسمبلی کے

رُکن تھے اس جلسہ میں تشریف فرما تھے۔ نواب صاحب موصوف خاں بہادر صاحب کے فرزند معظم علی خاں کے ہم زلف ہوتے ہیں۔

اس جلسہ میں مختصر مجمع تھا مگر سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے میں نے بڑے موڈ میں سیرتِ مقدسہ پر تقریر کی اس کے بعد نعتیہ کلام سنایا، خاں بہادر صاحب کی خوشی کا عالم دیدنی تھا، جلسہ کے بعد چائے نوشی ہوئی چائے کے ساتھ پرتکلف لوازم بھی تھے۔

خاں بہادر عالم علی خاں کی زندگی اس اعتبار سے ایک عجوبہ بلکہ معجزہ سے کم نہیں تھی کہ وہ پچیس تیس سال سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوئے۔ چوبیس گھنٹے اللہ آپ جیسے جاگتے گزرتی، ان کی اس مسلسل بیداری کا حال سن کر بعض انگریز سیاح اور آفیسران کے دیکھنے کے لیے آتے۔ برسوں کی اس بے خوابی کے باوجود ان کی صحت اچھی تھی، بڑھاپے میں بھی سُرخ و سپید رنگ تھا، جوانی میں بہت خوب صورت ہوں گے، مگر جب وقت آیا تو ہمیشہ کے لیے قیامت کی نیند سو گئے۔

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۶۷ء)

مولانا عامر عثمانی

مولانا عامر عثمانی سے پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ملاقات ہوئی اور پہلی ملاقات ہی میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے سے قبل بھی دوست تھے۔ دیو بند سے وہ کراچی اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے کے لیے کئی بار آئے۔ اور اُن سے مسلسل ملاقاتوں کے بعد بھی سیری نہیں ہوئی تشنگی باقی رہی! مولانا عامر عثمانی اور راقم الحروف کے درمیان نسل ورنگ اور قوم و وطن کا نہیں دین کا رشتہ تھا۔ اس رشتہ سے زیادہ قوی و مستحکم کوئی دوسرا رشتہ نہیں! جو وہ سوچتے اور لکھتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے خیالات لڑگئے ہیں اور میرے محسوسات کا تواردہوگیا ہے۔ افکار و خیالات میں اس قدر ہم آہنگی اور یک رنگی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

مگر یہ دنیا ہے جس میں انتہائی مخلص دوستوں، عزیزوں اور مخلص خیر خواہوں سے بھی اختلاف کے موقعے آجاتے ہیں بمشہور ناصبی العقیدہ اہل قلم محمود عباسی کے موقف کی تائید میں جو تحریریں ماہنامہ "تجلی" میں شائع ہوئیں تو مولانا عامر عثمانی کے اس موقف پر راقم الحروف کو حیرت بھی ہوئی اور وجدان نے اذیت بھی محسوس کی، میں نے اُن کو کئی خط بھی لکھے اور "فاران" میں بھی عامر عثمانی کی تحریروں پر نقد و احتساب کیا۔ میرے لیے یہ بڑا شدید مرحلہ تھا، ایک طرف گہری دوستی، مخلصانہ روابط اور برادرانہ تعلقات تھے اور دوسری طرف اظہارِ حق کے تقاضے تھے۔ میں سکوت بھی اختیار کرسکتا تھا لیکن دوست کی رو رعایت کے لیے ضمیر کی آواز کو دبانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ راقم الحروف نے وہی بات کہی جو اس کے نزدیک حق تھی۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قبول حق کے لیے اُن کا سینہ کھول دیا، حق اُن پر چڑھتے ہوئے سورج کی طرح واضح ہوگیا۔ عامر عثمانی نے اپنے موقف سے رجوع کرکے محمود عباسی کی کتابوں پر اس قدر مدلل جرح و تنقید کی کہ پڑھنے والے عش عش کرنے لگے! بھارت میں جن نامی گرامی علماء نے مولانا مودودی کی "خلافت و ملوکیت" کو طنز و تنقید کا ہدف بنایا اور مولانا موصوف پر اہانتِ صحابہؓ کا جھوٹا الزام لگایا تھا، اُن کی تحریروں اور کتابوں کے مولانا عامر عثمانی

نے دلیل و براہان کی تیغ براں سے پرخچے اڑا دیئے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا محمد میاں کی کتاب "شواہدِ تقدس" کا ماہنامہ "تجلی" میں اس قدر مہارت و بصیرت کے ساتھ پوسٹ مارٹم کیا گیا کہ یہ کتاب (شواہدِ تقدس) شواہدِ جہالت نظر آنے لگی! تنہا اس شخص نے دیوبند میں رہ کر جماعتِ اسلامی کی مخالفت کے طوفان کا منہ پھیر دیا ہے اور جیش تحریکِ اسلامی کے اس اکیلے سپاہی نے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے مخالفین و معاندین کی پلٹن کا مقابلہ کیا ہے!

راقم الحروف اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر، آخرت کی جواب دہی کے احساس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ مولانا عامر عثمانی نے بڑے بڑے علماء دین جن کے علم و فضل کے ڈنکے بج رہے ہیں اُن کی کتابوں اور تحریروں پر خالص علمی اور فقہی انداز میں جب گرفت کی ہے تو مرحوم کی تنقید پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہ علماء علم ہی نہیں عقل و بصیرت سے بھی کورے ہیں۔

مولانا عامر عثمانی کا مطالعہ بحرِ اوقیانوس کی طرح عریض و طویل اور عمیق تھا۔ وہ جوابات لکھتے تھے کتابوں کے حوالوں اور عقلی و فکری دلائل و براہین کے ساتھ لکھتے تھے۔ پھر سونے پر سہاگا زبان و ادب کی چاشنی اور سلاست و رعنائی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، لغت و ادب غرض تمام علوم میں مولانا عامر عثمانی کو قابلِ رشک بصیرت حاصل تھی۔ جس مسئلہ پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے۔ ایک ایک جزئیہ کی تردید یا تائید میں امہات الکتب کے حوالے پیش کرتے، علمی اور دینی مسائل میں اُن کی گرفت اتنی سخت ہوتی کہ بڑے بڑے جغادری اہلِ قلم پسینہ پسینہ ہو جاتے! انہیں اپنی رائے اور فکر پر، مطالعہ اور استدلال پر پورا اعتماد تھا اس لیے ہر عالم اور مفکر سے بلند و بالا ہو کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے! راقم الحروف ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھتا اور پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا کہ میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولانا عامر اپنی ذات سے دبستانِ علم و فضل تھے۔

مولانا عامر عثمانی کے فقہی جوابات میں ناول جیسی ادبی دلچسپی اور زبان کی چاشنی ہوتی۔ کیسے کیسے نازک مسائل کی مرحوم نے کس حذاقت و مہارت کے ساتھ گرہ کشائی کی ہے! "مسجد سے میخانے تک" ماہنامہ "تجلی" کا مستقل عنوان تھا۔ اس میں مزاح و ظرافت کا وہ چٹخارہ کہ:

فنا در ذائقہ در موجِ کوثر و تسنیم

مزاح و ظرافت کا مقصد لوگوں کی تفریحِ طبع اور ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ عبرت و موعظت کا درس

دیتا تھا! ان چٹکیوں اور گدگدیوں میں وہ بڑے کام کی باتیں بیان کر جاتے۔

دارالعلوم دیوبند میں ماہنامہ "تجلی" پر قدغن تھی مگر نہ جانے کتنے طلبہ چھپ چھپا کر "تجلی" کا مطالعہ کرتے۔ مولانا عامر عثمانی مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور اکابر دیوبند کے عقیدت مند تھے مگر لکیر کے فقیر نہ تھے! دیوبند کے متوسلین اپنے اکابر کی عقیدت میں جو غلو کرتے ہیں مولانا عامر اس سے محفوظ تھے اور اپنے بڑوں کی غلطیوں کی تائید اور تاویل نہیں کرتے تھے، اگر دیوبندی حضرات مولانا عامر عثمانی کی روش اختیار کرتے تو دیوبند کی مخالفت میں "زلزلہ" نام کی کتاب وجود میں نہ آتی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مولانا عامر عثمانی کے عم محترم تھے۔ اُن کے والد حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن قدس سرہٗ حضرت شیخ الہند سے بیعت تھے۔ مگر عامر عثمانی کو پیری مریدی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ "تجلی" میں عجمی تصوف پر وہ خوب کس کر تنقید کرتے رہتے تھے۔ شرک و بدعت کی تردید اور توحید و سنت کی تبلیغ و اشاعت اُن کا سب سے زیادہ محبوب شغل تھا۔ انہوں نے ہزاروں صفحے شرک و بدعت کی تنقیص و تردید میں لکھے ہیں اور مشرکانہ عقائد و رسوم کے ایک ایک جزئیہ پر احتساب کیا ہے، اس میدان میں وہ ہر وقت شمشیر برہنہ رہتے تھے! اُن کے مفاخر و حسنات کا سب سے روشن باب شرک و بدعت کے خلاف قلمی جہاد ہے، جس کا آخرت میں ان شاء اللہ العزیز اجرِ غیر ممنون انہیں ملے گا۔

اس تمام علم و فضل اور ذہانت و بصیرت کے باوجود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے انتہائی قدر شناس، عقیدت مند اور مداح تھے۔ مولانا مودودیؒ کو وہ امام العصر اور مجتہدِ وقت بلکہ اس دور کا مجدد سمجھتے تھے۔ مولانا مودودیؒ کی مدافعت میں وہ ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آتے تھے۔

"فاران" میں کتابوں پر جس انداز میں نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے، یہ انداز کئی رسالوں نے اختیار کیا مگر وہ اسے نباہ نہ سکے۔ مولانا عامر عثمانی نے "تجلی" میں اس انداز کو پوری طرح برقرار رکھا، شعر و ادب اور زبان پر "فاران" کی تنقیدیں "تجلی" کی تنقیدوں سے شاید کچھ نکلتی ہوئی ہوں، مگر علمی مباحث اور کتابوں پر "تجلی" کی تنقیدوں کا جواب نہیں! یہ مولانا عامر عثمانی کا حصہ تھا، جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے راقم الحروف کی اُن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اب سے تقریباً بائیس برس قبل مولانا عامر عثمانی کراچی تشریف لائے تو اُن کی زبان سے اس قسم کی غزلیں:

یہ قدم قدم بلائیں ، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

سن کر بڑی مسرت ہوئی، پھر انہوں نے "تجلّی" میں ابوالاثر حفیظ جالندھری کے شاہنامہ کی بحر اور انداز پر سیرت النبیؐ کے منظوم واقعات کا سلسلہ شروع کیا، جو خوب تھا اور اُسے پسند کیا گیا! پھر ایک ایسا دور بھی آیا کہ اُن کی شاعری کا شوق بجھ سا گیا، اس پر میں نے اُن کو لکھا کہ شعر کہنا ترک نہ کیجیے، اللہ تعالیٰ نے شعر گوئی کی جو صلاحیت آپ کو دی ہے اُسے کام میں لایئے۔

پاکستان اور ہندوستان کے مابین برسوں سے ڈاک بند رہنے کے بعد جو ڈاک کھلی تو مولانا عامر عثمانی سے مراسلت کا موقع ملا انہوں نے اپنے کئی قطعے بھیجے، اور اپنی شاعری کے بارے میں میری رائے دریافت کی، میں نے انہیں جواب میں لکھا کہ فلاں فلاں مصرعوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ آپ کو بھی "ترقی پسند شاعری" کی برائے نام ہی سہی مگر چھینٹ لگ گئی ہے ایک دو مصرعوں کا تجزیہ بھی میں نے کیا کہ ان میں یہ یہ مقامات محلِ نظر ہیں، میری تنقید و مشورت کا انہوں نے بُرا نہیں مانا۔

عجیب واقعہ ہے کہ یا تو وہ ایک زمانے میں شاعری سے بے تعلق ہو گئے تھے مگر کئی برس سے شعر گوئی کا شغف بڑھ گیا تھا۔ کوئی شک نہیں وہ نغز گو شاعر تھے! کئی مہینے ہوئے میرے پاس اُن کا خط آیا کہ مہینہ بھر صوبہ مدراس کے مختلف شہروں کا سفر کیا، ہر جگہ مشاعرے پڑھے پانڈیچری اور کیرالہ بھی ہو آیا جس دینی مشن کے وہ مبلغ تھے اور اُن کو علم و فضل کا جو بلند مقام حاصل تھا اُس کے دیکھتے ہوئے مولانا عامر عثمانی کی مشاعروں میں مسلسل شرکت اُن کے نیاز مندوں کی نگاہ میں قدسے محسوس ہوئی کہ وہ "ماہر القادری" نہیں "مولانا عامر عثمانی" تھے۔

پونا کے جس مشاعرے میں شعر پڑھتے ہوئے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اس مشاعرے اور ہندوستان کے متعدد شہروں کے مشاعروں کی دعوت راقم الحروف کو ملی تھی۔ اُدھر سے اصرار کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی، خطوط ہی نہیں تار بھی آئے، فون پر بھی بمبئی سے گفتگو ہوئی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بسترِ علالت سے دو خط لکھے کہ خدا کے لیے کسی طرح آجاؤ، مگر میرا جانا نہ ہو سکا! روزنامہ "دعوت" دہلی میں "مولانا عامر عثمانی کے آخری چند دن" کے عنوان سے جناب محمد داؤد (نگینہ) نے ایک مضمون قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا (عامر عثمانی) تین روز تک برابر خاموش پڑے رہے.... پھر آہستہ

آہستہ افاقہ ہونے لگا، آپ نے گھر والوں سے اور ڈاکٹروں سے اپنے بمبئی جانے کے ارادے کا اظہار کیا، ڈاکٹروں نے کہا کہ ہم اتنے طویل سفر کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے۔ آپ کو مسلسل آرام کی ضرورت ہے۔ اس پر مولانا نے کہا اچھا اجازت نہیں دیتے تو بغیر اجازت ہی چلا جاؤں گا۔ گھر کے لوگوں نے جب آپ کو اس سفر سے باز رکھنا چاہا تو آپ نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا میں وہاں ضرور جاؤں گا، میرا بچپن کا دوست ماہرالقادری[1] آرہا ہے اس سے ملنے کو میرا بے انتہا دل چاہتا ہے ...... "

جماعتِ اسلامی مہاراشٹر کے رُکن جناب عبدالرحمٰن صاحب کا میرے نام بمبئی سے جو خط (مورخہ ۱۴ اپریل) آیا ہے اُس میں صاحب موصوف نے لکھا ہے:

" ایک جانکاہ خبر سنانے جا رہا ہوں جس کے لیے نہ دل آمادہ ہے نہ قلم چل رہا ہے لیکن مشیتِ ایزدی کے آگے ہم بے بس ہیں، مولانا عامر عثمانی صاحب کا پرسوں شب میں پونہ میں انتقال ہوگیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

انجمن خیرالاسلام کے ایشیائی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے بمبئی تشریف لائے تھے، مشاعروں سے مرحوم کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن چونکہ آپ بھی شریک ہونے والے تھے لہٰذا آپ سے ملاقات کی شدید خواہش کے پیش نظر گزشتہ ماہ جب وہ بمبئی تشریف لائے تو ہم لوگوں سے فرمایا تھا کہ اس ایشیائی مشاعرے میں انہیں مدعو کیا جائے تو اچھا ہے چنانچہ بڑی کوششوں کے بعد ان کو دعوت نامہ جاسکا، کسے معلوم تھا کہ یہ بلاوا اصلاً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہوا ہے، بندرہ بیس روز قبل دل کا ایک دورہ پڑ چکا تھا۔ ۲۴ گھنٹے بے ہوش رہے اور ابھی صحت بمبئی کے سفر کی متحمل نہیں تھی، مگر آپ سے اور دیگر رفقاء سے ملاقات کے شوق میں چلے آئے، احتیاطاً اپنے برادر نسبتی کو ساتھ لے لیا تھا۔ ۱۱ اپریل کو صابو صدیق ٹکنک گراؤنڈ پر کلام بیٹھ کر سنایا، کچھ بدمستی حضرات نے ہوٹنگ

---

[1] مولانا عامر عثمانی مرحوم نے بچپن نہیں کہا ہوگا، وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے اور اُن سے پہلی بار ملاقات کراچی میں پاکستان بننے کے تین چار برس بعد ہوئی تھی۔ (م۔ق)

کردی۔ اس کے بعد مرحوم اسٹیج سے اٹھ گئے، ہم لوگ بھی اُن کے ساتھ نکل آئے۔ ڈاکٹر عبدالکریم نائیک صاحب نے ایک مشہور (CARDIOLOGIST) کے نام چھٹی لکھ کر مجھے دی کہ دوسرے دن میں وہاں لے جا کر معائنہ و علاج کراؤں۔

لیکن دوسرے دن منتظمین مشاعرہ اصرار کر کے انہیں پونہ کے مشاعرے میں لے گئے جہاں مرحوم نے کلام سنایا۔ خوب داد حاصل کی، کلام سنا کر بیٹھے اور برادرِ نسبتی کے زانو پر سر رکھ کر ابدی نیند سو گئے! ڈاکٹر نائک صاحب وہاں موجود تھے فوراً کار میں لے کر بمبئی روانہ ہو گئے، یہاں سے ہم نے دیوبند ٹرنک کال لگائی لیکن کامیابی نہیں ہوئی، امیر جماعت اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے مشورے سے بمبئی میں تدفین کر دی گئی، مفتی صاحب ہمارے فون کے فوراً بعد بذریعہ کار دیوبند تشریف لے گئے، ہم نے تو ہوائی جہاز کے ذریعہ میت بھیجنے کے انتظامات کر لیے تھے لیکن مفتی صاحب کے مشورے کو ترجیح دی گئی۔

"مرحوم کو آپ سے خصوصی تعلق تھا، پچھلی بار بمبئی تشریف لائے تو بڑے شوق سے آپ کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ آپ کے اس مشورے کا بھی تذکرہ کیا جو آپ نے انہیں شاعری نہ چھوڑنے کے سلسلہ میں دیا تھا۔ جماعتِ اسلامی کے تعلق سے پاکستان میں آپ نے جس محاذ کو سنبھالا ہے، اس محاذ پر ہندوستان میں مرحوم جو کبھی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس لحاظ سے جماعت کا بڑا نقصان ہوا۔ مرحوم کے قلم میں جو روانی، تیزی اور منطقی انداز تھا وہ بے مثل ہے، اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمائے، ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور لغزشوں سے درگزر......"

یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل و کرم ہے کہ مجھ جیسے معمولی حیثیت اور سطحی استعداد کے شخص کی اتنے بڑے لوگوں کے دل میں اتنی محبت ڈال دی گئی ہے!

بعض اشعار اور ضرب الامثال رسمی طور پر ہر پڑھے لکھے اور عالم کے لیے لکھ دیئے جاتے ہیں مگر مولانا عامر عثمانی کی موت فی الحقیقت "موت العالِم موت العالَم" کی صحیح مصداق ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۷۵ء)

مولانا عبدالباری ندوی

اب سے تقریباً ۵۵ برس پہلے اخبارات میں "مولانا عبدالباری" کا نام آتا تھا۔ تو پڑھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ یہ فرنگی محل کے شیخ الشیوخ مولانا عبدالباری ہیں۔ مولانا عبدالباری کے نام کے ساتھ "ندوی" کی نسبت سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا عبدالباری ندوی کے ناموں میں امتیاز ہوتا تھا! سیرت النبیؐ کی تیسری جلد میں "فلسفۂ جدیدہ اور معجزات" کے عنوان پر سو صفحے مولانا عبدالباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کے اس حصہ کے ذریعہ راقم الحروف اُن سے متعارف ہوا اور فلسفہ کے ساتھ اُن کی دینی وابستگی کا اچھا نقش میرے لوحِ دل و دماغ پر ثبت ہوگیا۔

مولانا عبدالباری ندوی جامعہ عثمانیہ دکن میں فلسفہ کے استاد تھے، اُن سے حیدرآباد دکن میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ملاقات ہوتی رہتی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سے اُن کا بڑا گہرا یارانہ تھا، اکثر و بیشتر موٹر کار میں جلسوں اور دعوتوں میں ان دونوں بزرگوں کو ایک ساتھ دیکھا گیا۔

ایک بار مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری غریب خانہ پر تشریف لائے اور مشہور صوفی بزرگ مولوی محمد حسین (ناظم سمتان و نیبرتی) کی مجلسِ وعظ و ارشاد میں مجھے لے گئے، راقم الحروف کو دیکھتے ہی مولوی محمد حسین نے فرمایا :

"ابھی کچھ نہیں ...... بہت بڑا مرتبہ ہونا، بڑا رتبہ ہونا۔"

مولوی محمد حسین مرحوم نے گھنٹہ سوا گھنٹہ لاالٰہ الا اللہ کی تشریح فرمائی۔ وعظ کہتے میں وہ سیگرٹ پیتے جاتے تھے، تقریر خاصی دلنشین تھی، وہ دینی عالم نہ تھے مگر اپنے وعظ میں ایسے نازک نکتے بیان کرتے جو بقول مولانا مناظر احسن گیلانی تصوف و اخلاق کی کتابوں میں نہیں ملتے! اُن کے معتقدین کا خیال تھا کہ انہیں "علم لدنی" عطا کیا گیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد یا تقسیم ہند سے کچھ قبل مولانا عبدالباری ندوی حیدرآباد دکن سے

پنشن لے کر لکھنؤ آ گئے اور مرتے دم تک یہیں رہے۔

"فاران" نکلنا شروع ہوا تو ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا، "فاران" اُن کی خدمت میں اعزازی بھیجا جاتا، اپنے خطوں میں راقم الحروف کے مضامین کی تعریف بھی فرماتے، اپنی ہر کتاب "فاران" میں تبصرہ کے لیے بھیجتے، ان میں مشہور مغربی فلسفی "ہیوم" (HUME) پر بھی ایک کتاب تھی۔ پھر انھوں نے مغربی فلاسفہ پر لکھنا بند کر دیا۔ اپنے قابلِ احترام شیخ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر کئی کتابیں لکھیں، جن پر "فاران" میں مفصل تبصرہ آچکا ہے۔ "جامع المجددین" میں مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا تھانویؒ کی شخصیت تمام مجددین کی جامع ہے اور حضرت مولانا تھانویؒ نے تجدیدِ دین کا کارنامہ انجام دیا ہے! اُن کی تحریریں خشک ہوتی تھیں مگر علم و حکمت اور اخلاق سے لبریز! مولانا مرحوم نے فلسفہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اسلام کی صداقت ثابت کرنے کے لیے جو سعی کی ہے اس کا اجر اُنہیں آخرت میں ملے گا! اُن کی علمی شخصیت بلند پایہ تھی اور سیرت و کردار صالحیت کی روشن مثال!

برسوں اُن کے خط آتے رہے جن سے مودت و محبت اور ہم فکری کا اظہار ہوتا تھا مگر پھر خطوں میں طنز و تعریض کا رنگ بھی پیدا ہو گیا، سیاست کو وہ دنیا داری کا کام سمجھنے لگے اور جب وہ سیاسیات پر طنز کرتے تو جماعتِ اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ کی ذات پیشِ نظر ہوتی، یہ لَے پھر بڑھتی ہی چلی گئی، میں نے اپنے نیاز ناموں میں انہیں لکھا کہ سیاست کو دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور حکومت بھی دنیا داری کا کام نہیں ہے اب رہی گندی سیاست تو ——— جماعتِ اسلامی اس کی تطہیر کا فرض انجام دے رہی ہے۔

اب کئی برس سے خط و کتابت بند تھی، اُن کی آخری کتاب "مذہب اور سائنس" جو مکتبہ رشیدیہ (شاہ عالم مارکیٹ لاہور) نے شائع کی ہے، تقریباً ایک برس سے تبصرے کے لیے آئی ہوئی رکھی ہے اس پر "فاران" میں ان شاء اللہ مفصل تبصرہ ہو گا۔

اس بات کو پندرہ سولہ برس ہوئے ہوں گے اُن کے صاحبزادے دفتر "فاران" میں اپنے والدِ محترم کے ایما پر مجھ سے ملے تھے، میں نے صاحبزادے سے کہا کہ مجھ سے

جو کچھ ہو سکتا ہے اُس کے لیے میں حاضر ہوں، پھر ان کی خیر خبر نہیں ملی کہ ہندوستان واپس چلے گئے یا پاکستان ہی میں موجود ہیں! خدا کرے جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں اور روزگار کی طرف سے مطمئن ہوں۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم ایک بار پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے علامہ سید سلیمان ندوی حیات تھے، اُنہی کے دولت کدے پر دعوت میں مولانا ندوی سے ملاقات ہوئی۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے چہرے سے، آنکھوں سے اور جبین و رخسار کی سلوٹوں سے ایسا لگتا تھا کہ شب بیدار ہیں اور وظائف و اوراد سے خاص شغف رکھتے ہیں! دینداری اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، فلسفہ کے ساتھ خانقاہی ذوق، آب و آتش کا اجتماع تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات اور تعلیمات کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے آخری عمر میں صحت اچھی نہیں رہی تھی اور گراں گوش تو وہ برسوں سے تھے! اُن کی وفات کی خبر اخباروں میں پڑھی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۶ء)

مولانا سیّد عبد الجبار

مولانا سید عبد الجبار مرحوم سے راقم الحروف کی شناسائی اور تعارف قیام حیدر آباد دکن کے زمانہ سے ہے، یہ مدت تیس سال سے کچھ زائد ہوگی۔ مولانا مرحوم حکومت حیدر آباد دکن کے محکمۂ امورِ مذہبی میں واعظ تھے۔ سرکار سے تنخواہ ملتی تھی اور مذہب و اخلاق کے موضوع پہ وعظ و خطابت کی خدمت ان سے متعلق تھی۔ بلدۂ حیدر آباد کے معاشرے میں مولانا مرحوم کی شرافت، نیک نفسی اور پاک و صاف زندگی کی اچھی شہرت تھی۔

قلمرو دکن پر بھارت کے قبضے کے بعد مولانا مرحوم پاکستان چلے آئے، پاکستان ریڈیو سے برسوں اُن کی تفسیرِ قرآن نشر ہوئی ہے، جسے تمام دینی حلقوں میں پسند کیا جاتا تھا اور اشتہاروں اور اعلانوں میں اُن کے نام کے ساتھ "مفسرِ قرآن ریڈیو پاکستان" لکھا جاتا تھا۔ ان کا اندازِ تفسیر اور اسلوبِ شرحِ قرآن سادہ، عام فہم اور دلنشیں ہوتا تھا۔ بمبئی بازار کی جامع (لال) مسجد میں وہ خطیب تھے اور سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں مولانا مرحوم کی خاصی مانگ رہتی تھی۔ اُن کے وعظ کی خصوصیت سادگی اور تاثیر تھی۔ وعظ و تقریر میں عوام کے ذوق اور عقائد کی انہوں نے کبھی رعایت نہیں کی ہمیشہ حق بات کہی چاہے وہ کسی کو بُری لگے یا بھلی!

مولانا عبد الجبار مرحوم کی صورت شکل، رفتار گفتار، لباس اور وضع قطع سے شرافت اور نیکی ظاہر ہوتی تھی، وہ مطب کے ذریعہ اپنی قوتِ بازو سے روزی کماتے تھے۔ فیڈرل ایریا میں انہوں نے مکان بھی بنا لیا تھا، مگر اُس میں شاید ڈیڑھ دو سال سے زیادہ رہنے کی مہلت نہیں ملی کہ خالقِ حیات و موت کی بارگاہ سے طلبی کا پروانہ آگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن! غفر لہ اللہ تعالیٰ

ذیابطیس اور بلڈ پریشر کے مریض تھے، کئی سال سے ان کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی، مگر اس عالم میں بھی وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہتے۔ مرحوم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے انتہائی قدر شناس اور مداح تھے اور جماعتِ اسلامی کے پُرجوش مؤید!

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنی حق گوئی اور ارباب اقتدار پر سخت تنقید کے سبب گرفتار ہوتے ہوتے رہ گئے۔ اگر یہ حادثہ پیش آجاتا تو وہ عزیمت کا ثبوت دیتے —— اس کردار کے لوگ عنقا ہوتے جارہے ہیں۔ ان کی موت ملّتِ اسلامیہ کا نقصان ہے۔

(ماہنامہ "فاران" جنوری ۷۲ء)

مولانا عبدالحامد بدایونی

۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے، اب سے ۵۴ سال قبل بدایوں کے عُرس قادری میں مشہور نعت گو شاعر مولانا ضیاء القادری بدایونی مرحوم نے مولانا عبدالحامد بدایونی سے میرا تعارف کرایا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد اُن سے ملنا ہوتا رہتا، عقائد کے اعتبار سے یہ میرا دورِ جاہلیت تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا عبدالحامد مرحوم کے مکان پر شاہ جلال بخاریؒ کی فاتحہ کی تقریب تھی، کھیر کونڈوں میں جمائی گئی تھی، نمک خواری کے بجائے شکر خواری کا اُن کے یہاں مجھے موقع ملا۔

بھساول میں ریلوے انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ہر سال سیرۃ النبیؐ کا جلسہ اور دوسرے دن کل ہند مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک بار (غالباً ۱۹۴۲ء میں) مولانا عبدالحامد صاحب کے ساتھ بھساول تک ریل میں سفر کیا اور سیرت کے جلسہ میں اُن کی تقریر سے قبل اور بعد میں نے نعتیہ نظمیں سنائیں۔

پاکستان بننے کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں جب راقم الحروف کراچی آیا، تو کسی دعوت یا جلسہ میں مولانا عبدالحامد مرحوم سے ملاقات ہوئی، اس وقت تک اُن کے اہل خانہ پاکستان نہیں آئے تھے، مولانا مرحوم آدم جی مسجد کی ملحق عمارت کے بالا خانے پر ٹھہرے ہوئے تھے، پھر انہیں گاندھی گارڈن کے قریب رہائش کے لیے بنگلہ مل گیا۔

مولانا مرحوم مقرر، میں شاعر، کراچی کے جلسوں میں اُن کا اور میرا ساتھ رہتا۔ کئی بار غریب خانہ پر بھی تشریف لائے، میں نہ ہوتا تو پرچہ لکھ کر چھوڑ جاتے۔ نواب مشتاق احمد خاں ان دنوں حکومت حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل تھے۔ مولانا کو علم ہوا کہ میری اُن سے اچھی خاصی جان پہچان ہے، تو ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ مشتاق صاحب سے کہیے وہ حیدر آباد کے مسئلہ پر پبلک جلسے کیوں نہیں کراتے؟ میں اس پر خاموش ہو گیا کیونکہ

بات پھر روپیہ پیسہ تک پہنچی تھی، مالی امداد کے بغیر تو جلسے نہیں ہو سکتے تھے۔

جب مولانا مرحوم اپنی والدہ کی شدید علالت کی خبر سُن کر جیل سے پیرول پر کراچی آئے تو میں اُن سے جا کر ملا، وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ پولیس کے سپاہیوں نے تم سے بنگلہ کے دروازے پر پوچھ گچھ تو نہیں کی؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے کسی نے نہیں ٹوکا، اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس قسم کے مرحلے میرے لیے آسان ہو جاتے ہیں!

اُن کے انتقال سے ڈیڑھ مہینہ قبل مولانا کے داماد اکرام صدیقی صاحب کے زیرِ اہتمام، فیڈرل ایریا میں جلسۂ سیرت کا اہتمام کیا گیا، وہ پہلے غریب خانہ پر کار لے کر آئے پھر مولانا کو اُن کے دولت کدے سے لیا۔ مولانا کی نقاہت کا یہ عالم تھا کہ موٹر میں بیٹھے تو سانس پھول گیا۔ کئی منٹ تک وہ بات نہ کر سکے مگر کس قیامت کی ہمت تھی کہ اس قدر نقاہت کے عالم میں بھی جلسوں میں تقریر کرتے اور کوئی پروگرام ناغہ نہ ہونے پاتا۔

مولانا عبدالحامد بدایونی کئی سال سے بیمار تھے، کمزوری بڑھتی گئی مگر مصروفیتوں میں کمی نہیں آئی، اب جمعیتہ علماء پاکستان جس کے وہ مستقل صدر تھے اُن کی "ذات" میں سمٹ کر رہ گئی تھی! جمعیتہ علماء کا بہت کچھ کام وہ خود کرتے تھے۔

وہابیت کی "تردید" میں سب سے زیادہ شہرت مولانا فضل رسول بدایونی کو حاصل رہی ہے، اُن کے پوتے حضرت عبدالمقتدر بدایونی جامع طریقت و شریعت تھے، مولانا عبدالحامد بدایونی بھی اسی عثمانی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے بڑے بھائی مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم تقریر و خطابت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا آزاد سبحانی کی صف میں شمار ہوتے تھے، اُن کے وعظ و تقریر کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی۔

"بریلوی فرقہ" جس کو کہا جاتا ہے، اس کا اصل مرکز تو بدایوں تھا، حیرت ہے کہ بدایوں پس منظر (BACK GROUND) میں چلا گیا اور "بریلی" کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی، مولانا احمد رضا خاں صاحب جن کو "بریلوی" فرقہ کا امام سمجھا جاتا ہے، وہ مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی محبّ رسول کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے، مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم کے مجموعۂ نعت و منقبت (حدائقِ بخشش) میں مولانا عبدالقادر محبّ رسول بدایونی کی شان میں احترام و عقیدت سے لبریز قصیدہ موجود ہے! جو مسجدیں بریلوی سلسلۂ طریقت کے زیرِ اثر ہیں اُن میں جمعہ کی اذانِ ثانی منبر کے سامنے نہیں بلکہ مسجد کے

صحن یا مینار و فصیل پر دی جاتی ہے اس پر مولانا احمد رضا خاں اور بدایوں کے علماء میں اختلاف پیدا ہوا اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ مقدمہ بازی کی نوبت آ گئی۔

بدایوں اور بریلی کے عقائد کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "ندوہ" جب قائم ہوا ہے، تو ان حضرات نے اس کے خلاف فتوے دیئے۔ اسی "باطل" (؟) کو مٹانے کے لیے مولانا عبدالحامد بدایونی کے والد مولانا عبدالقیوم نے بہار کا سفر کیا مگر بدایوں واپس آنا قسمت میں نہیں لکھا تھا، پٹنہ کے ریلوے اسٹیشن پر چلتی گاڑی میں سوار ہونے لگے تو پاؤں ڈگمگائے اور ٹرین کے نیچے آ کر جاں بحق ہو گئے۔

حامد میاں[1] کے والد کا جب انتقال ہوا ہے تو وہ کمسن تھے۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے اُن کی پرورش اور تربیت کا بارِ گراں اٹھایا اور اپنی زندگی ہی میں اس قابل کر دیا کہ وہ مذہبی اور سیاسی جلسوں میں بلائے جانے لگے! ماجد میاں مرحوم کی وفات کے بعد حامد میاں اگر اپنے بھتیجے مولانا عبدالواحد عثمانی کو سہارا دیتے تو وہ "بہت کچھ" بن سکتے تھے اور مولانا عبدالحامد کے حریف یا مدِ مقابل بننے کے بجائے خود اُن کے دست و بازو بنتے۔ واحد میاں اپنے چچا حامد میاں سے زیادہ لکھے پڑھے ہیں اور رفتار و گفتار، شکل و شباہت اور اندازِ تقریر میں اپنے محترم والد (ماجد میاں مرحوم) کے شبیہ و مثنیٰ! مگر مولانا عبدالحامد بدایونی اپنی ذات اور مفاد کے حصول و تحفظ میں انتہائی محتاط اور دور اندیش تھے۔ محسن بھائی کے بیٹوں (واجد میاں اور واحد میاں) کی سرپرستی اور امداد کرنا تو ایک طرف رہا، ریاست حیدر آباد سے ماجد میاں اور حامد میاں کو جو وظیفہ ملتا تھا اس سلسلہ میں چچا اور بھتیجوں کے درمیان نزاع برپا ہو گئی۔ میں ان دنوں حیدر آباد دکن میں تھا، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا عبدالواحد عثمانی دونوں بلدہ حیدر آباد پہنچے ہوئے تھے اور وظیفہ کے لیے صدر محاسبی میں پیشیاں ہو رہی تھیں۔ مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی واحد میاں کے طرفدار تھے۔

---

[1] مولانا عبدالحامد اور مولانا عبدالماجد بدایوں میں "حامد میاں" اور "ماجد میاں" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ فرنگی محل کے قطب میاں اور جمال میاں کی طرح۔

حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی کا ذکر اوپر آچکا ہے، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور اب سے ساٹھ سال پہلے اس خاندان کے تمام چھوٹے بڑے مولانا عبدالمقتدر رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ بیعت وارادت میں داخل تھے۔ مولانا عبدالحامد اپنے نام کے ساتھ "قادری، مقتدری، معینی، عثمانی" لکھا کرتے تھے۔

ایک ہی خاندان کے چشم وچراغ ہونے کے باوجود مولانا عبدالقدیر بدایونی اور مولانا عبدالماجد میں اختلاف تھا، ایک دوسرے کے گھر آنا جانا اور ملنا جلنا بند! حامد میاں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ تھے، مگر مولانا عبدالقدیر بدایونی اس خانوادہ طریقت کے صاحب سجادہ تھے، اس لیے جہاں کہیں مولانا عبدالماجد اور مولانا عبدالحامد کا مولانا عبدالقدیر بدایونی سے سامنا ہو جاتا تو دونوں بھائی مولانا عبدالقدیر صاحب کے پاؤں چھونے کے لیے بے ساختہ جھک جاتے۔

سلسلۂ قادریہ میں "سماع" ممنوع ہے، مگر حضرت مولانا عبدالمقتدر کے عرس کے دوسرے دن مولانا عبدالماجد بدایونی کے مکان پر بڑے دھوم کی قوالی ہوتی تھی، ہندوستان کے سب سے بڑے قوال بخشا کو میں نے اسی محفل میں سنا۔ کراچی میں مولانا عبدالحامد مرحوم کے یہاں قوالیاں ہوتی تھیں وہ "قادری" ہی نہیں "چشتی" (معینی) بھی تھے۔

حامد میاں مرحوم نے مدرسہ شمس العلوم (بدایوں) میں درس نظامی کی تکمیل کی۔ تقریر وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی کیا کرتے تھے، تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سیاسی اور دینی اجتماعات میں انہیں تقریر کرنے کے لیے بلایا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اُن کی شہرت ہونے لگی یہاں تک کہ تحریک پاکستان میں ایک مقرر اور عالم دین کی حیثیت سے حصہ لینے کے سبب اُن کی شہرت میں خاصا اضافہ ہوا۔ شہرت کے ساتھ اُن کی مالی حالت بھی بہتر سے بہتر ہوتی چلی گئی۔ بدایوں کے آبائی مکان کو انہوں نے کئی ہزار روپیہ لگا کر دیدہ زیب اور کشادہ بنایا۔ میں نے اُس دَور میں اپنی آنکھوں سے اخباروں کے نام اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مراسلے دیکھے ہیں، جن میں اُن کے استقبال و پذیرائی کی کیفیت القاب وآداب کے ساتھ درج تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اخبار والے میرا خط کا ہے کو پہچانتے ہوں گے اور ان کا یہ خیال صحیح بھی تھا مگر پھر بھی —— تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو مرزا نصراللہ بیگ صدر محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل) کے یہاں قیام فرمایا، میرا مکان اُن کی قیام گاہ سے بہت قریب تھا، دو تین بار اُن سے ملنے کے لیے گیا۔ مسلمانانِ دکن کے رہنمائے اعظم نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے اپنے یہاں اُن کی دعوت کی۔ نظام دکن کی بارگاہ میں دو تین بار انہیں باریاب ہونے کا موقع ملا۔ غالباً ایک بار نواب میر عثمان علی خاں والیٔ دکن نے اُن کی تقریر بھی سُنی۔ آبائی وظیفہ کے علاوہ مولانا عبدالحامد بدایونی کی ذات کے لیے حضور نظام نے تیس ۳۰ یا پچاس ۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر فرمایا۔

پاکستان آنے کے بعد مولانا عبدالحامد بدایونی کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، اس میں خود ان کی اپنی محنت، سعی و توجہ اور دوڑ دھوپ کا بہت کچھ ہاتھ تھا۔ شدید بیماری کی حالت میں بھی جلسوں میں تقریریں کرتے۔ جمعیۃ علماء پاکستان کے اجلاس بُلاتے قراردادیں خود لکھتے، باہر سے آئے ہوئے مسلم مشاہیر اور وفود سے ملنے کے لیے جاتے اور ان کے اعزاز میں دعوتوں اور استقبالیوں کا اہتمام فرماتے، اس طرح انہوں نے اپنی شخصیت کو منوا کر چھوڑا۔ مذہب و سیاست کے ہر بڑے سے بڑے مشترک جلسہ میں مولانا مرحوم کو مسلمانوں کے ایک طبقہ کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا۔ علماء کا وہ طبقہ جسے "بریلوی" کہا جاتا ہے اُس کے امتیاز و تشخص کو باقی رکھنے کا بہت کچھ کریڈٹ مولانا عبدالحامد بدایونی کو ملنا چاہیے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی کی تقریر عوام کو متاثر کرتی تھی مگر ایک ہی تقریر میں موضوع بدلتے رہتے۔ ابھی قیامِ میلاد کے جواز پر دلیلیں لا رہے ہیں، اس کے بعد اپنے جیل جانے کا ذکر چھیڑ دیا پھر انگریزی زبان پر طنز فرمانے لگے کہ اُس میں یکسانی نہیں پائی جاتی، بی، یو، ٹی "BUT" کا "بٹ" اور پی، یو، ٹی "PUT" کا تلفظ "پُٹ" کیا جاتا ہے۔ اس مقام سے جو گریز کی تو اپنے سفرِ چین کے حالات بیان کرنے لگے۔ یہ لطیفہ بہت مشہور ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یونین ہال میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خاص لہجہ اور انداز میں "اے روحِ محمد علی" کئی بار کہا، اس پر مجمع سے آواز بلند ہوئی:

"میں آئی"

اور پھر ہال قہقہوں سے گونج گیا۔

تقریر کے ساتھ عقائد کا یہ رنگ کہ انھوں نے کسی بزرگ کے یوم وفات پر الآ ان اولیآء اللّٰہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون سے تقریر کا آغاز کیا اور اس آیت کی شرح کرتے ہوئے بزرگان دین کی منقبت میں وہ تمام باتیں کہہ گئے جو شان الوہیت کا خاصّہ ہیں یعنی ہر کسی کی فریاد کو سننا اور مشکل کشائی کرنا، لوگوں کے دلوں کا حال جاننا، کائنات کے کسی ذرّہ کا بھی اولیاء اللہ کی نگاہ میں پوشیدہ نہ رہنا۔ عوام بے چارے جو عربی نہیں جانتے وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ قرآن کریم کی آیت میں "اولیاء اللہ" آیا ہے اور مولانا جو کچھ فرما رہے ہیں وہ قرآن کے عین مطابق ہے حالانکہ اس آیت میں اولیاء اللہ کے غمگین و محزون ہونے کی نفی کی گئی ہے اس میں یہ تک نہیں کہا گیا کہ اولیاء اللہ مخلوق خدا کے غم دور کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

جلسۂ سیرت کی صدارت کوئی سرکاری عہدیدار اور "بڑا آدمی" کرتا ہوتا تو صاحب صدر کے مناقب اتنی دیر تک بیان کرتے کہ حاضرین جلسہ میں چہ میگوئیاں ہونے لگتیں کہ "ہم صدر جلسہ کی سیرت نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سننے کے لیے یہاں آئے ہیں۔"

پاکستان کے سابق گورنر جنرل مسٹر غلام محمد کا سیرت النبیؐ کے جلسہ میں "محمدؐ کا غلام" کہہ کر جو خیر مقدم کیا ہے تو اُن کی تعریف کے پل توڑ دیئے! مدح و ستائش کا فن اُن کو خوب آتا تھا، مگر جلسوں میں ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی اور پلکیں آنسوؤں میں بھیگ گئیں۔

مصر کے صدر ناصر ہوں یا نجد و حجاز کے شاہ فیصل ان سب سے وہ مل چکے تھے کویت، فلسطین و شام اور عراق کے اکابر سے بھی اُن کا تعارف تھا۔ ایک یا دو بار مصر کا سفر کیا، حجاز میں کئی بار شاہی مہمان رہے۔ کراچی کی آبادی سے کچھ دور جامعہ تعلیمات اسلامی کی بنا ڈالی، اُس زمانہ کے صدر ایوب خاں نے سنگِ بنیاد رکھا اور (غالبًا) ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔ اسی لیے عمارت کے صدر دروازے پر "باب ایوب" لکھا ہوا ہے، حکومت کویت نے خاصی گرانقدر مالی امداد دی، بعض ملکوں نے بھی چندہ دیا، مگر یہ جان کر خاصی حیرت اور کوفت ہوئی کہ صرف انیس طلباء اس جامعہ (؟) میں تعلیم پاتے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ عطیات اور چندے کی رقم خود اُن کے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع ہے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم اسلام، ملّت اور پاکستان کے بہی خواہ تھے اور اللہ کے دین کا غلبہ اور سر بلندی چاہتے تھے مگر جب اُن کی ذات کا سوال آتا تو انہیں اس بات کا

ہوش نہ رہتا کہ ان کی روش اور موقف کا ملک و ملت پر کیا اثر پڑے گا ۔ ! فیلڈ مارشل ایوب خاں کے وہ آخر وقت تک مداح رہے، سال میں نہ جانے کتنی بار ایوب خاں صاحب کو مبارک باد کے تار بھیجتے ۔ روس اور چین کا سفر فرمایا تو ان اشتراکی ملکوں کی خوب تعریف کی ۔ اُن کے بیانات اور تحریروں سے ان حکومتوں نے "پروپیگنڈے" کا کام لیا، روسی سفارت خانہ کے آرگن "طلوع" میں مولانا عبدالحامد بدایونی کی تصویر شائع ہوئی جس کے نیچے ۔ "ہمارے دوست" لکھا تھا ۔ !

مولانا عبدالحامد بدایونی کو ایوب خاں صاحب نے مجلس مشورت اسلامی کا رکن مقرر کیا، وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف بھی تھے ۔ اندازِ تحریر سادہ اور عام فہم ! مولانا مرحوم مفکر کم اور مبلغ و واعظ زیادہ تھے ۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ جب وہ پہلی بار حیدرآباد گئے ہیں تو مرزا نصر اللہ بیگ کے مہمان تھے، مرزا صاحب، نواب الٰہی بخش خاں معروف سے خاندانی تعلق رکھتے تھے ۔ الٰہی بخش معروف غالب کے خسر تھے ان کی بیوی امراؤ بیگم معروف کی بڑی صاحبزادی تھیں ۔ الٰہی بخش خاں معروف کا قلمی دیوان مرزا نصر اللہ بیگ کے پاس تھا، جو مولانا عبدالحامد بدایونی کے اہتمام سے شائع ہوا، اس پر انہوں نے مقدمہ بھی لکھا ۔

مولانا عبدالحامد بدایونی کا جنازہ نماز کے بعد عوام نے لاری میں نہیں رکھنے دیا ۔ وہ کئی میل پیدل چل کر جنازے کو اپنے کاندھوں پر جامعہ تعلیمات اسلامی تک لائے، کئی ہزار کا مجمع تھا، یہاں بھی صحن موٹروں سے بھرا ہوا تھا ۔ اس کے بعد دفن کا مرحلہ اور "منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة أخرى" کی آوازیں ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۷۰ء)

مولوی عبدالحق (بی۔ اے)[1]

بابائے اُردُو

حیدر آباد دکن میں ایک صاحب تھے محمد اصغر بیرسٹر، مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے (غالباً علاتی) بھائی تھے۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں اصغر بیرسٹر بڑے جوشیلے قومی کارکن تھے پھر وہ ہائی کورٹ کے جج ہوگئے۔ نواب اصغر یار جنگ خطاب ملا، شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ اصغر تخلص کرتے تھے۔ نواب معظم جاہ بہادر کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ شعر پر داد دینے کا خاص انداز تھا۔ حضرت فانی بدایونی لطف لینے کے لیے مجھ سے پوچھتے "بھئی ماہر! رات پرنس کے یہاں نواب اصغر یار جنگ بہادر نے فلاں شعر پر کس طرح داد دی؟" میں نقل کر کے بتاتا۔ اس پر فانی مسکراہٹ سے لے کر قہقہہ تک پہنچ جاتے! انہی نواب اصغر یار جنگ کے یہاں

[1] بابائے اردو مذہبی عالم نہ تھے، حیدر آباد دکن میں اُن کا تقریباً پچاس سال قیام رہا ہے اور محکمۂ تعلیمات کے معزز عہدوں پر وہ فائز رہے ہیں، اس لیے "مولوی" اُن کے نام کا جزوِ لاینفک بن کر رہ گیا، کیونکہ ریاست دکن میں سرکاری طور پر "مسٹر" کی جگہ "مولوی" عہدیداروں کے ناموں کے ساتھ لکھا جاتا تھا! مولوی عبدالحق نے جس زمانے میں "بی۔ اے" پاس کیا ہے، اس دَور کے ہندوستان کے مسلمانوں میں گریجوایٹ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی بہت بڑا تعلیمی اعزاز تھا۔ چنانچہ مولوی عزیز مرزا اور مولانا ظفر علی خاں کے ناموں کے ساتھ "بی۔ اے" لازمی طور پر لکھا جاتا تھا۔ رسالہ اُردو کا سرورق ہو یا "بابائے اُردو" کی دوسری تصنیفات — ہر جگہ — مولوی عبدالحق بی۔ اے لکھا ہوا ملے گا، یہی اُن کا پسندیدہ نام بھی تھا، اور اسی نام اور لقب سے وہ مشہور بھی ہوئے۔

سب سے پہلے میں نے مولوی عبدالحق صاحب کو دیکھا، یہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے۔
نواب اصغر یار جنگ بہادر غالباً اس وقت تک "اصغر بیرسٹر تھے، اور اسی سال جج ہو بھی گئے ہوں تو نوابی کے خطاب سے بہرحال سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی معیت میں میرا وہاں جانا ہوگیا، چائے کا دَور چلا، مولوی عبدالحق کتاب کے مُطالعہ میں مصروف کیا مستغرق تھے! مولوی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی بلکہ اُن کا دیدار ہوا، بات چیت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مولوی صاحب کے تعارف کی ضرورت ہی نہ تھی کہ اُنہیں سب لوگ جانتے تھے اور اب سے اکتیس سال قبل میں کسی حیثیت سے بھی قابلِ تعارف نہ تھا۔

مولوی عبدالحق کا قیام اُن دنوں اورنگ آباد میں رہتا تھا، پھر وہ چند سال کے بعد بلدہ حیدرآباد میں آگئے۔ اسے کوئی چاہے تو احساسِ کمتری سے تعبیر کرلے یا اس کو خودداری کا نام دے دیا جائے۔ بہرحال مجھے مولوی صاحب کی قیام گاہ پر جانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی، جلسوں اور پارٹیوں میں دوچار بار اُن کا دیدار ہوکر رہ گیا! یہ میری عادت رہی ہے کہ میں نے خواہش کے باوجود اپنی طرف سے اکابر و مشاہیر سے ملنے کی پیش قدمی شاذونادر ہی کی ہے! مگر اُن سے ملاقات کے اسباب خودبخود پیدا ہوگئے ہیں، کیسے کیسے نامی گرامی آدمیوں سے ملاقات کے مواقع کس وقار کے ساتھ میسّر آئے ہیں ——— میرا ہی شعر ہے ؎

تجلّی بے حجابی کے لیے تیار ہو جائے
نگاہِ شوق تھوڑی سی اگر خوددار ہو جائے

انہی دنوں حیدرآباد دکن میں "ملکی تحریک" نے زور پکڑا، اس وطنی عصبیت کا نشانہ سب سے زیادہ یُوپی کے مسلمان تھے! اس المیہ کو کس سے بیان کیجیے کہ اس خطّۂ مینوسواد اور ذہانت بنیاد کے رہنے والوں کی "روشنیٔ طبع" ہر دَور میں، ہر جگہ انہی کے لیے "بلائے جان" ثابت ہوئی ہے۔ ہائے! یہ سفلہ پرور دُنیا، جہاں ذہانت و دانش پر نااہلی اور نالائقی کی پھبتیاں چُست کی جاتی ہیں۔

حیدرآباد دکن میں جب "ملکی تحریک" کا آغاز ہوا ہے، تو قائدِ ملّت نواب بہادر یار جنگ تک اس فتنہ کی جھپیٹ میں آگئے۔ بلدہ حیدرآباد دکن کے دیوک وردھنی تھیٹر میں،

مشہور مہا سبھائی لیڈر وامن نایک کے ساتھ اسی موضوع پر نواب صاحب نے دھواں دھار تقریر کی، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا کہ وہ بہت ہی جلد اس مخمصے سے نکل گئے، اور پھر اسلامی اتحاد کے پُرجوش داعی اور کتاب و سنت کے نقیب بن گئے! (اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمت ہو)

"ملکی تحریک" نے جب زور پکڑا، تو مولوی عبدالحق صاحب کی ذات اور انجمن ترقی اردو بھی اس لپیٹ میں آگئیں، بلدہ حیدرآباد کے جن حلقوں میں بھی میری پہنچ تھی، میں نے پوری قوت کے ساتھ مولوی صاحب کی مدافعت کی، میں نے شدّ و مد کے ساتھ کہا کہ جہاں تک اُردو زبان و ادب کی خدمت و ترقی کا تعلق ہے، پورے دکن میں ایک شخص بھی اُن کی برابری نہیں کر سکتا بلکہ بہت سے ادیب اور اہلِ قلم جن کو اُردو دانی کا دعویٰ ہے۔ مولوی صاحب کے پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہیں۔

میرا یہ کہنا کہ "میں نے مولوی صاحب کی مدافعت کی" یقیناً چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ میں کیا اور میری مدافعت کیا! مگر کسی حق بات کی تائید و حمایت کے لیے لغت میں "مدافعت" کے علاوہ کوئی اور موزوں لفظ ہی نہیں ہے! جن دنوں کی یہ بات ہے، اس وقت تک مولوی صاحب کی خدمت میں مجھے شرفِ نیاز بھی نہیں حاصل ہوا تھا۔ جب اُن کی خدمت میں آنا جانا ہوا، تو ان باتوں کے ذکر کا کوئی محل ہی نہ تھا، اور محل بھی ہوتا تو میں اس اوچھے پن کے لیے آمادہ نہ ہوتا، اب ان کے مرنے کے بعد اظہارِ واقعہ کے طور پر یہ باتیں درمیان میں آگئیں۔

غالباً ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے، جب کانپور میں اُردو کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ کانفرنس کے صدر سر شیخ عبدالقادر اور مشاعرے کے صدر نواب جمشید علی خاں رئیس باغپت تھے، میرا قیام اُن دنوں حیدرآباد دکن میں تھا۔ کانفرنس اور مشاعرے والوں کی طلبی بلکہ اصرار پر شدِّ رحال کرتا ہوا، کانپور پہنچا، دو دن اور دو رات کا مسلسل سفر، اُس کے بعد فوراً ہی کانفرنس کی شرکت!

مولوی سید محمد جامع مرحوم حیدرآباد دکن میں کسی محکمہ کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے! ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، اپنے وطن کانپور میں رہتے تھے، افتخار آباد میں اُن کی چھوٹی سی کوٹھی تھی، بڑے ہی وضعدار، علم دوست اور خوش ذوق انسان تھے، مولوی عبدالحق سے اُن کا بڑا یارانہ تھا۔ حسنِ اتفاق کہ انہی کے مکان میں مولوی صاحب اور اُن کے چند ساتھی قیام فرما

ہوئے اور وہیں راقم الحروف بھی ٹھہرا! زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مولوی صاحب کے ساتھ رہنے، کھانے پینے اور بیٹھنے اُٹھنے کا اتفاق ہوا۔

اُردو کانفرنس بہت کامیاب رہی اور کانفرنس سے زیادہ دُھوم کا مشاعرہ ہوا، مشاعرہ ختم ہوا تو حکیم اسرار احمد صاحب کریوی نے کہا کہ مولوی عبدالحق صاحب صبح سویرے مہگاؤں جارہے ہیں، مولوی صاحب کا ارشاد ہے کہ "ماہرالقادری اور احسان دانش بھی انجمن کی خاطر میرے ساتھ چلنے کی تکلیف گوارا کریں، وہاں کل شب میں چھوٹا سا مشاعرہ ہوگا....." مولوی صاحب کے حکم کو کون ٹال سکتا تھا، اُردو کے خدمت گزاروں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جس کے امیر مولوی عبدالحق صاحب تھے، ٹرین کے ذریعہ منوری اسٹیشن پر اُترا، اور وہاں سے تانگوں میں بیٹھ کر سب لوگ مہگاؤں پہنچے! یہ گاؤں نہیں مسلمان شرفا کا چھوٹا سا قصبہ نکلا، جہاں کے لکھے پڑھے لوگ زیادہ تر محکمہ پولیس میں ملازم تھے! ہم جب اسٹیشن سے بستی کی طرف روانہ ہوئے ہیں تو راستہ میں امرود کے باغات ملے، امرودوں سے درخت لدے ہوئے تھے بلکہ یوں کہیے خوب بہار دے رہے تھے۔ الٰہ آباد یہاں سے دُور نہ تھا، بہت سے بہت دس بارہ میل ہوگا۔

مولوی عبدالحق کھانے کے بہت شوقین تھے، میزبانوں سے سرسوں کے ساگ کی فرمائش کی! مغرب کے بعد دسترخوان بچھا، کھانا آیا۔ دو رکابیوں میں سرسوں کا ساگ بھی تھا! کھانے والے دس بارہ سے کیا کم ہوں گے، سرسوں کا ساگ ایک ایک نوالہ جوگا بھی نہ نکلا، مولوی صاحب نے سرسوں کے ساگ کی خالی رکابی اٹھائی، مطلب یہ تھا کہ سرسوں کا ساگ اور لے کر آؤ۔ مگر اس کے جواب میں پلاؤ، قورمہ، کھیر اور شامی کباب آئے چلے جا رہے ہیں، لیکن سرسوں کا ساگ نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ساگ کے انتظار میں سب لوگ کھانا کھا کر اُٹھ بھی گئے، میزبانوں سے کمرہ خالی ہوا تو مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا:-

"تم نے دیکھا.... (میں نے اثبات میں سر ہلایا) یہ عجیب آدمی نکلے! ارے بھئی! پلاؤ اور قورمہ تو دعوتوں میں کھاتے ہی رہتے ہیں، ہم نے تو دیہاتی کھانے سرسوں کے ساگ کی فرمائش کی تھی، شہروں میں یہ نعمت کہاں میسر آتی ہے..... مگر ان لوگوں نے ساگ کے معاملہ میں نزاکت کی حد

بھی کردی ......"

مشاعرے کے بعد مولوی صاحب موٹر کار کے ذریعہ الہ آباد چلے گئے، اور وہاں ڈاکٹر نجم الدین جعفری کے یہاں قیام کیا۔

انجمن ترقی اُردو کا دفتر دلّی منتقل ہو جانے کے بعد، مشاعروں کے سلسلہ میں جب بھی میرا دلّی آنا ہوتا تو مولوی صاحب کے یہاں ضرور حاضری دیتا، بڑے تپاک اور بزرگانہ شفقت سے ملتے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں مولوی صاحب کے ایما سے کراچی کے مشاعرے اور کانفرنس میں شرکت کی، پیر الٰہی بخش اُن دنوں وزیر تعلیم تھے، اُن کی کوٹھی کے سامنے ایک بنگلہ میں شعراء کا قیام تھا، پیر حسام الدین صاحب راشدی سے اسی سفر میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ سندھ میں وہ مولوی صاحب کے سب سے زیادہ معتمد علیہ اُردو کے کارکن بلکہ ان کے رفیق کار سمجھے جاتے تھے۔ مولوی صاحب کے ساتھ پیر صاحب موصوف کے یہاں کئی بار دعوتوں سے لُطف اندوز ہونے کا موقع بھی ملا۔

۱۹۴۵ء میں ناگپور میں نہایت شاندار پیمانے پر اُردو کانفرنس منعقد ہوئی، نواب صدیق علی خاں، حکیم اسرار احمد کریوی، ابراہیم علی خاں فنا اور سید صلاح الدین بہاری اس کانفرنس کے روحِ رواں تھے! ودیا مندر اسکیم کے مقابلہ میں سب سے زیادہ فعال اور مستحکم محاذ ناگپور ہی میں قائم تھا، مولوی صاحب نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ "یہ ناگ پور" نہیں "جاگ پور" ہے، اس شہر میں اُردو کی ترقی اور بقا کے لیے بڑی بیداری پائی جاتی ہے ....! کانفرنس میں بڑی پُر جوش تقریریں ہوئیں، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ناگ پور کا ذرہ ذرہ "اُردو، اُردو" پکار رہا ہے!"

ناگ پور کا آل انڈیا مشاعرہ بھی یادگار رہے گا، پورا پنڈال ہزارہا سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ تو مبالغہ ہے کہ تل دھرنے کی بھی کہیں جگہ نہ تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ سامعین پھیل کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ میری ایک نظم (اُردو) جو مولوی صاحب کو بھی پسند تھی۔ اُس کے لیے سامعین نے فرمائش کی! میں نے عرض کیا مجھے یہ نظم پوری طرح یاد نہیں ہے، آوازیں آئیں کہ جتنے شعر بھی یاد ہوں، سنائیے! اتنے میں ایک صاحب نے میرا چھپا ہوا کلام میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس میں یہ نظم بھی تھی جس کے تین شعر یہ ہیں:۔

موجِ کوثر کی طرح نرم و رواں ہے اُردو — طبعِ دشمن پہ مگر پھر بھی گراں ہے اُردو
اس کو قوموں کے تمدّن نے کیا ہے پیدا — کون کہتا ہے کہ قلعہ کی زباں ہے اُردو
کیا مٹائے گا کوئی اس کو مٹانے والا — دل میں، آنکھوں میں، خیالوں میں نہاں ہے اُردو

دوسرے دن صبح کو بُک اسٹال والے نے مجھ سے کہا کہ آپ کے مجموعۂ کلام کے کئی درجن نسخے ہمارے پاس موجود تھے اور صرف چند نسخے کل تک فروخت ہوئے تھے مگر آپ نے اپنی کتاب میں دیکھ کر جو "اُردو" پر نظم سُنائی تو اس کے بعد تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ بِک گئے۔

اس کانفرنس کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولوی صاحب جو کھانے کے معاملہ میں متنوع اور نفیس ذوق رکھتے تھے، سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ایک وقت میں معمولی پکا ہوا صرف ایک سالن ہوتا تھا، مولوی صاحب نے کھانے کے معاملہ میں اپنے لیے خاص اہتمام پسند نہیں فرمایا، وہ ذرا سا اشارہ بھی کر دیتے تو سب کچھ ہو سکتا تھا۔

میں بھی ۱۹۴۲ء میں دلّی آ گیا، انجمن ترقیِ اُردو کا دفتر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں تھا اور یہی کوٹھی مولوی صاحب کی اقامت گاہ تھی۔ وہاں بارہا آنا جانا ہوا، ایک بار مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے، پرسوں گاندھی جی یہاں تشریف لائے تھے، میں نے اُن سے کہا کہ اُردو کے ساتھ سی۔پی میں بڑا ظلم ہو رہا ہے، گاندھی جی نے جواب دیا۔

"پر میری تہکیک[1] (تحقیق) میں تو یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔۔۔۔"

میں نے (مولوی صاحب نے) جواب دیا کہ آپ نے تو ملزموں سے تحقیق فرمائی ہے،
اس پر گاندھی جی نے کہا کہ آپ اس مسئلہ کے بارے میں ضروری مواد میرے پاس بھجوا دیں!
چنانچہ مولوی صاحب نے پوری مسل (FILE) مرتب کر کے مہاتما جی کے خدمت میں بھیج دی مگر جب نیتوں میں فساد پیدا ہو جائے تو پھر کوئی دلیل و حجت کام نہیں آتی۔

دلّی میں کئی بار مولوی صاحب نے مجھے دوپہر اور رات کے کھانے پر بلایا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے کھانا کھلا کر شعر سُننے کی کبھی فرمائش نہیں کی۔ ورنہ عام طور پر شاعروں کو شعر خوانی کے لیے ہی دعوتوں میں بُلایا جاتا ہے! انجمن ترقی اُردو کے دفتر میں مولوی صاحب

---

[1] مولوی صاحب نے گاندھی جی کے لہجہ کی نقل اُتارنے کی کوشش کی!

کے بعد سب سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر شخصیت علامہ برجوہن وتاتریہ کیفی کی تھی، اُن سے پہلی بار ملاقات ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی۔ جب وہ دکن تشریف لے گئے تھے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت نے اُن کے اعزاز میں طرحی مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ طرحی مصرع تھا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

علامہ وتاتریہ کیفی سے استفادہ کی خاطر میں زبان کی ضرب الامثال اور محاوروں کے بارے میں گفتگو چھیڑتا، مگر وہ اس گفتگو کو مختصر فرما کر بلکہ بات کاٹ کر، اپنی طویل نظمیں سنانا شروع کر دیتے! پُرانے ہندوؤں میں پنڈت امرناتھ ساحر اور علامہ وتاتریہ کیفی اُردو کے حامی بلکہ عاشقِ زار تھے! اور اب پنڈت زار زتشی اس مسند کو سنبھالے ہوئے ہیں!

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو بیتا پڑی کہ اس آشوبِ قیامت کے سامنے سنہ ستاون کا غدر بھی گرد ہو کر رہ گیا، تو راقم الحروف کو بھی اس شعر کی معنویت سے دوچار ہونا پڑا ؎

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

مگر "یادِ وطن" کے سمجھانے کو کلیجہ پر پتھر کی سِل رکھ کر ٹھکرا دینا پڑا .... ہائے!

وطن چھوڑ آئے، چمن چھوڑ آئے
وہ آغوشِ گنگ وجمن چھوڑ آئے (م۔ق)

آہ! اس ذکر نے کتنی چوٹوں کو اُبھار دیا اور کتنے زخموں کو ہرا کر دیا۔

مفسدوں کی نگاہ میں انجمن ترقی اُردو اور انگریزی "ڈان" کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ انہی کے دفتروں کو سب سے زیادہ تباہ کیا گیا، مولوی صاحب ہندوستان میں رہنا بھی چاہتے تو انہیں وہاں کون رہنے دیتا، یا تو وہ مارے جاتے، یا جیل بھیج دیے جاتے!

کراچی میں مولوی صاحب کی خدمت میں بار بار حاضری کا موقع ملا، میں نے اُن کو کبھی خالی بیٹھا ہوا نہیں پایا، وہ لکھتے ہوتے یا پڑھتے ہوتے! انجمن کے دفتر میں مولوی صاحب کے علاوہ اختر میاں جوناگڑھی سے بھی ملاقات ہو جاتی، جو اپنے علم وفضل علمی تحقیق و

تدقیق اور سیرت وکردار کے اعتبار سے عظیم شخصیت تھے!

ایک صاحب تھے علی شبّر حالتی، حیدرآباد دکن میں انہوں نے انجمن ترقی اُردو کے لیے زمین آسمان ایک کر دیے تھے، مولوی صاحب کے عقیدت مندوں کا کچھ شمار نہیں، مگر اُن کا فدائی اور جاں نثار علی شبّر حالتی سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا! مولوی صاحب اُن کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے، افسوس ہے کہ چند سال سے وہ لاپتا ہیں، سندھ میں حکومت کے اشتراک سے بڑے پیمانہ پر غلّہ کا کاروبار کیا تھا۔ اُس میں کوئی ایسا نازک مرحلہ آیا کہ وہ بیوی بچّوں کو چھوڑ کر ایکاایکی غائب ہو گئے، مولوی صاحب کو اُن کی گمشدگی کا بڑا صدمہ ہوا، علی شبّر کے بیوی بچّوں کی مولوی صاحب ہمیشہ خبرگیری اور مدد کرتے رہے۔

ہاں! تو یہی علی شبّر حالتی، مولوی صاحب کی طرف سے دعوت اور جلسہ کا پیام لے کر آیا کرتے تھے، شہیدِ ملّت لیاقت علی خاں مرحوم کو انجمن ترقی اُردو نے بلایا، تو اس جلسہ کے لیے مولوی صاحب کے ایما پر میں نے نظم کہی، مولوی صاحب نے اس نظم کو پسند فرما کر، اُس کا عنوان نظم کے اِس مصرع

حکم ہو جائے کہ اُردو کا چلن اب عام ہو

کو تجویز فرمایا، یہ نظم انجمن کی طرف سے چھاپی گئی، اور جلسہ میں تقسیم کی گئی، سامعین نے اس نظم کا خاصا خیر مقدم کیا، مگر جب میں نے اپنے کلام پر اشاعت سے قبل نگاہِ انتخاب ڈالی، تو اسے خارج کر دینا پڑا کہ اس میں واقعیت زیادہ اور شعریت کم تھی۔

تقریباً چھ سال سے مولوی صاحب کے یہاں میرا آنا جانا نہیں تھا، کیوں نہیں تھا؟ یہ داستان الم انگیز ہے اور عبرت خیز بھی، اگر میں اس کو چھپا جاؤں تو قومی جرم کا مرتکب ہوں گا! ہوا یہ کہ انجمن ترقی اُردو کے بارے میں بعض ثقہ اور ذمہ دار اصحاب کی زبانی بعض ایسے اضطرابات کا علم ہوا، جو حیرت انگیز تو تھے ہی تکلیف دہ بھی تھے! عام طور پر مولوی صاحب کے سُوءِ مزاج کی شکایت سُنی گئی جس کا سبب پیرانہ سالی ہی ہو سکتا ہے بعض اہل الرائے نے ان معاملات کو سلجھانے کی بھی کوشش کی مگر ایک شخص جس کو مولوی صاحب بہت چاہتے تھے، اُس کا ذکر آتے ہی وہ آتش زیر پا ہو جاتے یہ کہ "جو کوئی اس کا مخالف ہے وہ میرا مخالف ہے" میں نے اسی وجہ سے مولوی صاحب کی خدمت میں آنا جانا ترک کر دیا تھا کہ ان مسائل کا ذکر چھڑ گیا تھا اور میرے منہ سے کوئی بات نکل

گئی تو کہیں میں بھی اُن کی خفگی کا نشانہ نہ بن جاؤں اور بدمزگی کی نوبت نہ آجائے اس لیے میں نے دُور رہنے ہی میں بھلائی دیکھی۔

انجمن ترقی اُردو کے یہ اضطرابات اُلجھتے ہی چلے گئے۔ میں نے بعض حضرات سے کہا کہ مسٹر چرچل کی مثال ہمارے سامنے ہے، دوسری جنگِ عظیم اسی بوڑھے مدبّر کے حوصلے اور حُسنِ تدبیر کی بدولت انگلستان اور اتحادیوں نے جیتی ہے، مگر جنگ کے بعد انگریز قوم نے چرچل کے ہاتھ سے زمامِ کار لے لی۔ مولوی صاحب نے اُردو زبان کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے، وہ اپنی جگہ مُسلّم ہے، اُردو زبان کے بہت بڑے محسن ہیں، ان کو آپ سونے کے چبوترے پر بٹھا دیجئے۔ زندگی کے آخری دَور میں ان کے لیے ایسا انتظام کر دیا جائے کہ وہ ہر ممکنہ آسائش اور اطمینان و فراغت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرسکیں، مگر انجمن ترقی اُردو ایک قومی ادارہ ہے اُسے شخصی احترام پر بھینٹ چڑھنے سے بچایئے! انجمن کے اربابِ حل و عقد شدید دل گرفتگی کے باوجود حدودِ احترام ہی کا پاس و لحاظ کرتے رہے اور اس اقدام کی جرأت نہ کرسکے۔

مولوی سیّد تقی الدین مرحوم سے مولوی صاحب کے پرانے تعلقات تھے، اُردو کالج کی انہی نے بنا ڈالی تھی۔ ان کو مولوی صاحب نے کھڑے کھڑے علیٰحدہ کر دیا۔ یہی صورت سیّد ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ پیش آئی۔ ہاشمی صاحب مولوی صاحب کے انتہائی مخلص رفیقِ کار تھے، کم از کم ۳۵ سال سے وہ ہر مرحلہ پر مولوی صاحب کے دست و بازو بنے رہے! پیر حسام الدین راشدی جن کی کوششوں سے انجمن ترقی اُردو کو یہ عمارت الاٹ ہوئی تھی۔ انجمن اور کالج کی رسّہ کشی اور ان افسوسناک حالات کو دیکھ کر وہ بھی چیخ اُٹھے! ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر معین الحق جیسے مخلص اور بے غرض کارکن بھی ان الجھنوں کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑے ہوئے! مولوی صاحب نے انہی دنوں اپنا ایک خاص نمائندہ مسٹر اسکندر مرزا کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لائیں اور انجمن کی مجلسِ منتظمہ کو توڑ دیں۔ مگر مولوی صاحب کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی! مولوی صاحب

---

[1] پیر صاحب کے علاوہ کراچی کے سابق میئر حکیم محمد احسن کی جدّ و جہد بھی اس معاملہ میں شریک تھی۔

کوئی شک نہیں انجمن ترقی اُردو کے معمار اور محافظ و سرپرست تھے لیکن انہی کے مزاج وطبیعت کے ہاتھوں انجمن کو جس خارزار سے گزرنا پڑا، اُس کا سبب اُن کی وہ پیرانہ سالی تھی جسے حدیث شریف میں "ارذل العمر" کہا گیا ہے۔

مولوی صاحب نہ مذہبی آدمی تھے، نہ مذہبی مسائل سے انہوں نے کبھی کوئی واسطہ رکھا اور نہ دینی معاملات اُن کے فکر وعمل کے موضوع تھے۔ مگر علالت کے زمانہ میں انہوں نے "عائلی کمیشن" کی تائید کرکے، دینی طبقوں کو ملول کر دیا، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اپنے ہفت روزہ "صدقِ جدید" میں اس خبر پر "دانا کی نادانی" کا عنوان قائم کیا اور لکھا کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق، جس طرح ہمیشہ مذہبیات سے الگ تھلگ رہے ہیں، اب بھی اُنہیں ایسا ہی رہنا چاہیئے تھا۔ آخر کبر میں انہوں نے یہ کیا کیا ؟

زندگی کی جھلکیاں :

مولوی عبدالحق کا مولد ومنشا ہاپوڑ[1] ہے، یہ ضلع میرٹھ[2] کا ایک مشہور قصبہ ہے جو دلّی سے پچیس میل دُور ہے۔ ہاپوڑ اُتر پردیش (U - P) میں غلّہ کی سب سے بڑی منڈی ہے، لاکھوں من غلّہ بڑی بڑی کھتیوں اور کوٹھوں میں محفوظ رہتا ہے، غلّہ پر سٹہ کی جو گرم بازاری رہتی ہے، اُس کی کوئی حد ونہایت نہیں، چند گھنٹوں میں لاکھوں کے وارے نیارے ہوجاتے ہیں، مولوی معشوق حسین اطہر جو شاعر سے زیادہ عروضی تھے، ہاپوڑ ہی کے رہنے والے تھے، اور مشہور مزاحیہ شاعر بوم اسی خاک سے اٹھا اور میرٹھ میں پیوندِ زمین ہو گیا۔

مولوی عبدالحق کے ایک بھائی ضیا الحق تھے جو اَب سے تقریباً چالیس سال پہلے خاصے مشہور تھے۔ شہرت اس کی کہ ہندوستان کے والیانِ ریاست کے معاملات میں وہ بڑا اُونچا کھیل کھیلتے تھے !

مولوی عبدالحق نے علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی اور سر سید احمد خاں مرحوم سے ملنے جلنے

---

[1] ایک اخبار میں مولوی صاحب کا وطن سرانواں بھی بتایا گیا ہے جو ہاپوڑ کے قریب کوئی بڑا گاؤں ہے۔ [2] اب یہ قصبہ ضلع غازی آباد میں آچکا ہے۔ (ت، م)

اور اُن کے قریب رہنے کے مواقع انہیں میسّر آئے، مولانا حالیؒ، اور علامہ شبلیؒ سے بھی مولوی صاحب نے فیض اُٹھایا، تعلیم سے فارغ ہو کر وہ حیدر آباد دکن چلے گئے، اور وہاں آصفیہ ہائی سکول میں صدر مدرسی کی خدمت پر مامور کیے گئے! اسی مدرسہ آصفیہ میں ڈیڑھ دو مہینے میں نے بھی گزارے ہیں، اس کو بھی تیس سال ہونے کو آئے! نواب افسر الملک بہادر (کمانڈر انچیف افواج آصفی) کے داماد میجر ممتاز یار الدولہ بہادر اس مدرسہ کے بانی اور سرپرست تھے، اُن کا ارادہ مدرسہ کی طرف سے ایک ماہنامہ جاری کرنے کا تھا، اُس کی ادارت کے لیے اُنہوں نے مجھے منتخب فرمایا، مگر یہ ارادہ بس زینت فکر و خیال ہی بنا رہا! میجر ممتاز یار الدولہ اپنے کو "دکن کا سر سیّد" سمجھتے تھے، کوئی شک نہیں وہ اپنی دھن کے پکے اور لگن کے سچے تھے، ان کی سادہ لوحی کے بعض لطیفے بھی مشہور تھے!

مدرسہ آصفیہ کے بعد مولوی صاحب حکومتِ دکن کے محکمہ تعلیمات میں مہتمم (ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز) ہو گئے، اور پھر اپنی خداداد قابلیت اور محنت و خلوص کے سہارے ترقی ہی کرتے چلے گئے، اورنگ آباد کالج کے وہ برسوں پرنسپل رہے ہیں اور جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اُردو کی پروفیسری کو بھی اُن کی شخصیت نے شرف بخشا ہے۔

شروع شروع میں "ترقی اُردو" مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھا، ۱۹۱۲ء میں یہ شعبہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا اور انہوں نے اپنی محنت، قابلیت، جانفشانی اور شخصیت سے اس شعبہ کو ہندوستان میں اُردو کا سب سے بڑا ادارہ بنا دیا۔ انجمن ترقی اُردو اور مولوی عبدالحق ایک دوسرے کے ساتھ وہی تعلق اور شہرت رکھتے تھے، جو ربط اور شہرت گل و بلبل شمع و پروانہ اور چاند اور چکور کو حاصل ہے۔

مولوی صاحب نثر نگاری میں سر سیّد اور حالؔی کے مقلّد تھے۔ شبلؔی کے علم و فضل کا بھی انہیں اعتراف تھا مگر شبلؔی کی شعر العجم پر تنقید کا آغاز مولوی صاحب کے رسالہ "اُردو" ہی سے ہوا۔ منشی محمد امین زبیری نے شبلی نعمانی کی جو داستانِ معاشقہ چھاپی تھی اس کو مولوی صاحب کی رضامندی حاصل تھی۔ شبلؔی پر تنقید و تعریض انہیں ناگوار نہ گزرتی تھی مگر حالؔی پر نقد و احتساب کو وہ کسی عنوان برداشت نہ کر سکتے تھے۔

مولوی صاحب کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت اُس کی سادگی اور بے تکلفی ہے، وہ تکلف کے ساتھ گھما پھرا کر ایچ پیچ سے بات کہنے کے عادی نہ تھے، اُن کی تحریروں

میں سلجھاؤ اور روانی کے ساتھ دل نشینی بھی پائی جاتی ہے، نہ بات کو اتنا طول دیتے کہ طبیعت اُکتا جائے اور نہ اس قدر ایجاز و اختصار سے کام لیتے کہ طبیعت گھٹنے لگے۔

مصنفین اور مؤلفین کی کتابوں پر مولوی صاحب کے مقدمے اور تقریظیں بڑی جاندار ہیں۔ "Conflict between Religion & Science"

ڈریپر کی بہت مشہور کتاب ہے جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے اَب سے تقریباً نصف صدی قبل کیا تھا۔ یہ ترجمہ اپنی جگہ خود ایک علمی و ادبی شاہکار ہے، اس کتاب (معرکۂ مذہب و سائنس) پر مولوی صاحب کا مقدمہ پڑھنے کی چیز ہے۔

اپنے "ہم عصروں" کی مولوی صاحب نے جس خوبی کے ساتھ کردار نگاری کی ہے، اس کا اُردو زبان و ادب میں ایک مقام ہے۔ خاص طور سے اپنے باغ کے ہندو مالی کو تو انہوں نے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اب سے چار سو سال قبل دکن میں جو اُردو بولی جاتی تھی۔ اس کے بعض شاعروں کے شعروں کی شرح میں مولوی صاحب نے جس کاوش و تحقیق سے کام لیا ہے، اس پر وہ اُردو دُنیا کی طرف سے مبارکباد اور شکرگزاری کے مستحق ہیں، اُن کی مُرتّب کی ہوئی "قواعدِ اُردو" بھی بڑی جامع گرامر ہے!

رسالہ "اُردو" ان کی ادارت میں تقریباً چالیس سال تک نکلتا رہا ہے، اس رسالہ کے تحقیقی مقالے اور خاص طور سے کتابوں پر تنقیدیں اور تبصرے اُردو زبان میں یادگار رہیں گے، حکومتِ دکن میں میٹرک کے نصاب میں اُن کی مُرتّب کی ہوئی کتاب برسوں شامل رہی ہے، اس میں ایک جگہ مولوی صاحب نے "درخت بونا" لکھ دیا تھا، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے جرأت کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کر ہی دیا کہ درخت بوئے نہیں لگائے جاتے ہیں، ہاں! بیج بویا جاتا ہے!" اس پر مولوی صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے، زبان سے کچھ نہیں کہا۔

انگلش اُردو ڈکشنری بھی مولوی صاحب کا قابلِ قدر کارنامہ ہے، مگر اس کے دیباچہ میں اُنہیں اپنے معاونین کے نام ضرور ظاہر کرنے چاہیئے تھے، قابلِ اعتماد اصحاب کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ مولوی صاحب کے لائق شاگرد شیخ چاند مرحوم کا اس ڈکشنری کی تسوید میں بہت کچھ ہاتھ تھا۔

میں ضلع بلند شہر (یو۔پی) کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں، مضمون نگاری شروع

کی تو اپنے نواح کے محاورے استعمال کرتے ہوئے میں بہت جھجکتا تھا کہ کہیں مجھ پر دیہاتی ہونے کا الزام نہ آجائے، مولوی عبدالحق صاحب کا ایک مقالہ میر مہدی مجروح پر جب میری نظر سے گزرا تو اس میں "جنگی پیالہ" پڑھ کر میں چونکا کہ یہ تو ہمارے علاقہ کی خاص زبان ہے، ہر بڑی چیز کو "جنگی" بولتے ہیں، مثلاً "جنگی آدمی" "جنگی ٹوپی" "جنگی گھڑی" اس دن سے میری وہ جھجک جاتی رہی اور اب میں تُرت پُھرت، چھلا، جُھری، پھمیٹا، گنگا پھری، سکورا، بادیہ، پٹ پٹیا (جگنو) اونت، ڈبدا، گھپلا — جیسے لفظ بے تکلف بولتا اور لکھتا ہوں۔

مولوی صاحب کا اردو رسم الخط میں یہ انداز تھا کہ وہ "یونیورسٹی" کو "یونی ورسٹی"، "گاؤں" کو "گانو" اور "پاؤں" کو "پانو" لکھتے تھے اور غالباً ہاتھ کو "ہات" بھی! اُن کا یہ انداز عام طور پر مقبول نہ ہوسکا۔

مولوی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ساری زندگی لکھنے پڑھنے ہی میں گزار دی، محنت کر کے اُن کے اندر اور تازگی اور توانائی آتی تھی، اس بڑھاپے میں بھی کئی طویل مقالے لکھے! کاہلی اور آرام طلبی سے انہیں بیر تھا۔

مولوی صاحب شعلہ بیان خطیب اور بلند پایہ مقرر نہ تھے۔ مگر اپنی بات بڑے سلیقے سے کہتے، تقریر رُک رُک کر کرتے اور ایک ایک گھنٹہ کی تقریر میں بھی اپنے موضوع سے اِدھر اُدھر نہ ہوتے، ناگ پور میں "زبان و ادب" پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے بڑی نازک بات کہی۔ فرمایا "نثر نگاری کا کمال یہ ہے کہ آدمی جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے ہو بہو بیان کردے!"

کراچی کے وائی، ایم، سی ہال میں جلسہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سر آغا خاں نے نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر یہ مشورہ دیا کہ پاکستان کی قومی زبان عربی ہونی چاہیے، اس پر مولوی صاحب نے طنز کی، بولے "انگریز کے زمانے میں انگریزی ہم پر مسلط رہی، اب پاکستان میں کہا جا رہا ہے کہ عربی زبان اختیار کر لو تو کیا ہم ساری عمر پتھر ہی ڈھوتے رہیں گے"۔ کورنگی کے مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے مختصر سی تقریر کی ..... فرمایا "مشاعروں کی داد نے شاعروں کو بنایا بھی ہے اور بگاڑا بھی ہے ......!"

مولوی صاحب سنجیدہ اور متین تھے مگر اپنے بے تکلف دوستوں میں خاصے شوخ طبع

نظر آتے، نواب منظور جنگ بہادر حیدر آباد دکن میں تعلقدار (کلکٹر ضلع) تھے۔ منظور جنگ نے بڑی شگفتہ اور باغ و بہار طبیعت پائی تھی، دوسروں کو ہنساتے، نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن کے دربار میں اُن کی رسائی اُن کی بذلہ سنجی کے سبب ہوئی، مولوی صاحب سے ان کا بڑا گہرا یارانہ تھا۔ اس قسم کے بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا ہو جاتا تو مولوی صاحب لطیفوں کی خوب خوب پھلجڑیاں چھوڑتے اور تکلف و سنجیدگی کی بساط تھوڑی دیر کے لیے تہہ کر کے رکھ دیتے۔

مولوی صاحب سرسید احمد خاں سے بہت زیادہ متاثر تھے مگر اس تاثر کا تعلق ادب و انشا، سے تھا۔ سرسید کی مذہبیت کا مولوی صاحب نے اثر قبول نہیں کیا، اُن کے ڈاڑھی تھی، "مولوی" اُن کے نام کا جزو تھا۔ لیکن وہ مذہبیت سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ پرائیویٹ صحبتوں میں مذہب پر اُن کی زبان سے پھبتیاں بھی سُنی گئیں مگر انہوں نے اپنی تحریروں میں مذہب کے خلاف ایک حرف بھی نہیں لکھا؟ زندگی کی آخری ساعتوں میں مسلمان کے قلب میں کتنی رقت، خوفِ خدا اور توبہ و انابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت کا اتنا احساس کہ وہ سچ مچ رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے —— لیکن مولوی صاحب نے بسترِ علالت سے جو خط رقم فرمایا، اُس میں لکھا:۔

The Doctors Have failed. My condition is getting worse. I have given the Doctors an ultimatum of four Days. Ayub is un–Approachable and God is too far.

(ڈاکٹر ناکام ہو گئے، میری حالت ابتر ہوتی جا رہی ہے، میں نے ڈاکٹروں کو چار دن کا الٹی میٹم دے دیا ہے، ایوب تک رسائی محال ہے اور اللہ بہت دُور ہے)

یہ بھی ایک اعجوبہ ہی ہے کہ "بابائے اُردو" نے زندگی کے آخری ایام میں اپنے درد و غم کا اظہار انگریزی زبان میں کیا۔

بعض اخبارات نے مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے شادی نہیں

کی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتے تھے، اپنے گھر والوں کے شدید اصرار پر انہوں نے شادی کی اور بادلِ ناخواستہ دُولہا بنے، مگر بیوی سے غیر متعلق رہے!

مولوی صاحب کو فراغت و اطمینان اور خوش حالی کے ماحول میں کام کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع ملتے رہے، اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کے مقبرے کے قریب وہ جس مکان میں رہتے، شاندار تھا، وسیع وکشادہ اور آرام دہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے آس پاس کا منظر بڑا حسین تھا۔ اب سے تیس سال پہلے اُن کی تنخواہ چودہ سو روپیہ کے لگ بھگ تھی، پھر نصاب میں اُن کی کتابیں شامل تھیں، اُس کی خاصی رائلٹی انہیں مل جاتی، امتحانات کی کاپیاں جانچنے کی آمدنی اس پر مستزاد! اُن کی مجموعی آمدنی دو ہزار سے کیا کم ہوگی، تنہا جان، بیوی بچوں اور عزیزوں کا کوئی بکھیڑا نہیں، وہ بڑی آسائش، بے فکری اور اطمینان وفراغت کی زندگی بسر کرتے تھے، موٹر، بنگلہ، نوکر چاکر، اچھا کھانا، اچھا پہننا! کہاں حیدرآباد دکن اور کہاں کوئٹہ، انہوں نے گرمی گزارنے اور پھل کھانے کے لیے کوئٹہ تک کا سفر بھی کیا ہے۔ دِلّی میں ڈاکٹر انصاری کی شاندار کوٹھی اُن کی اقامت گاہ تھی اور وہیں ہر طرح کی آسائش انہیں میسر تھی   اُردو پر مولوی صاحب کا احسان ہے اور مولوی صاحب پر اُردو کا احسان ہے کہ اسی زبان کی خدمت کی بدولت اُن کو اتنی عزت، شہرت اور خوش حالی نصیب ہوئی۔

مولوی صاحب کی شخصیت بڑی باوقار تھی، سر راس مسعود ہوں یا سر تیج بہادر سپرو، سر اکبر حیدری ہوں یا مہاراجہ کشن پرشاد، تمام اکابر اُن کی عزت کرتے تھے!

پاکستان کے محترم صدر جناب محمد ایوب خاں (بالقابہ) نے مولوی صاحب کی جو پزیرائی فرمائی ہے، اور احترام و قدرشناسی کا جو سلوک کیا ہے، اُس نے شاہانِ سلف کی علم دوستی کی یاد تازہ کردی ہے!

اُردو مولوی صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھی، زندگی تھی، دین و ایمان تھی، اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے انہوں نے مستقل مزاجی کے ساتھ ساٹھ سال تک جدوجہد کی ہے، اُردو کے مشن کے علاوہ، انہوں نے کسی دوسری تحریک اور مقصد سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا، وہ جو قاآنی نے کہا ہے، ؎

رسمِ عاشق نیست بایک دل، دو دلبر داشتن

تو مولوی عبدالحق نے "محبوبۂ اُردو" کے سوا اور کسی سے دل ہی نہیں لگایا، اُنہوں نے اُردو سے جو پیمانِ وفا باندھا تھا، اُسے مرتے دم تک نباہا! مولوی صاحب کو اس کا شدید صدمہ تھا کہ پاکستان میں اُردو کو اس کا جائز حق بھی نہ مل سکا، اسی صدمہ کو لیے ہوئے وہ اس دنیا سے رُخصت ہو گئے!

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۱ء)

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق

اب سے تقریباً اٹھارہ انیس سال پہلے کی بات ہے کہ ان دنوں میرا حیدر آباد دکن میں قیام تھا اور قیام کیا، بلکہ یوں کہیے کہ مستقل اقامت تھی۔ اسی زمانے میں مدراس سے اُردو کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کی دعوت آئی، میری طبیعت کچھ ناساز تھی اور پھر رقمی شرائط بھی خاطر خواہ طے نہ ہو سکے اس لیے میں نے معذرت لکھ کر بھیج دی۔ میرے انکاری جواب پر کانفرنس والوں نے اپنے ایک نمائندے کو دوڑایا جس کے پُرخلوص اصرار کے آگے میری تمام معذرت آمیز دلیلوں کو سپر ڈال دینی پڑی اور میں نے مدراس چلنے کی ہامی بھر لی۔ شب میں جب ٹرین میں سوار ہوا تو طبیعت خاصی بے کیف تھی۔ مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ورنگل جنکشن پر پہنچتے پہنچتے میں اپنے اندر چستی محسوس کرنے لگا۔ دوسرے دن صبح آٹھ بجے دریائے کرشنا کو پار کر کے جب ٹرین بجواڑہ پہنچی تو طبیعت چاق چوبند تھی، اور شام کے وقت مدراس کے قریب پہنچ کر جب سرد کے درختوں کے مناظر نگاہ سے گزرے تو طبیعت پر بے کیفی کی جگہ نشاط کا غلبہ تھا، سچ تو یہ ہے کہ مدراس کی آب و ہوا نے میرے حق میں مسیحائی کی!

مولانا ظفر علی خان مرحوم کانفرنس کے صدر تھے، زندگی میں پہلی بار کئی دن تک ان کی معیت، ہم نشینی اور بے تکلف صحبت کا شرف حاصل رہا۔ کانفرنس کا افتتاح ہز ہائینس نواب صاحب بنگن پلی نے کیا، کانفرنس کامیاب رہی اور مشاعرہ کامیاب تر!

مدراس پریسیڈنسی میں "اسلامیہ کالج" کو وہاں کے مسلمانوں کی یونیورسٹی سمجھیے۔ اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالحق مرحوم تھے۔ ان کی دعوت پر مولانا ظفر علی خاں مرحوم اور میں اسلامیہ کالج پہنچے، مولانا نے تقریر کی، میں نے کلام سنایا اور پھر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد مولانا محمد عمر مرحوم سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا سعادت مند بیٹے اور خوش قسمت باپ کی یکجائی شعر و ادب اور فلکیات کی

زبان میں اسی کو "قران السعدین" کہا جاتا ہے۔

مدراس کا یہ میرا سب سے پہلا سفر تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دعوت میں بنگلور کا ذکر نکلا کہ وہ شہر دکن کی جنت (Paradise of Deccan) ہے۔ میں سیر سپاٹے کا بچپن سے شوقین ہوں۔ بنگلور کی تعریف سن کر وہاں جانے کی تمنا نے اور زیادہ ابھارا۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے فرمایا کہ آپ وہاں میرے دوست عبدالغفور صاحب مودی کے یہاں ٹھہریے۔ وہ وہاں کے ذی عزت تاجر اور علم دوست بزرگ ہیں۔

ویلور کے ایک ادبی جلسہ میں شرکت کے بعد میں بنگلور روانہ ہوا۔ راستہ بھر سوچتا رہا کہ اگر اسٹیشن پر عبدالغفور صاحب مودی کا کوئی آدمی مجھے لینے کے لیے نہ آیا تو کیا ہوگا؟ میں ان کے یہاں سواری میں بیٹھ کر جا بھی تو سکتا ہوں۔ مگر ایک اجنبی شخص کے یہاں اس طرح "ناخواندہ مہمان" بن کر جا دھمکنا بھی تو خاصا غور طلب مسئلہ ہے! ایسے مواقع پر عقل اور ضمیر کے مابین "جرح و تعدیل" اور رد و قبول کی کشمکش برپا ہو جاتی ہے!

بنگلور اسٹیشن پر پہنچا تو ایک سن رسیدہ خوش شکل بزرگ میری طرف بڑھے اور "عبدالغفور مودی میرا نام ہے" کہتے ہوئے بغلگیر ہو گئے، بولے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے مدراس سے آپ کی آمد کی مجھے اطلاع دے دی تھی۔ میں نئے مہمانوں کو لینے کے لیے اسٹیشن خود جایا کرتا ہوں اور اس معاملہ میں نوکروں پر اعتبار نہیں کرتا۔

بنگلور میں کئی دن تک مودی صاحب کے یہاں قیام رہا، دو دن کے بعد مولانا ظفر علی صاحب بھی تشریف لے آئے، محمد علی ہال میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، اس کے بعد بنگلور میں اتنے دوست ہو گئے کہ وہاں بار بار جاتا رہا اور بنگلور میری "تفریح گاہ" بن گیا۔ میری یہ غزل قیام بنگلور ہی کی یادگار ہے۔

سینکڑوں مفہوم رکھتی ہے وہ چشم التفات
دیکھنے والوں کو دھوکے میں نہ آنا چاہیئے،

غالباً ۱۹۴۲ء تھا۔ فلمی دنیا سے تعلق کے سبب بمبئی میں میرا قیام تھا، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا خط ملا کہ اسلامیہ کالج مدراس کی جوبلی ہو رہی ہے، اس میں مشاعرے کا بھی پروگرام ہے، تمہاری شرکت ضروری ہے! طبیعت سفر کے لیے آمادہ نہ تھی،

مگر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ٹیلیگرام نے رخت سفر باندھنے پر مجبور کر دیا! بمبئی سے سیدھا مدراس پہنچا۔ اسلامیہ کالج کی جوبلی کے دو سرے پروگرام ہو چکے تھے بس مشاعرہ باقی تھا، اور یہی اس علمی ادارہ کے جشن سیمیں کا نقطۂ اختتام تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم بڑے تپاک سے ملے، مصافحہ اور معانقہ میں ان کا انداز دیدنی تھا کہ جیسے میرے آجانے پر سراپا سپاس بنے ہوئے ہیں، ان کے اس انکسار و تواضع کو دیکھ کر میں پانی پانی ہوا جاتا تھا!

مجھے جس کمرہ میں ٹھہرایا گیا، اسی کے برابر ڈاکٹر ہادی حسن صاحب (سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی) کا قیام تھا۔ انھوں نے ہز ایکسیلینسی گورنر مدراس کی موجودگی میں "اسلامی فن تعمیر" پر تقریر کی تھی جو بہت کامیاب رہی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نشۂ تحسین و ستائش سے سرشار تھے، مجھ سے انگریزی میں خطاب کیا۔

Mahir – "You missed a very good lecture."

میں نے جواب میں عرض کیا کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کی تقریر میں نہ سن سکا! کیا کروں مشاعرے کا تار ہی بالکل تنت وقت پر ملا۔

ڈاکٹر ہادی حسن صاحب ذہانت کا مجسمہ ہیں، بڑی دھواں دھار تقریر کرتے ہیں۔ مگر بعض "دانایان راز" کی زبانی یہ روایت بھی پہنچی ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں صفحے کے صفحے دوسروں کی کتابوں کے سنا دیتے ہیں! (واللہ اعلم بالصواب)

اسلامیہ کالج کا مشاعرہ اتنا کامیاب رہا کہ اس قدر رچاؤ اور دلچسپی کے مشاعرے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ رات کے دو بجے جا کر یہ محفل ختم ہوئی، میں مدراس میں بس ایک ہی رات کا مہمان تھا۔ مجھے اُسی دن صبح حیدرآباد دکن جانا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹا اور تکیہ پر سر رکھتے ہی نیند آگئی! دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی صاحب دبے پاؤں برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ میں پلنگ سے اٹھا تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب سامنے موجود تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ —— آپ ——" میں نے حیرت کے ساتھ تشکر آمیز لہجہ میں کہا۔"

ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔

بھائی! آپ میری دعوت پر سینکڑوں میل کا سفر کر کے آئے ہیں۔ نوکروں پر آپ کے جگانے کا کام چھوڑ دیتا تو کیا عجب ہے کہ وہ خود تھکے ہارے ہیں سو جاتے اور آپ کی ٹرین نکل جاتی، میں مشاعرے کے بعد سویا تھوڑی ہوں، آپ کچھ دیر اور نہ اٹھتے تو میں آپ کو جگانے والا ہی تھا۔

ان کی اس محبت، قدر شناسی، مہمان نوازی اور عالی ظرفی کا مجھ پر جو اثر تھا، اس کے اظہار کے لیے میری زبان فرطِ جذبات سے گنگ ہو گئی ——— میں ضروریات سے فارغ ہوا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ملازم پُر تکلف ناشتہ کا خوان لیے ہوئے آ گیا، ڈاکٹر صاحب اور میں نے ناشتہ کیا، پھر وہ مجھے اپنی کار میں لے کر اسٹیشن پہنچے، خود پیش قدمی کر کے ٹکٹ خریدا۔ ریلوے میل سروس کے ایک کلرک کو جو اس ٹرین سے جا رہا تھا تاکید کی کہ وہ راستے میں میرے آرام اور ضروریات کی خیر خبر رکھے۔

اس کے بعد پھر اُن سے ملنا نہ ہو سکا۔ اخبارات میں ان کے مناصب کی ترقی اور علمی مصروفیتوں کی خبریں پڑھتا رہا۔ اب سے چند ماہ قبل مدراس میں منعقد ہونے والے اردو سیمینار کا دعوت نامہ آیا تھا، کیا عجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا بھی اس میں ایماء شریک ہو۔

میں نے جواب میں معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ:

از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

بس پھر اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحق کی موت کی خبر اخبار میں پڑھی اور دل نے بڑی اذیت محسوس کی، ہر آدمی کو اپنی زندگی پیاری ہوتی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم اتنے کام کے آدمی تھے، کہ اگر زندگی کا کچھ حصہ دوسرے کو دیا جا سکتا تو میں ناکارہ اپنی عمر کے چند سال ان کو نذر کر دیتا۔

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک مومن "تھے"۔ "قلباً مومن و دماغش ہم مومن بود" صورت، سیرت، چال ڈھال، وضع قطع اور نشست و برخاست میں اسلامی شرافت اور مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ! فلالوجی میں ڈاکٹر عربی کے عالم، حکومت میں بڑے سے بڑے عہدے پر رہے مگر طبیعت کی سادگی اور مزاج کے انکسار میں کوئی فرق نہ آیا، سر دیگ نہ تنگ! اپنے اللہ سے جو عہدِ وفا باندھا تھا اسے آخر وقت تک نباہتے رہے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے لیے اسلامی اخلاق کی ایک مثال! دین و دنیا میں کامیاب و بامراد! اللہ تعالیٰ قبر سے لے کر یومِ آخرت تک کی ہر منزل کو ان کے لیے آسان بنائے (آمین) اللّٰھم اغفرہ وارحمہ۔!

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۵۸ء)

پرنسپل عبدالحکیم قریشی (ایم۔اے)

سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے میں دفتر "فاران" میں بیٹھا ڈاک پڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ علیک سلیک اور مصافحہ کے بعد اپنا وزٹنگ کارڈ مجھے دیا، جس میں لکھا تھا:۔

"عبدالحکیم قریشی (ایم۔اے علیگ)
سابق وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی"

—— کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر وہ مجھ سے کہنے لگے کہ مشرقی پاکستان میں "جماعت اسلامی" کا جو لوگ کام کر رہے ہیں اُن کے سربراہ اور اُمراء شہرت و وجاہت کے اعتبار سے اس درجہ کے نہیں ہیں جس درجہ کا انہیں ہونا چاہیے، مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کا چارج مجھے دلوایا جائے، تو میں اس کام کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکوں گا، اس مسئلہ میں میری امداد کیجیے!

میں نے عرض کیا کہ میں جماعتِ اسلامی کا صرف ہمدرد ہوں، اس تنظیم سے میرا کارکن کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے میری کوشش اس معاملہ میں موثر نہیں ہوسکتی۔ پھر "جماعتِ اسلامی" پاکستان کی دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح نہیں ہے۔ برسوں کی اُمیدواری کے بعد اس کی رکنیت کا موقع ملتا ہے۔

گھنٹہ پون گھنٹہ تک صاحبِ موصوف دفتر "فاران" میں تشریف فرما رہے، انھوں نے اپنی فارسی اور اردو غزلوں کی بیاض بھی مجھے پڑھنے کے لیے دی۔ یہ بھی فرمایا کہ میں جسمانی ورزش میں خاص مہارت رکھتا ہوں، اور اس کا مجھے تجربہ اور مشق ہے کہ مختلف قسم کے امراض جسمانی ورزشیں کرنے سے دور ہو جاتے ہیں ——
انھوں نے رخصت ہوتے ہوئے فرمایا کہ میں لاہور جا کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملوں گا۔

صاحبِ موصوف سے ایک دوبار اور ملنا ہوا، اُن کے ایک دو خط بھی اُسی زمانے

میں آئے۔ پانچ مہینے ہوئے جب انھوں نے اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر واپس کر دیا۔ پھر اُن کا ایک قصیدہ صدرِ پاکستان کی مدح میں آیا، جو بحر سے خارج تھا، اس خط میں انھوں نے اس کا افسوس ظاہر کیا کہ صدرِ پاکستان کو بعض شورش پسندوں کی شورش کی وجہ سے راجشاہی کا دورہ ملتوی کرنا پڑا، مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا ہی رہ گئی۔ اگر میری صحت اجازت دیتی تو میں راولپنڈی حاضر ہو کر صدرِ محترم کی خدمت میں اپنے منظوم جذبات پیش کرتا۔ خط کا مضمون پوری طرح میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہا غالباً انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں صدرِ محترم سے اپنی شناسائی کا بھی ذکر کیا تھا۔

میں نے وہ قصیدہ واپس کر دیا اور انھیں لکھا کہ شاعری کے لیے موزوں طبع ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ آپ کے اشعار بحر اور وزن سے خارج ہیں، ان پر اصلاح کیا دوں ——— اور آپ کی فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خاں سے شناسائی اور تعارف ہے، تو اُن سے درخواست کیجیے کہ "رقص و سرود" کے ہنگاموں کو وہ اپنے خصوصی حکم کے ذریعہ روک دیں۔

اس خط کے بعد اُن کا پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اخبار میں اُن کے انتقال کی خبر نگاہ سے گزری! اور اُن کے صاحبزادے (مسٹر عبدالعزیز قریشی) کے خط سے اُن کی علالت اور انتقال کی تفصیل معلوم ہوئی۔

جناب عبدالحکیم قریشی علی گڑھ کے "ایم اے" تھے۔ برسوں ڈھاکہ کالج کے پرنسپل رہے اور اس خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد راجشاہی میں جا کر مستقل طور پر بس گئے۔ راجشاہی یونیورسٹی کے وہ اعزازی خزانچی بھی رہے، اور کچھ دن تک اسی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی خدمت جلیلہ بھی اُن سے متعلق رہی! مرحوم عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور بنگالی کے عالم تھے، اور کئی زبانوں میں شعر کہتے تھے! اُن کے یہاں ایک عجیب تضاد نظر آیا ——— یہ کہ اُن کی فارسی غزلیں بحر و وزن کے اعتبار سے موزوں ہوتی تھیں مگر اردو غزلیں ناموزوں! اُن کا خط بہت پاکیزہ تھا، جسم کسرتی اور گٹھا ہوا۔۔۔۔ اور اس بڑھاپے میں بھی اُن کے قویٰ مضبوط بلکہ فولادی نظر آتے تھے۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی، اسلام کی خیر خواہی اور مسلمانوں کا درد اپنے

اندر رکھتے تھے۔

مرحوم کو کھیل اور ورزش سے غیر معمولی دلچسپی تھی، وہ پیدائشی کھلاڑی تھے، اور اس معاملہ میں کسی گھر بند بنے تھے، ہر کھیل کے شوقین (All Round sports man) طلبار سے انہیں بڑی ہمدردی تھی، نادار طلبار کی مدد کرتے اور کتنوں کو تو اُن کی سعی و سفارش سے بڑے بڑے عہدے مل گئے۔ مشرقی پاکستان کے دوسرے اکابر کے برخلاف مارشل لار کی حکومت کے مدح خواں تھے اور مشرقی پاکستان میں طلبار کے احتجاج نے جو صورتِ حال پیدا کردی تھی، اس سے وہ خاصے ملول اور دل گرفتہ تھے۔

"فاران" کے مستقل خریدار تھے اور اسی ذریعہ سے اس ہیچمداں سے متعارف بلکہ قدرداں تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، اور لحد سے لے کر روزِ جزا تک کی ہر منزل آسان ہو۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اگست ۱۹۶۲ء)

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

مجھے یاد پڑتا ہے کہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی سے پہلی بار ملاقات پاکستان بننے کے بعد جماعتِ اسلامی کے کسی اجتماع میں ہوئی مگر یہ ملاقات بڑی رواروی کی ملاقات تھی! پھر ان کے مضامین رسالوں میں آنے لگے، شروع شروع میں اُن کے ایک دو مضمون توجہ یا زیادہ توجہ کے ساتھ نہیں پڑھے، میرا قیاس یہ تھا کہ کوئی نو مشق اہلِ قلم ہیں! لیکن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے زمانۂ قید و بند، گوناگوں مصروفیات اور پھر علالت کے باعث ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے "اشارات" عبدالحمید صدیقی مرحوم لکھنے لگے تو انہیں پڑھ کر صدیقی صاحب کی قابلیت، ذہانت اور علم و فضل کے جوہر کھلے۔

مولانا مودودیؒ کی بہت کچھ شہرت "ترجمان القرآن" کے اداریوں (اشارات) ہی سے ہوئی تھی۔ ہر اداریہ اپنے موضوع پر حسین مرقع اور نقشِ بدیع! پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو صد آفریں کہ مولانا مودودیؒ نے "اشارات" کی جو بلند و بالا سطح قائم کی تھی اُسے پست نہیں ہونے دیا۔ بعض "اشارات" پڑھ کر تو ایسا محسوس ہوا کہ سید مودودیؒ (متعنا اللہ بطول حیاتہ) نے یہ مضمون املا (Dictate) کرایا ہے یا نظرِ ثانی فرما کر اس کے نوک پلک درست کیے ہیں۔ "ترجمان القرآن" کے اشارات لکھنا بہت بڑا اعزاز تھا جو مرحوم کو میسر آیا۔

ایوب خاں کے دورِ آمریت میں اُن کی کتاب (Friends Not Masters) پر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے جس قابلیت، ذہانت، حکمت، فراست اور جرأت کے ساتھ تبصرہ کیا اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، یہ تبصرہ اردو تنقید نگاری کا شاہکار ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کی تصنیف کے تمام کمزور پہلوؤں کو اجاگر کیا اور اُن کے کتنے ہی بلند بانگ دعووں کی دلائل کے ساتھ پول کھول دی۔ یہ تنقید ایوب خاں کے زوال کا نقشِ آغاز اور ان کی عزت و اقبال کے لیے پہلا الارم تھی۔

مرحوم اردو اور انگریزی پر یکساں قدرت رکھتے تھے ۔ انگریزی سے اردو میں اردو سے انگریزی میں اتنے شگفتہ اور رواں ترجمے کیے کہ اُن کا ذکر اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں آنا چاہیے۔ مسلم شریف، مشکوٰۃ شریف اور ریاض الصالحین کے اُن کے انگریزی تراجم مقبول ہوئے، تراجم کے علاوہ کئی بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑیں۔

جوانی میں تعلیمی ریکارڈ اتنا شاندار کہ معاشیات میں ایم۔اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی میں سب سے اوّل رہے! پھر وہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں لیکچرار اور بعد میں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر ہو گئے۔ ایوب خاں کے دَور میں ان کو نازک امتحان سے گزرنا پڑا —— یہ کہ جماعتِ اسلامی کی رکنیت سے دست برداری یا ملازمت سے قطعِ تعلق! اُن کی جراُتِ ایمانی نے جماعت سے وابستہ رہنے کا فیصلہ کیا اور لگا لگایا روزگار چھوڑ دیا۔ اس عزیمت اور استقامت کے لوگ اب خال خال نظر آتے ہیں۔

راقم الحروف سے جب بھی ملتے بڑی محبت اور انکسار و تواضع کا اظہار فرماتے! اُن کے چہرے مہرے، قدوقامت، لباس اور انکسار و فروتنی کو دیکھ کر کوئی اجنبی آدمی یہ تاثر نہیں لے سکتا تھا کہ یہ اتنا لکھا پڑھا شخص ہے۔ عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے بارے میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ گوجرانوالہ وطن تھا وہاں سے روزانہ ٹرین کے ذریعہ لاہور آنا جانا رہتا۔

دنیائے اسلام کے عظیم مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مرحوم کی اہلیہ کے نام ایک تعزیتی پیغام میں فرمایا:

"آپ کے قابلِ قدر شوہر اور ہمارے محترم رفیق کے انتقال کی خبر سُن کر مجھے ناقابلِ بیان صدمہ ہوا۔ پروفیسر عبدالحمید میرے بہترین رفیقوں میں سے تھے، وہ سالہا سال ترجمان القرآن کے لیے مضامین لکھتے رہے ان کی وجہ سے میں ایک طرح سے ترجمان القرآن سے (فارغ اور مطمئن) ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے جو کام انہوں نے کیے کم ہی لوگ اُن تک پہنچتے ہیں۔"

مولانا مودودیؒ کے اس اعتراف کے بعد اب کس کی رائے نقل کیجیے ——

اللہ تعالیٰ آخرت میں مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۷۸ء)

سر شیخ عبدالقادر

سر شیخ عبدالقادر مرحوم اُن اکابرین سے تھے، جن کے دیکھنے اور ملنے کا مجھے خود اشتیاق تھا، مگر ہر بات اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے، آدمی ہزار چاہے اور ہزار کوشش کرے، وقتِ معیّن سے پہلے کچھ ہو نہیں سکتا، اب سے کوئی بارہ برس پہلے کا ذکر ہے، کانپور میں اُردو کانفرنس ہوئی تھی، مشاعرہ بھی تھا، کانفرنس کے صدر سر عبدالقادر مرحوم اور مشاعرہ کے صدر نواب جمشید علی خاں رئیس باغپت تھے۔ میں اُن دنوں حیدر آباد دکن میں مقیم تھا، اسی کانفرنس اور مشاعرے کے لیے ایک ہزار میل کا سفر کرکے کانپور آیا۔

میں کانفرنس کے پہلے اجلاس میں شریک نہ ہوسکا، کانپور دوسرے دن پہنچا دوسرے اجلاس میں چند مقالے پڑھے گئے جن میں مسعود علی ذوقی کا مقالہ "فسانۂ عجائب" پر بہت خوب تھا، سب نے پسند کیا، میں نے "اُردو"[1] پر نظم پڑھی، سر عبدالقادر کرسی صدارت پر تشریف فرما تھے، جلسہ کے بعد بڑے تپاک سے ملے جیسے وہ مجھے بہت دنوں سے جانتے ہیں، میں نے دریافت کیا یہاں کانپور میں کہاں قیام ہے؟ فرمایا ایک انگریزی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں، اور "نرم رواں" والا مضمون ہے۔۔۔۔۔"!

بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب، مولوی سید محی الدین صاحب ایم۔ اے (سابق پرنسپل اورنگ آباد کالج) اور اس خاکسار کا قیام مولوی سید عبدالجامع صاحب کے مکان واقع افتخار آباد میں تھا، جلسہ گاہ سے سواری میں روانہ ہوئے تو راستہ میں باتوں کا ایسا سلسلہ چھڑا کہ سر عبدالقادر مرحوم ہوٹل جانے کے بجائے سید محمد عبدالجامع صاحب کے مکان پر اُتر گئے، دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ مل کر کھایا، کھانے کے بعد، شام کی چائے کے وقت تک شعر و ادب کے موضوع پر مسلسل گفتگو ہوتی رہی، شعر خوانی بھی ہوئی، ادبی لطیفے بھی رہے، اور علمی مسائل کا بھی

---

[1] موجِ کوثر کی طرح نرم و رواں ہے اُردو　　طبعِ دشمن پہ مگر پھر بھی گراں ہے اُردو

ذکر آیا۔

شب میں مشاعرہ ہوا، سر عبدالقادر مرحوم جس کانفرنس کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے وہ کانفرنس ختم ہو چکی تھی مگر مشاعرہ سننے کے لیے رُک گئے، دسمبر کا مہینہ تھا، کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے، سامعین کے لیے کرسیوں کا انتظام اور شاعروں کے لیے اسٹیج پر قالین کا انتظام تھا۔ سر عبدالقادر مرحوم اسٹیج ہی پر فروکش تھے، ایک "خاتون" نے دو تین بار مجھے پان دیا تو میری طرف جُھک کر آہستہ سے بولے "تم پان نہیں رُوح کھا رہے ہو"۔

اس واقعہ کے دوسرے سال میرا لاہور جانا ہوا، میں نے سر عبدالقادر مرحوم کو خط بھیجا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں کوئی فرصت کا وقت بتایئے۔ مرحوم نے جو جواب دیا وہ مجھے مغرب کے بعد ملا، اس میں لکھا تھا کہ شام کی چائے میرے ساتھ آکر پیجیے، میں نے خط لانے والے کے ہاتھ اُسی وقت جواب بھیجا کہ دعوت کا وقت تو گزر چکا، اب آپ سے ملاقات کب ہو سکے گی؟ کمال محبت کے ساتھ جواب دیا" کاش! میرے خط کا جواب دینے کے بجائے آپ خود چلے آتے، یہاں بہت سے آپ کے کلام کے مشتاق جمع تھے مگر اب ان کا ہاتھ آنا ممکن نہیں، میں صبح کی ٹرین سے فیصل آباد جا رہا ہوں، شب کا کھانا میرے یہاں ضرور کھایئے۔

نئی جگہ کا پتا لگانا میرے لیے بڑا دشوار ہے، طبیعت میں کیا کیا جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے، لوگوں سے پتا پوچھتے ہوئے شرم سی آتی ہے، پہلے اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کی رہنمائی کا احسان لیے بغیر ہی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں اور جب اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوتی تو راہِ سخن وا کرنی ہی پڑتی ہے —— مگر سر عبدالقادر مرحوم کی کوٹھی کا پتا کسی سے پوچھے بغیر ہی مل گیا، ٹیمپل روڈ پر اُن کی کوٹھی کے دروازے پر تانگہ والے نے جا کر اُتار دیا۔

بڑی محبت اور بزرگانہ شفقت کا اظہار فرمایا، ذائقہ دار کھانوں سے تواضع کی گئی، پھر شعر خوانی ہوئی اور آخر میں "نعتیہ سلام" مجھ سے سُنا، میں نے کہا اپنی کوئی تصنیف مجھے پڑھنے کے لیے دیجیے، فرمایا "سفرنامہ" کا صرف ایک نسخہ رہ گیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ مجھ پر اعتماد فرما کر دے دیجیے میں دو تین دن میں پڑھ کر واپس کر دوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا میں نے اُن کے سفرنامہ کو "نشاط ہوٹل" میں پڑھ کر اُن کے پاس واپس بھیج دیا۔

آخری بار حیدرآباد دکن میں نیاز حاصل ہوا، وہاں "لا کانفرنس" (Law Conference)

تھی، سر عبدالقادر مرحوم ایک اجلاس کے صدر تھے، ہندوستان کے چوٹی کے قانون داں جمع ہوئے تھے، اُسی زمانہ میں وہاں ایک اُردو کانفرنس بھی منعقد ہوئی اور حیدرآباد دکن میں پہلی بار اشتراکیت نواز "ترقی پسندوں" کو قدم جمانے کا موقع ملا، مجھ سے یہ گروہ ہمیشہ سے خفا رہا ہے اور ہے، اُسے خفا ہونا ہی چاہیے کہ میں ان کے مسلک کا شدید مخالف ہوں، کانفرنس سے ایک دن پہلے میرے پاس دعوتی رقعہ بھیجا گیا، اور وہ بھی شاید کسی کے کہنے سننے سے۔ میں نہ کانفرنس میں گیا اور نہ مشاعرہ میں شرکت کی۔

مشاعرہ جس رات کو ہوا ہے، اُس کے دوسرے دن صبح کے وقت سر عبدالقادر مرحوم سے میں ملنے کے لیے گیا، باغ عام کے سامنے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں اُن کا قیام تھا، ایک صاحب جو اس کانفرنس کے بانیوں میں تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ مشاعرے میں کیوں نہیں آئے؟" میں خاموش ہو گیا، انہوں نے پھر سوال کیا اس پر سر عبدالقادر مرحوم نے فرمایا۔ "آپ لوگوں نے ان (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو بُلایا نہ ہوگا" اُن صاحب نے جواب دیا "ان کو دعوت نامہ بھیجا گیا تھا" سر عبدالقادر مرحوم نے میری طرف دیکھا اور ذرا سے توقف کے بعد فرمایا "تو آپ نے وہ ذرائع اختیار نہ کیے ہوں گے جو ان کو بلانے کے لیے چاہئیں....." اور پھر میرے بارے میں بہت کچھ کہا، میں نے محسوس کیا کہ سر عبدالقادر مرحوم کس قدر ذہین، معاملہ فہم اور نفسیات کے ماہر ہیں کہ میں نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہا اور معاملہ کی نوعیت کو اس طرح سمجھ گئے جیسے یہ واقعہ خود اُن پر گزرا ہے۔

سر عبدالقادر مرحوم لندن میں انڈیا کونسل کے ممبر بھی رہے ہیں، میں نے اس سلسلہ میں کچھ دریافت کیا تو بولے کہ وہ تو بس ایک اعزاز تھا جو تنخواہ ملتی تھی اس میں گزر کہاں ہوتی تھی، لندن کی زندگی پھر عہدے اور پوزیشن کا رکھ رکھاؤ، مجھے اپنی زمین بیچ کر اس عہدے کو نباہنا پڑا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر عبدالقادر کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "قبر کی حالت مردہ ہی جانتا ہے" باہر کے لوگ تو بس قیاس و رائے کے تیر تکے لڑاتے رہتے ہیں۔

سر عبدالقادر مرحوم نے اپنی ذاتی قابلیت اور کوشش سے ترقی کی منزلیں طے کیں، ذمہ داری اور عزت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، اردو ادب کے وہ نہایت مخلص خدمت گزار تھے، اُن کے رسالہ "مخزن" سے اردو لٹریچر کی تاریخ وابستہ ہے، مرحوم کی نثر کا انداز بہت سادہ اور سلیس تھا، شاعروں اور ادیبوں کے بڑے قدرداں تھے، بعض مشہور شاعروں کی سر عبدالقادر مرحوم نے زندگیاں بنا دیں، ہونہار نوجوانوں کو اُبھارنے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرنے کا مرحوم میں بے پناہ جذبہ تھا، اردو زبان کی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتی۔

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۵۱ء)

عبداللہ المسدوسی

ریاست حیدرآباد دکن کا ایک ضلع "محبوب نگر" تھا جس کے نواح کے شریفے (سیتا پھل) بہت مشہور تھے، بے حد شیریں اور حجم میں چھوٹے کموڑرے کے برابر۔ محبوب نگر سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک درخت تھا جس کی شاخوں کا پھیلاؤ رقبہ کے لحاظ سے کئی فرلانگ کا تھا! ایک بڑا قافلہ اس درخت کے سائے میں ٹھہر سکتا تھا یہی محبوب نگر عبداللہ المسدوسی مرحوم کا مولد و مسکن تھا۔

اُن کی تعلیم بلدہ حیدرآباد میں ہوئی جب وہ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، تو نواب بہادر یار جنگ مرحوم اُن کے ہم مدرسہ اور ہم جماعت تھے، پھر وہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوگئے اور وہاں سے بی۔اے اور ایل، ایل، بی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ تحریر و تقریر کا شوق ہائی اسکول ہی کے زمانے سے تھا۔

تعلیم ختم ہونے کے بعد مسدوسی صاحب نے حیدرآباد میں وکالت شروع کی اور اوسط درجہ کے وکلا میں اُن کا شمار ہونے لگا، بنگلہ میں رہتے تھے اور سواری کے لیے موٹر تھی۔ سیاسی زندگی کا آغاز مجلس اتحاد المسلمین کی رکنیت سے ہوا، مگر نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی پالیسی سے اختلاف کے سبب اتحاد المسلمین سے کنارہ کش ہوگئے۔ اُن کا اپنا خاص مزاج تھا ارباب اقتدار پر نقد و احتساب کے مقابلے میں اُن سے تعاون کو زیادہ پسند کرتے تھے، اسی لیے وہ خلفاء بنی اُمیہ کے مداح تھے اکئی بار راقم الحروف سے اس مسئلہ پر بحث ہوئی۔ پاکستان میں بھی مسدوسی صاحب مرحوم کا یہی مزاج اور رنگ رہا۔

حیدرآباد دکن کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں اُن سے کئی بار ملاقات رہی مگر میرا اُن کے یہاں آنا جانا نہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی میں مولانا ظفر احمد انصاری کے مکان پر اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہتیں اور اس طرح اُن سے خاصے گہرے روابط ہوگئے،

دکنی کھانوں کے علاوہ "حلیم" اُن کے یہاں خاصے اہتمام سے تیار کیا جاتا، مجھے کئی بار مرحوم کے یہاں کی دعوتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور دستر خوان پر اُن کی سیر چشمی کا تجربہ ہوا۔

پاکستان بننے کے دو سال بعد "زکوٰۃ کمیٹی" حکومت نے مقرر کی تھی وہ ریسرچ کا کام کرتے تھے، اردو کالج کے شعبۂ قانون میں برسوں لیکچرار رہے اور یہ جز وقتی خدمت (Part time) تھی جو اُن سے متعلق تھی۔ "قانونِ شہادت" میں خاصی بصیرت حاصل تھی!

تقریر بہت اچھی کرتے تھے، اگر طول بیانی کی عادت نہ ہوتی تو ان کی تقریریں خاصی شہرت اور قبول عام حاصل کرتے۔ اب سے چند سال قبل بہاولپور میں سیرۃ النبیؐ کا جلسہ اعلیٰ پیمانہ پر ہوا، اس جلسہ میں اُن کا ساتھ رہا، ایک ہی جگہ قیام کیا۔

فقہ شافعی کے پیرو تھے مگر کبھی کوئی اختلافی گفتگو اُن کی زبان سے سننے میں نہیں آئی، احناف کی امامت میں کسی کراہت کے بغیر نماز پڑھتے۔

"مذاہبِ عالم" — اور "افریقہ — ایک چیلنج" اُن کی یہ بلند پایہ کتابیں خاصی مشہور اور مقبول ہوئیں۔ "مذاہبِ عالم" کو تو یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے کے نصاب میں داخل کرلیا گیا، تصنیف و تالیف میں محنت کا یہ عالم کہ بخار چڑھا ہوا ہے اور کام کیے جارہے ہیں جسم منحنی، زکام کے دائمی مریض جس کے سبب ہلکا ہلکا بخار بھی رہتا۔ انہی امراض اور تنگیٔ معیشت کی حالت میں زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت بھی حاصل کی۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے غزواتِ نبوی کو نقشوں کی صورت میں پیش کیا تھا — مگر عبداللہ مسدی مرحوم عہدِ نبوی اور اس کے بعد کی اسلامی تاریخ کو نقشوں میں دکھانا چاہتے تھے، اس پر وہ کئی سال سے کام کر رہے تھے اور متعدد نقشے تیار کرچکے تھے۔ اب سے سات آٹھ مہینے پہلے مرحوم اور راقم الحروف ایک دعوت میں شریک تھے، وہاں انہوں نے اپنے نقشوں کا ذکر کیا، دعوت کے بعد میں اُن کے مکان پر گیا پون گھنٹہ تک نقشوں کو دکھاتے اور سمجھاتے رہے میں نے بعض مشورے دیئے تو فراخدلی کے ساتھ قبول کرلیے اور فرمایا کہ نقشوں میں آپ کے کہنے کے مطابق اصلاح کردی جائے گی، فرماتے تھے کہ بیوی کا زیور بیچ کر اور ضرورت پڑی تو مکان رہن رکھ کر لندن جاؤں گا کہ یہ نقشے وہاں کے چھاپے خانوں ہی میں خاطر خواہ اہتمام کے ساتھ چھپ سکتے ہیں۔ یہ ایک عظیم الشان علمی، دینی اور تاریخی کارنامہ تھا جس کا سہرا اُن کے سر بندھنے والا تھا — کہ اسی دوران میں بیمار ہوئے اور چند دن کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ غفرلہ اللہ تعالیٰ۔ (آمین)

(ماہنامہ فاران، ستمبر ۱۹۶۸ء)

عبدالحمید اسمٰعیل

جناب عبدالحمید اسماعیل سے سب سے پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ مرحوم نے کسی قومی فنڈ (غالباً بہار فنڈ تھا) کے سلسلہ میں، مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ سرکاؤس جی جہانگیر ہال میں دوپہر کے بعد مشاعرہ منعقد ہوا، اور توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ فلمی ستارے نظروں کے سامنے ہوں تو کریہہ الصوت شاعر بھی بلبل کی طرح چہکنے کی کوشش کرتا ہے!

مسٹر عبدالحمید اسماعیل ان دنوں کسی جہاز راں کمپنی میں بہت بڑے افسر تھے!

تقسیم ہند کے بعد وہ بھی کراچی چلے آئے اور یہاں "پان اسلامک کمپنی" قائم کر دی۔ اس کمپنی کی طرف سے دو بار بڑے شاندار پیمانہ پر تقریبیں ہوئیں۔ مرحوم نے مجھے اُن میں خاص طور سے بلوایا، میں نے ان جلسوں میں نظمیں پڑھیں، جنھیں خاصے اہتمام سے چھپوایا گیا —— ان پارٹیوں میں دو دو ہزار مہمانوں نے شرکت کی، کیسا سلیقہ اور کیا حسنِ انتظام تھا! ہر طرف شہر کے منتخب افراد اور اعلیٰ حکام ہی نظر آتے تھے۔

سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین جب پہلی بار پاکستان تشریف لائے تھے تو "پان اسلامک اسٹیم شپ کمپنی" کی طرف سے بیچ لگژری ہوٹل میں اُن کے اعزاز میں شاندار لنچ دیا گیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں مجھے زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہوئی۔ پان اسلامک کمپنی کے جہاز سے ڈیک کے ٹکٹ خرید کیے تھے، مستورات بھی ساتھ تھیں، قلی ہمارا سامان ڈیک پر پہنچا چکے تھے، میں سیڑھیوں پر چڑھ کر جہاز میں داخل ہوا، تو عبدالحمید اسماعیل مرحوم کھڑے ہوئے ملے۔ علیک سلیک ہوئی، بولے یہاں کیسے! میں نے کہا حج کا قصد ہے، فرمایا، کس درجہ میں سفر کر رہے ہو، میں نے جواب دیا، ڈیک میں!! اس پر قدرے متحیر ہو کر بولے: —— "ایں! آپ اور ڈیک میں، یہ کیا؟" اُن کے قریب ہی جہاز کے افسر کھڑے تھے، حکم دیا کہ افسروں کا کمرہ کھلوا

کر، انہیں دیا جائے۔ اُن کے حکم کی ذرا سی دیر میں تعمیل ہوگئی، یہ کمرہ فرسٹ کلاس کے بالکل محاذ میں تھا۔ ہمارا سامان بھی تیسرے درجہ سے اوپر آگیا اور آن کی آن میں فرش والے عرش نشیں بن گئے! مرحوم کی مہربانی سے بڑا آرام ملا۔ حجاز مقدس سے واپسی میں جناب ضیاء الدین احمد برنی کے توسط اور مرحوم کے حکم اور منظوری سے پھر اسی کمرے میں انتظام ہوگیا۔ اُن کے لیے بار بار دل سے دُعائیں نکلیں! شیطان نے اس وسوسہ میں مبتلا کرنا چاہا کہ یہ تمہاری شاعرانہ شہرت کے سبب سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر ضمیر نے لاحول پڑھی کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔

اہلِ غرض، ضرورت مند اور بے روزگار بڑے آدمیوں سے لوگوں کے تعلقات و روابط کا پتا لگا لیتے ہیں، مجھ سے بھی نہ جانے کتنے امیدوار مرحوم کے نام سفارشی خطوط لے کر اُن سے ملے جس کی قسمت نے یاوری کی اُسے جگہ بھی مل گئی! سفارشوں کی بھرمار، سفارش کو بے وزن بنا دیتی ہے۔ اہلِ غرض کو یہ بات سمجھاؤ، تو وہ یہ تاثر قبول کرتے ہیں کہ ہمارے ٹالنے کے لیے یہ فلسفہ بگھارا جا رہا ہے۔

عبدالحمید اسماعیل مرحوم برسوں سے دل کے مریض تھے، اُن کی صورت کو دیکھ کر ترس آتا تھا، اسی بیماری اور نقاہت کے عالم میں کمپنی کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے، دوسرے ملکوں میں جا کر کروڑوں روپیہ کی قیمت کے جہازوں کا سودا کرتے، بحری جہازوں کے نظم و نسق میں وہ مہارتِ تامہ اور یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ پان اسلامک کمپنی کو اپنی خداداد ذہانت اور حسنِ انتظام کی بدولت کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کمپنی کے وہ سب سے بڑے افسر بھی تھے اور حصہ دار بھی! کئی کئی ہزار روپیہ کی تنخواہ کے عہدیدار اُن کے نیچے کام کرتے تھے، اس عزت اور جاہ و دولت کے ہوتے ہوئے، متواضع اور منکسر المزاج تھے۔

اُن کے بڑے بھائی محمد ہاشم اسمٰعیل مرحوم ممبئی سے پاکستان آتے رہتے، واہ (Wah) کی کسی کمپنی سے اُن کا تعلق تھا۔ ہاشم اسمٰعیل کو شاعری کا خاص ذوق تھا۔ اردو کے پسندیدہ اور منتخب اشعار کا انتخاب بھی انھوں نے چھپوایا تھا۔ اس کتاب کی زیب و زینت (Get up) پر انھوں نے ہزاروں روپیہ خرچ کیے۔

ہاشم اسمٰعیل مرحوم اپنے چھوٹے بھائی عبدالحمید اسمٰعیل مرحوم کے مکان میں

ٹھہرتے، یہ مکان نہیں قصر ہے۔ کراچی کی سب سے اونچی پہاڑی پر بلند و بالا عمارت پائیں باغ میں کھڑے ہو کر دیکھیے تو کراچی کس قدر خوش منظر لگتا ہے۔ اس مکان کا باغیچہ، برآمدے، صحن، کمرے، فرنیچر، صفائی، سلیقہ، خوش انتظامی غرض ہر چیز دامنِ دل کو کھینچتی ہے کہ "جا ایں جا است" ہاشم اسمٰعیل نے کئی بار راقم الحروف کو اس مکان میں کھانے پر بلایا۔ وہ فرماتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ اُن کا اصرار تھا کہ میں اپنے کلام کا انتخاب چھپواؤں۔ ایک بار بمبئی سے شیروانی کا کپڑا لا کر دیا۔ ابھی چند ماہ قبل کراچی تشریف لائے تو کہتے تھے کہ گرمی کا زمانہ یورپ میں گزاروں گا۔ یورپ کے بڑے بڑے لوگوں سے اُن کے تعلقات تھے۔ افسوس ہے کہ لندن کے کسی ہوٹل میں اُن کا ہارٹ فیل ہو گیا! منتخب شعروں کی بیاض اور "فاران" میں چھپے ہوئے مضامین! اپنی علمی اور ادبی یادگار چھوڑے!

بڑے بھائی کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ چھوٹے بھائی (عبدالحمید اسمٰعیل) کو اپنی خوش نما، خوش منظر بلند و بالا کوٹھی چھوڑ کر، قبر کا گوشہ بسانا پڑا! رہے نام اللہ کا! (اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے)

جو آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہے، موت ہر نفس کے لیے مقدر ہو چکی ہے ؎ وہ بھی نہ رہیں گے، جو رہے ہیں

حیوان اور ڈھور ڈنگر موت و ہلاکت سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے اور کرتے بھی ہوں تو ہم اُسے سمجھ نہیں سکتے۔ مگر انسانوں کو موت سے عبرت ملتی ہے، اور جو دُنیا کو "مزرعۂ آخرت" سمجھ کر نیکیوں کی تخم ریزی میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں، وہی کامیاب اور بامراد ہیں۔

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۲ء)

حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی

تیرہ چودہ سال کی عمر بلوغِ شعور کے بعد کی دوسری منزل ہوتی ہے۔ اُسی وقت سے ماہنامہ" النجم" (لکھنؤ) کے ذریعہ حضرت مولانا عبدالشکور کے نام سے میں واقف تھا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ جانا ہوا تو مولانا سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے پاٹا نالہ پہنچا۔ مولانا مسجد میں عصر کی نماز پڑھا کر دعا مانگ رہے تھے، دُوری سے اُن کی جھلک دیکھی اور میں وہاں سے چلا آیا۔ کہاں تو شوقِ ملاقات کی وہ شوریدہ سری کہ لوگوں سے پتا پوچھتا ہوا، دو ڈھائی میل پیدل چل کر پاٹا نالہ پہنچا اور پھر یہ "بے نمکی" کہ دُور ہی کے سرسری دیدار ہی پر کفایت کرلی، اور اس عالم میں واپس ہوا کہ: ؎

دیکھا بھی تھا یا جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

غالباً سنہ ۱۹۴۰ء میں جب میں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا، مولانا مرحوم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے عبدالغنی فاروقی[1] نے مراسلت کا آغاز فرمایا۔ موصوف اُن دنوں میں درسِ نظامی کے طالبِ علم تھے۔ یہ مراسلت کئی سال تک چلتی رہی، اس خط و کتابت میں شعر و ادب کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی، انہی کی تحریک پر مدحِ صحابہؓ کے مشاعرے میں دو بار حیدرآباد دکن سے مجھے بلوایا گیا۔

مدحِ صحابہؓ کا مشاعرہ سال کے سال بڑے اہتمام سے ہوتا تھا۔ ہزاروں روپیہ مشاعرے کی پنڈال کی آرائش پر ہی صرف ہو جاتا ہوگا۔ مشرف حسین مرحوم برق کی

---

[1] مولانا عبدالغنی فاروقی درسِ نظامی کے عالم اور مستند طبیب ہیں۔ اور راقم الحروف کے اشعار کے حافظ ہیں، ڈیڑھ سال سے کراچی میں قیام ہے۔ میری لاابالی طبیعت کی کوتاہیوں کے باوجود، مجھ سے پہلے ہی کی طرح ربط و خلوص رکھتے ہیں۔

فیکٹری کے مالک تھے۔ انہی کے دولت کدے پر شعراء ٹھہرائے جاتے تھے! اور بڑی سیر چشمی کے ساتھ اُن کی تواضع اور مدارات کی جاتی تھی، ایک بار مشاعرے کی صدارت حضرت جگر مرادآبادی مرحوم نے فرمائی۔ اس مشاعرے میں اس کا بھی ایک صاحب نے اعلان کیا کہ جگر صاحب آج سے شرعی ڈاڑھی رکھیں گے ــــ ایک مشت دوانگل

حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی قدس سرہٗ سے جب بھی نیاز حاصل ہوا، بڑی شفقت اور محبت کا اظہار فرمایا، بزرگانہ تواضع جس میں خلوص کے سوا اور کسی شے کی آمیزش نہ تھی! ایک بار اپنی بیس پچیس کتابیں عنایت فرمائیں، اُن کتابوں کے مطالعہ سے مجھ کم سواد کو بہت کچھ روشنی ملی، اور معلومات میں اضافہ ہوا، خاص طور سے "حدیثِ قرطاس" کے بارے میں جو الجھن تھی وہ دُور ہوگئی۔

بعض لوگوں کی زبان سے یہ باتیں بھی ان کانوں نے سُنیں کہ رفض کی تردید کرتے کرتے مولانا کے مزاج وطبیعت میں خارجیت کی جھلک پیدا ہوگئی ہے، مگر مولانا مرحوم نے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہٗ کے جو حالات لکھے ہیں، انہیں پڑھ کر معلوم ہوا کہ ان کی ذات سے "خارجیت" کی نسبت بے سروپا تہمت ہے۔ اہلِ بیتِ کرام سے وہ اُسی طرح محبت اور عقیدت رکھتے ہیں، جو اہلِ سُنّت کا شعار ہے ــــ بلکہ مجھے تو فضائلِ علیؓ میں ایک دو مقامات پر مولانا کے قلم سے "غلو" کی جھلک نظر آئی۔

سن ۱۹۴۶ء میں "مدحِ صحابہؓ" کے مشاعرے کی صدارت مجھے کرنی پڑی، لاہور کے ایک صاحب تھے تاج محمد یا تاج الدین، علامہ اقبال کے سخت مخالف۔ علامہ کی نظموں کے جواب میں انھوں نے نظمیں کہی ہیں، اور اس طرح جیتے جی اپنی رسوائی کے اسباب خود فراہم کیے ہیں۔ نہ جانے زندہ ہیں یا مر گئے، اور زندہ ہیں تو کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ ہاں تو ان صاحب نے "مدحِ صحابہؓ" کے مشاعرے میں نظم پڑھی، مزاج کی طرح آواز میں بھی خشونت تھی، بھرّائی ہوئی آواز، غضب ناک لہجہ، گلے کی رگیں پھولی ہوئیں۔ ایک شعر کو بار بار پڑھا، جس کا مفہوم یہ تھا ــــ کیا قیامت ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتل کا نام اب تک پوشیدہ ہے۔

اس شعر کے تیور بتا رہے تھے کہ اس کی رمزیت اور اشاریت میں "ناصبیت" اور "خارجیت" جھلک رہی ہے ــــ اُن کی نظم ختم ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا،

میں نے ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی، میں نے کہا کہ ہم تو اہلِ محبت ہیں، صحابۂ کرام اور اہلِ بیت عظام سبھی سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور یہ تمام نفوسِ قدسیہ ہمارے مخدوم ہیں، جس طرح "رفض" گمراہی ہے۔ اسی طرح "خارجیت" بھی گمراہی ہے!
اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال تھا کہ میرے اس "انتباہ" کو پسند کیا گیا، اور ہزاروں کے مجمع سے ایک آواز بھی اس کی تردید اور مخالفت میں سنائی نہیں دی۔ حضرت مولانا عبدالشکور بھی وہاں تشریف فرما تھے۔

۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد میں پاکستان چلا آیا، حضرت مولانا عبدالشکور مرحوم پاکستان بننے کے بعد دو تین بار کراچی تشریف لائے۔ گزشتہ سال کراچی کے مشہور مخیر سیٹھ عبداللطیف باوانی مرحوم کی نمازِ جنازہ میں مولانا مرحوم سے مشرف نیاز حاصل ہوا اُن کے بڑھاپے کو دیکھ کر دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ دین و اخلاق کی یہ شمع اب زیادہ دن تک نہ جل سکے گی! اس ملاقات کے چند مہینے بعد اخبارات میں اُن کی وفات کی خبر پڑھی۔

حضرت مولانا عبدالشکور جیسے ثقہ اور مخلص عالم روز روز پیدا نہیں ہوتے وہ ایک طرف علم و فضل کا کوہِ گراں تھے، تو دوسری طرف نیکوکاری اور تقویٰ کا نور اُن کے چہرے سے جھلکتا تھا، اُن کی ذات سلف صالحین کا روشن نمونہ تھی، رہنا سہنا کس قدر سادہ، لباس معمولی اور چال ڈھال کتنی باوقار اور نستعلیق تھی، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عصمت و عزت کی مدافعت میں جو لازوال علمی اور دینی کارنامہ انھوں نے انجام دیا ہے، اس نے انہیں "امامِ اہلِ سنت" بنا دیا ــــ رحمۃ اللہ علیہ و برد اللہ مضجعہ و نور قبرہ!

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۶۲ء)

مولانا عبدالعزیز (کوئٹہ والے)

مولانا عبدالعزیز مرحوم سے یقیناً پاکستان بننے کے بعد کراچی یا لاہور میں جماعت اسلامی کے کسی نہ کسی اجتماع میں ملاقات ہوئی ہوگی مگر سرداردی کی ملاقاتیں پوری طرح ذہن و دماغ میں محفوظ کہاں رہتی ہیں؟ مولانا مرحوم سے تفصیلی ملاقات ۱۹۵۲ء میں ہوئی، کوئٹہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں جانا ہوگیا، نواب ارباب کرم خاں جو صوبہ بلوچستان کے نامور رئیس اور قبیلہ کے معزز سردار تھے۔ اُن کی کوٹھی میں کراچی کے شاعروں کو ٹھہرایا گیا ان کا وسیع و عریض مکان "باغ و بہار" تھا، گلاب کی اتنی بہت سی قسمیں کم ہی پائیں باغیچوں میں دیکھنے میں آئیں۔

جماعت اسلامی کے دفتر میں مولانا عبدالعزیز مرحوم کے ساتھ چائے پی، میں نے باتوں باتوں میں عرض کیا کہ شاعری میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ برسوں سے مشاعرے پڑھ رہا ہوں، اس ذریعہ سے بہت کچھ کمایا بھی ہے مگر مشاعروں کی شرکت کو میں "مکروہ" سمجھتا ہوں، مولانا عبدالعزیز کسی تامل کے بغیر بولے:

"مگر اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے مشاعروں کے انعقاد کو میں واجب سمجھتا ہوں۔"

اُن کے اس جواب سے دل باغ باغ ہوگیا جی میں آیا کہ اُن کے ہاتھ چوم لوں۔

اس کے بعد مولانا مرحوم و مغفور سے سال میں ایک دو بار کہیں نہ کہیں ملاقات ہوتی رہتی! کئی برس سے اُن کا معمول تھا کہ وہ جاڑوں میں سال کے سال کوئٹہ سے کراچی تشریف لاتے اور کئی مہینے قیام فرماتے، کوئٹہ کی سردی اُن سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ اُن کے اطبا کا یہی مشورہ تھا کہ سردی میں کسی گرم یا معتدل مقام پر رہیں۔

کراچی کے دورانِ قیام میں انہیں آرام سے بیٹھنا کہاں نصیب ہوتا تھا۔ تقریباً روزانہ سیرت و اخلاق پر اُن کی تقریروں کا پروگرام رہتا اور خرابی صحت کے باوجود دن رات

ہیں کئی کئی تقریریں کرتے، اللہ کی راہ کے مسافر کو سستانے اور آرام کرنے کی فرصت کہاں ملتی ہے، سفر اور مسلسل سفر!

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اس منزل میں مصیبتیں اٹھا کر اور زخم کھا کر جو لطف ملتا ہے۔

؎ یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

یا

؎ لطف ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

مولانا عبدالعزیز علمی تبحر کے باوجود منکسر المزاج تھے، اپنے علم و فضل پر ذرا سا بھی غرہ نہیں تھا، علمی مسائل میں اُن کا اندازِ گفتگو طالب علمانہ ہوتا۔ حافظہ بہت اچھا تھا، جو کچھ پڑھا تھا اُس کی خاصی مقدار دل و دماغ میں محفوظ تھی!

مولانا عبدالعزیز مرحوم کی تقریریں اثر انگیزی میں اپنا آپ جواب تھیں، جماعت اسلامی کے زیرِ اہتمام کراچی میں ایک جلسہ تھا، اس میں صحابہ کرامؓ کے مصائب ایثار و قربانی اور جفاکشی کے حالات بیان کیے تو سننے والے رونے لگے، کسی کسی کی تو فرطِ تاثر سے چیخ نکل گئی۔ وہ شعلہ نوا خطیب اور قادر الکلام مقرر تھے، کسی بات پر زور دینے کے لیے جب وہ اپنے ہاتھ کو خاص انداز میں جنبش دیتے تو سامعین کے دل بے اختیار کھنچنے لگتے، اسی کا نام تقریر و خطابت کی ساحری ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے مقرروں کی اگر کوئی تاریخ مرتب کی جائے تو مولانا عبدالعزیز مرحوم کا ذکر اس میں ضرور آنا چاہیئے۔

ہم نے بعض ایسے جادو بیان مقررین کی تقریریں بھی سُنی ہیں جو خطابت کے جوش میں کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں —— مگر مولانا عبدالعزیز مرحوم کی تقریر و وعظ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ موضوع سے اِدھر اُدھر نہ ہوتے۔ سامعین کو ہنسانے اور اُن کی دلچسپی کے لیے نہ تو مولانا مرحوم لطیفے بیان کرتے اور نہ اشعار پڑھتے! باوقار خطابت، سنجیدہ اسلوبِ تقریر مگر تاثیر قیامت کی! اور یہ اثر تھا اُن کے اخلاص اور پاکیزہ باطنی کا!

جماعت اسلامی سے جو تعلق پیدا ہوا تو پھر اس میں نہ کمی آئی اور نہ فترت واقع ہوئی بلکہ جتنے دن گزرتے گئے یہ تعلق مضبوط تر ہوتا گیا۔ جماعت سے کون، کیوں علیحدہ ہوا؟

اس کی انہوں نے پرواہی نہیں کی، جماعت اسلامی کو مولانا مرحوم حق پسند تنظیم سمجھتے تھے اس لیے آخر دم تک وہ جماعت سے وابستہ رہے۔ خود بڑے عالم دین، اونچے درجہ کے خطیب اور صاحب فکر دانشور مگر مولانا مودودیؒ کے علم وفضل کے انتہائی معترف اور مداح! میں مولانا مودودیؒ کی بعض تحریروں کے بارے میں اُن سے کبھی کبھار پوچھتا کہ مولانا نے ایسا لکھا ہے؟ تو وہ جواب میں کہتے کہ مولانا مودودیؒ تحقیق کے بغیر کوئی بات نہیں لکھتے! بعض اوقات مولانا کے کسی قول کی توجیہہ وتاویل بھی فرمادیتے جو عام طور پر دلنشین ہوتی! اور میں ندامت ومسرت محسوس کرتا۔ ندامت اس کی کہ میں نے یہ اعتراض کیوں کیا! اور مسرت اس بات کی کہ ذہنی خلش دور ہوگئی۔

اردو زبان میں وہ اہل زبان کی طرح مستند اور معتبر تھے گیارہ سال رام پور میں رہ کر علم دین کی تحصیل کی اور ساتھ ہی اردو زبان کے روزمرہ پر پورا عبور حاصل کیا۔ ادارہ معارف اسلامیہ کراچی کی طرف سے ایک عربی کتاب کے ترجمہ کا مسودہ ان کو نظرثانی کے لیے دیا گیا تھا پھر وہ مسودہ میرے پاس آیا یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالعزیز نے کتاب کی زبان میں اس طرح تصرف تصحیح اور ترمیم و اضافہ کیا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کا کوئی مشاق اور صاحب طرز ادیب اسے پڑھتا تو مولانا مرحوم کی زبان دانی کی داد دیتا۔ راقم الحروف کو اُن کی نظرثانی کے مقامات پر بس دو چار جگہ قلم لگانا پڑا، اُن کے لب ولہجہ سے ایسا لگتا جیسے عبدالعزیز بلوچستان میں نہیں یوپی میں پیدا ہوئے ہیں۔

مولانا عبدالعزیز آغاز شباب ہی سے نیک کردار تھے، دین کی تعلیم نے اس جوہر کو چمکایا اور جماعت اسلامی میں آنے کے بعد یہ رنگ اور چوکھا ہوگیا۔ وہ صاحب علم ہونے کے ساتھ صاحب عزیمت بھی تھے۔ کوئی بھی دورِ حکومت کیوں نہ ہو مولانا مرحوم نے حق بات کہنے اور اہل اقتدار کی غلطیوں پر ٹوکنے کا حق ادا کردیا۔ اُن کا دل خشیت الٰہی اور محبت رسولؐ سے معمور تھا۔ غیر اللہ سے ڈرنا، مرعوب ہونا، مصلحت آمیز انداز اختیار کرنا، ایسی باتوں کی انہیں ہوا بھی نہ لگی تھی، حق کا اعلان ڈنکے کی چوٹ کیا اور اس کے عواقب کی پرواہی نہیں کی۔ سنجیدہ اور باوقار خوش مزاجی بے تکلف صحبتوں میں بھی "بازاری مزاح" نہیں بننے پائی۔ شعر وادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔

مولانا عبدالعزیز کی موت نے جماعت اسلامی کے بہت بڑے رکن کو چھین لیا، اُن کی جدائی سے سب کے دل ملول ہیں۔ مگر صبر کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا اپنے فرمانبردار بندے سے دعوت حق کا کام لیا، جب چاہا بلا لیا، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ رضینا برضا اللہ، غفرلہ اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۷۲ء)

عبدالقیوم خاں

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم کے عزیزوں میں ایک بزرگ اکبر حسین تھے، جو حیدر آباد دکن کی کسی جاگیر میں منصف تھے، اُن کے گھرانے میں شعر و ادب کا بہت ذوق تھا، اکبر حسین مرحوم کے صاحبزادے اختر حسین (ایم۔اے) روزنامہ "پیام" کے ایڈیٹر رہے تھے۔ ان کے یہاں مہینے میں دو تین ادبی صحبتیں ضرور ہوتیں، افسانے اور تنقیدی مضامین پڑھے جاتے اور شعر خوانی بھی ہوتی، اس گھرانے میں پردہ تھا مگر رفتہ رفتہ حجاب و نقاب کے بند ڈھیلے ہونے لگے، اور پھر کچھ دن بعد پردہ رخصت ہو گیا۔

۱۹۶۱ء میں "جشنِ شاعر" بمبئی میں بڑی دھوم سے منایا گیا، مدراس کے مشاعرے میں شرکت کرنے کے بعد میں بمبئی پہنچا "جشنِ شاعر" کے مشاعرے میں اسٹیج کے قریب ایک لڑکی نے آکر سلام کیا ـــــ میں چونک پڑا، صورت جانی پہچانی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ سید اکبر حسین موہانی مرحوم کی ان صاحبزادی کی دشوا امتر عادل سے سول میریج ہو گئی۔ شریعت کی حدود توڑنے کے بعد ہی "المیہ" ظہور میں آسکتا ہے۔

اسی گھرانے میں حیدر آباد دکن کے دو تین خاندانوں کا آنا جانا تھا، سب لوگ شاعری سے شوق و دلچسپی رکھتے تھے۔ قصبہ لوہاری ضلع سہارن پور کے رہنے والے ایک صاحب عبداللطیف خاں تھے، جو اب سے تقریباً ۸۰ سال قبل ریاست حیدر آباد دکن میں ملازم ہوئے اور اپنی ذہانت و قابلیت کی بدولت ترقی کر کے محکمہ آبکاری کے ناظم ہو گئے، اور "نواب لطیف یار جنگ" کے خطاب سے نوازے گئے، ان کے داماد احمد علی خاں مرحوم ۱۹۳۷ء میں محکمہ آبکاری میں مہتمم (سپرنٹنڈنٹ) تھے، اور پھر انھوں نے نائب ناظم کے عہدہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ ان کے یہاں بھی شعر و شاعری کی محفلیں جمتیں اور ان محفلوں میں تنہا راقم الحروف ہی گھنٹوں شعر سناتا۔ عبدالقیوم خاں صاحب سے جو ان دنوں ہوم آفس میں مددگار معتمد (ڈپٹی سکریٹری) تھے، احمد علی خاں صاحب ہی

کے یہاں تعارف ہوا، پھر رفتہ رفتہ اُن سے روابط اور تعلقات بڑھتے اور استوار ہوتے چلے گئے۔ عبدالقیوم خاں، نواب لطیف یار جنگ بہادر کے فرزند تھے اور احمد علی خاں مرحوم کے برادرِ نسبتی!

احمد علی خاں صاحب کا نوتعمیر مکان ایک پہاڑی پر تھا، اچھی خاصی لمبی چوڑی کوٹھی، منظر خوشنما اور محل وقوع شاندار! وہ سال میں دو تین بار پک نِک کے لیے ضرور جاتے، پہلے سے ڈاک بنگلہ ریزرو کرالیا جاتا، گرمی میں برف کی سلیں اور سوڈا واٹر کی بوتلیں ساتھ رہتیں، اچھے سے اچھے کھانوں کا اہتمام، سیر کے لیے موٹریں، شکار کے لیے بندوقیں اور کارتوسوں کی بہتات، شعر خوانی، کھیل کود، تفریح، سچ مچ جنگل میں منگل!

۱۹۴۱ء ہوگا جب قائدِاعظم محمد علی جناح کسی مقدمہ کی پیروی کے لیے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے۔ تو قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کا پیغام خاکسار کو ملا کہ میرے یہاں فلاں دن شام کو مسٹر جناح کا ایٹ ہوم ہے، تمہیں اس تقریب کی مناسبت سے کوئی نظم پڑھنی ہوگی۔ میں نے جواب میں کہلوا بھیجا کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل میں نظم ضرور سناؤں گا مگر یہ نظم "قصیدہ" نہیں ہوگی۔ انہی دنوں احمد علی خاں صاحب مرحوم کے ساتھ پک نک میں جانا نکل آیا۔ ایک دن اور ایک رات گزر چکی تھی، ڈیڑھ دن کا پروگرام اور باقی تھا، دوسرے دن عبدالقیوم خاں بھی بلدہ حیدرآباد سے اپنی کار میں آگئے، میں نے اُن سے کہا کہ آج شام کو نواب بہادر یار جنگ کے یہاں مسٹر جناح کا عصرانہ ہے، مجھے اُس میں ضرور شریک ہونا ہے، وہ بولے مجھے بھی وہاں جانا ہے، مگر تم نے اس پروگرام کا یہاں ذکر کردیا تو یہ لوگ تمہیں کسی قیمت پر جانے نہیں دیں گے، یہاں سے چلنے کی بس ایک ہی سبیل ہے کہ ان لوگوں سے کہے بغیر موٹر میں بیٹھ کر ہم روانہ ہوجائیں، تمہارا بستر اور کپڑے یہ دوسرے دن اپنے ہمراہ لے آئیں گے۔

دوپہر کا کھانا کھاکر، درختوں کے سایہ میں سب لوگ آرام کر رہے تھے، کوئی آرام کرسی پر نیم دراز تھا، کسی نے سفری پلنگ کو خواب گاہ بنا رکھا تھا۔ کچھ لوگ سبزے پر لیٹے تھے، نیچے ڈاک بنگلہ کے صحن میں کبڈی کھیل رہے تھے، اتنے میں عبدالقیوم خاں مرحوم نے مجھے اشارہ کیا، وہ ٹہلتے ہوئے چلے، میں بھی اُن کے پیچھے، سب لوگ سمجھے کہ ہم باغیچہ کی روشوں پر گھومتے جا رہے ہیں، پھر ہم موٹر میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا، پیچھے مڑ کر

ہی نہیں دیکھا! وہ جو گاؤں والوں کی کہاوت ہے کہ گھوڑوں کو گھر کیا دور ہے — اور یہ تو موٹر تھی، جسے پچاس میل کی مسافت طے کرنے میں بہت سے بہت ڈیڑھ گھنٹہ لگا ہوگا۔
میں اپنے گھر پر اتر گیا اور شام کے وقت کپڑے بدل کر نواب بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی پہنچا۔ بیگم بازار میں تماشائیوں کی کافی بھیڑ تھی، عصرانہ میں بلدہ حیدرآباد کے اعیان و اکابر جمع تھے، قائدِ اعظمؒ وقتِ مقررہ پر تشریف لائے، اُن کے آتے ہی بینڈ بجنے لگا، ڈیوڑھی کے صدر دروازے پر چار دُش بندوقیں لیے اور کمر سے تلواریں لگائے کھڑے تھے، کسی کسی کی ڈاب میں قردلی اور پیش قبض تھا۔
قائدِ اعظمؒ جب لوگوں سے ملنے کے لیے گھومنے لگے تو نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے ایک خالی کرسی اٹھا کر رکھ دی اور ان کے فرمانے پر میں اُس پر کھڑا ہو گیا۔ قائدِ اعظمؒ اُس کرسی کے سامنے آکر رُک گئے اور میں نے "قائدِ اعظم کا پیغام ملت کے نام" کے عنوان سے چند اشعار سنائے۔ پہلا اور آخری شعر

جینے کا قصد ہے تو سکوں کی نہ کر تلاش
یہ زندگی کشاکشِ پیہم کا نام ہے

نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسماں
سمعِ قبول ہو تو خموشی پیام ہے

مسٹر جناح نظم ختم ہونے تک کرسی کے سامنے کھڑے رہے!
مسٹر عبدالقیوم خاں کے یہاں بھی دعوتیں اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوئیں، حیدرآباد دکن میں اُن کا بنگلہ بڑا خوشنما تھا، دیواروں پر پھول پتے بنے ہوئے، پائیں باغ وسیع و کشادہ، چاروں طرف گملوں کی قطاریں، مکان کے برآمدے کی دیوار سے پانی کا آبشار گرتا تھا، اس کے لیے انہوں نے موٹر پمپ لگایا تھا۔
تقسیمِ ہند کے بعد کراچی میں پہلی بار اُن سے ملنا ہوا تو لپٹ گئے، اُن دنوں وہ حیدرآباد دکن کا مقدمہ مجلسِ اقوام میں پیش کرنے کی غرض سے جنیوا جا رہے تھے اور سفر کی تیاریوں میں مصروف تھے — کراچی میں جب بھی ملنا ہوتا، غیر معمولی خلوص و وضع کا اظہار کرتے، اپنے یہاں کی دعوتوں میں اصرار کر کے بلاتے، دو تین بار غریب خانہ پر بھی تشریف لائے، دل کے مریض تھے بیاسی سیڑھیاں چڑھنے کی ہمت نہ کر سکے۔

ڈرائیور کو بھیج کر مجھے بلوایا اور موٹر میں بیٹھ کر باتیں کیں۔

تین چار سال سے اُن کی صحت گرنے لگی تھی، دل کا مریض ڈاکٹروں کے چکر میں پھنس جائے تو پھر اس چکر سے موت کے بعد ہی شاید نکلنا ہوتا ہے، علاج معالجہ کی بڑی سے بڑی سہولتیں موجود تھیں، انگریز عورت سے شادی کی تھی، پاکستان آنے کے دو تین سال بعد وہ عورت انگلستان واپس چلی گئی۔ مرحوم کے کوئی اولاد نہ تھی، اکیلے دم کے لیے چار چار پانچ پانچ نوکر، ہر طرح آرام اور بے فکری! میں نے ایک دن صبح سویرے اُن کی موت کی خبر اخبار میں پڑھی، اور شرافت و سنجیدگی کی تاریخ فلم کے پردے کی طرح سامنے آگئی —— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

عبدالقیوم خاں مرحوم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی، نوابزادہ لیاقت علی خاں اور وہ ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہتے تھے پھر انہوں نے انگلستان جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا، حکومتِ دکن میں متعدد عہدوں پر فائز رہے —— ڈپٹی سیکرٹری ڈسٹرکٹ جج ہائی کورٹ کے رجسٹرار، پٹنہ کے سید عبدالعزیز مرحوم وزیرِ عدالت کے پرسنل اسسٹنٹ اور اس کے بعد امورِ مذہبی کے ناظم!

پاکستان بننے کے بعد مشتاق احمد خاں صاحب جن دنوں حکومتِ دکن کے ایجنٹ جنرل تھے، عبدالقیوم خاں اُن کے سیکرٹری تھے، پھر چند برس کے بعد ایسی صورت پیش آئی کہ مولوی مشتاق احمد خاں صاحب اس عہدے سے سبکدوش ہوگئے، اور اس وقت سے اب تک عبدالقیوم خاں مرحوم سیکرٹری جنرل کے منصب پر فائز رہے۔ تنخواہ دو ہزار سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔ موٹر کار اور کرایہ مکان وغیرہ کے الاؤنس اس پر مستزاد انتہائی آرام کی نوکری، کوئی خاص ذمہ داری اور مصروفیت نہیں۔

عبدالقیوم خان مرحوم نے کلفٹن پر ایک بنگلہ خریدا تھا اور اُسے اپنی خوش ذوقی سے باغ و بہار بنا دیا، مگر پھر اُسے بیچ کر ناظم آباد میں شاندار مکان بنایا، مکان کے دروازے سے لے کر، باتھ رُوم تک، ہر گوشہ دیکھنے کے قابل، کوٹھی کا فرنیچر دیدہ زیب! باغیچہ انتہائی خوشنما حوض کے چاروں طرف سبزہ اس قدر خوش منظر کہ اس کے نظارے سے دُکھتی آنکھیں اچھی ہو جائیں —— موت آئی تو اعمال کے سوا، مکان کا ایک تنکا بھی وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے، ہر کسی کو اسی منزل

سے گزرنا ہوتا ہے مگر" دنیا کے مکروہات آدمی کو آخر دم تک غافل بنائے رہتے ہیں! مرحوم کی جائداد، مکان اور مال و متاع اُن کے وارثوں (بہنؓ، بھائی، بھتیجوں) کے حصّے میں آئیں گے ـــــ رہے نام اللہ کا۔

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۶۷ء)

ؔ مرحوم کی بڑی بہن کے اکلوتے فرزند خورشید علی خاں حیدرآباد میں محکمہ فنانس کے ڈپٹی سکریٹری تھے پاکستان آکر انہوں نے ملازمت کی بجائے تجارت سے نئی زندگی کا آغاز کیا، اُن کی اہلیہ نے خلع لے کر مشہور ناول "شمیم" کے مصنف فیاض علی خاں ایڈووکیٹ جنرل سے شادی کرلی اور اُن کے مرنے کے بعد اب وہ مسٹر محمد شعیب (سابق وزیر خزانہ پاکستان اور حال ڈائرکٹر/ وائس چیرمین ورلڈ بنک) کی شریکِ زندگی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی

گیارہ بارہ برس کی عمر سے راقم الحروف کو رسالے اور اخبار پڑھنے کا شوق اور ذوق رہا ہے۔ اس دورِ کمسنی میں جبکہ کتابوں کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر تھا علمی مضامین سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر نئے نئے الفاظ معلوم کرنے کے شوق میں ان مضامین کو جیسے تیسے پڑھ لیا کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مطالعہ کی یہ صورت ہوگئی کہ علمی مقالوں کا کچھ حصہ تو سمجھ میں آیا کچھ حصہ پلّے نہیں پڑا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری، مطالعہ کی وسعت اور رفتار بڑھتی ہی چلی گئی اور شروع شروع میں طفلانہ جذبۂ نام و نمود کا یہ عالم بھی رہا ؎

یک حرف خواندہ ایم وبصد جا نوشتہ ایم

مولانا عبدالماجد دریا بادی کی بھی بعض تحریریں نظر سے گزریں اور اُن کے مضامین پڑھ کر ہی فلسفہ کا شوق پیدا ہوا۔ " نفسیات ــــ اجتماعِ ضدین ــــ نقیض ــ استشہاد ــــ حسِ مشترک ــ قضیہ ــــ علت و معلول ــــ سبب و مسبب ...... یہ الفاظ اور اصطلاحیں مجھ جیسے دیہاتی طالب علم کے لیے عجیب و غریب ہی نہیں تھیں بلکہ " اکتشافات " کا درجہ رکھتی تھیں۔

۱۹۲۷ء میں لکھنؤ کی بارہ دری میں عظیم الشان پیمانے پر " حجاز کانفرنس " منعقد ہوئی۔ صالح بھائی بڑدوہ والے اس کے صدر تھے۔ مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی جیسے اکابر نے اس میں شرکت فرمائی۔ " الحجاز للحجازیین " کا موضوع زیرِ بحث رہا۔ مجھے بھی مولانا عبدالقدیر بدایونی کے طفیل اس کانفرنس میں باریاب ہونے کا موقع میسر آیا۔ اسی کانفرنس میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ ان کی فلسفیانہ شخصیت کی جو مرعوبیت تھی وہ دید و نظارگی میں بھی باقی رہی۔

حیدرآباد دکن کے دورانِ قیام میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ میرے انتہائی کرم فرما دوست نواب نثار یار جنگ بہادر (پنشنر ڈپٹی کمشنر

کے یہاں مولانا دریا بادی کے جریدہ "سچ" کے تمام فائل محفوظ تھے، وہ ایک ایک کرکے پڑھ ڈالے! اردو کے وہ چند چوٹی کے اہلِ قلم جو مجھے انتہائی پسند اور محبوب تھے اُن میں مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی شامل تھے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اُن دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھے اور ترجمان القرآن میں اُن کے معرکہ آرا دینی مضامین نے بلند پایہ مسلم دانشوروں کو چونکا دیا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منظور محمد نعمانی جیسی شخصیتیں مولانا مودودیؒ کے دینی افکار سے بے حد متاثر تھیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنے ہفتہ وار "صدق" میں مولانا مودودیؒ کے مضامین و افکار کی تعریفیں کیا کرتے تھے اور مولانا مودودیؒ کو "متکلمِ اسلام" انہیں نے سب سے پہلی بار لکھا تھا۔

غالباً ۱۹۴۱ء میں یہ تغیر بھی دیکھنے میں آیا کہ "صدق" میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کے قلم سے مولانا مودودیؒ پر طنز و تعریض کی جانے لگی اور یہ سلسلہ رکنے نہیں پایا چلتا ہی رہا۔ راقم الحروف نے حیدرآباد دکن سے سات آٹھ صفحے کا خط مولانا دریا بادی کی خدمت میں ارسال کیا اور انہیں لکھا کہ مولانا مودودیؒ کی برسوں داد و ستائش کے بعد چند مہینے سے "صدق" میں اُن پر جو آپ نقد و جرح فرما رہے ہیں۔ اس کی علم سمجھ میں نہیں آتی پھر وہ نوجوان مسلمان طلبہ جو مولانا مودودیؒ اور آپ دونوں سے متاثر ہیں اور آپ حضرات کو ایک ہی شجرِ طیبہ کے برگ و بار سمجھتے ہیں وہ آپ کی اس بدلی ہوئی روش سے سخت الجھن میں ہیں اُن کی یہ ذہنی الجھن اور آشفتہ خاطری اُن کو دین کے بارے میں مذبذب بھی کر سکتی ہے۔۔۔۔! ۲۶ برس پہلے کے خط کی نہ میرے پاس نقل ہے اور نہ اُس کی پوری عبارت میرے ذہن میں محفوظ رہی ہے، بہرحال میں نے جو کچھ لکھا پوری دردمندی اور سوز و اخلاص کے ساتھ لکھا، مفصل اور مدلل لکھا، اُس کے جواب میں مولانا دریا بادی مرحوم کا چند سطروں کا ایک کارڈ ملا جس میں لکھا تھا۔

"آپ کو تبلیغ کا اجر مل گیا مگر آپ کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔"

اُن کی اس تحریر کا میں کیا جواب دیتا انہوں نے تو پتنگ[1] ہی ہتھول سے کاٹ دی!

---

[1] میں نے "پتنگ" کو اپنے نواح میں مونث ہی سُنا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں جب "فاران" کا پہلا پرچہ منظرِ عام پر آیا ہے تو مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں "فاران" بھیجا گیا، وہاں سے "صدق جدید" تبادلہ میں آنے لگا۔ تقسیم ہند سے قبل مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی صاحبزادی کے عقد نکاح پر جو خطبہ دیا تھا وہ اپنی جگہ ادبُ انشار اور اخلاق وعظمت کا شاہکار تھا۔ میں نے درخواست کی کہ اس خطبہ کی نقل عنایت فرمائی جائے، مولانا دریابادی نے ہاتھ کے ہاتھ اُس اپنے خطبہ کی نقل روانہ فرمادی، جسے "فاران" میں شائع کیا گیا۔

"صدقِ جدید" پابندی سے "فاران" کے تبادلے میں آتا تھا اس کا ایک ایک لفظ راقم الحروف انتہائی شوق ودلچسپی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ مولانا مودودیؒ پر طنز وتنقید کا سلسلہ "صدق جدید" میں چلتا رہا اس کے ساتھ پاکستان کی جماعت اسلامی بھی مولانا دریابادی کی طنز وتعریض کی لپیٹ میں آجاتی۔ جماعت اسلامی ہند کی کبھی کبھار تعریف کرتے تو اس تعریف کے ساتھ مولانا مودودیؒ اور پاکستان کی جماعت اسلامی کی دوچار چھینٹوں سے ضرور تواضع فرما دیتے۔ یہ صورتِ حال کوئی شک نہیں تکلیف دہ تھی مگر اس کو گوارا کیا گیا اور اس سلسلہ میں ایک حرف بھی مولانا دریابادی کو نہیں لکھا لیکن مولانا مرحوم نے ایک اور رُخ اختیار کیا ـــــ یعنی قادیانیوں کا مدح آمیز لفظوں میں تذکرہ "صدقِ جدید" میں آنے لگا۔ قادیانیوں کے کافرانہ عقائد سے وہ متفق نہیں تھے اور مرزا غلام احمد کے دعویٔ نبوت کو درست نہیں سمجھتے تھے مگر ان کی دوڑ دھوپ، تنظیمی صلاحیت اور طریقِ کار کے مداح تھے۔ اُن کی تحریروں سے ایسا مترشح ہوتا تھا جیسے مرزا غلام احمد اور قادیانیت کی تکفیر کی تکرار انہیں کھٹکتی ہے۔ میں نے مولانا دریابادی کو دو خط لکھے اور ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کی اس روش سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے، قادیانیوں کی مدح میں آپ کی تحریریں پڑھ کر مسلمانوں کو روحانی اذیت ہوتی ہے! آپ ان ظالموں کی تکفیر نہ کرنے میں کوئی دینی مصلحت سمجھتے ہیں تو آپ خاموش رہ سکتے ہیں ـــــ! مولانا نے میرے خطوں کا کوئی جواب نہیں دیا، قادیانیوں کے لیے اُن کے دل میں جو نرم گوشہ تھا وہ "صدقِ جدید" کے صفحات پر نمایاں ہوتا رہتا ـــــ اُن کی اس روش سے تنگ آکر راقم الحروف نے ایک طویل عریضہ مولانا دریابادی کی خدمت میں ارسال کیا جس میں

لکھا کہ سینکڑوں برس پہلے بعض صوفیا کے جو خطرناک اقوال ملتے ہیں اُن کی تاویلیں اور اُن کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں کہ انہوں نے واقعی وہ باتیں کہی بھی تھیں ——— اور کہی تھیں تو راویوں نے اُن میں نمک مرچ لگا کر اُن کو شدید تو نہیں بنا دیا، پھر ان "شطحیات" کی تحسین نہیں کی جاتی، مرزا غلام احمد کے دیکھنے والے زندہ ہیں، اُس کے زمانۂ حیات کی چھپی ہوئی کتابیں موجود ہیں اُن میں کسی نے کتر بیونت نہیں کی اور کوئی غلط قول مرزا غلام احمد علیہ ما علیہ سے منسوب نہیں کیا۔ نبوّت کا پورا انسٹی ٹیوشن قادیان اور ربوہ میں قائم ہے ——— اس کے بعد مرزا غلام احمد کے اصل اقوال درج کرتے ہوئے لکھا کہ یہ دعوے صریح کفر نہیں تو اور کیا ہیں ؟ پھر آپ قادیانیوں کے بارے میں آخر کس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اُن کے کفر کے بارے میں یہ تذبذب اور گومگو کس لیے ؟ میں نے آخر میں لکھا کہ اگر قادیانیت کے بارے میں آپ کا یہی اندازِ فکر رہا تو خدا نہ کرے مجھے آپ کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے ! (یہ آخری جملہ کوئی شک نہیں بہت شدید تھا مگر قادیانیوں کی مدح و توصیف میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی)۔

میرے عریضہ کے جواب میں مولانا دریا بادی کا عتاب نامہ آیا، جس میں لکھا تھا کہ تمام تعلقات ختم، خط و کتابت موقوف، "فاران" بھیجنا بند کر دیجیے "صدقِ جدید" بھی تبادلہ میں نہیں جائے گا، اور ۔۔۔۔ ! میں نے جواب دیا کہ آپ "فاران" پڑھنا نہیں چاہتے تو نہ پڑھیے مگر "صدق جدید" تبادلہ میں نہیں آئے گا تو راقم الحروف اس کا چندہ بھجوا کر خریدار کی حیثیت سے "صدق جدید" کا مطالعہ کرے گا۔

چنانچہ کئی مہینے فاران اور "صدقِ جدید" کا تبادلہ بند رہا۔ "صدق جدید" کے منتظم، مولانا دریا بادی کے خویش اور برادر زادے حکیم عبدالقوی کراچی تشریف لائے، تو اُن سے خاصی طویل گفتگو رہی، انہوں نے میری روداد سن کر نہ تو "ناں" کہا اور نہ "ہاں" ! عزیز جانب دارانہ روش ! مگر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ آپ "فاران" دریا باد مولانا کے پاس نہ بھیجیں، میرے نام لکھنؤ صدق جدید کے پتے پر روانہ فرمائیں، آپ براہِ راست دریا باد رسالہ بھیجیں گے تو مولانا اُسے واپس کر دیں گے، مگر میرے واسطہ سے "فاران" جب بھی انہیں ملے گا تو ضرور پڑھیں گے ! اور اُن کی کتابیں بھی براہِ راست نہیں میرے ذریعہ سے آپ کو تبصرے کے لیے ملتی رہیں گی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ ان دنوں حیات تھے۔ "صدق جدید" کے مضامین کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مزاجاً صندی واقع ہوئے ہیں، اور ہاں! اپنی دہریت کے زمانہ میں مولوی محمد علی مرزائی لاہوری کے انگریزی ترجمہ قرآن کو انہوں نے پڑھا ہے، اس کا اثر اُن کے ذہن و دماغ پر اب تک باقی ہے۔ مولانا حکیم نصیرالدین ندوی نے علامہ سید سلیمان ندویؒ سے دریافت کیا کہ آپ حضرات کے صحبت یافتہ ہوتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کا قادیانیوں کی طرف رجحان و میلان سمجھ میں نہیں آتا تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "وہ اسی راستہ سے اسلام کی طرف آئے ہیں۔"

اس قضیہ نامرضیہ سے قبل مولانا عبدالماجد دریابادی نے "صدق جدید" میں کئی بار لکھا کہ پاکستان میں ملا واحدی، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور ماہر القادری سے اردو روزمرہ کے مسائل میں رجوع کرنا چاہیے (مفہوم کی ترجمانی) مگر اس بدمزگی کے بعد انہوں نے میرا نام لکھنا ترک کر دیا۔ مُلا واحدی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کے نام لکھ کر "وغیرہ" تحریر فرمادیا کرتے! یعنی مولانا مرحوم راقم الحروف کو "خاصانِ اردو" میں سمجھتے تھے، مگر اب میرا شمار "وغیرہ" میں ہونے لگا۔

مولانا دریابادی کی جو کتابیں "فاران" میں تبصرے کے لیے آتیں ان پر نقد و تبصرہ کی منصفانہ ذمہ داریوں کے ساتھ ریویو کیا جاتا۔ اس قضیہ کی ذرا سی شخصی ناگواری مولانا مرحوم کی کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اثر انداز نہ ہونے پاتی —— مگر میرے سفرنامہ "کاروانِ حجاز" پر "صدقِ جدید" میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ اس سے مختلف تھا۔ اُن کا دل مجھ سے مکدر تھا۔ سب سے پہلا اعتراض کتاب کے نام (کاروانِ حجاز) پر وارد کیا گیا کہ یہ بے جوڑ سا نام ہے۔ پھر "امیرالحاج" پر گرفت کہ صحیح ترکیب "امیرالحجاج" ہے ...... ! مولانا کے ایک دو اعتراض تو صحیح تھے۔ مگر ان کے دوسرے اعتراضات اُن کے مزاج کی جھنجلاہٹ کے ترجمان تھے۔ میں نے اُن کے تبصرہ پر "فاران" میں تبصرہ کیا کہ سفرِ حجاز کی مناسبت سے "کاروانِ حجاز" کے نام میں آخر کیا خرابی اور ناموزونیت پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں "سقایۃ الحاج" آیا ہے۔ اس لیے میرا "امیرالحاج" لکھنا بالکل صحیح ہے "امتلا"

پر بھی گرفت فرمائی گئی کہ عربی میں اس کے معنی "مملو اور بھرے ہونے" کے ہیں۔ میں نے لغت کے حوالہ سے عرض کیا کہ اردو میں متلی کے معنی میں "امتلا" بولتے ہیں۔

راقم الحروف اوپر اس کا ذکر کر چکا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنے ہفتہ وار مجلہ "صدق" میں مولانا مودودیؒ کی تعریف کیا کرتے مگر پھر ان کا قلم مولانا مودودیؒ پر طنز کرنے لگا، اس تبدیلی کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا دریا بادی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو مشورہ دیا تھا آپ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقہ بیعت و ارادت میں داخل ہو جائیں، مولانا مودودیؒ نے جواب دیا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی عظمت کا میں خود بھی قائل ہوں لیکن بیعت کا معاملہ ایسا ہے کہ جب تک شیخ اور مسترشد کے درمیان مناسبتِ مزاج نہ ہو اس وقت تک نتیجۂ مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے اور مولانا (حضرت تھانویؒ) کے درمیان اس طرح کی مناسبت محسوس نہیں کرتا، اس لیے آپ کے مشورے پر عمل کرنے سے معذور ہوں، البتہ اس بات کا ہمیشہ خواہشمند رہا ہوں کہ کوئی ایسا بزرگ مجھے میسر آجائے جس سے تزکیۂ نفس کی نعمت حاصل کر سکوں۔

مولانا مودودیؒ کا یہ جواب اور بیعت کے سلسلہ میں معذرت و انکار مولانا عبدالماجد دریا بادی کو اس درجہ ناگوار ہوا کہ اس دن سے انہوں نے "صدق" میں مولانا مودودیؒ کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا ...... ! ان کی خفگی کی یہ رو رکی نہیں تھوڑے بہت وقفہ سے چلتی ہی رہی۔

مسٹر غلام محمد سابق گورنر جنرل پاکستان کی دعوت پر مولانا دریا بادی پاکستان تشریف لائے، بیچ ملگزری کی ایک دعوت میں ان سے سرسری ملاقات ہوئی۔ دریا باد جا کر انہوں نے سفرِ پاکستان کے حالات "صدق جدید" میں قلمبند فرمائے اور لکھا کہ ..... ماہر القادری جو کبھی اپنے مہربان تھے اُن کے قریب ایک دعوت میں منتظمین دستگو لے مجھے زیادہ دیر تک کھڑا ہی نہیں رہنے دیا ..... ! "قطع تعلق" اور "ختم روابط و مراسم" کا آغاز مولانا دریا بادی کی طرف سے ہوا تھا، میں کس توقع پر گورنر جنرل ہاؤس میں جا کر ان سے ملنے کی کوشش کرتا، اگرچہ دل بہت کچھ چاہتا تھا، مسٹر غلام محمد سے بھی حیدرآباد دکن کی ملاقات اور شناسائی تھی مگر مولانا کے مزاج کی افتاد سے ہر طرح کے سلوک اور بے نیازی کا اندیشہ تھا۔

جب پاکستان اور ہندوستان کے مابین ڈاک کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو "صدق جدید" کی محرومی بہت کچھ کھلنے لگی، کبھی کبھار کویت وغیرہ سے کسی صاحب کے پاس "صدق جدید" کے پرچے آجاتے تو انہیں دیکھ کر اور پڑھ کر روحانی مسرت ہوتی۔

اس بات کو تقریباً چار برس ہوئے ہیں جوشؔ ملیح آبادی کی خود نوشت سوانح عمری "یادوں کی برات" پر "فاران" میں خاصا طویل تبصرہ شائع ہوا، اس کے بعد میرے پاس لیبیا سے مولانا ریحان ندوی کا خط آیا کہ میں دریا باد گیا تھا، مولانا عبدالماجد صاحب سے آپ کے تبصرے کا ذکر آیا۔ وہ اس تبصرے کو پڑھنا چاہتے ہیں! "فاران" کا وہ شمارہ مولانا دریا بادی مرحوم کو جب ملا تو انہوں نے اپنے کسی عزیز کو کویت خط لکھا" ایک صاحب اس خط کی نقل لے کر میرے پاس آئے جس میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا کہ مدیر "فاران" کو جانتے ہو یہ وہی ماہر القادری ہیں جو اپنے کرم فرما تھے مگر ایک مضمون انہوں نے ایسا لکھ دیا جس کی وجہ سے اُن سے تعلقات ختم ہو گئے مگر اب برسوں کے بعد "یادوں کی برات" پر اُن کا ایک ایسا تبصرہ آیا ہے کہ جس سے اُن کے سات خون معاف ہو جاتے ہیں، بارک اللہ جزاک اللہ ......!" پھر مولانا دریا بادی نے "صدق جدید" میں مسلسل ڈھائی مہینہ تک راقم الحروف کے اس تبصرے کو شائع فرمایا اور اس کے شروع میں تعریف آمیز نوٹ تحریر کیا جس میں لکھا کہ یہ ایک ایسا سنجیدہ اور متوازن تبصرہ ہے جس پر کسی نقد و اضافہ کی ضرورت نہیں ہے!

مولانا عبدالماجد دریا بادی ایک خوشحال اور شریف و معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے اُس زمانے میں بی اے پاس کیا جب ناموں کے ساتھ بی۔اے لکھا جانا باعثِ فخر و مباہات تھا ـــــ مولانا محمد علی (بی۔اے آکسن) مولانا ظفر علی خاں (بی۔اے) مولوی عزیز مرزا (بی۔اے) بابائے اردو مولوی عبدالحق (بی۔اے علیگ) اسی طرح عبدالماجد دریا بادی کے نام کے ساتھ بھی اُن کے ابتدائی مضامین اور تصانیف کے ساتھ "بی۔اے" ضرور لکھا جاتا تھا! مولانا نے فلسفہ پر کئی کتابیں لکھیں جس کی بناء پر "عبدالماجد دریا بادی فلسفی" کے نام سے ان کی شہرت ہوئی۔ فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی اور شغف نے اُن کو مذہب سے بیگانہ کر دیا! ان کی دہریت کے زمانہ کی تحریروں

میں مذہب پر طنز و تعریض ملتی ہے، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ دہریت کی دھند چھٹنی شروع ہوئی۔ مذہبیت سے جو بیگانگی اور وحشت تھی اس میں ٹھہراؤ پیدا ہوا، دہریت کی شدت میں کمی آئی۔ اللہ اور رسولؐ کے ذکر و فکر سے اُن کے دل کو سکون ملنے لگا۔ خلافت کی تحریک نے اس پر سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اب وہ پکے مسلمان بن گئے اور نہ صرف مسلمان بلکہ اسلام کے پُرجوش مبلغ! دہریت، مذہب بیگانگی اور خدا ناشناسی کے سخت ناقد، مغربی تہذیب کے سب سے بڑے طناز رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت نے دینی رنگ کو پختہ تر کر دیا! پھر وہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے مگر مولانا مدنیؒ نے عبدالماجد دریابادی کی تربیت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سپرد کر دی! پھر تو اُن کی زندگی اللہ والوں کی زندگی بن کر رہ گئی۔ ورد و ظائف، ماثورہ دعاؤں کی کثرت پنج وقتہ نماز کے علاوہ تہجد و اشراق سے شغف! زبان و قلم سے دین ہی کی تبلیغ، اللہ، رسول اور دین و اخلاق ہی کا ذکر! اُن کی سیرت نے "صبغۃ اللہ" کے سوا کسی اور رنگ کو قبول ہی نہیں کیا۔

نیاز فتحپوری نے "نگار" کو مذہب کی مخالفت کا آرگن بنا دیا، فقہ و حدیث پر جرح و تنقید، جنت و دوزخ کا مذاق، اسلام کے بارے میں طرح طرح کی شگوفہ کاریاں اس ظالم نے یہ تک لکھ دیا کہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے نیاز فتحپوری کے ہفوات پر خوب کس کر تنقیدیں کیں اور بات "ترکِ تعلقات" (بائیکاٹ) تک جا پہنچی، مسلمانوں کے دباؤ کی تاب نہ کر نیاز فتحپوری نے توبہ نامہ شائع کیا جس میں اس بات کا شرعی قسم کے ساتھ اقرار تھا کہ اب "نگار" میں مذہب کی تضحیک نہیں کی جائے گی۔ اور دل آزارانہ مضامین نہیں آئیں گے، نیاز صاحب کچھ دنوں اپنے عہد پر قائم رہے۔ مگر پھر انہوں نے توبہ توڑ دی۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی سعید الفطرت اور قابلِ اعتماد دینی عالم تھے۔ ندوہ کے ممتاز استاد! اُن کی وفات کے بعد اُن کی بیوہ سے مولانا دریابادی نے عقدِ ثانی کیا مگر آپس میں نباہ نہ ہو سکا، علیحدگی کی نوبت آ گئی۔ نیاز فتحپوری نے اس موقع کو غنیمت جان کر مولانا عبدالماجد دریابادی کے خلاف مہم چلائی اور "عبدالماجد دریابادی بنے تھے"

کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا، مگر نیاز صاحب کا یہ حربہ کارگر نہیں ہوا اُن کی مخالفانہ مہم ٹھپ ہو کر رہ گئی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اردو زبان وادب کے گنے چنے بلند پایہ اہل قلم میں ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے تھے۔ طنز نگاری کے بادشاہ زبان و روزمرہ کے مستند و معتبر استاد! فلسفی، صوفی،[1] مبلغ اخلاق، مفسر، نقاد، طناز! ان کی شخصیت گوناگوں کمالات کی جامع تھی۔ اشعار اور خاص طور سے مصرعوں کا اس قدر موزوں اور برجستہ استعمال اور کسی اہل قلم کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا، مغربی تمدن و تہذیب پر طنز ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ "سچ" اور "صدق جدید" میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے شذرے دراصل زبان وادب کے شہ پارے ہیں۔ مغرب زدوں کی ایسی چٹکیاں لیتے کہ یہ گروہ سی سی کرتا اور تلملاتا ہوا رہ جاتا۔ راقم الحروف اس حقیقت کے اعتراف میں جھجک نہیں بلکہ فخر محسوس کرتا ہے کہ مولانا دریابادی کی تحریروں اور کتابوں سے میں نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد مرحوم نے ہندو راج پر نقد و تبصرہ کا مجاہدانہ فرض انجام دیا، اور اس وقت جب بھارت کے چاروں کھونٹ جن سنگھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے اور مسلمانوں پر آشوب قیامت طاری تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان مظالم کا پیرایہ اور عنوان بدل بدل کر نشاندہی کی۔ یہ سب کچھ ان کی قوت ایمانی کا کرشمہ تھا۔ جو بات لکھتے دلائل و براہین بلکہ بعض اوقات اعداد و شمار کی تفصیل کے ساتھ لکھتے۔ مثلاً انہوں نے "صدق جدید" میں مسلمان طلبہ کی یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی کے اعداد و شمار دیے کہ سب کے سب کئی کئی مضامین میں امتیاز کے ساتھ اعلیٰ ترین ڈویژن میں کامیاب! مگر ملازمتوں کے لیے جو امتحانات اور انٹرویو ہوتے ان میں ناکامیاب! ان واقعات پر مولانا طنز فرماتے کہ یہ کیسے مسلمان

---

[1] مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی "فیہ مافیہ" جو علامہ شبلی کے زمانہ تک ناپید تھی اُس کا نسخہ ملنے کے بعد مولانا دریابادی نے اسے ایڈٹ کیا اور دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا۔ میرے کرم فرما دوست مولوی محمد اختر سہارنپوری جن کی عمر کا زیادہ حصہ حیدرآباد دکن میں گزرا، وسیع المطالعہ اور دقیق النظر بزرگ تھے انہوں نے "فیہ مافیہ" کے ایک ایک لفظ کو پڑھ کر اس کی اغلاط کی تصحیح کی تھی۔ کاش! وہ اپنے تصحیح شدہ نسخہ کو اعظم گڑھ یا دریاباد بھیج دیتے۔

طلبا ہیں جو یونیورسٹیوں کے امتحانات میں تو امتیاز اور پوزیشن حاصل کرتے ہیں لیکن ملازمتوں کے لیے مقابلہ کے امتحانات اور انٹرویو میں بے چاروں کی قابلیت اور ذہانت ایکا ایکی سلب ہو جاتی ہے اور ملازمت کے کامیاب امیدواروں کی لسٹ میں کسی مسلمان طالب علم کا نام شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ حکومتِ ہند کی پالیسی اور طریق کار پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی طنز و تنقید پڑھ کر گووند بلبھ پنتھ وزیر اعلیٰ اتر پردیش (U.P) نے انہیں اپنے یہاں بلایا تھا۔ یہ مولانا ہی کا دل گردہ تھا کہ وزیر اعلیٰ سے ملاقات و گفتگو کی تفصیل "صدق جدید" میں لفظاً لفظاً شائع فرمادی۔ مسٹر سمپورنانند جب راجستھان میں گورنر تھے تو مولانا عبدالماجد دریابادی کو جے پور بلایا اور گورنر ہاؤس میں چند دن مہمان رکھا۔ مولانا کی صداقت علم و فضل، صاف ستھری زندگی، قلم کی قوت اور حق گوئی کا ان کے دشمن بھی لوہا مانتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "علم النفس" پر جب کتاب لکھی اور (Pain and Pleasure) کا ترجمہ "حظ و کرب" کیا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے اس پر گرفت فرمائی اور لکھا کہ نفسیات کی ان انگریزی اصطلاحوں کا صحیح اور جامع ترجمہ "لذت و الم" ہے۔ پھر اس موضوع پر طرفین کی جانب سے خوب معرکہ آرائی ہوئی۔ یہ اونچے درجہ کی لسانی بحث و گفتگو تھی، مولانا دریابادی نے اپنی مدافعت میں "غیاث اللغات" کا حوالہ دے دیا۔ اس کا مولانا آزاد نے خوب مذاق اڑایا! اس بحث و نزاع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بات بالا رہی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشاہیر علما اور بلند و بالا شخصیتوں سے ذاتی تعلقات تھے۔ سید صاحب کے برسوں کے خطوط مولانا دریابادی نے سینت سینت کر رکھے اور پھر انہیں "مکاتیب سلیمانی" کے نام سے چھپوایا۔ ان میں ایک خط مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہے جو انہوں نے سید سلیمان ندویؒ مرحوم کو لکھا تھا اور اس میں اپنی شراب نوشی کا اعتراف کیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ یہ خط دارالمصنفین اعظم گڑھ کی لائبریری میں محفوظ تھا اور سید صاحب اس کی اشاعت مناسب نہیں سمجھتے تھے مگر مولانا عبدالماجد دریابادی نے "مکاتیب سلیمانی" میں مولانا آزاد کے اس خط کو

شامل کر دیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے مولانا دریابادی کے مخلصانہ تعلقات اور دوستانہ مراسم تھے۔ مگر جب ڈاکٹر صاحب حکومتِ ہند کے صدر بنے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شنکر آچاریہ جی کو پریذیڈنٹ ہاؤس میں بلوا کر اُن کے چرن چھوئے اور پھر اردو زبان اور بھارت میں مسلمانوں کی جو درگت تھی اُس کے بارے میں چپ سادھ لی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی اس روش پر مولانا دریابادی نے شدید تنقید کی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے کتابوں پر جو پیش لفظ اور دیباچے اور تعارف لکھے ہیں اُن کو جمع کر دیا جائے تو زبان و ادب کی ایک بلند پایہ کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ مثنوی "زہرِ عشق" بدنام مثنوی ہے مگر مولانا عبدالماجد کے شگفتہ قلم نے اس پر دیباچہ لکھ کر اخلاقی پہلو پیدا کیے۔ اور اس زہر میں بھی امرت کے کچھ ذرّے دکھا دیے۔

"محمد علی کی ڈائری" اور "نقوش و تاثرات" اُن کی معرکہ آرا کتابیں ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علیؒ تزکیۂ نفس میں اُن کے مُربّی تھے مگر قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر میں جگہ جگہ مولانا تھانویؒ کی عالی ظرفی اور حق پسندی دیکھیے کہ انہوں نے اپنے مسترشد کے بہت سے مشوروں کو قبول فرمالیا۔ مولانا محمد علی کی ذات اور شخصیت سے مولانا دریابادی کو عشق تھا اُن کا جب کہیں ذکر چھڑتا تو مولانا دریابادی پر

؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

کا عالم طاری ہو جاتا۔

حکومتِ پاکستان نے قادیانیوں کی تکفیر کا جو منصفانہ فیصلہ کیا جس کی تمام دنیا کے مسلمانوں نے توصیف و ستائش کی جیسے ان کے دل کی تمنا بر آئی ——— مگر اس کا شدید افسوس ہے کہ مولانا دریابادی نے اس فیصلہ پر اپنے قلم سے چھینٹیں اڑائیں۔ ان کی اس روش کو مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے پسند نہیں کیا! اللہ تعالیٰ مولانا کو سکر د ذہول کا الاؤنس دے کر ان کی اس شدید کوتاہی سے درگزر فرمائے۔

"تفسیرِ ماجدی" مولانا عبدالماجد دریابادی کا عظیم دینی کارنامہ ہے، اپنی اس

تفسیر میں حضرت مولانا تھانوی کی "بیان القرآن" سے مولانا دریابادی نے خاصا استفادہ کیا ہے مگر ان کی اپنی فکر، تحقیق و ریاضت قابلِ تحسین ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ "نورٌ علیٰ نور" ۔

سات برس ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کو بڑھاپے میں اپنی بیگم صاحبہ کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا "بوڑھی محبوبہ" کے عنوان سے انہوں نے غم انگیز تاثرات کا "صدقِ جدید" میں اظہار کیا۔ دو ڈھائی برس ہوئے ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے نڈھال کردیا۔ علالت کے زمانے میں بھی نماز باجماعت ادا کرتے۔ علاج معالجہ سے افاقہ بھی ہوگیا مگر یہ افاقہ "افاقۃ الموت" ثابت ہوا۔ عمر کی تراسی منزلیں طے کرنے کے بعد آخر وہ وقت آہی گیا جو ہر متنفس اور جاندار کے لیے مقدر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے علمی و ادبی اور دینی حلقوں میں ان کی رحلت کی خبر خاموش کہرام بن کر سنی گئی۔ اپنے انداز اور طرز کے وہ منفرد ادیب تھے۔ اس صنف میں ان کا کوئی حریف نہ تھا —— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۷۷ء)

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع، نظام دکن

متحدہ ہندوستان میں ریاست حیدر آباد دکن حکومت مغلیہ کی یادگار اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا مظہر سمجھی جاتی تھی، اس لیے متحدہ ہند کے مسلمانوں کے لیے حیدرآباد دکن کے نام اور نظام کی شخصیت میں غیر معمولی کشش تھی، راقم الحروف نے بھی بچپن ہی سے حیدرآباد دکن اور نظام کا نام سنا تھا اور بحدِ شعور کو پہنچنے تک کوفہ و بغداد اور کابل و بخارا کے بعد حیدرآباد دکن کی شہرت و عظمت کا نقش دل و دماغ پر ثبت ہو چکا تھا۔

۱۹۲۸ء میں نواب میر عثمان علی خاں وائسرائے ہند سے ملنے کے لیے دلی تشریف لائے تو شمالی ہند میں دھوم مچ گئی۔ امیر حبیب اللہ خاں والیٔ کابل کے شاہانہ خیر مقدم کے بعد یہ دوسرا استقبال تھا جس میں مسلمانانِ ہند نے اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے۔

نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی تشریف آوری سے ہفتوں پہلے دلی میں ان کی آمد آمد کا ہنگامہ برپا تھا، اخبارات میں جلی سرخیوں اور نمایاں عنوانات کے ساتھ سفر شاہانہ کے انتظامات کی خبریں شائع ہوتی رہتیں۔ نئی دلی میں نظام پیلس کے اردگرد تماشائیوں کا ہجوم رہتا، قصرِ شاہی کو آراستہ کیا جا رہا تھا، خیموں، جھنڈیوں اور بیرقوں کے ہجوم میں گملوں کی قطاریں اور بہار دے رہی تھیں، حیدرآباد دکن سے مختلف سرکاری محکموں کے عہدیدار روزانہ دلی آ رہے تھے۔

اتفاق یا شاید حسنِ اتفاق تھا کہ میں اُن دنوں دلی میں مقیم تھا اور وقتی طور پر گزارے کے لیے صدیقیہ ہائی اسکول (پھاٹک حبش خاں) میں ملازمت کر لی تھی۔ طلبا جب راقم الحروف کو "ماسٹر صاحب" کہہ کر پکارتے تھے، تو میں اپنے اندر ایک عجیب قسم کی توحش انگیز کیفیت محسوس کرتا تھا!

مولانا عبدالقدیر[1] بدایونی مرحوم حضور نظام کے استقبال کے لیے بدایوں سے دلی آئے اور کشمیری بازار سے کچھ دور پرانے سکرٹریٹ کے علاقہ میں نواب معظم علی خاں کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، نواب صاحب موصوف بھوپال کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے والد کا نام نواب یٰسین علی خاں تھا، مولانا کی قیام گاہ پر ہی یہ بات سُننے میں آئی کہ اگر بھوپال کے نوابی خانوادے میں کوئی مرد تاج و تخت کا وارث ہوتا،

---

[1] بدایوں کے سب سے زیادہ مشہور و معزز عثمانی خانوادے کی قابلِ ذکر شخصیت! مولانا عبدالقدیر کے دادا مولانا فضل رسول بدایونی علمبرداران توحید و سنت پر "وہابیت" کے نام سے تنقید کرنے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ "بریلوی" مسلک تو مولانا احمد رضا بریلوی کی نسبت سے شہرت پا گیا ہے۔ اس مسلک کا اصل مرکز تو بدایوں تھا، مولانا احمد رضا خاں صاحب نے مولانا عبدالقادر بدایونی محبّ رسولؐ سے علمی استفادہ کیا، اپنے اُستاد کی مدح میں اُن کا قصیدہ اُن کے نعتیہ دیوان (حدائقِ بخشش) میں موجود ہے! پھر ایک ایسا دور بھی آیا کہ جمعہ کی اذانِ ثانی کے مسئلہ میں بدایوں اور بریلی کے دینی مرکزوں میں اتحادِ عقائد کے باوجود شدید اختلاف پیدا ہو گیا، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا قلم طنز و تعریض میں شمشیرِ برہنہ تھا، بات تفسیق و تضلیل تک پہنچی، علماء بدایوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، یہاں تک کہ مقدمہ بازی کی نوبت آگئی، نواب حامد علی خاں والئ رام پور کی حکمتِ عملی نے اس قضیۂ نامرضیہ کو جیسے تیسے ختم کرا دیا۔

مولانا عبدالقدیر بدایونی نے اپنے علمی و دینی گھرانے ہی میں دینی علوم کی تحصیل کی، پھر وہ ٹونک تشریف لے گئے اور وہاں مولانا سید برکات احمد مرحوم سے جو خیر آبادی فلسفہ کے سب سے بڑے ستون تھے، منطق اور فلسفہ پڑھا، مولانا عبدالقدیر بدایونی کو اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ مولانا عبدالمقتدر صاحب لاولد تھے، اس لیے اُن کی وفات کے بعد خانوادۂ قادریہ کے مولانا موصوف ہی سجادہ نشین قرار پائے۔

تحریکِ خلافت کے زمانہ کے شہرۂ آفاق مقرر مولانا عبدالماجد بدایونی بھی اسی خاندان کے معزز فرد تھے، مگر مولانا عبدالقدیر بدایونی اور مولانا ماجد میاں کے درمیان آخر وقت تک ناچاقی اور چشمک ہی رہی، لیکن اس اختلاف کے باوجود جب بھی دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تو ماجد میاں مرحوم اُن کے قدم چھونے کے لیے ہاتھ بڑھاتے اور مولانا عبدالقدیر محبت و شفقت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۸۶ پر)

تو نواب یسین علی خاں یا اُن کے والد ہوتے! ان دنوں دلی میں کرکٹ کا میچ ہو رہا تھا نواب معظم علی خاں اُس کے امپائر کے فرائض انجام دے رہے تھے، یہ خاندان مولانا عبدالقدیر بدایونی کے خانوادے سے بیعت و عقیدت کا تعلق رکھتا تھا! مہمانوں کی ضیافت میں نوابی اور امارت کی شان جھلکتی تھی!

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے ساتھ اُن کا ہاتھ تھام لیتے۔

ضلع بدایوں میں گنور ایک مشہور قصبہ ہے، ایک زمانہ میں وہاں کے مسلمان زمیندار تمام علاقہ پر چھائے ہوئے تھے بگر پھر شامت اعمال رنگ لائی اور اُن کے حالات خاصے ابتر ہو گئے۔ اب سے پچاس سال قبل مشہور نعت گو شاعر مولانا ضیاء القادری بدایونی تحصیل گنور میں رجسٹرار قانون گو تھے، اُن کے اہتمام سے گنور میں سال کے سال بڑے دھوم کی رجبی ہوتی اور بدایونی اور بریلوی عقائد کے مشہور و معروف علماء اس جلسہ میں شریک ہوتے۔

اب سے کم و بیش سو سال پہلے گنور میں کوئی صاحب سخاوت حسین گزرے ہیں، وہ اپنی تحقیق کی بنا پر اہل حدیث ہو گئے انہی کے اثر، صحبت اور تبلیغ سے گنور میں مسلک اہل حدیث کو فروغ میسر آیا اور متعدد گھرانوں میں یہ مسلک مقبول اور رائج ہو گیا یہاں تک کہ اہل حدیث کی ایک مسجد بھی بن گئی! اس قصبہ میں رجبی کے جو جلسے ہوتے تھے، اُن میں علماء اور واعظین کا اکثر و بیشتر موضوع "ردِ وہابیت" ہوتا تھا۔ میری عمر بہت سے بہت بارہ تیرہ سال کی ہوگی، مجھے اب تک یاد ہے۔ مولانا فاخر شاہ الٰہ آبادی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ:۔

"وہابی کہتے ہیں، اولیاء اللہ اولاد نہیں دے سکتے، میں دعوٰی کرتا ہوں کہ تم اپنی عورتوں کو ہمارے یہاں لاؤ ہم اولاد دیں گے۔"

اس قسم کے سطحی لطیفوں اور بازاری قسم کی چوٹوں سے اہل بدعت خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے وہ ان باتوں کو اپنے مسلک کی فتح اور ردِ وہابیت کی شکست سمجھتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے لوگ گنور کے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے، مولانا عبدالقدیر بدایونی کی تقریروں سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور یہی تاثر مولانا موصوف کی عقیدت کی بنیاد بن گیا پھر انہیں کسیر (ضلع بلند شہر) میں بلایا گیا، مولانا موصوف کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی مگر چہرے سے وجاہت اور بزرگی کے آثار نمایاں تھے، گورا رنگ، طباق سا چہرہ، موزوں ناک نقشہ،

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۸۷ پر)

دلی میں ہر طرف نظام دکن ہی کی آمد کے چرچے تھے، ہزاروں مسلمان باہر سے اُن کے دیکھنے کے لیے آگئے تھے، مولانا عبدالقدیر بدایونی بھی اُن کے خیر مقدم کے لیے نئی دلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، میں اُن کے ہمراہ تھا، پلیٹ فارم پر کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی، استقبال کرنے والے ریلوے اسٹیشن سے باہر کھڑے تھے، اتنے میں شاہی اسپیشل ٹرین آکر رُکی اور اعزاز و خیر مقدم کی توپیں سر ہونے لگیں، رائے سینا کے ریلوے اسٹیشن سے لے کر نظام پیلس تک تماشائیوں کے ٹھٹ لگے تھے، نظام دکن نے اپنی کار سے مولانا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ۔ اُن کو دیکھ کر دل ذنگاہ کشش و جاذبیت محسوس کرتے! وعظ کہنے کا انداز بھی خاصا دل نشین تھا۔ اُن کا ایک مخصوص وعظ (مال، جمال اور کمال) بیسوں بار کی تکرار کے باوجود بھلا لگتا، شروع شروع میں ہمارے گاؤں کے تین چار آدمی اُن کے مرید ہوئے اور پھر جو سلسلہ چلا ہے تو گاؤں کی ایک چوتھائی مسلمان آبادی اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئی!

مولانا عبدالقدیر بدایونی، کسیر کلاں میں پہلی بار جب آئے تو گاؤں کی معروف شخصیت فیاض علی صاحب (جو مولانا کے لقب سے مشہور ہیں اور اُن کا گھرانا "نوابوں" کا خاندان کہلاتا ہے) کے یہاں قیام فرمایا، مولانا بدایونی کے اصل میں لانے والے یہی مولانا فیاض تھے، جلسۂ میلاد کا اشتہار راقم الحروف کے والد مرحوم نے لکھا۔ اس نواح میں یہ شاید پہلا اشتہار تھا جو عوام کی اطلاع کے لیے مسجدوں اور بعض دوسرے نمایاں مقامات پر چسپاں کیا گیا تھا۔ کسیر کلاں سے تین میل کی دُوری پر ڈبائی مشہور قصبہ ہے، وہاں کی مسجد میں جب یہ اشتہار لگایا جا رہا تھا، تو ایک صاحب نے قدرے طنز و مزاح کے انداز میں پوچھا:۔

"ارے کسیر والو! تم میلاد شریف میں کیا تقسیم کرو گے۔"

اشتہار لگانے والے نے جواب دیا "وہ تو اس اشتہار میں لکھا ہوا ہے" ڈبائی کے اس شخص نے اشتہار پڑھتے ہوئے جھنجلا کر کہا اس میں تو کہیں نہیں لکھا کہ جلسہ میں کیا تبرک تقسیم ہوگا۔ ہمارے گاؤں والے نے جواب دیا اس اشتہار کا یہ شعر کیا آپ نے نہیں پڑھا:

تقسیم آج ہوگی ثواب عظیم کی ۔۔۔ محفل ہے ذکرِ پاک رسولِ کریم کی

دیہاتی کی اس ذہانت اور حاضر جوابی پر وہ قصباتی جھینپ کر رہ گیا۔

عبدالقدیر بدایونی کو دیکھا اور ان کے سلام کرنے پر انگلی کا اشارہ کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ۔ظرافت میں ایک مصرع بھی نہیں کہا، یہ تو فارسی والوں نے "ظریف" کو خوش طبع اور اردو والوں نے ہنسی دل لگی کی باتیں کرنے والا بنا دیا، عربی میں تو ظریف زیرک و دانا کو کہتے ہیں! میں اُن دنوں میلاد پڑھا کرتا تھا، والد مرحوم نے میری خاطر پورا میلاد مرتب کیا، جو مولودِ شہیدی وغیرہ جیسی کتابوں سے مستفاد و ماخوذ تھا۔ نعتیہ نظمیں اور غزلیں سب کی سب انہی کی تھیں!

والد مرحوم گاؤں کی مروجہ رسموں — میلاد کے قیام، فاتحہ، سوم و چہلم — میں حصہ لیتے تھے، مگر دوسرے مسلمانوں کی طرح علماء دیوبند سے بدظن نہ تھے بلکہ اُن کا احترام کرتے تھے، پوری بستی میں صرف ہمارے گھر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا "بہشتی زیور" تھا، اسی نسبت اور ربط و تعلق کے سبب گاؤں کے مسلمانوں کی زبان سے اُن پر "دیوبندیت" کی طنز سننے میں آتی تھی!

میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، اُن دنوں مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم ہمارے گاؤں میں آئے ہوئے تھے، گاؤں سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر مسلمانوں کی چھوٹی سی بستی گودھنہ ہے وہاں ایک بزرگ کے عرس میں مولانا مرحوم کا وعظ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ ہمارے محلہ کے چند لوگ مولانا کے مرید ہو رہے ہیں، اُن کی دیکھا دیکھی میرے دل میں بھی یہ شوق پیدا ہوا، میں نے اپنی پھوپھی سے جنہوں نے مجھے بیٹے کی طرح پالا تھا نو پیسے نذر کے لیے اور ان پیسوں کے بتاشے دکان سے خرید کر محفلِ وعظ میں پہنچا اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اُن کا مرید بن گیا۔ میں اس کمسنی میں شعر تو موزوں کر لیا کرتا تھا مگر جلسوں اور میلادوں میں دوسروں کی غزلیں لحن کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، اس محفل میں مرید ہونے کے بعد جو غزل میں نے سنائی اس کے یہ دو شعر اب تک یاد ہیں:

جانے کیا ساقی کی نظروں نے اشارا کر دیا
نذرِ ساغر آج میں نے زہد و تقویٰ کر دیا

کل تلک تھا میکدے میں خشک ساحل کی طرح
آج ساقی نے مجھے قطرے سے دریا کر دیا

موقع کی مناسبت سے ان شعروں نے اُس محفل میں عجیب سماں پیدا کر دیا۔

مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کو سب لوگ "حضرت صاحب" کہتے تھے۔ پاسِ ادب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۰ پر)

دوسرے دن مولانا نے مجھے خط دے کر نظام پیلس بھیجا، یہ خط نواب اظہر جنگ بہادر مرحوم کے نام تھا، جو ان دنوں عرض بیگی کی خدمت انجام دے رہے تھے، عربی میں اس عہدے کا نام "مدیر التشریفات" ہے، اردو میں شاہی پیشکار کہہ سکتے ہیں۔ دروازوں پر باوردی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) - اور فرطِ عقیدت کے سبب اُن کا نام کوئی نہ لیتا تھا، مرید اُن کا بدل دیتے، اُن کی رکابی میں بچے ہوئے کھانے کو "تبرک" سمجھا جاتا، گھر گھر دعوتیں ہوتیں، حسبِ حیثیت و استطاعت نذرانے دیے جاتے، گاؤں کے مسلمان کھیتی باڑی کرتے تھے، دو چار کسان جن کے پاس سو بیگھہ سے زیادہ زمین تھی وہ تو البتہ خاصے خوشحال تھے، باقی لوگوں کی بس گزر بسر ہو جاتی تھی، اس لیے ایک پھیرے میں "حضرت صاحب" کو مریدوں سے چالیس پچاس روپیہ سے زیادہ کی یافت نہ ہوتی، اُن کے فدائی عقیدت مند اور جاں نثار مرید راقم الحروف کے عزیز حافظ اللہ دیا، جن کا نام مولانا مرحوم نے بدل کر "عطاء الرحمٰن" رکھ دیا تھا۔ مولانا کی سب سے زیادہ پذیرائی اور خاطر و مدارات کرتے اُنہی کے مردانہ مکان میں جو "کمرہ" کہلاتا تھا، مولانا قیام فرماتے۔

۱۹۲۴ء میں مولانا مرحوم زیارتِ حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوئے، ہمارے گاؤں کے پانچ چھ آدمی اور بستی کے چند عقیدت مند تاجر اس سفر میں اُن کے ہمراہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان ابنِ سعود نے حجاز پر حملہ کر دیا اور شریف حسین کی فوجوں کو ہر محاذ پر شکست ہو رہی تھی، مولانا عقیدے کے اعتبار سے نجدیوں کے انتہائی مخالف تھے، مکہ مکرمہ میں ہز مجسٹی شریف حسین سے اُن کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ مولانا فرماتے تھے کہ ایک دو بار شریف حسین نے دوربین سے اُنہیں کسی جنگی محاذ کا منظر بھی دکھایا تھا، سفرِ حجاز سے واپس آکر وہ ہندوستان کے تنہا عالم تھے، جنھوں نے شریف حسین کی کھل کر تائید کی، پھر انہوں نے اپنے روابط و تعلقات اور شخصیت سے علمائے فرنگی محل کو بھی بڑی حد تک متاثر کر دیا، ان علماء کے اتحاد و تائید کی قدرِ مشترک "وہابیت اور نجدیت" سے ان کا اختلاف تھا، جنت البقیع کی قبروں اور گنبدوں کی شکست و ریخت کے چرچے اور تذکروں نے متحدہ ہندوستان کے عوام ...... (مسلمانوں) کو نجدیوں کی طرف سے بہت کچھ بدظن کر دیا تھا۔

بہرے دار سنگین لیے کھڑے تھے، چھوٹے بڑے ملازمین اور عہدیداروں کا قریب قریب ایک ہی سا پہناوا تھا، شیروانی، سر پر دستار اور کمر میں پیٹی بندھی ہوئی، حکومت آصفی کا پیلے رنگ کا لیٹر بکس بھی پیلس کے گیٹ کے قریب نصب تھا! قصرِ شاہی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)۔ اجتماع میں نظر نہیں آیا (بمبئی کے سیٹھ صالح بڑودہ والا اس کانفرنس کے صدر تھے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے بھی اپنی شرکت سے اس جلسہ کی زینت اور عزت کو دوبالا کر دیا، راقم الحروف نے بہت قریب سے دیکھا کہ سر علی محمد خاں مہاراجہ محمود آباد نے کھڑے ہو کر کافی کی پیالی مولانا محمد علی کی خدمت میں پیش کی، حجاز کانفرنس کی پوری کارروائی تو حافظہ میں محفوظ نہیں رہی، اتنا یاد ہے کہ "الحجاز للحجازئین" کی قرارداد علمائے کرام سے منظور ہوئی۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی اس کانفرنس میں سب سے زیادہ فعال، نمایاں اور پیش پیش نظر آتے تھے، مولانا محمد علی مرحوم نے بھی شاید کوئی قرارداد پیش کرنی چاہی تھی، وہ پیش نہ ہو سکی اس بات پر مولانا شوکت علی خاصے کبیدہ نظر آتے تھے، اس کانفرنس میں صفی لکھنوی نے بڑے معرکہ کی نظم پڑھی، ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

اُٹھتی ہے گرد مرقدِ خیر الانامؐ سے
اے تیغِ انتقام نکل آ نیام سے

سلطان ابن سعود کی فوجیں جب سوادِ مکہ تک آگئیں، تو شریف حسین صاحب شاہی خزانہ لے کر جدہ چلے آئے، اور چند دن کے بعد اپنے بڑے بیٹے علی کو اپنا قائم مقام مقرر فرما کر، وہاں سے پانی کے جہاز کے ذریعہ قبرص تشریف لے گئے، خلافتِ ترکی سے غداری اپنا رنگ لائی، اور شریف حسین کا حسرتناک انجام تاریخ کے صفحات پر عبرت کے نشان چھوڑ گیا۔

جلالۃ الملک علی چند مہینہ جدہ میں ٹکے رہے، مگر ایک ملک میں دو دو بادشاہ کیسے رہ سکتے تھے، آخر انہیں بھی جدہ چھوڑنا پڑا اور اپنے چھوٹے بھائی فیصل شاہ عراق کے پاس پناہ لینی پڑی، جن دنوں وہ جدہ میں اپنے والد بزرگوار شریف حسین کے جانشین کی حیثیت سے اقامت گزیں تھے اس زمانہ میں انہوں نے طاہر الدباغ کی قیادت میں ایک وفد ہندوستان بھیجا، ہندوستان کے علماء کا ایک وفد بھی جدہ پہنچا۔ اس وفد کے ارکان میں

کی رونق اور بہار اپنے شباب پر تھی، نوکروں کی بھاگ دوڑ نے ماحول کو اور زیادہ پُر رعب بنا دیا تھا۔ نواب اظہر جنگ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے مولانا کا خط پڑھ کر مختصر سا جواب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۔ میں شریک تھے۔

مولانا عبدالقدیر کے بھانجے مولانا خواجہ غلام نظام الدین جو اپنے ماموں کے انتہائی مخلص ہمدرد اور جان نثار بہی خواہ تھے، انہوں نے ہمارے گاؤں سے عربی کا ایک پوسٹر شریف علی کو جدہ بھجوایا، جس میں ہندوستانی علماء کے اس وفد پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا (عبارت کے شروع کے الفاظ یہ تھے، "لا نعتمدُ علیٰ ھذا الوفد.....) جب یہ وفد جدہ پہنچ کر شریف علی سے ملا تو انہوں نے وہی پوسٹر ارکانِ وفد کے ہاتھ میں تھما دیا اور علماء سے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان تو آپ کی نمائندگی پر اعتماد ہی نہیں کرتے! یہ بالکل خلافِ توقع صورتِ حال تھی جس سے ان علماء کو دوچار ہونا پڑا۔

۱۹۲۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے جو امتحان میں نے دیا اُس کا تعلیمی بورڈ نے نام (High School Examination our S.L.C Line) رکھا، ریاضی کے علاوہ تمام دوسرے مضامین میں میری حیثیت امتیازی تھی، فارسی تو گھر ہی پر اتنی پڑھ لی تھی، جو میٹرک تک کام آئی، اسلامیں پڑھنے والوں سے بھی دو چار قدم آگے، تاریخ میری خاص دلچسپی کی چیز تھی، مگر ریاضی سے میں ہمیشہ کتراتا اور کنی کاٹتا رہتا، اساتذہ ریاضی کا کام (Home Work) دیتے تو دوسرے طلباء کی کاپیوں سے سوالات کے جوابات نقل کر لیتا، اس صورت میں کامیابی کی کیا سبیل اور توقع تھی۔ اس ناکامی کے چند مہینے بعد والد کی وفات کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا، ہر باپ اپنی اولاد سے پیار کرتا ہے مگر والدِ مرحوم کی شفقت و محبت کی کوئی حد و نہایت نہ تھی ؎

دوسروں کے سامنے میری ذہانت کا بیاں
اور میرے سامنے میری شکایت ہائے ہائے!

میاں (والد مرحوم) کے انتقال کے بعد سوا سال کی مدت اضطراب میں گزری، نوجوانی کے جذبات، شاعری کا بدذِ شعور، سرمد، مومن، غالب، داغ اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۲ پر)

لہ افسوس ہے تقسیم ہند سے قبل گھریلو معاملات کے سبب ماموں اور بھانجے کے درمیان شدید ناچاقی ہو گئی۔

لکھ دیا۔

دلّی میں دس بارہ دن خوب چہل پہل اور گہما گہمی رہی۔ عوام میں نظامِ دکن کے بارے میں طرح طرح کے قصّے مشہور تھے۔ یہ کہ وہ راتوں کو لباس بدل کر شہر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ فلاں فقیر کو جو فٹ پاتھ پر پڑا تھا اتنی اشرفیاں عنایت فرمادیں، بعض

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اُس اپنے زمانے کے اکابر شعراء۔ فانی اور جگر۔ عشق عاشقی کے قصّے سُن رکھے تھے، مولانا حسرت موہانی کی تقہ زندگی کی بہت شہرت تھی، مگر اُن کے یہاں بھی اس قسم کے خیالات اور واردات نظر سے گزرے:

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

۱۹۲۵ء کے آخری ہفتہ میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سلور جوبلی منائی جارہی تھی، میری شادی ہوئی جس نے اس طوفان میں ٹھہراؤ سا پیدا کر دیا۔ "نکاح" کو شاید اسی لیے "نصف دین" کہا گیا ہے۔ نئی ذمہ داری، گھر میں عورتوں کے علاوہ کوئی بڑا اور سرپرست نہ تھا، سوا سال کی ہنگامہ آفریں زندگی نے گھر کے معاشی نظام پر بھی اثر ڈالا، سرکاری ملازمت کے لیے کم سے کم انٹرنس کی سند ہونی ضروری تھی۔

ڈیڑھ سال کی چھوٹی ہوئی پڑھائی خاص طور سے ریاضی میں تھوڑے بہت جو قاعدے آتے تھے انہیں بھول بھال گیا، مگر آدمی اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر کے حوصلہ سے کام لے اور کمر ہمت باندھ لے تو کیا نہیں ہو سکتا! چھ سات مہینہ کی محنت میں سچ مچ لوہے کے چنے چبانے پڑے! ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان دیا اور اُس میں کامیاب ہو گیا، ریاضی کے پرچوں کا معاملہ خاصہ مذبذب تھا، امتحان میں پاس ہونے کی جب خبر ملی ہے تو سجدے میں گر پڑا اور شکر و مسرت کے آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے!

اس عرصہ میں مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم سے خط و کتابت ہوتی رہی، ہر خط میں اُن سے اصلاحِ احوال کے لیے دعا کی تمنا! پھر وہ ہمارے گاؤں تشریف لائے تو اپنے ساتھ بدایوں لے گئے! وہاں ایک صاحب تھے مولوی فصیح الدین، انگریزی دور کے خان بہادر ریٹائرڈ کلکٹر اور یو۔ پی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر! بڑھاپے میں بصارت سے قریب قریب معذور ہو چکے تھے، اراضی مسائل پر کونسل میں اُن کی تقریریں بڑی دلچسپی کے ساتھ سُنی جاتیں، مولانا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۳ پر)

اوقات غیر معمولی عقیدت و محبت قصوں اور داستانوں میں "الف لیلہ" کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب پروپیگنڈے کے فن کے بادشاہ تھے، انھوں نے "نظام گزٹ"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مرحوم نے خان بہادر صاحب سے مجھے ملایا اور نہ صرف سفارش کی بلکہ اُنہیں اس پر پوری طرح آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نینی تال لے جائیں اور وہاں کسی محکمہ میں سفارش کر کے ملازمت دلا دیں۔

بدایوں سے انٹر کلاس میں خان بہادر فصیح الدین، مولوی نظام الدین حسن ایڈیٹر "ذوالقرنین" اور میں نینی تال کے لیے روانہ ہوئے، بریلی جنکشن سے ڈاکٹر ضیاء الدین کا ساتھ ہو گیا، وہ بھی اُسی ڈبہ میں تشریف لے آئے، اُس زمانہ میں مسافروں کی آج جیسی بھیڑ نہیں ہوتی تھی، ہندوؤں کے اشنانوں اور میلوں کے علاوہ تھرڈ کلاس تک میں بڑی خلاصہ جگہ ملتی، نینی تال میں خان بہادر صاحب، نواب سر محمد یوسف وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ کی قیام گاہ پر ٹھہرے اور اُن کے ساتھ مولوی نظام الدین اور راقم الحروف بھی! اس کوٹھی کا نام "اوک اوور لاج" (Oak over lodge) تھا اور غالباً نینی تال کی سب سے بلند چوٹی پر واقع تھی، اس کے اصل مالک نواب صاحب چھتاری تھے، گورنمنٹ نے اُن سے کرایہ پر لے لی تھی!

شب میں کھانے کی گھنٹی بجی، دوسرے مہمانوں کے ساتھ میں بھی کھانے کی میز پر پہنچا، ڈائننگ روم خاصا سجا ہوا، کھانے کی میز پر خوبصورت سفید چادر، اُس پر چھری کانٹے سلیقہ کے ساتھ چُنے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گلدان رکھے ہوئے، جن میں آج کی طرح پلاسٹک کے مصنوعی پھول نہیں، اصل پھول تھے! میں نے ایک دو بار مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم ہی کی معیت میں البتہ راجہ صاحب سلیم پور کے یہاں کھانا کھایا تھا، مگر یہاں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر نگاہ ٹھٹک سی گئی، چھری کانٹے سے کھانا کھانے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ بعض انگریزی کھانے میرے لیے بالکل نئے تھے، سامنے والوں کو دیکھ دیکھ کر کھانا کھانے میں اُن کی نقل کر رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ نقل کسی نوبت پر مضحکہ خیز نہ بن جائے۔ پہلے دن اسی اندیشہ و تکلف کی بدولت پوری طرح سیر نہ ہو سکا، نواب سر محمد یوسف کے یہاں تین ہفتہ کے قریب قیام رہا، اور اس مدت میں انگریزی طرز پر کھانا کھانے کی خاصی مشق ہو گئی! نواب صاحب موصوف کے یہاں کھانے پر مہمانوں کا ہجوم رہتا، ایک دو اونچے درجہ کے انگریز

(باقی حاشیہ اگلے ۹۴ صفحہ پر)

نکال دیا، زرد چکنا کاغذ، کتابت وطباعت دیدہ زیب، شام کے وقت یہ بلیٹن شائع ہوتا اور نظامِ دکن کی نقل وحرکت کی ایک ایک خبر تفصیل کے ساتھ درج ہوتی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ عہدے دار لنچ یا ڈنر میں ضرور ہوتے، مسٹر اوڈونل آن ونول فینانس منسٹر تھے، گورنر کے بعد انہی کا درجہ تھا، وہ متعدد بار کھانے میں شریک رہے! نواب زادہ لیاقت علی خاں اور سر شفاعت احمد خاں بھی نواب صاحب کے مہمان تھے، ان کے علاوہ محمود آباد اسٹیٹ کے منیجر خان بہادر حبیب اللہ (ریٹائرڈ کلکٹر) جو اپنی وجاہت کے سبب پورے مجمع پر چھا جاتے، بار بار کھانے پر تشریف لاتے! نیلی چھتری کے مصنف مسٹر ظفر عمر سے بھی نینی تال ہی میں ملاقات ہوئی۔

آنریبل منسٹر کی کوٹھی پر قیام، امیرانہ ضیافت اور اتنے بڑے بڑے آدمیوں کی ہم نشینی، میں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ ملازمت ملے یا نہ ملے مگر یہ فراغت وعزت اور لطف ومسرت بھی اپنی جگہ بہت کچھ ہے ایسے موقعے ہر کسی کو کہاں میسر آتے ہیں! ہاں! ایک خاص بات تو رہی جاتی ہے وہ یہ کہ نواب صاحب کے یہاں کھانے میں کبھی کوئی خاتون شریک نہیں ہوئی، مشرقی روایات اور اسلامی تمدن کی پاسداری اس حد تک کہ کوئی انگریز عہدیدار بھی اپنی بیوی کو دعوت میں لے کر نہیں آیا اور اب ..... ؎

یہاں کیا ذکر شرم وآبرو کا
یہ دورِ عظمتِ مریم نہیں ہے

انگریز کے اُس دورِ حکومت میں صوبے کے وزراء کی تنخواہوں کا مجموعی بجٹ تمام وزیروں پر تقسیم کر دیا جاتا اور یہ تقسیم آنے پائی کی کسر تک جا کر پہنچتی، ہر وزیر کو پانچ ہزار تین سو تینتیس روپیہ تین آنہ یا پانچ آنہ چار پائی تنخواہ ملتی، نواب سر محمد یوسف کے اخراجات شاہانہ تھے، وزارت کی تنخواہ میں اُن کا پورا کہاں پڑتا تھا، زمینداری کی ساری آمدنی بھی صرف میں آ جاتی، آقا کی حد سے بڑھی ہوئی کشادہ دستی اور سیر چشمی سے ملازمین خوب فائدہ اٹھاتے اور گلچھرے اڑاتے۔

نینی تال میں گورنر کے علاوہ اور کسی کو موٹر چلانے کی اجازت نہ تھی، وزراء کے پاس خوب صورت قسم کی رکشائیں تھیں جن کے آگے پیچھے آٹھ آدمی لگے رہتے بلکہ یوں کہئے جُتے رہتے۔ وہ ان کی رنگ برنگ کی وردیاں ان پر سنہری لیس اور دیدہ زیب پیٹی جھم جھم کرتی ہوئی!

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۵ پر)

چند مہینے کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میں خود حیدرآباد دکن پہنچ گیا، مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ساتھ ٹھیرنا ہوا اور انہی کی ہمراہی میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت صدر اعظم حکومتِ آصفیہ سے ملاقات ہوئی۔

(لقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)۔ صوبے کی مجلس قانون ساز میں تماشائیوں کی گیلری سے وہاں کی کارروائی دیکھی، سرسیتارام مجلس قانون ساز کے صدر تھے، جو برسوں اس منصب جلیل پر فائز رہے، بڑی رواں اور شستہ انگریزی بولتے تھے، کانگریس کے ٹکٹ پر کوئی صاحب جن کا نام بھگوتی سہائے اور بیدار تخلص تھا، صوبائی کونسل میں ممبر منتخب ہو گئے تھے، یہ اپنی تقریر میں دو چار جملوں کے بعد اُردو اشعار پڑھتے، ایک بار ان کی تقریر خاصا طول کھینچ گئی، سرسیتارام نے انہیں ٹوکا، مگر بڑے خوبصورت انداز میں Mr. Baidar How Many Couplets More?
اس لطیف طنز پر سب مسکرا دیے! انہی سیتارام صاحب کی صدارت میں سُنا ہے لکھنؤ میں کوئی مشاعرہ تھا! مشہور مزاحیہ نگار شاعر ظریف لکھنوی نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا ؎

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتارام کی

مسٹر سی، وائی چنتامنی روزنامہ لیڈر (الہ آباد) کے نامور ایڈیٹر تھے، اور یو۔پی میں وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے، کسی مسئلہ میں محکمہ تعلیمات کے انگریز ڈائرکٹر سے اختلاف ہوا، بات گورنر تک پہنچی، گورنر نے ڈائرکٹر کی پچ کی، مسٹر چنتامنی اس مداخلت کو برداشت نہ کر سکے، انہوں نے کھٹ سے استعفا دے دیا، صاحب موصوف صوبائی مجلس قانون ساز کے سب سے اچھے مقرر تھے، محکمہ جیل کی اصلاحات پر اُن کی تقریر ہوئی اور سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں سب نے اس کی تعریف کی، مسلمانوں میں نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم چوٹی کے مقرر تھے اور کانگریسیوں میں گووند بلبھ پنتھ! خان بہادر حافظ ہدایت حسین مرحوم کے نام تک سے آج کا تعلیم یافتہ طبقہ واقف نہیں ہے، مگر اُن دنوں وہ بڑی شہرت کے مالک تھے، کانپور کے مشہور وکیل، انگریزی کے بلند پایہ مقرر، اُن کی شہرت اور قابلیت کے سبب انہیں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بلایا گیا۔

؎ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

خان بہادر نصیح الدین صاحب نے محکمہ جنگلات کے سب سے بڑے انگریز عہدیدار سے جن کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۶ پر)

حضور نظام بلدہ حیدر آباد میں سیرت النبیؐ کے خاص خاص جلسوں میں شرکت
فرماتے تو مولانا عبدالقدیر بدایونی کی معیت میں راقم الحروف کو بھی اُن کے قریب ہی جگہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) - عہدے کا نام (Conservator) تھا مجھے
ملا، درخواست بھی دی، مگر کچھ ہوا ہوایا نہیں -

اس تضاد پر اب غور کرتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ سرکاری ملازمت کی دوڑ دھوپ بھی کر رہا تھا اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں میرے مضامین اور مراسلے بھی اخبارات میں چھپتے تھے۔

اس کے بعد میرا بدایوں آنا جانا رہا اور بعض دفعہ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے یہاں مدرسہ قادریہ میں ڈیڑھ، ڈیڑھ دو دو مہینہ قیام کی نوبت آجاتی، مولانا مرحوم تو سراپا لطف و کرم تھے ہی، اُن کے اعزہ اور متوسلین بھی بڑے احترام و محبت سے پیش آتے، غالباً ۱۹۲۷ء ہو گا، عرس قادری کے سلسلہ میں بزم شعر و سخن بھی منعقد ہوئی، باہر کے مہمانوں کے علاوہ شہر کے منتخب افراد کا مجمع تھا، اتنے اونچے درجہ کے سامعین میں شعر پڑھنے کا میرا پہلا اتفاق تھا، اتنی داد ملی کہ میں اپنے کو فضا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا حضرت مولانا احسن مارہروی بھی مشاعرے میں شریک تھے، مشاعرہ ختم ہو جانے کے بعد میں اپنی چھولداری میں چلا آیا، وہ وہاں سے گزرے تو مجھے پلنگ پر بیٹھا دیکھ کر رُکے میں تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا، میری شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خاص لکنت زدہ انداز میں بولے :

" میاں! وہ شعر تو پھر پڑھنا جس کا قافیہ " غلط انداز ہے "

اُن کے اس طرح فرمانے پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ میرے اس شعر میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے، شعر تھا:

ہو چکی بیمار بیمارِ اُلفت کو تسلّی ہو چکی
اک نگاہِ واپسیں وہ بھی غلط انداز ہے

پلک جھپکتے میں ذہن " نگاہِ واپسیں " پر پہنچا کہ نگاہِ واپسیں تو مرنے والے کی آخری نگاہ کو کہتے ہیں، میں نے محبوب کی مڑتی ہوئی نگاہ کو " نگاہِ واپسیں " کہا ہے، یہ تو بڑی فاش غلطی ہے، میں نے قدرے تامل کے بعد شعر پڑھا:-

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۷ پر)

مل جاتی، عام محفل میں حضور نظام کے لیے جو نشست مخصوص ہوتی اس کا قرب ہر کسی کو کہاں میسر آتا تھا۔ ایک بار نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی ڈیوڑھی میں جلسہ سیرت تھا، نواب صاحب کی تقریر کا یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ زمانہ آغاز اور بدو شعور تھا، اس لیے وہ اس کی جرأت نہ کر سکے کہ اپنے یہاں کے جلسہ سیرت میں خود اپنی تقریر پروگرام میں رکھتے۔ تلاوت قرآن کریم کے بعد جوش ملیح آبادی صاحب نے نعتیہ نظم سنائی پھر ایک مہدوی معمر عالم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔

ہو چکی بیمار الفت کو تسلی ہو چکی
ایک دزدیدہ نظر وہ بھی غلط انداز ہے

مولانا احسن مرحوم پھر وہاں رکے نہیں، عجیب حیرت زدہ انداز میں اپنے خیمے کی طرف بڑھ گئے۔
کراچی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا میں نے ایک ادبی نشست میں اپنی غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ تھا ——

غنچوں کے دل سے پوچھئے لطف کشادگی
بادِ صبا پہ تہمت آوارگی سہی!

اس پر ایک صاحب نے "لطف کشادگی" طنزیہ انداز میں دہرایا، میں نے برجستہ دوسری بار مصرع اولیٰ یوں پڑھا۔

غنچوں کے دل سے پوچھئے لطف شگفتگی

حیدرآباد دکن میں مولانا عبدالقدیر بدایونی ہی کی ذات میرے وہاں پہنچنے کی تقریب اور تعارف و قیام کا سبب بنی ورنہ اب سے چالیس برس پہلے مجھے کون جانتا تھا ۱۹۳۲ء میں مولانا کے ساتھ عراق کا سفر کیا اور انہی کی بدولت بغداد کے عمائد و مشاہیر یہاں تک کہ ہز مجسٹی شاہ غازی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اس سفر میں تمام مصارف و اخراجات کے وہی کفیل تھے!

—— باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۸ پر ——

لہ حیدرآباد کے دورانِ قیام میں راقم الحروف مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی آمد و وداع کے اطلاعی مراسلے روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ میں چھپا کرتا تھا۔ بغداد شریف سے واپسی کے ساتھ شاہ غازی سے ملاقات کی تفصیل ایک مضمون کی شکل میں روزنامہ رہبر دکن کو ارسال کی، یہ مضمون نمایاں طور پر شائع ہوا اور دفتروں سے لے کر قصر ایوان تک میں پڑھا گیا۔

نے وعظ شروع کیا مگر ان کا رنگ نہیں جما، پندرہ بیس منٹ کے بعد حضور نظام نے اپنے خاص انداز میں فرمایا: "لقاء علی۔ لقاء علی"

مولانا لقاء علی[1] بدایونی تھوڑی دور پر بیٹھے ہوئے تھے وہ سامنے سے آئے، تو نواب میر عثمان علی خاں تند و تیز لہجہ میں بولے: — "یہ کیا؟ پیچھے سے آؤ"

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ۔ میرے حیدرآباد جانے سے پہلے مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم اور اُن کے خواہرزادہ خواجہ غلام نظام الدین صاحب کے صلاح مشورے سے یہ بات طے پائی کہ بدایوں سے ایک ماہنامہ نکالا جائے جس کا نام "نظام الملک" تجویز کیا گیا، اس رسالہ کے مطبوعہ اشتہارات دوسرے رسالوں میں بھی چھپنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ میں نے رسالہ کے ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے بدایوں کی کلکٹری کچہری میں ڈیکلریشن داخل کیا، جو ایک گھنٹہ میں مل گیا۔ یہ انگریز کے دورِ استبداد کا واقعہ ہے، اور آج پاکستان کی بنیادی جمہوریت کے دَور میں کسی نئے رسالے اور اخبار کے لیے ڈیکلریشن لینا ہفتخواں کو طے کرنا ہے، پرنٹر پبلشر کے نام کی تبدیلی کے لیے مہینوں گزر جاتے ہیں مگر شنوائی نہیں ہوتی اور خفیہ پولیس مشتبہ لوگوں کی طرح متعلقہ افراد کے بارے میں پوچھ گچھ کرتی رہتی ہے ؎

اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہوگئی!

ریاست حیدرآباد دکن سے مولانا عبدالقدیر بدایونی کے تین پشتوں کے تعلقات تھے غالباً اُن کے دادا مولانا فضلِ رسول بدایونی کا نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ خامس کے عہد میں روزینہ مقرر ہوا تھا، اُس زمانہ میں قلمرو دکن میں "چلنی روپیہ" کا چلن تھا۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی کی اپنی شخصیت اور تعلقات اور ذاتی جد و جہد سے مدرسہ قادریہ اور اُس کے کتب خانہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۹۹ پر)

---

[1] بدایوں کے رہنے والے تھے، ان کا شمار شیعہ علماء میں نہیں، خوش بیان مقررین میں ہوتا تھا۔ اُن کے نام کے ساتھ "مبلغِ اسلام بہ اقصائے شرق" لکھا جاتا تھا۔ انگریز مصنفین کی عبارتیں فرفر تقریر میں سناتے چلے جاتے۔ حیدرآباد دکن میں چار پانچ سال ان کی تقریروں کی خوب دھوم رہی اُن کی تقریروں سے متاثر ہو کر نظام دکن نے وظیفہ مقرر کر دیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے مگر زیادہ نمایاں نہ ہو سکے، ان کو وفات پائے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے۔

شاہانہ مزاج کی یہ بہت ہی ہلکی سی تُندی و تیزی تھی مگر لقار علی صاحب کو پسینہ آ گیا، پھر انھوں نے تقریر کی، حضور نظام نے کئی بار دورانِ تقریر میں "سبحان اللہ" اور "ماشاء اللہ" فرمایا۔

مولانا بدایونی ایک بار بدایوں سے تشریف لائے، تو شیرینی اجمیر شریف کے تبرک

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ۔ کے لیے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر ہوا خود ان کا ذاتی منصب سو روپیہ ماہوار تھا، اُن کے خاندان کو مدرسہ قادریہ کی امداد سمیت ایک ہزار روپیہ ماہوار کے قریب ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نواب صدر یار جنگ بہادر صدر الصدور کے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو مولانا بدایونی نے اس کے لیے جدوجہد کی، مگر وہ عہدہ ہی توڑ دیا گیا، نواب صدر یار جنگ بہادر محکمہ امورِ مذہبی قلمروِ آصفیہ کے آخری صدر الصدور تھے اُن کا علم و فضل، دیانت و تقویٰ اور پھر ذاتی امارت و وجاہت اس درجہ کی تھی کہ یہ عہدہ ان کی نسبت سے معزز و مشرف تھا! اللہ تعالیٰ آدمی کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ کا پھل بھی کسی نہ کسی عنوان سے اس دنیا میں عنایت فرما دیتا ہے، "من جد وجد" عربی کی مشہور ضرب المثل ہے! چند سال کے بعد مولانا مرحوم کو حکومت حیدر آباد کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) میں "مفتی" کا سرکاری عہدہ فرمانِ خسروی کے ذریعہ مل گیا، اُن کے دفتر افتاء کا اہلکار کہیے یا پیشی کا منتظم راقم الحروف ہی تھا۔

میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اور پل کر جوان ہوا، وہاں اور اس کے نواح میں بدایوں اور بریلی کے عقائد کا غلبہ تھا کوئی مسلمان مر جاتا تو اس کا تیجا اور چالیسواں فرض و واجب سمجھ کر کیا جاتا، محفلِ میلاد میں قیام عشقِ رسولؐ کا سب سے بڑا مظہر سمجھا جاتا۔ بچپن سے کانوں نے یہ آوازیں سُنی تھیں کہ دیوبندی اور وہابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین کی توہین کرتے ہیں، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی وہ کتابیں جن میں اکابرِ دیوبند کی نام بنام تکفیر کی گئی ہے دین میں حجت اور سند سمجھ کر پڑھی جاتی تھیں، اہلِ بدعت کا یہ عقیدہ تھا کہ اولیاء اللہ اور اللہ تعالیٰ میں بس "ذات" اور "عطاء" کا فرق ہے۔ جو کام اللہ تعالیٰ کرتا ہے، وہ کام اولیاء اللہ بھی انجام دینے کی باذن اللہ قدرت رکھتے ہیں اور اللہ اور رسولؐ اللہ کے

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۰ پر)

کے عنوان سے اپنے ایک معروضہ کے ساتھ میرے ہاتھ کنگ[1] کوٹھی بھجوائی۔ کنگ کوٹھی پر پولیس کا جو امین (انسپکٹر) متعین تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں شیرینی اور مولانا کا معروضہ کنگ کوٹھی میں بھجوا رہا ہوں۔ وہاں سے جواب آنے تک آپ یہیں ٹھہرے رہیں۔ تھوڑی دیر میں شاگرد پیشہ دوڑا ہوا آیا کہ سرکار فرماتے ہیں کہ جو شخص معروضہ اور تبرک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۔ درمیان انیس بیس کا بل (فرق) ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، اس لیے ؎

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

شب معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعلین مبارک پہنے ہوئے عرش پر اللہ میاں کے برابر بیٹھ گئے تھے اور احمد واحد میں بس ایک میم کا پردہ ہے، اس قسم کے مشرکانہ اشعار تک ان کانوں نے سنے ہیں کہ ؎

وہ جو کہ مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفا ہو کر

اور بدایوں کے ایک شاعر (دلدار علی شاہ مذاق تلمیذ ذوق (دہلوی) نے تو حد ہی کر دی۔

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام ـــــ رکھ لیا خواجہ غریب نواز

ان عقائد و تصورات سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ !

ہاں تو مولانا عبد القدیر بدایونی کے ایما ر سے جب ماہنامہ "نظام الملک" کا ڈیکلریشن حاصل کیا گیا (جس کے نکلنے کی نوبت نہیں آئی) اور رسالہ کو میں ترتیب دینے لگا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں فقہی مسائل کا باب بھی ہونا چاہیے! مدرسہ قادریہ کے کتب خانہ میں اردو، فارسی اور عربی میں فقہ کی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، اور رہنمائی کے لیے مدرسہ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۱ پر)

---

[1] نظام حیدرآباد ولی عہدی کے زمانہ سے اس کوٹھی میں رہتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں نواب میر محبوب علی خاں کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھے تو پرانی حویلی یا چو محلہ مبارک میں اپنے پیش رو فرمانرواؤں کی طرح قیام نہیں فرمایا یہیں رہتے رہے۔ یہ کمال خاں نامی کسی جاگیردار کی بنوائی ہوئی عمارت تھی جس کی دیواروں پر "K-K" لکھا تھا، ان حرفوں کی رعایت سے اس کا نام "کنگ کوٹھی" رکھ دیا گیا۔

لے کر آیا ہے اُسے اندر بھیجو! میں ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور شاہی دربار میں دستار اور کمر پٹکے کی پابندی تھی ایمن پولیس نے اپنی دستار میرے سر پر رکھ دی اور چمڑے کا بکلوس دیا میں نے کمر سے باندھ لیا۔ کنگ کوٹھی مبارک کے دروازے پر پردہ پڑا رہتا تھا۔ اس سے گزر کر اندر پہنچا حضور نظام برآمدے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ کے استاد ہر وقت میسر تھے! میرے دل و دماغ پر عرس و فاتحہ اور مزارات اپنے تمام لوازم کے ساتھ چھائے ہوئے تھے۔ میں نے فقہ کی کتابوں میں سب سے پہلے اسی موضوع پر لکھنے کے لیے مواد تلاش کیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُن کتابوں میں سرے سے ان باتوں کا ذکر ہی نہیں تھا، پھر کتاب و سنّت، سیرتِ رسولؐ، آثارِ صحابہ اور دوسری دینی کتابوں کا جس قدر مطالعہ کا موقعہ ملتا گیا، اہلِ بدعت کے ایک ایک عقیدہ کی آپ ہی آپ نفی ہوتی گئی اور اس قسم کے غلط عقائد کی قلعی کھلتی گئی، سلسلہ قادریہ میں:

یا عبدالقادر جیلانی شیئاً للّٰہ

سب سے زیادہ محبوب ورد وظیفہ بلکہ حرزِ جان اور علامتِ ایمان! مگر خود حنفی مسلک کے شیوخ و ائمہ کے یہاں اس عقیدے، نعرے اور جملہ پر شدید ترین وعید اور نکیر نگاہ سے گزری! بہت دن تک ڈرتا رہا کہ فلاں بزرگ کا جو یہ قابلِ اعتراض عمل اور قول ہے اُن کی مخالفت کا کہیں کوئی وبال نہ آپڑے مگر پھر سراج الامت حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم دینی شخصیتوں کے اس قسم کے مستند اقوال نگاہ سے گزرے کہ ہمارا کوئی قول کتاب و سنّت کے خلاف نظر آئے تو اُسے بے دریغ دیوار پر مار دو! قرآنِ کریم میں غور و فکر اور تدبر کیا تو اہلِ بدعت کے عقائد تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ بودے نظر آئے، پورے قرآن شریف کے مضامین کا مرکزی نقطہ اور خلاصہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی عالم الغیب ہے نہ حلّالِ مشکلات ہے، نہ خبیر بما فی الصدور ہے، انبیاء کرام تک کو بعض اوقات کیسی کیسی حیرانیاں، پریشانیاں اور مجبوریاں پیش آئی ہیں، قرآنِ کریم میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا کہ کسی وفات پائے ہوئے بزرگ کی روح سے کسی نے استغاثہ کیا ہو! مولانا عبدالقدیر بدایونی کو میرے عقائد کی تبدیلی کا علم تھا ایک دو بار میں نے اُن سے گفتگو بھی کی مگر وہ ناراض ہو گئے۔ میں نے ایک دفعہ عرض کیا کہ قبروں پر جو کچھ ہو رہا ہے، پھول اور چادریں چڑھانا، چراغ جلانا، صندل ملنا، قبروں کو غسل دینا، انہیں چومنا کیا ان میں سے کوئی چیز بھی بدعت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ١٠٢ پر)

میں تہمد باندھے ہوئے ٹہل رہے تھے برآمدے میں چھوٹی سی میز دھری تھی جس کے کاغذ شیشہ کے پیپر ویٹ کی جگہ اینٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے دبے ہوئے تھے، میں دروازے میں داخل ہوتے ہی آداب بجالایا اور اسی حالت میں دونوں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ۔ نہیں ہے؟ اس کے جواب میں وہ تند آمیز لہجہ میں بولے:
"بدعت ——— مولوی اشرف علی کا نام ہے۔"
بس پھر اس دن کے بعد اُن سے میں نے ان مسائل پر گفتگو نہیں کی!

وہ قبروں کو چومتے تھے، انہیں غسل دیتے تھے اور وہ سب کچھ کرتے تھے، جو اس مسلک وعقیدہ کے لوگ کرتے ہیں یہاں تک کہ صلوٰۃ غوثیہ تک پڑھتے تھے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ ننھیال کی طرف سے مولانا کے عزیز ہوتے ہیں، ایک بار بلدہ حیدرآباد میں وہ دونوں موٹر کار میں جارہے تھے راستہ میں ایک بچہ کار کے نیچے آتے آتے رہ گیا اس موقعہ پر مولانا کی زبان سے بے ساختہ ——— "یا شیخ عبدالقادر میراں محی الدین" ——— نکلا۔

مودودی صاحب نے مولانا مرحوم سے کہا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ مشرکین مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے اور جب مصیبت ٹل جاتی تھی تو اپنے معبودوں میں مشغول ہو جاتے تھے مگر آپ نے تو مصیبت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کے نام کی دہائی دی......!

مولانا موصوف اور راقم الحروف کے عقائد میں بعد المشرقین پیدا ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود راقم الحروف سے بزرگانہ شفقت کے ساتھ پیش آتے۔

مولانا موصوف ہر سال ربیع الثانی کے مہینہ میں بغداد شریف جایا کرتے تھے "بڑی گیارہویں" وہ بغداد ہی میں کرتے تھے، ۱۹۵۳ء میں بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعہ کراچی آئے اور چند گھنٹہ کے لیے یہاں اترے میری بیماری کی خبر سُن کر مجھے ڈھونڈتے ہوئے جیکب لائن پہنچے اور عیادت فرمائی!

بڑے ذہین، طباع اور ساتھ ہی بذلہ سنج بھی، شعر وشاعری سے غیر معمولی شغف، کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے اُن کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

پھر بھی واپس ہے تو آپ اے ابد و جانیئے
دل کہ جس کے صرف لے لینے کو قیمت جانیئے

ہاتھوں سے سلام کرتا ہوا حضور نظام کے سامنے جا پہنچا۔

"نام" ؟ —— ارشاد ہوا

منظور حسین ماہر القادری " —— میں نے جواب دیا۔

" منظور حسین " نام (حضور نظام بولے) اور " ماہر " (میں نے عرض کیا تخلص)

اسی سوال و جواب کے وقفہ میں گھبرا کر میں نے اپنی تازہ غزل کا مقطع سُنا دیا

میں نے ماہر جب کہا طوفانِ غم میں یا علیؑ

موج کشتی بن گئی، گرداب ساحل ہو گیا

" تو تم شیعہ ہو " —— ؟ مجھ سے دریافت فرمایا گیا —— میں نے عرض کیا " شیعہ نہیں ہوں " —— اس پر نطقِ ہمایونی کے یہ الفاظ میرے کانوں نے سُنے۔

" تو شیعیت میں کیا برائی ہے " ؟

میں خاموش رہا —— " تمہارے یہاں محرم میں علم بٹھلاتے ہیں، مجھ سے سوال کیا گیا، " نہیں ہمارے یہاں علم نہیں بٹھلائے جاتے " —— میں نے جواب دیا!

" کیا تم نے شیعیت کا بہ نگاہِ غائر مطالعہ کیا ہے " ؟

میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا، کیا کہوں، کیا نہ کہوں، جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا اس کو چھپانے کے لیے میرا ضمیر آمادہ نہ تھا، معاً ایک بات سوجھ گئی، میں نے عرض کیا:

" سرکار! فدوی کیا اور فدوی کی نگاہ کیا، میں نے ایک تقریر مولوی سبط حسن صاحب (ہاں! ہاں! سبط حسن کو میں جانتا ہوں۔ نظام بیچ میں بول پڑے) کی سنی ہے اس میں انہوں نے فرمایا کہ قرآن میں لاکھ قطع و برید کے بعد حضرت مولا علی کی تعریف موجود ہے، " ورفعناہُ مکاناً علیا —— " یہ تو قرآنِ کریم کی لفظی اور معنوی تحریف کا عقیدہ ہے...... "

میرے اس کہنے پر وہ ڈیڑھ دو منٹ تک خاموش رہے! پھر بولے یہ بدایوں کس طرف ہے میں نے بتایا کہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان! پھر پوچھا کہ " تو کہاں رہتا ہے "! میں نے عرض کیا، ملک پیٹ میں، سرکار سردار ولا تشریف لے جایا کرتے ہیں، اوپر سے ریل گزرتی ہے، پل اُس کے نیچے ہے، اُسی مقام پر نو تعمیر کوارٹروں میں فدوی کی سکونت ہے —— اور حضور! اُن کوارٹروں کا کرایہ بڑھائے جانے کی خبر سے لوگ

پریشان ہیں۔

یہ حاضری پون گھنٹہ کے قریب رہی، واپس آکر مولانا عبدالقدیر بدایونی اور دوسرے احباب کو یہ تفصیل سنائی تو وہ مبارکباد دینے لگے کہ تم بڑے خوش قسمت ہو، جو سرکار سے کسی کوشش، جد وجہد اور انتظار کی زحمت اٹھائے بغیر مل آئے، اس پر لطف یہ کہ تمہاری جیب سے ایک کوڑی بھی خرچ نہیں ہوئی، کنگ کوٹھی میں حاضر ہونے والوں کو کم سے کم حیدرآباد کی ایک اشرفی اور پانچ روپیہ نذر دینے پڑتے ہیں، ملازمینِ شاہی کو باریابی کی خوشی میں انعام بھی دیا جاتا ہے وہ رقم مل ملاکر سو روپیہ ہوتی ہے۔

ان واقعات کو برسوں ہوگئے، تاریخ اور سن کسے یاد رہتے ہیں، غالباً یہ سنہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے، اس کے آٹھ نو سال بعد، ایک واقعہ نہیں سانحہ پیش آیا، میری مندرجہ ذیل نظم بلدہ حیدرآباد کے روزنامہ "صبحِ دکن" میں شائع ہوئی۔

"سلطانِ کائنات سے خطاب"

جہاں میں نقشِ وفا چھوڑ کر گزرتا جا — حنین و بدر کے خاکوں میں رنگ بھرتا جا
مٹا سکے نہ جسے انقلابِ مستقبل — جبینِ دہر پہ ایسا بھی نقش کرتا جا
نگاہِ دہر ہے پھر بوقبیس کی جانب — جہاں پہ نور فشاں ہوکے خود نکھرتا جا
قسم ہے پائے محمدؐ کی ٹھوکروں کی تجھے — گزر رہا ہے تو پتھر کو نرم کرتا جا

حرا سے پھر کوئی نغمہ سُنا رہا ہے تجھے
قریب آکے زمانہ بُلا رہا ہے تجھے

ترے غلام ازل سے ہیں نصرت و اقبال — یہ کیوں کہوں کہ تجھے کامیاب ہونا ہے
تری نگاہِ کرم کا ہے منتظر شاید — وہ ذرّہ جس کو ابھی آفتاب ہونا ہے
نہ دیکھ رشک سے تہذیب کی نمائش کو — تجھے جہاں میں فقط بوترابؓ ہونا ہے
نہیں ہوئی ابھی بیدار جرأتِ فاروقؓ — ابھی جہاں میں بڑا انقلاب ہونا ہے
ترے تبسمِ رنگیں پہ ہے چمن کی نظر — کہ خار و خس کو چمن میں گلاب ہونا ہے

تمام دہر کا سلطاں بنا کے بھیجا ہے
خدا نے تجھ کو مسلماں بنا کے بھیجا ہے

اس نظم کو نواب میر عثمان علی خاں نے نہ جانے کس موڈ میں پڑھا اور کیا اثر قبول

کیا کہ راقم الحروف پر عتاب شاہانہ دشنام آمیز فرمان کی صورت میں نازل ہوا، یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ میری اس نظم کا عنوان "سلطانِ کائنات سے خطاب" انہیں ناگوار گزرا، یا اس مصرع ـــ تجھے جہاں میں نقطۂ تو تراب ہونا ہے ـــ کو انہوں نے خلافِ ادب سمجھا یا پھر اس شعر میں ؎

نہیں ہوئی ابھی بیدار جرأتِ فاروقؓ
ابھی جہاں میں بڑا انقلاب ہونا ہے

حضرت "فاروق" (رضی اللہ عنہ) کی مدح و منقبت نے مزاج شاہانہ کو مکدر کر دیا۔

شخصی حکومتوں میں جو کوئی قسمت کا مارا شاہی عتاب کی زد میں آجاتا ہے، اس سے لوگ ہمدردی کرتے ہوئے بھی خوف کرتے ہیں کہ کہیں ہم بھی اس لپیٹ میں نہ آ جائیں، میں نے خود بھی اپنے بعض صاحب حیثیت اور معروف و خوشحال دوستوں کو کہلوا بھیجا کہ غریب خانہ پر اظہارِ ہمدردی کے لیے تشریف لا کر خطرے میں نہ پڑیں۔ اخبار میں میرے خلاف فرمانِ مبارک پڑھ کر بعض حضرات ہمدردی کے لیے آتے بھی رہے ـــ! نواب نثار یار جنگ بہادر (پنشنر کلکٹر) نے اپنے داماد قمر مقصود (مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کے والد) کے ہاتھ رات کے وقت روپیہ اور زیور بھیجا کہ یہ حاضر ہے۔ میں نے نواب صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے روپیہ اور زیور واپس کر دیا اور کہا کہ کچھ واجبی سا پس انداز بھی ہے ضرورت پڑی تو فرنیچر وغیرہ بیچ کر وطن جانے کے لیے کرایہ کا بندوبست ہو جائے گا، اخراجات کے بارے میں مجھے کسی قسم کی تشویش نہیں ہے۔

دوسرے دن نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ نے مجھے بلا بھیجا میں اُن کی کوٹھی پر پہنچا تو نظام حیدرآباد کے خسر، حکومتِ دکن کے محکمہ فوج کے سابق معتمد (سیکرٹری) نواب نذیر جنگ بہادر وہاں پہلے سے تشریف فرما تھے، نواب محسن الملک بہادر ان نذیر بیگ کے پھوپھا ہوتے تھے۔ محسن الملک کے کوئی اولاد نہ تھی، انہوں نے اولاد کی طرح مرزا نذیر بیگ کی پرورش کی تھی، انگلستان کے سفر میں وہ نواب محسن الملک کے ہمراہ تھے کوتوال صاحب نے مجھ سے اس نظم کے بارے میں چند سوالات کیے، نواب نذیر جنگ بہادر یہ سمجھے کہ کسی ملازمت کے سلسلہ میں مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا ہے۔ وہ کوتوال بلدہ سے بولے :

"......یہ ماہر القادری تو زبان کا بادشاہ ہے۔"

اس پر نواب رحمت یار جنگ بہادر نے ان کا ہاتھ دبا دیا۔

عتاب خسروی کے چوتھے دن مجھے آغا جانی (نواب سلطان یار جنگ) سینئر نائب کوتوال نے بلوایا۔ میں اُن کے پاس پہنچا تو کہنے لگے کہ بھئی! کل شام کو سواری مبارک پرانی حویلی جانے کے لیے گزر رہی تھی، سرکار نے فرمایا کہ پرانی حویلی کے قریب ایک شخص اپنی غلطی پر نادم سر جھکائے ادب کے ساتھ کھڑا تھا، تم لوگوں نے ماہر کا جو حلیہ بتایا ہے وہ آدمی اسی حلیہ کا تھا ـــــ میں نے جواب میں کہا کہ کل دن بھر میں گھر سے باہر ہی نہیں گیا، نہ سواری مبارک کا سامنا ہوا، اس پر وہ بولے تمہیں اپنی حیرانی پریشانی میں شاید وہاں جانا یاد نہ رہا ہو، میں نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی قسم کی حیرانی پریشانی نہیں ہے، اس پر آغا جانی نے میری بات کاٹتے ہوئے فرمایا۔ نہیں نہیں ایسا نہ کہو (مقصد یہ تھا کہ شاہی عتاب کے بعد تمہیں پریشان اور آزردہ تو لازمی طور پر ہونا چاہیے......)

پھر وہ بولے اچھا تو آپ یہ بات کاغذ پر لکھ دیں، میں نے دو تین سطروں میں لکھ دیا کہ میں نہ تو کل شہر گیا اور نہ سواری مبارک کا سامنا ہوا، اس واقعہ کے دوسرے دن تین بجے کنگ کوٹھی سے شاگرد پیشہ آیا کہ آپ کی پیشی مبارک میں یاد ہوئی ہے، سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔ دستار اور بنگلوس میرے پاس موجود تھی میں نے جلدی سے کپڑے بدلے، دستار لگائی اور کنگ کوٹھی کے قریب دروازے پر پہنچ کر کمر پٹہ کمر سے باندھا، قصر شاہی کا سرا پر وہ اٹھا اور میں دونوں ہاتھوں سے تسلیم و آداب کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا، مجھے دیکھتے ہی نواب میر عثمان علی خاں گرجدار آواز میں بولے:

"یہ ٹٹ پنجیا کیا چیز ہے، میں نے تو بڑے بڑوں کا دماغ درست کر دیا اور ایک کو مارا جاتا ہے، سو لوگ کانپتے ہیں سو آدمیوں کو تنبیہ کی جاتی ہے تو ہزاروں کی اصلاح ہوتی ہے دنیا کا مسلمہ قانون۔"

اعلیٰ حضرت نظام دکن بات کرتے میں ٹہلتے جاتے تھے، نواب رحمت یار جنگ، ہوش بلگرامی اور نواب خورشید یار جنگ اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

"اصلاح کس سے لیتا ہے" ـــــ دریافت فرمایا گیا۔

" ندوی کے والد بھی شاعر تھے ..... مگر میں نے کسی سے شاعری میں اصلاح نہیں لی"
میرے جواب پر ہاتھوں کو خاص انداز میں جنبش دیتے ہوئے وہ بولے : ——
" ہاں ! ہاں ! ..... بس یہی کمزوری ہے۔ ارے مجھے دیکھو کہ شاعری میں کیا ہوں .... مگر پھر بھی جائے استاد خالی است"

حضور نظام جو کچھ فرماتے تھے، اُن کے ہر جملہ کے آخری لفظوں کو اُن کے درباری دہراتے جاتے تھے۔

" عمر کیا ہے ؟" نظام دکن نے استفسار فرمایا۔

اکتیس سال" میں نے عرض کیا۔

" مجھے ہوش نے اس ماہر کا جو حلیہ بتایا تھا، اُس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر اٹھائیس سال کی ہے۔"

نظام کا جملہ ختم ہوتے ہی ہوش بلگرامی نے برجستہ عرض کیا۔

" سرکار ! اسے اپنی عمر کا کیا پتا، اس کے باپ کو معلوم ہوگی۔"

ہوش کے اس جملہ پر میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی، پھر بھی دبی دبی سی مسکراہٹ تو ہونٹوں پر آہی گئی ! اس کے بعد انہوں نے جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس ماہر کے دل میں کھوٹ نہیں ہے، اپنی نادانی اور شاعرانہ ناپختگی کے سبب اس سے غلطی ہوگئی !

شام کو ہوش بلگرامی نے مجھے بُلایا اور کہا کہ یہ بادشاہ لوگ ہیں یہ جو کچھ بھی کر گزریں، اپنی غلطی کا کسی صورت اعتراف نہیں کرتے، شاہانہ معافی کے لیے کچھ نہ کچھ بہانہ چاہیے، تم معذرت کے طور پر چند جملے لکھ دو، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا میں نے بادلِ ناخواستہ چند معذرت آمیز سطریں لکھ دیں، دوسرے دن صبح کو دوسرا فرمان ہوا جس کا ایک جملہ یاد رہ گیا ہے : ——

" ما از لغزشِ ماہر القادری درگزر کردیم، چراکہ مادر او خبث باطن نمی بینیم "

چار پانچ دن کے بعد پھر آغا جانی (نواب سلطان یار جنگ) سینئر نائب کوتوال نے بلایا، اور مجھ سے کہا کہ ماہر ! تم بہت خوش قسمت ہو، تمہیں وہ چیز مل رہی ہے جو آج تک کسی کو میسر نہیں آئی ! میں نے اس اجمال کی تفصیل چاہی، انھوں نے کھل کر صاف طور پر

تو نہیں بتایا، مگر اُن کے اشارے اور دفتر متعلقہ کے دوسرے کارکنوں سے پتا چل گیا کہ میری وہ نظم جس پر عتاب شاہانہ ہوا تھا حضور نظام نے اس پر اصلاح دی ہے اور وہ "صبح دکن" میں شائع ہوگی، خوش نویس اُس کی تبیض کر رہا ہے! مگر وہ نظم اخبارات میں نہ آسکی۔ ہوا یہ کہ نظام حیدرآباد نے میری غزل کے تمام اشعار کی اصلاح اور مرمت کر دی، مگر یہ شعر ——

ابھی نہیں ہوئی بیدار جرأت فاروق ابھی جہاں میں بڑا انقلاب ہونا ہے

چھوڑ دیا اس پر ہوش بلگرامی نے عرض کیا کہ حضور! اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوں گی، پوری نظم اس شعر سمیت اخبار میں آنی چاہیے اس پر انہوں نے اس اصلاح شدہ نظم کی اشاعت ملتوی فرمادی۔ اور اس کے چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال بعد میری نظم کسی اخبار میں شائع ہوئی، جس کے تین شعر یہ تھے: ——

جب تیرا اختیار ہے پابند غیر کا قبضہ میں تیرے ملک سلیماں ہوا تو کیا

شاہیں کے بازوؤں کی حرارت ہے در جنیر زاغ و زغن کی طرح پر افشاں ہوا تو کیا

دل میں ترے امنگ ہی باقی نہیں رہی تجھ پر طلوع صبح بہاراں ہوا تو کیا

اس پر کوتوال صاحب نے بلا کر مجھ سے فرمایا کہ آپ نے پھر اس قسم کے شعر کہنے اور چھپوانے شروع کر دیئے! میں نے جواب دیا کہ ان شعروں میں آخر قابل اعتراض بات کیا ہے؟ پلس پردہ بولے میں نے آپ کو بحث و مباحثہ کے لیے نہیں بلایا، آپ کو میں نے تنبیہہ کر دی ہے۔

جھلکیاں

ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، اور ہر زندگی کچھ لطائف و ظرائف رکھتی ہے، عام لوگوں کی باتیں گمنامی کی نذر ہو کر رہ جاتی ہیں مگر مشاہیر کی زندگی کے واقعات سب کے سامنے آجاتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عوام ہوں یا خواص زندگی کے احوال و واقعات کے حمام میں انسانوں کی غالب اکثریت برہنہ یا نیم برہنہ نظر آتی ہے!

بادشاہ اور امراء جن کے کان بچپن ہی سے اپنی تعریف و ستائش سننے کے عادی ہوتے ہیں اور جنھوں نے آنکھ کھولتے ہی لوگوں کو اپنے روبرو جھکتے اور آداب و تعظیم بجالاتے دیکھا ہے، وہ خود پسند ہو جائیں یا اپنی ذرا سی خوبی کو بہت بڑا سمجھنے لگیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے، اوّل تو اس طبقہ کے لوگ فطری طور پر خوشامد، در آمد اور مدح و منقبت

کے عادی ہوتے ہیں پھر ان کے اہلِ دربار اور متوسلین بھی اپنے حلوے مانڈے کی خاطر امیروں بادشاہوں اور حاکموں کو عجیب چیز بنا دیتے ہیں۔ ریاست ٹونک کے فرمانروا نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے بارے میں مشہور ہے اُن کے درباریوں نے انہیں یہ باور کرا دیا تھا کہ آپ نماز کی نیت تو اپنے محل میں باندھتے ہیں، مگر دراصل حرم کعبہ میں نماز پڑھتے ہوتے ہیں۔

آئینِ حکمرانی اور امورِ سیاست میں نظام اپنے کو بہت بڑا ماہر سمجھتے تھے، مولانا عبدالقدیر بدایونی نے خود مجھ سے بیان کیا کہ بعض ملکوں کے سیاسی اضطرابات کی خبریں اخبارات میں آئیں تو حضور نظام نے اُن سے پوچھا: ——

"مولانا! حکومت کون شخص سنبھال سکتا ہے۔"

مولانا نے جواب دیا: — "سرکار! وہ جس کے یہاں سات پشتوں سے بادشاہت ہوتی آئی ہو۔"

نظام نے اس جملہ کی تحسین فرمائی کیونکہ وہ "آصف سابع" یعنی آصف جاہی خاندان کے ساتویں بادشاہ تھے۔

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں مرحوم کی شاعری کا ایک تو وہ دَور ہے، جب اُن کی شاعری "فکرِ دیگراں" کی بہت کچھ رہینِ منت ہوتی تھی، مثلاً اُن کے اسی دَور کی نعتیہ غزل کے دو شعر ہیں:

واللیل چوں نہ گویم گیسوئے مصطفٰے را | مازاغ گفت ایزد آں چشمِ حق نما را
اے تاج گنج کلاہاں، سلطانِ بادشاہاں | برحالِ زارِ عثماں چشمِ کرم خدارا

ان کی فارسی اور اردو شاعری کا وہ دور جو تقریباً ۱۹۳۱ء سے شروع ہوتا ہے اُس میں ان شعروں جیسی پختگی، روانی اور سلاست کہاں پائی جاتی ہے۔

جس پہلے دَور کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، اُس دَور کی شاعری کلیات کی صورت میں شائع ہوئی تھی، مگر اس کے نسخے بازار میں نہیں لائے گئے، جس کسی کے یہاں نظام وکن نسخہ بھیج دیتے وہ نذر لے کر حاضر ہوتا، انہوں نے فرمان جاری کیا کہ اُن کا دیوان ایم۔ اے کے اردو نصاب میں داخل کیا جائے، یہ شاہی فرمان تھا جس کی تعمیل ضروری تھی، محکمہ تعلیمات کے اربابِ حل وعقد سخت پریشان تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں! بابائے

اردو مولوی عبدالحق اُن دنوں دکن میں تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک بات سجھا دی، دربارِ شاہی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ سرکار کے دیوان کا جامعہ کے نصاب میں داخل ہو جانا بڑی سعادت کی بات ہے مگر حضور! مشکل یہ آن پڑی ہے کہ سرکار کے اشعار علوم و معارف کا گنجینہ اور حکمت و دانش کا خزینہ ہوتے ہیں انہیں طلباء کو پڑھائے گا کون! یہ بیچارے پروفیسر صاحبان شاہانہ فکر کی باریکیوں تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ حضور نظام نے اس پر خوش ہو کر فرمایا، اچھا! فرمان داخل دفتر کر دیا جائے! مولوی عبدالحق صاحب کی تدبیر کارگر ہوئی اور یونیورسٹی کے نصاب کو ایک عجیب مخمصہ سے نجات مل گئی۔

روزنامہ "صبح دکن" میں نظام حیدرآباد کی غزلیں "استادِ دلئے جلیل" کے ساتھ چھپا کرتی تھیں، نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل تلمیذ و جانشین حضرت امیر مینائی اس انداز کے شعروں کو آخر کہاں تک درست کرتے :——

کس کا یہ بوجھ تھا، جس کو کہ اٹھایا اس نے
رکھی کرسی ہے کہاں پوچھے تو منبر سے بھی

اخباروں میں جو غزلیں شائع ہوتیں، اُن میں نظام دکن کے نزدیک جو مشکل اور ادق الفاظ ہوتے، اُن کے معنیٰ بھی خود ہی درج فرما دیتے مثلاً "گل —— بہ معنیٰ پھول" ایک بار "حنا" کے معنیٰ "سرسوں" لکھ مارے! فارسی میں جو تک بندی فرماتے اُس میں بعض اشعار کی شرح اور توصیف میں فارسی جملے لکھ دیتے۔ بعض خوشامدی حاشیہ نشینوں نے نظام حیدرآباد کو یہ باور کرایا کہ ایران کے اہل قلم سرکار کے فارسی اندازِ تحریر کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کے پھیر یہاں تک بڑھ گئی کہ اُن کے سامنے حافظ اور سعدی وغیرہ جیسے اکابر شعراء کا ذکر آتا تو "تا بجدِ خویش" اُن کی زبان سے نکلتا مطلب یہ کہ شعراء بس اپنی وسعت و استطاعت کی حد تک خوب ہیں، مگر با دولت ......!؟

فرمانروائے دکن میر عثمان علی خاں مرحوم کی یہ غزل جس کا مقطع تھا :

سلاطینِ دکن نذرِ اجل سب ہو گئے عثماںؔ
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

بہت مشہور بلکہ دکن میں زبان زدِ خاص و عام تھی اور دکن ریڈیو کا قومی ترانہ بن گئی تھی!

نواب سالار جنگ بہادر کے یہاں مجلسِ عزا تھی۔ لکھنؤ کے مشہور بلکہ اپنے دور کے

سب سے بڑے سوز خواں منجھو صاحب کو سوز پڑھنے کے لیے خاص طور سے بلایا گیا تھا، راقم الحروف بھی منجھو صاحب کو سننے کے لیے وہاں پہنچا۔ جلسہ گاہ حاضرین سے کھچا کھچ بھری تھی اور حضور نظام کی تشریف آوری کا انتظار ہو رہا تھا، اتنے میں پولس کی سیٹیاں بجنی شروع ہوئیں اور سرکار تشریف لے آئے، مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بھی اُس مجلس میں موجود تھے، اُن کی نیاز مندی اور احترام و تعظیم کا یہ عالم کہ جیسے رکوع کر رہے ہیں! اور کچھ دیر میں سجدے میں گر پڑیں گے۔

"مہاراجہ، قریب آؤ، قریب آؤ......" نظام نے فرمایا۔

مہاراجہ بہادر صاحب ادب کے ساتھ، سر جھکائے ہوئے قریب آکر بیٹھ گئے، زبانِ شاہ پھر یوں گویا ہوئی:——

"مہاراجہ پرانے چاول ہیں، یہ میرے اشعار سمجھیں گے یہ (مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) عوام کالانعام میری شاعری کو بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں!"

اس کے بعد منجھو صاحب نے حضور نظام کا کہا ہوا تازہ ترین سلام سنایا اور سوز خوانی میں جتنا فن بھی اُن کو آتا تھا وہ سارے کا سارا صرف کر دیا۔ اپنے ایک ایک مصرع پر نظام خود ہی لوٹ ہوئے جاتے تھے، یہ غلط فہمی بھی تھی، خود ستائی بھی اور خود فریبی بھی، مگر کس کی مجال تھی جو بادشاہِ وقت کی شاعری پر زبانِ تنقید دراز کرتا، راقم الحروف سے اگر وہ اپنی شاعری کے بارے میں رائے لیتے تو میری زبان سے بھی تعریف و توصیف ہی نکلتی۔ یہ مضمون تو میں اس فضا میں لکھ رہا ہوں جہاں نظامِ دکن کی ذات کا کوئی خوف ہے اور نہ لالچ ہے، ورنہ.....!

جو "فرمانِ مبارک" وہ خود تحریر فرماتے تھے، اس کی نثر ان کی شاعری کے رنگ کی ہوتی تھی، ایک فرمان کے آخر میں —— باقی خیریت ہے —— ارقام فرما دیا، نواب بہادر یار جنگ نے چادر گھاٹ کے علاقہ میں جو تقریر کی تھی اور اُسے سن کر "بہادر یار جنگ" کا خطاب اُنہیں عطا کیا گیا تھا، اُس فرمان میں سنا ہے کہ یہ جملہ بھی تحریر فرما دیا:۔

"اُن کی تقریر سے علمی مادّہ ٹپک رہا تھا۔"

نواب میر عثمان علی خاں موزوں طبع واقع ہوئے تھے اس لیے شاعری میں بہر حال کچھ نہ کچھ شد بد تھی، مگر شاعری کی طرح فنِ طب میں بھی وہ خود کو "امام" سمجھتے تھے شاعری

اور طب کی سلطانی کا خطاب اور سپاسنامہ اُن کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اُن کے متوسلین جاگیردار اور حکام اپنی بیماری اُن سے چھپاتے اگر کوئی قسمت کا مارا اپنی بیماری کا بھولے سے ذکر کر دیتا تو اُس کے لیے نسخہ تجویز فرمایا جاتا، اور وہ نسخہ اُسے پینا پڑتا۔

جواد جاہ غالباً حضور نظام کی آخری اولاد تھی، اُس کے بارے میں یہ سننے میں آیا کہ حکیم منیر الدین (افسر الاطبا) نے جواہر مہرہ جس مقدار میں تجویز کیا تھا۔ اس مقدار میں بندگان عالی کی دخل در معقولات کے سبب اضافہ کر دیا گیا یہاں تک کہ اس بچہ کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے بعد جو اُس بے چارے پر عتاب نازل ہوا ہے تو اس کی تذلیل میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ملازمت سے برطرفی کے ساتھ شہر بدر بھی ہونا پڑا، ہفتوں تک مسلسل اخبار میں "حکیم بد" کے عنوان و لقب سے غریب کو گالیاں دی جاتی رہیں یہاں تک کہ اُس کے بعض رشتہ دار عتاب شاہانہ کی لپیٹ میں آ گئے۔

نظام حیدرآباد جمعہ کی نماز " باغ عام " کی مسجد میں پڑھا کرتے تھے، یہ مسجد انہی کی بنوائی ہوئی تھی اور حسن و موزونیت کے لحاظ سے باغ میں ایسی لگتی تھی جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوا —— بن گئی باغِ عام کی مسجد —— سے اس مسجد کی تاریخ تعمیر نکلتی ہے! ان کے آنے سے قبل امین پولیس (انسپکٹر) لوگوں کو ہدایت کرتا:

> " سرکار کے روبرو کوئی درخواست پیش نہ کی جائے، کوئی عرض معروضہ نہ کیا جائے۔ آنکھ کھجانے کی ضرورت پیش آئے تو دونوں آنکھیں ایک ساتھ کھجائی جائیں، ایک آنکھ نہیں! حضور کی تشریف آوری پر لوگ مسجد میں تعظیم کے لیے نہ اٹھیں ......"

ایک زمانہ تک نظام اپنی صاحبزادیوں کو مسجد میں لاتے رہے وہ سب سے اگلی صف میں جماعت سے نماز ادا کرتیں، حضور نظام کو شبہ ہو گیا کہ بعض لوگ ایک آنکھ ملتے ہوئے دوسری آنکھ سے شہزادیوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اسی بناء پر اُن کے ایماء سے پولیس انسپکٹر جمعہ کی نماز سے قبل یہ ہدایت کیا کرتا تھا کہ ضرورت محسوس ہو تو ایک آنکھ نہیں دونوں آنکھیں ایک ساتھ کھجائی جائیں۔

دکن میں علماء اور مشائخ کی کمی نہ تھی، متحدہ ہندوستان کے علماء بھی حضور نظام کے یہاں باریاب ہوتے رہتے مگر کسی کی مجال نہ تھی جو شہزادیوں کو مسجد میں لانے اور سب

سے اگلی صف میں باجماعت نماز پڑھنے پر نظام کو ٹوکتا، یہ جرأت پیر جماعت علی شاہ صاحب کو ہوئی۔ اُن کے کہنے سے حضور نظام نے مسجد میں شہزادیوں کا لانا بند کر دیا۔ پیر صاحب نے اُن کو ایک تلوار بھی دی تھی، جسے نظام باہر جاتے وقت ساتھ رکھتے۔

اُن کے دربار اور ذات کے بارے میں اتنے لطیفے مشہور ہیں کہ انہیں جمع کیا جائے تو اچھی خاصی ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے، حیدرآباد کے مشائخ میں ایک صاحب تھے مہدی پاشا زریں کلاہ، انہوں نے بارگاہِ سلطانی میں ایک قصیدہ پیش کیا اور قصیدہ کے ذیل میں یہ عبارت لکھی :

"دُعاگو احقر الزماں مہدی پاشا"

نظام نے "احقر الزماں" کو "آخر الزماں" پڑھا، مہدی کے ساتھ "آخر الزماں" کو مناسبت بھی تھی، بس پھر کیا تھا، اُس غریب کی شامت آگئی جو شخص قصیدہ گزران کر کسی صلہ کی توقع لے کر حاضر ہوا تھا، اُسے گردن دے کر، کنگ کوٹھی سے باہر نکال دیا گیا۔

ایک صاحب تھے مرزا منظور بیگ۔ ان کی والدہ ہز ہائی نس نواب لُہارو کی بہن تھیں، حکومت حیدرآباد دکن میں تعلقداری (کلکٹری) کے عہدے پر برسوں فائز رہے، "منظور جنگ" خطاب ملا، موصوف بڑے بذلہ سنج واقع ہوئے تھے، مہاراجہ سرکشن بہادر کی مسلمان بیٹی ان کے اکلوتے فرزند (بابر مرزا) کو بیاہی تھی۔ نواب منظور جنگ بہادر ہوش بلگرامی اور نواب شہید یار جنگ کی طرح روزانہ کے حاضر باشوں میں تو نہ تھے، مگر نظام ان کو بلاتے رہتے، اور اُن کی بذلہ سنجی سے لطف لیتے۔

حیدرآباد دکن کے دارالضرب (Mint) سے پرامیسری نوٹوں کی چوری ہوگئی تھی انہی دنوں نواب غازی یار جنگ بہادر جج ہائی کورٹ دربار شاہانہ میں حاضر ہوئے اور حضور کو یہ قصہ سنایا کہ میرا سو روپیہ کا نوٹ کھو گیا تھا، والد مرحوم (نواب عزیز جنگ بہادر) کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جو فارغ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سو روپیہ کا نوٹ میرے پیروں کے پاس پڑا ہے اس پر نواب منظور جنگ بہادر جھٹ بولے:

"حضور! اس کے باپ کی قبر کھدائی جائے، دارالضرب سے جو نوٹ چوری ہو گئے ہیں وہ وہاں مل جائیں گے۔"

اس پر نظام نے تحسین آمیز قہقہہ لگایا اور دربار میں خوش طبعی کی لہر دوڑ گئی۔

نواب میر عثمان علی خاں نے اپنی والدہ کے نام پر، اُن کے انتقال کے بعد

"عزاخانۂ زہرہ" تعمیر کرایا، اس عمارت کے نام ہی سے اُن کے عقائد کا پتا چلتا ہے۔ ایک دور ایسا آیا کہ اخبارات میں نظام کی جو غزلیں، فرمان اور شعروں پر فٹ نوٹ شائع ہوا کرتے تھے ان میں مذہبی عقائد کی بھی ترجمانی ہوتی تھی، اس نے اہلِ سنت و الجماعت میں برہمی پیدا کر دی۔ امیرِ ملت کے ایک مولانا (مصباح الاسلام فاروقی) اُن دنوں بلدہ حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے نظام دکن کے مذہبی رجحانات پر نقد و احتساب کیا، اس پر فرمان کے ذریعے مولانا موصوف کا حدودِ ریاست سے اخراج عمل میں آیا، اس نے فضا کو اور زیادہ مکدر بنا دیا، ریاست حیدرآباد دکن کے قانونچے میں یہ دفعہ درج تھی کہ حیدرآباد کے والی اور فرماں روا کا سنی اور حنفی العقیدہ مسلمان ہونا ضروری ہے، اس خوف سے نواب میر عثمان علی خاں تبدیلِ عقائد کا اعلان کرتے کرتے رُک گئے، مگر سُنا ہے کہ مرنے سے دو تین سال قبل انہوں نے جمعہ کی نماز کے لیے باغِ عام کی مسجد جانا چھوڑ دیا اور کھل کر "تشیع" کا اعلان فرما دیا، اسی لیے کراچی میں اُن کی وفات پر اُن کی رُوح کو ثواب پہنچانے کے لیے مجلسِ عزا برپا کی گئی۔

قرآن کریم میں "قصاص" کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے۔

"ولکم فی القصاص حیٰوۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون"

(عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم (اس) قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو)

مگر میر عثمان علی خاں بہادر کے ۳۶ سالہ دورِ حکومت میں کسی قاتل کو قصاص (قتل) کی سزا نہیں دی گئی، اس غلط روش کو جو جینی دھرم کی ترجمان و عکاس ہے، نظام جذبۂ رحم و کرم کی دلیل سمجھتے تھے، قاتلوں کو عدالتِ عالیہ سے مفتی کے فتوے کی توثیق کے ساتھ قتل کی سزا کا حکم سنایا جاتا مگر فرمانِ شاہی اُسے حبسِ دوام قید میں بدل دیتا۔

نظام کے محلات میں متعدد بیویاں بھی تھیں اور بہت سی خواصیں بھی۔ یہ خرابی بین الاختین تک پہنچ گئی تھی، زندہ اولاد ڈیڑھ درجن سے کیا کم ہوگی، شام کے وقت تین موٹر کاروں میں صاحبزادگان ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے۔ بادشاہ دُلہن سے دو لڑکے تھے، حمایت علی خاں اعظم جاہ اور شجاعت علی خاں معظم جاہ! یہ دونوں شہزادے اپنے مزاج و طبیعت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے! نواب اعظم جاہ شہسواری اور شکار

کے شوقین، نواب معظم جاہ کو شاعری اور گانے بجانے سے دلچسپی! نظام معظم جاہ کو زیادہ چاہتے تھے۔

نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں ابھی میرا آنا جانا نہیں ہوا تھا، اس زمانہ میں سید ناظر الحسن ہوشؔ بلگرامی نے (جو بعد میں جاکر ہوش یار جنگ بہادر ہو گئے) مجھ سے فرمایا کہ نواب اعظم جاہ بہادر کی طبیعت میں شعر و شاعری کی تھوڑی سی امنگ پیدا ہوئی ہے، تم ایک غزل لکھو، اور اس میں دانستہ طور پر ایک دو غلطیاں رہنے دو، یہ غزل اعظم جاہ اپنے نام سے نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ کے یہاں اصلاح کے لیے بھیجیں گے، میں نے ہوش بلگرامی کے کہنے پر غزل کہی اور وہ غزل حضرت جلیلؔ کی اصلاح کے بعد نواب اعظم جاہ بہادر کے نام سے اخبار میں شائع ہوئی!

ہوش بلگرامی میری ترقی اور منفعت کے لیے تجویز سوچتے تھے، مگر نہ جانے کیا بھید تھا کہ تھوڑی بہت جد و جہد کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا، یہی صورت یہاں پیش آئی کہ اس غزل کے بعد پھر انھوں نے اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہیں کیا اور میں نے بھی کسی قسم کی کوئی سلسلہ جنبانی نہیں کی!

نواب قدرت نواز جنگ بہادر خاندانی جاگیردار تھے۔ اب بھی بفضلہ بقید حیات ہیں برسوں نظم جمعیت کے ناظم رہے پھر محکمہ فوج کے معتمد (سیکرٹری) ہو گئے۔ بادشاہ دلہن یعنی حضور نظام کی ملکہ کے حقیقی بھائی، نظام کے برادرِ نسبتی اور نواب اعظم بہادر ولی عہد کے سگے ماموں! اعزاز اور جاہ و منصب کی اتنی بہت سی نسبتوں نے ان کی شخصیت کو بہت ممتاز اور نمایاں بنا دیا تھا، راقم الحروف کو موٹر کار بھیج کر اکثر اپنے یہاں بلاتے ان کا دسترخوان طرح طرح کے لذیذ کھانوں کے لیے مشہور تھا۔

نواب قدرت نواز جنگ بہادر نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ ولی عہد بہادر سے آپ کا ذکر آیا تھا وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، پھر ایک دن اعظم جاہ کے یہاں حاضر ہونے کا دن مقرر ہوا، نواب صاحب نے ولی عہد بہادر کی نذر کے لیے گیارہ روپے جو خوب اُجلے ہوئے تھے، قیمتی رومال اور سنہری لیس کا کمر پٹہ عنایت فرمایا، پھر ہم اعظم جاہ بہادر کی قیام گاہ —— بلادسٹا —— پہنچے، انہوں نے اپنی خوابگاہ (بیڈ روم) ہی میں بلا لیا، شب خوابی کا ملگجا سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔

"سرکار! ماہر کے بہت سے خریدار ہیں، ان کو مشکل ہی سے فرصت ملتی ہے، پھر یہ ہندوستان کے شہروں میں مشاعرے پڑھنے کے لیے بھی جاتے رہتے ہیں، بڑی مصروف زندگی ہے ان کی......" نواب قدرت نواز جنگ کی بات ختم نہ ہو پائی تھی کہ نواب اعظم جاہ بہادر بیچ میں بول پڑے۔

"ہاں! میں جانتا ہوں ان لوگوں کا یہی کنتھا رہتا ہے۔"

پھر انہوں نے فرمایا:

میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کسی اور دن تمہیں بلاؤں گا۔"

اس کے بعد آن کا اسلحہ خانہ راقم الحروف کو دکھایا گیا جس میں خلیفہ عبدالمجید خاں سلطان ترکی کے دیے ہوئے قیمتی خنجر وغیرہ تھے، نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں جو سلیقہ اور اہتمام دیکھنے میں آیا وہ اعظم جاہ بہادر کے یہاں نہیں دیکھا گیا۔ ولی عہد بہادر کی کوٹھی، اعظم جاہ کی قیام گاہ سے بہت بڑی تھی، ان کے اخراجات بھی چھوٹے بھائی سے بڑھ چڑھ کر تھے، مگر مکان کی آرائش اور نظم و سلیقہ اس درجہ کا نہ تھا۔

یہ اپنے اپنے ذوق طبیعت کی بات ہے

اعظم جاہ بہادر نے ایک بار شکار میں انتیس شیر مارے، ہوش بلگرامی سے انہوں نے فخریہ لہجہ میں فرمایا ـــــ ہوش! اتنے شیر ایک ہی شکار میں شاید ہی کسی شکاری نے شکار کیے ہوں، ہوش بلگرامی نے اس پر کہا ـــــ نہیں سرکار! آپ نے کچھ نہیں کیا، اس پر اعظم جاہ برہم ہونے لگے، اور ہوش اپنے لفظوں کو دہراتے رہے، پھر وہ بولے:

"سرکار! ایک شیر اور مار لیتے تو آپ تیس مار خاں ہو جاتے۔"

اس ظریفانہ نکتہ کو سن کر اعظم جاہ بہادر اس طرح پھڑک اٹھے، جیسے کوئی سخن سنج اچھے شعر کو سن کر بے اختیار ہو جاتا ہے۔

نواب اعظم جاہ بہادر کو اس کا بڑا غم تھا کہ میری عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گئی مگر تخت شاہی سے محروم ہوں۔ اُن کے والد میر عثمان علی خاں جب تخت نشین ہوئے ہیں اُن کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی، اس کے لیے وہ عاملوں سے وظیفے پڑھواتے منتیں مانتے، مولانا عبدالقدیر بدایونی کو ہر سال بغداد شریف بھیجتے، ایک بار اپنی پیشی کے ایک فوجی کپتان کو متحدہ ہندوستان کے تمام مزارات کی زیارت کے لیے بھیجا، اُن صاحب نے

مدراس سے لے کر پشاور اور کوئٹہ تک شاید ہی کوئی مزار اور آستانہ حاضری دیے بغیر چھوڑا ہو، اجمیر، پیرانِ کلیر، دلی، بدایوں، بہار، لاہور، پاک پٹن اور ملتان مزارات کے لیے مشہور ہیں۔ ان مقامات کے علاوہ کالپی، ردولی، امیٹھی، پھلواری، تونسہ اور چاچڑا ڈل جیسے کم مشہور مقامات کے مزاروں پر بھی حاضری دی۔ میرا قیاس نہیں، یقین ہے کہ ولی عہد کے بھیجے ہوئے یہ گماشتے میر عثمان علی خاں کی موت کے لیے دعا ہرگز نہ کرتے ہوں گے! سمع ہمایونی تک یہ خبریں پہنچتیں اس لیے نظام ولی عہد سے ناراض رہتے —— یہاں تک کہ مرنے کے چند سال پہلے اپنے پوتے (مکرم جاہ) کو اپنا وارث اور جانشین بنا دیا اور حکومت ہند نے اس تجویز کو سرکاری طور پر منظور کر لیا۔

نظام نے دلی کا سفر کیا تو راستہ میں مہاراجہ دتیا نے اُن کی ضیافت کا اہتمام کیا، نظام نے بھی اُن کو حیدرآباد بلایا اور مہاراجہ کی خاصی آؤبھگت کی، جس سفر میں نظام حیدرآباد دہلی کے بعد لکھنؤ تشریف لے گئے تھے، اُس سفر میں نواب رضا علی خاں، والیٔ رام پور کی درخواست پر چند گھنٹہ کے لیے نظام نے اپنے متعلقین اور لاؤلشکر کے ساتھ رام پور میں قیام فرمایا، نواب رام پور نے لاکھوں روپیہ شاہانہ ضیافت میں صرف کر دیا، خوشبو لگانے کے لیے نقرئی اور طلائی عطردان اُن کے سامنے پیش کیے گئے تو نظام نے وہ عطردان ہی رکھ لیے! نواب رام پور اس پر کہتے تو کیا کہتے۔

نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال بڑے رکھ رکھاؤ کے والیٔ ملک تھے، سر جوزف بھور وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے، جب وہ وہاں سے پنشن پر سبکدوش ہوئے تو نواب صاحب بھوپال نے اُن کو اپنے یہاں رکھ لیا۔ ریاست بھوپال آمدنی اور اپنی وسعت کے لحاظ سے اتنی بھاری تنخواہوں کی متحمل کہاں ہو سکتی تھی۔ اس قسم کے مصارف کے سبب سے ۲۵ سال قبل ریاست بھوپال کے مالی حالات اچھے نہ تھے، نواب بھوپال نے نظام حیدرآباد سے ذاتی طور پر بیس لاکھ روپیہ بطور قرضِ حسنہ مانگے، نظام نے اپنے ذاتی خزانہ سے قرض دینے کی بجائے یہ کارروائی بابِ حکومت میں بھیج دی۔ نواب بھوپال کو اس کا پتا چلا تو کبیدہ خاطر ہوئے اور اس کارروائی کو سرکاری سطح پر آگے چلنے سے رکوا دیا! مگر دوسری جنگِ عظیم میں نواب بھوپال نے تجارت کے ذریعہ بہت کچھ کمایا اور خاصے سرمایہ دار ہو گئے۔

ریاست حیدرآباد دکن کے قصر و ایوان اور سرکار دربار میں کبھی کبھار سازشیں بھی ہوتیں۔ سر علی امام نے حکومتِ دکن کی صدارتِ عظمیٰ کے فرائض انتہائی خلوص و فراست کے ساتھ انجام دیئے۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ حکومت حیدرآباد میں مسلمانوں کو باہر سے لاکر آباد کیا جائے تاکہ اُن کی آبادی کم سے کم ایک تہائی تو ضرور ہو جائے۔ اس کے لیے انہوں نے انگریزی حکومت سے گفت و شنید کا آغاز بھی کر دیا تھا، مدراس کے موپلوں کو حیدرآباد میں بسانے کی تجویز زیرِ غور تھی مگر اس بیل کے منڈھے چڑھنے سے پہلے، سر اکبر حیدری جو اُس زمانہ میں غالباً ہوم سیکرٹری تھے، اُن کی سازش کامیاب ہو گئی، اور سر علی امام کو استعفاء دے کر وطن واپس جانا پڑا۔ نواب نثار یار جنگ بہادر جو علی امام کی پیشی کے صدر منتظم تھے، راقم الحروف سے فرماتے تھے کہ علی امام نے استعفاء دینے کے بعد ریاست حیدرآباد کی حدود پار کرنے تک پانی نہیں پیا۔ علی امام کہا کرتے تھے کہ میں اس ریاست میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ سر علی امام مرحوم بڑے دیدہ ور اور صاحبِ فراست تھے، انہوں نے جو کچھ کہا تقسیمِ ہند کے بعد حیدرآباد اسٹیٹ میں وہی ہو کر رہا۔

حضور نظام نے جرأت کر کے علاقہ برار کی واپسی کے مسئلہ کو بھی اٹھایا مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لارڈ ریڈنگ ان دنوں ہندوستان کے وائسرائے تھے، انہوں نے بڑا سخت خط لکھا، جس میں یہ تک لکھ دیا کہ نظام حیدرآباد حکومت برطانیہ سے مساویانہ انداز میں مراسلت کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے۔

ایک صاحب تھے عبداللہ خاں کسمنڈوی، عجیب پُر اسرار شخصیت تھی اُن کی! نہ وہ خاندانی طور پر نواب تھے اور نہ حکومت نے اُن کو یہ خطاب دیا تھا، مگر اُن کے نام کے ساتھ "نواب" لکھا جاتا تھا، سننے میں یہ آیا کہ پرنس آف ویلز نے جب ہندوستان میں نزولِ اجلال فرمایا تو عبداللہ خاں صاحب نے اُن کو خیر مقدم کا برقیہ بھیجا، اور اس میں اپنے نام کے ساتھ "نواب" لکھا۔ پرنس آف ویلز کی پیشی سے شکریہ کا جو تار بھیجا گیا، اس میں "نواب" درج تھا۔ یہی تار اُن کی "نوابی" کے لیے سند بن گیا! یہ بھی سننے میں آیا واللہ اعلم اس میں کتنی اصلیت ہے کہ پرنس آف ویلز کے دورے میں نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی شریک و ہم سفر رہے، والیانِ ملک یہ سمجھتے رہے کہ وہ پرنس آف ویلز کے اسٹاف

میں ہیں اور پرنس آف ویلز کے اسٹاف والے اس گمان میں رہے کہ یہ والیانِ ملک کے نمائندے ہیں۔

جناب مُلّا واحدی دہلوی فرماتے تھے کہ ۱۹۱۲ء میں دلّی میں جب شاہی دربار ہوا تو عبداللہ کسمنڈوی کا خیمہ بادشاہ کی خواب گاہ سے بہت قریب تھا۔ آخری عمر میں باریابی حاصل کر کے اُن کو اس قدر متاثر کر دیا کہ حضور نظام کے یہاں اُنہیں کرسی ملنے لگی اور نظام سے ان کی بے تکلفی کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ نظام ان صاحب کو مسئلہ برار کے سلسلے میں جد و جہد کرنے کے لیے انگلستان بھیجنا چاہتے تھے، یہ دو چار لاکھ کا نہیں کروڑ دو کروڑ روپیہ کا ایرپھیر تھا، مگر غالباً سر علی امام کی مداخلت نے اس ڈرامہ کو اسٹیج نہیں ہونے دیا۔

قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناحؒ کے ساتھ کنگ کوٹھی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ جب بارگاہِ سلطانی میں پہنچے تو سگریٹ اُن کی انگلیوں میں تھی، حضور نظام نے اس پر انہیں ٹوکا، مسٹر جناح نے سگریٹ کو ہاتھ سے پھینکتے پھینکتے اُن سے یہ پوچھا کہ کیا ریزیڈنٹ یور ایگزالٹیڈ ہائی نس کے روبرو سگریٹ نہیں پیتا، نظام اس پر خاموش ہو گئے اور قائدِ اعظم بدستور سگریٹ پیتے رہے، نظام کو یہ بات خاصی ناگوار گزری مگر مسٹر جناح خود بے تاج کے بادشاہ تھے، نظام اُن کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

جینم بائی لے طائفہ کی ایک چھوکری نواب میر محبوب علی خاں مرحوم آصف جاہ سادس کے محل میں داخل ہوئی، میر عثمان علی خاں اسی کے بطن سے تھے، اور فرمانروائے وقت کے سب سے بڑے فرزند ہونے کے سبب ولی عہد قرار پائے! اُن کی ولی عہدی کے زمانہ میں ضلع بیدر میں نمائش ہونے والی تھی، اُس کے افتتاح کے لیے میر عثمان علی خاں —— وہاں تشریف لے گئے، اُن کے والد یعنی نواب میر محبوب علی خاں مرحوم نے انہیں پچاس ساٹھ ہزار روپیہ اس غرض کے لیے دیا کہ نمائش سے سامان خریدیں اور لوگوں کو انعام و اکرام عنایت فرمائیں مگر میر عثمان علی خاں نے اُن روپوں کو ہاتھ ہی نہیں لگایا، روپیوں کی یہ تھیلیاں جوں کی توں واپس آئیں بلکہ وہاں ہزاروں روپیہ کی جو نذریں ملیں وہ اس روپیہ پر مزید اضافہ تھیں! نواب میر محبوب علی خاں کو یہ تفصیل معلوم ہوئی تو بہت ناراض ہوئے، وہ لکھ لٹ تھے، اور یہ ایک ایک پیسہ کو دانتوں سے پکڑتے تھے، ہر باپ اپنے بیٹے میں اپنی اچھائیوں کی جھلک اور اپنی روایتوں اور خوبیوں کی نمود

دیکھنا چاہتا ہے، یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا باپ کی داد و دہش کی کوئی حد و انتہا نہیں تھی، وہ سخاوت میں شہرۂ آفاق اور بیٹا بخل میں آپ اپنی نظیر!

نواب میر محبوب علی خاں ان سے خفا رہنے لگے اور یہ خفگی اس حد تک پہنچ گئی کہ ولی عہدی کا مسئلہ موضوعِ غور و فکر بن گیا، حیدرآباد کے امرا کی ایک پارٹی جس میں سر مہاراجہ کشن پرشاد بھی شامل تھے، میر عثمان علی خاں کی مخالف تھی، اس نے اس کشمکش اور تلخی کو اور بڑھا دیا۔ راقم الحروف سے حیدرآباد کے بعض ثقہ لوگوں نے کہا کہ ۱۹۱۲ء میں دہلی میں جو شاہی دربار ہونے والا تھا اس میں نواب میر محبوب علی خاں اس منصوبہ کو ذہن میں رکھ کر شریک ہو رہے تھے کہ میر عثمان علی خاں کی ولی عہدی کو منسوخ کرا کے کمسن شہزادے صلابت جاہ بہادر کی ولی عہدی کا اعلان کریں گے، مگر میر عثمان علی خاں کی قسمت میں بادشاہ ہونا لکھا تھا، میر محبوب علی خاں کو ہیضہ ہوا اور وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے، ان کی وفات کے بعد میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے کہ یہی جائز وارث اور انگریزی حکومت کے منظور شدہ ولی عہد تھے۔

نواب میر عثمان علی خاں اپنے خدمت گاروں سے بھی زیادہ گھٹیا لباس پہنتے تھے۔ ڈاڑھی بڑھ جاتی، ترکی ٹوپی پر میل چڑھ جاتا، سرکاری طور پر جو فرمان نافذ ہوتے تھے وہ تو چکنے دبیز کاغذ پر خوشنویس کے لکھے ہوئے ہوتے مگر خود وہ جو کچھ لکھتے تھے اس کے لیے زیادہ تر سگریٹ کیس استعمال کرتے یا پھر اخباروں کا جو حاشیہ بغیر لکھا ہوا ہوتا ہے اُسے قینچی سے کاٹ کر کام میں لاتے یہ سب کچھ بخل کے سبب تھا۔ روپیہ پیسہ کو سینت سینت کر رکھنا اور اس میں "ہل من مزید" کی تمنا یہ اُن کی فطرت، عادت اور (Hobby) بن گئی تھی، ان کی کنجوسی کے قصے عام طور پر مشہور تھے: حیرت ہے کہ وہ بادشاہت کے ساتھ بخل کو کس طرح نباہتے تھے۔

وہ روزانہ کسی نہ کسی عہدیدار یا جاگیردار کو خاصہ بھیجتے رہتے جس کے یہاں خاصہ جاتا وہ دوسرے روز نذر لے کر حاضر ہوتا۔ خاصے میں عام طور پر تین سالن ہوتے، مقدار اتنی کہ ایک آدمی مشکل ہی سے سیر ہو سکتا تھا! کھانے لذیذ ہوتے خاص طور سے کوفتہ خاصے کی چیز تھا، میز خانہ شاہی کی بالائی لطافت اور لذت میں خوب سے خوب تر، نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں تقریباً روزانہ بالائی بھجواتے ہیں میں نے شاہی خاصہ بھی چکھا ہے اور بالائی سے بھی لذت اندوز ہوا ہوں۔ فلک نما کے قریب ایک تالاب ہے صرف اسی کا پانی پیتے، باہر سفر میں جاتے تو اسی تالاب کا پانی ریل کے

ذریعہ روزانہ بھیجا جاتا۔

اُن کی دولت کے بارے میں بہت سی باتیں بلکہ افسانے سننے میں آئے ہیں، ۱۹۱۲ء میں جب وہ تخت نشین ہوئے ہیں تو نواب میر محبوب علی خاں کی سخاوت اور فیاضی اور تعیش کے سبب صرفِ خاص کا خزانہ خالی تھا، صرفِ خاص کی آمدنی ڈیڑھ کروڑ کے قریب تھی، پچاس لاکھ روپیہ سالانہ ان کو حقِ شاہی کے طور پر ملتا، سال میں دو عیدیں اور سالگرہ کی ایک تقریب؛ ان تینوں موقعوں پر جو نذرانہ وصول ہوتا تھا وہ تقریباً چھ سات لاکھ ہونا چاہیے۔ یہ جو مشہور ہے کہ نظام حیدرآباد کے پاس اربوں کا سونا تھا۔ یہ لوگوں کے غلط اندازے ہیں، وہ تجارت کرتے تو اُن کی دولت بیشک اربوں تک پہنچ جاتی۔ جواہرات کے علاوہ اُن کی نقد جمع پونجی ساٹھ ستر کروڑ کی ہوگی! زوالِ حیدرآباد کے بعد جب وہ "اعلیٰ حضرت اور ظلِ سبحانی" کی بجائے صرف "راج پر مکھ" رہ گئے تو انہوں نے کروڑوں کا سونا ہندوستان کی حکومت کو قرض کے طور پر دے دیا۔ یہ کام انہوں نے اپنی خوشی سے کاہیکو کیا ہوگا، کئی کروڑ کے خانوادۂ شاہی کی گزر بسر کے لیے ٹرسٹ بنا دیئے۔ اس زمانہ میں سُنا ہے انہیں اس کا شوق ہوگیا تھا کہ نوجوانوں کو جنہیں "خانہ زاد" کہا جاتا تھا، منتخب کرکے اُن کی شادیاں کراتے اور اُن کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے مصارف اپنے خزانہ سے برداشت فرماتے، اس شوق میں اُن کا مذہبی مسلک بھی شریک تھا۔ خانہ زادوں کی اس پلٹن پر لاکھوں روپیہ ماہانہ کا خرچ ہوتا۔

یہ چراغ بھی بجھ گیا۔ حیدرآباد ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح ریاست نہیں، حکومت تھی۔ مُلک میں اس کا اپنا سکہ چلتا تھا جس میں پرامیسری نوٹ بھی شامل تھے، ڈاک خانہ اور ریلوے بھی اس کی اپنی تھی، حیدرآباد کے بعض جاگیردار ہندوستانی ریاستوں کے اور بعض نوابوں اور راجاؤں کی ٹکر کے تھے، حکومت کا فرمانروا مسلمان تھا جس کے سبب حیدرآباد میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو سیاسی برتری حاصل تھی مگر ہندوؤں کے ساتھ ریاست کا برتاؤ عادلانہ اور مشفقانہ تھا۔ ہندو مسلمانوں سے زیادہ خوشحال تھے، دیہات کا پورا نظم و نسق ہندو پٹواریوں اور پٹیلوں کے ہاتھ میں تھا، حیدرآباد دکن کے عہدیداروں کی سول لسٹ اس کی شہادت دے گی کہ حکومت کا صدر اعظم، دارالحکومت کا کمشنر پولیس، ہائی کورٹ کے دو جج اور وزیر ایک ہی وقت میں برسرِ کار تھے! قانونی طور پر گائے کی قربانی پر کوئی پابندی نہیں تھی مگر بلدۂ حیدرآباد میں گائے کی قربانی شاذ و نادر ہوتی تھی، بڑے جانور کا گوشت بلدۂ حیدرآباد کے مسلمانوں کی مرغوب غذا نہ تھی۔ جس کا بھی جی چاہتا

تو سکندر آباد سے جہاں انگریزی حکومت تھی، بڑے لاٹ کا گزشت ہول ہے آتا! اس وضع داری میں شاہِ وقت کا ایما بھی کارفرما تھا ——— میر عثمان علی خاں ——— ہز اگزالٹیڈ ہائی نس اور برطانیہ کے یارِ وفادار تھے، ان کی حیثیت نوابوں کی نہیں، بادشاہوں جیسی تھی، والیانِ ریاست اُن کو "سرکار" اور "حضور" کہہ کر خطاب کرتے! راقم الحروف نے بہت قریب سے ہز مجسٹی غازی شاہ عراق، شریف علی والیِ حجاز، موجودہ شہنشاہِ ایران اور شاہِ افغانستان کو دیکھا ہے مگر عثمان علی خاں کے چہرے سے جو شاہانہ رعب نمایاں تھا وہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ مرحوم کو اگر اچھا ماحول اور سازگار فضا ملتی تو وہ مسلمانوں کے جہاد کے کارناموں کو دہرا دیتے۔ اُن میں جرأت بھی تھی اور ساتھ ہی جوش و عزیمت اور دینی حمیت بھی! مذہب سے انہیں غیر معمولی شغف تھا، باغ عام کی مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد بے اختیار سجدے میں گر جاتے! جمعہ کے دن قرأت سننا اُن کے معمول میں داخل تھا۔ علماء دین کے قدر شناس تھے، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تقریر فرما رہے تھے، نظام اُس جلسہ میں تشریف فرما تھے۔ مولانا نے کہا کہ یہ میر عثمان علی خاں بادشاہِ وقت ہیں مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے جوتے کا تسمہ انہیں کہیں مل جائے تو یہ اُسے اپنے سر کا تاج بنا لیں گے! اس پر میر عثمان علی خاں نے والہانہ انداز میں "بیشک مولانا بیشک" فرمایا۔ اپنی والدہ کے احترام و مزاج داری میں انہوں نے ایک مثال قائم کر دی۔

بڑے جفاکش واقع ہوئے تھے، ایک سو چار بخار ہے اور کام کر رہے ہیں، اپنا بستر جھاڑنا، تکیہ رکھنا اس قسم کے کام وہ خود کرتے، اردو کا خط صاف اور دیدہ زیب تھا، حرفوں پر احتیاط کے ساتھ نقطے لگاتے اور تحریر کو "مشکول" (Punctuate) کرتے جاتے! دماغ کی یکسوئی اور ذہن و فکر کی ترتیب کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف وائسرائے ہند سے خط و کتابت میں چیف سکریٹری کو مشورہ دے رہے ہیں، دوسری طرف کسی ملازم کا کوئی بچہ بیمار ہے، تو اس کی خیریت پوچھ کر اُس کے لیے دوا تجویز فرما رہے ہیں۔

انہی کے دور میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور اردو کو انتہائی عروج نصیب ہوا، نظام ساگر اور دوسرے تالاب اور بند تعمیر ہوئے۔ عثمانیہ دواخانہ، ہائی کورٹ اور آصفیہ لائبریری کی خوبصورت عمارتیں بنیں، طبِ یونانی کو فروغ میسر آیا۔ عہدِ عثمانی نے حقیقت میں علم پروری اور معارف نوازی میں غرناطہ اور بغداد کی یاد کو تازہ کر دیا تھا، ترقی و تعمیر کی یہ اسکیمیں کوئی شک نہیں عمالِ حکومت ہی بناتے تھے، مگر اُن کی منظوری کا دارومدار تو "اعلیٰحضرت" ہی کی مرضی پر تھا! اُن کی منظوری کے بعد یہ اسکیمیں کاغذ سے عملی دنیا میں منتقل ہوتی تھیں۔

نواب میر عثمان علی خاں مرحوم کی وفات پر مسلمانوں کی تاریخ کے ایک قابلِ فخر باب کا خاتمہ ہو گیا ——— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ———

(ماہنامہ "فاران"، اپریل ۱۹۶۷ء)

مولانا نصر اللہ خاں عزیز

حیدر آباد دکن میں رہتے ہوئے پانچ برس ہو گئے تھے، ادبی ذوق کا تقاضا تھا کہ کسی رسالہ یا اخبار سے تعلق پیدا ہو جائے، شعر و ادب اور صحافت ہی کی طرف طبیعت کا رجحان تھا، سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) میں برسوں سے میرا کلام چھپ رہا تھا۔ ہر غزل کا عنوان "محسوساتِ ماہر" رہتا اور پھر پہلے مجموعۂ کلام کا یہی نام (محسوساتِ ماہر) رکھا گیا!!
سہ روزہ "مدینہ" میں ایک اشتہار نظر سے گزرا کہ بجنور سے "روزنامہ" مدینہ شائع ہو رہا ہے اُس کے لیے اسسٹنٹ ایڈیٹروں کی ضرورت تھی۔ میں نے اشتہار پڑھتے ہی مولوی مجید حسن صاحب مالک سہ روزہ "مدینہ" کی خدمت میں درخواست بھیج دی اور وہاں سے چند دن کے بعد منظوری آگئی کہ پچاس روپے ماہوار پر تمہارا تقرر کیا جاتا ہے۔
یہ ۱۳۲۲ھ یا (۱۹۳۴ء) کا واقعہ ہے۔ اب جبکہ بیالیس برس کے بعد روپیہ کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے، اُس وقت کے پچاس روپے آج کل کے ڈیڑھ ہزار روپے کے برابر تھے۔ شوکت تھانوی نے بھی اس جگہ کے لیے درخواست بھیجی تھی مگر وہ ساٹھ روپیہ ماہوار سے کم مشاہرے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

حیدر آباد دکن کے احباب سے میں نے اپنے جانے کا ذکر نہیں کیا یہاں تک کہ سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر صدرِ اعظم حکومتِ آصفیہ کو اس سے بے خبر رکھا۔ بلدۂ حیدرآباد میں مجھے کسی چیز کی تکلیف نہ تھی، کوئی ضرورت اور کام رُکنے نہ پاتا، علمی اور ادبی ماحول بھی میسر تھا مگر ادب و صحافت سے وابستگی اور کام کرنے کا شوق ان تمام سہولتوں پر غالب آیا اور مجھے کشاں کشاں دکن سے بجنور لے گیا۔

رمضان کا مہینہ تھا اور جاڑے کی رُت تھی میں اسٹیشن سے سیدھا مدینہ منزل پہنچا مولوی مجید حسن نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا، یہ شب کا وقت تھا، تھوڑی ہی دیر میں انڈے کا گرم حلوا اور چائے آگئی۔ دوسرے دن صبح کے وقت مولانا نصر اللہ خاں عزیز (بی۔ اے) سے تعارف ہوا جو سہ روزہ مدینہ کے ایڈیٹر تھے اُ

کئی برس سے کام کر رہے تھے! اُن کے اسسٹنٹ مولانا حامد الانصاری غازی[1] تھے جو سہ روزہ مدینہ میں "شذرات" لکھتے تھے اور عرب ممالک کی اہم خبروں کی تلخیص اُن سے متعلق تھی۔ یہ تلخیص سہ روزہ "مدینہ" کے پہلے صفحہ پر جگہ پاتی۔ تیسرے صاحب مولانا مجید حسن کے بڑے داماد حمید حسن صاحب تھے جو سہ روزہ مدینہ کی ادارت میں شامل تھے ان کی تعلیم ساتویں آٹھویں کلاس سے زیادہ نہ تھی مگر بے حد ذہین اور طبیعت بڑی اخاذ پائی تھی۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز سے پہلے بدر جلالی (بی اے علیگ) سہ روزہ مدینہ کے ایڈیٹر تھے۔ حمید حسن صاحب بدر جلالی مرحوم کے تربیت یافتہ تھے اور مولوی مجید حسن کے گھریلو معاملات میں بہت کچھ دخیل تھے!

جوانی کا زمانہ رسالوں اور اخباروں میں میرا کلام اور مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ صحافت کا تجربہ نہ تھا مگر اس کا غرّہ تھا کہ قلم کے زور سے صحافتی ذمہ داری کو نباہ لوں گا۔ مولانا عزیز نے سر سیموئل ہور کا ایک انگریزی بیان ترجمہ کے لیے دیا۔ سر سیموئل ہور ان دنوں لندن کے سیکرٹریٹ میں برطانوی ہند سے متعلقہ امور کے مشیر تھے۔ میں نے اس انگریزی تقریر کو بار بار پڑھا مگر میرے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ انگریزی الفاظ میرے لیے نامانوس اور اجنبی نہ تھے لیکن عبارت کے جملوں کا ٹھیک طور پر ترجمہ کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں اپنا غم لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا اور یہ خلش مجھے بے چین کیے ہوئے تھی کہ روزنامہ "مدینہ" میں میری کارکردگی ناکام ہو گئی تو میرا ادبی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز میری مشکلات کی تہہ کو پہنچ گئے۔ انہوں نے شفقت و محبت کے انداز میں کہا آپ بددل نہ ہوں شروع شروع میں ہر نئے مترجم کو دشواری پیش آتی ہے۔ پھر انہوں نے

---

[1] مولانا حامد الانصاری غازی کم و بیش تینتیس برس سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند سے ان کا تعلق اور بمبئی کے مسلمان سرمایہ داروں سے اُن کے روابط ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد راقم الحروف تین بار مشاعروں میں شرکت کی غرض سے بمبئی گیا، مولانا حامد الانصاری سے ملاقاتیں رہیں۔ ایک بار اپنے یہاں کھانے پر بھی بُلایا! معاشی طور پر وہ خوش حال نہیں تھے بس گزر ہو جاتی تھی۔ جب وہ سہ روزہ "مدینہ" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تو اُن کی دوسری شادی مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صاحبزادی سے ہوئی اپنی اہلیہ کی سلیقہ مندی، اور بچوں کی اچھی تربیت کی تعریف کرتے

مجھے بتایا کہ اخبار میں لفظی ترجمہ سے کام نہیں چلتا۔ عبارت کے مفہوم کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ انہوں نے ایک دو جملوں کا ترجمہ کیا اور فرمایا کہ بعض اوقات انگریزی کے ایک جملہ کی ترجمانی کے لیے اردو کے دو تین فقروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی ہمت افزائی اور رہنمائی نے بہت کچھ سہارا دیا اور میں خبروں کا ترجمہ کرنے لگا۔ ایک مہینہ کی مشق میں دوسرے مشاق و تجربہ کار مترجموں کی طرح میرے ترجمہ میں روانی آگئی اور یہ فولاد میرے لیے پانی ہو گیا۔

خبروں کے ترجمہ کے علاوہ روزنامہ "مدینہ" میں مراسلات اور ادبی صفحہ مجھ سے متعلق تھا۔ اس کے ساتھ ہی بچوں کا رسالہ "غنچہ" کی ادارت بھی مجھے تفویض کی گئی۔ چھ مہینہ مولانا عزیز کی رفاقت کی سعادت میسر آئی۔ کئی کئی گھنٹہ مسلسل ساتھ رہتا۔ مرحوم بڑے ملنسار اور خوش مزاج تھے وہ پکے اور پورے کانگریسی اور میں نیم کانگریسی، اس لیے بعض سیاسی مسائل پر بحث بھی ہو جاتی مگر اس بحث میں کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ جہاں تک برطانوی حکومت اور انگریزی سامراج سے نفرت و بیزاری کا تعلق تھا اس میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کم نہ تھے۔

میں جس مکان میں رہتا تھا وہ "مدینہ منزل" سے بہت قریب تھا اور مولوی مجید حسن اس مکان کے مالک تھے۔ اس کا کرایہ مجھے دینا نہیں پڑتا تھا۔ "مدینہ اخبار" کا ایک ملازم گھر کا سودا سلف لے آتا۔ چار بجے سے پہلے ٹرین بجنور پہنچتی تھی اس میں ایسوشی ایٹڈ پریس کی خبروں کا بنڈل آتا اور ہم تین کارکن (حمید حسن، صلاح الدین بہاری اور راقم الحروف) خبروں کا ترجمہ شروع کر دیتے۔ جاڑے کا زمانہ تھا دہکتی ہوئی انگیٹھیوں پر تاپ کر لکھنا پڑتا۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے اخبار کے لیے دو ڈھائی صفحہ کا مضمون ہم تیار کر لیتے۔ صبح سویرے میرے گھر سے ڈیڑھ پاؤ خالص دودھ اور اس میں پانچ چھ انڈوں کی زردی حل کی ہوئی، دفتر میں آجاتی۔ انڈوں کی سفیدی تھوڑے سے گھی میں تلی ہوئی اور اس پر نمک اور پسی ہوئی سیاہ مرچیں چھڑکی ہوئیں ـــ اُس وقت ارزانی کا یہ عالم تھا کہ خالص دودھ دو ڈھائی آنہ سیر اور انڈے دو پیسہ کے تین! اب یہ باتیں خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا نصراللہ خاں عزیز اور مولانا حامد الانصاری غازی کو بھی "مدینہ اخبار" کی

طرف سے مکان دیے گئے تھے۔ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے ہمسایے تھے۔ مگر سوءِ اتفاق کہیے یا شوخیٔ اتفاق کہ طوائفوں کے کوٹھے ان مکانوں سے ملے ہوئے تھے اس لیے "سر دردِ ہمسایہ" سے بچنا ممکن نہیں تھا۔

ایک صاحب جو قصبہ چاندپور کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، مولانا نصراللہ خاں عزیز کے ساتھ جیل خانے میں رہے تھے وہ انہیں "رفیق سجن" کہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی اور ہم چار رفقا کی ایک رات اسی گاؤں میں بسر ہوئی۔ ہمارے میزبان نے بڑی آؤ بھگت کی، اس دعوت کی خاص چیز رساول تھی۔ قصبہ چاندپور اس نواح میں کھدر کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں سے ہم نے اچھے قسم کا کھدر مول لیا۔

روزنامہ "مدینہ" جب شروع شروع میں نکلنا شروع ہوا تو ایک دعوت میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں صرف خشکہ اور ماش کی دال تھی۔ ماش کی دال میں مرچوں کی وہ کثرت کہ میں تو پہلے ہی نوالے پر تلملا کر رہ گیا اور سی سی کرنے لگا، مگر مولوی مجید حسن، مولانا عزیز اور دوسرے لوگوں نے بڑے شوق سے کھانا کھایا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ بجنور کا خاص کھانا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یہاں کا یہ "خاص کھانا" ہے تو عام کھانا کیا ہوگا؟ بجنور کی دو خصوصیتیں اور تھیں، ریلوے اسٹیشن تھا مگر پلیٹ فارم ندارد۔ گھنٹہ گھر کی عمارت بنی ہوئی تھی مگر اس میں گھنٹہ نہیں تھا۔

مولانا نصراللہ خاں عزیز کا خط خاصا خوبصورت تھا۔ روزنامہ "مدینہ" نکلنے کے بعد اُن کی مشغولیت بہت بڑھ گئی تھی۔ روزنامہ کے لیے روزانہ اداریہ اور مزاحیہ کالم اور سہ روزہ "مدینہ" کے لیے ہفتہ میں دو لیڈر اور دو "سرراہے" لکھتے۔ سفید کاغذ کے لانبے تراشے (SLIPS) ایڈیٹروں کو لکھنے کے لیے دیے جاتے۔ مولانا نصراللہ خاں عزیز کا اتنا صحیح اندازہ ہوتا کہ ان کے لکھے ہوئے تراشوں کے اداریے عام طور پر ٹھیک کالموں کی جگہ پورا کر دیتے۔ شاید ایک سطر بھی گھٹنے اور بڑھنے نہ پاتی۔

روزناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت خبروں کی ہوتی ہے۔ روزنامہ "مدینہ" اس معاملہ میں دوسرے اخباروں سے پیچھے تھا: بجنور چھوٹی لائن پر واقع ہے دلی سے چلی ہوئی خبریں کئی گھنٹہ بعد بجنور پہنچتیں اور دوسرے اخباروں کے مقابلہ میں ایک

دن بعد باسی خبریں چھپتیں۔ مولوی مجید حسن کو مشورہ دیا گیا کہ اخبار کے مضامین تو پسند کیے جاتے ہیں مگر خبروں کی کمی اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ مرادآباد، بریلی یا دلی کو اخبار منتقل کر دیا جائے، اس کے لیے مولوی مجید حسن تیار نہیں ہوئے۔ ان کے لیے خاصی دشواریاں بھی تھیں چنانچہ چھ مہینے کے بعد روزنامہ "مدینہ" بند کر دیا گیا۔

نصر اللہ خاں عزیز، حامد الانصاری غازی اور حمید حسن سہ روزہ "مدینہ" میں بدستور کارگزار رہے۔ سید صلاح الدین بہاری اور راقم الحروف کو علیحدہ ہونا پڑا کیونکہ ہماری ملازمت کا تعلق صرف روزنامہ "مدینہ" سے تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۰ء میں پھر مولانا عزیز سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ اُن کے صاحبزادے ظفر اللہ خاں نے مشاعرے کی دعوت دی۔ یہ مشاعرہ غالباً اسلامی جمعیتہ طلبہ کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ ظفر اللہ خاں ان دنوں بی۔اے یا ایم۔اے میں بڑھتے تھے۔ میرا قیام نصر اللہ خاں عزیز ہی کے مکان پر رہا، دو تین دن ان کے یہاں ٹھہرا، سیر چشمی کے ساتھ میزبانی کی گئی، اس مشاعرے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی شریک تھے مگر پیرانہ سالی کے سبب ضعف کا وہ عالم کہ ہاتھ کپکپاتے تھے۔ مشاعرہ خاصا کامیاب رہا۔ اس کے بعد خاں صاحب سے کراچی یا لاہور میں ملاقات ہوتی رہتی۔ کراچی میں کئی برس سے وہ اپنی صاحبزادی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ مرحوم فون پر اپنے کراچی پہنچنے کی راقم الحروف کو اطلاع دیتے۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز بلند پایہ صحافی، شگفتہ قلم ادیب، صاحب طرز طنز نگار اور خوش گو شاعر تھے، اُن کی تقریر بھی اثر انگیز ہوتی تھی۔ اب سے چالیس پیالیس برس پہلے کان پور کے پریڈ میدان میں ہر سال سیرت کا عظیم الشان اجتماع ہوتا تھا، مولانا عزیز کو اس اجتماع میں تقریر کی دعوت دی جاتی۔ مرحوم بجنور سے کان پور تشریف لاتے اور اپنی تقریر کا عوام و خواص کے دلوں پر نقش قائم کر دیتے۔ تحریر و انشاء پر اتنی قدرت کہ سہ روزہ "مدینہ" کا سنجیدہ اداریہ لکھنے کے بعد، مزاحیہ کالم تحریر فرماتے اور سنجیدگی و مزاح کی ادبی خوبیاں اور خصوصیتیں قائم رہتیں۔

زبان و بیان پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی، وہ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کی صف کے صحافت نگار تھے۔ فکر و فن کی ان خوبیوں کے باوجود طبیعت میں انکسار تھا۔ اپنے بارے میں بہت کم کہتے دوسرے فنکاروں کا ذکر زیادہ کرتے۔ بجنور ہی کے زمانہ

ادارت کا واقعہ ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں "گڑی ہوئی لاشیں اکھیڑنا" لکھا۔ میں نے عرض کیا روزمرہ "گڑے ہوئے مردے اکھیڑنا" ہے۔ کسی تاویل و توجیہہ اور تامل کے بغیر میری بات مان لی۔

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو شعر گوئی کی وافر صلاحیت عطا فرمائی تھی مگر ان کی یہ صلاحیت تحریر و انشاء اور صحافت کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں نہ ہو سکی۔ اپنے دوسرے صحافتی اور ادبی مشاغل کے مقابلہ میں انہوں نے خود بھی شاعری کو دوسرا نمبر اور ثانوی حیثیت دے رکھی تھی۔

بجنور شہر میں کوئی مسلمان ڈپٹی کلکٹر تھے جو مرحوم ہو چکے تھے اُن کی حویلی میں مشاعرے ہوا کرتے تھے طرحی بھی اور غیر طرحی بھی! مولانا عزیز مرحوم بھی ان مشاعروں میں شرکت فرماتے اور اپنا کلام سناتے مگر پابندی کے ساتھ نہیں۔ ان کی شرکت گنڈے دار ہوتی!

انگریزی دورِ حکومت میں جب وہ جیل بھیج دیے گئے اور قید بامشقت کی سزا تجویز ہوئی تو انہیں بانس کی تیلیاں چھیلنے کے لیے دی گئیں۔ "تیلیوں" پر انہوں نے بڑی اچھی نظم کہی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان تیلیوں کو لیلیٰ کی انگلیوں سے تشبیہہ دی۔ اس طرح ایک خشک و جامد شے میں "جمالیات" کا لطف پیدا کر دیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی دوبار قید و بند میں رہے اور اہلِ قلم کے لیے صبر و استقامت کی روشن مثال چھوڑی۔

اس بات کو آٹھ دس برس ہو رہے ہیں۔ ان کے کلام کا مسودہ میرے پاس آیا۔ میں نے اس کا انتخاب کیا، وہ مسودہ کلام جس ذریعہ سے آیا تھا میں نے وہاں لکھ کر یا کہلوا کر بھیج دیا کہ آپ پہلے میرا یہ انتخاب شائع کر دیں اُس کے بعد آپ مولانا عزیز کا پورے کا پورا مجموعۂ کلام چھپوائیں۔ مگر میری گزارش کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا، اُن کا پورا مسودۂ کلام چھپا لیکن "فاران" میں تبصرے کے لیے نہیں بھیجا گیا! حیرت ہے کہ لوگ کیفیت (Quality) پر کمیت (Quantity) کو ترجیح دیتے ہیں اور اشعار کے انتخاب کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہوئے تو مرتے دم تک یہ تعلق قائم رہا۔ جماعت کے بعض اکابر جماعت سے علیحدہ ہوئے، ان کی علیحدگی نے بعض

دوسرے ارکان کو بھی مذبذب سا کر دیا مگر یہ "مذبذب و ذہول" بھر جاتا رہا لیکن مولانا عزیزؔ کی استقامت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ اُن کا اخلاص، دینداری اور اسلام سے محبت قابلِ رشک تھی۔ چہرہ نورانی، گفتگو دلچسپ، نشست و برخاست نستعلیق! طبیعت میں مزاح بھی تھا مگر سنجیدہ و شگفتہ! —— اُن سے آخری ملاقات نومبر ۱۹۷۵ء کے آغاز میں ہوئی۔ ایک مشاعرے کے سلسلہ میں میرا لاہور جانا ہو گیا۔ جناب الطاف حسن قریشی مدیر "اردو ڈائجسٹ" نے اپنے یہاں عشائیہ اور بزمِ سخن کا اہتمام کیا۔ پہلی شفٹ میں مولانا نصر اللہ خاں عزیزؔ اور راقم الحروف نے ایک ہی میز پر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے میں ہلکے پھلکے لطائف و ظرائف بھی رہے! مرحوم نے ترنم کے ساتھ اپنا کلام سنایا مگر بزمِ سخن کے آغاز ہی میں اپنا کلام سنا کر چلے گئے۔ بس اس کے کئی مہینہ بعد اخباروں میں اُن کی وفات کی خبر پڑھی اور چالیس برس کی تاریخ ایک ایک فلمی منظر کی طرح نگاہوں کے سامنے آگئی! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران"، ستمبر ۱۹۷۶ء)

مولوی عزیزالحق

دلی کی سبزی منڈی کا علاقہ بہت وسیع ہے۔ اس کے ایک محلہ کا نام شورہ کوٹھی ہے یہیں سے جامع مسجد کے لیے ٹرام جاتی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل ڈھائی تین برس میں اسی محلہ میں رہا ہوں، شورہ کوٹھی سے آدھ میل پر برلا مل کے قریب میں نے ادھ بنا مکان خرید کر بنوایا تھا اور جب اس مکان کی تعمیر آخری مرحلہ میں تھی تو دلی چھوڑنی پڑی، اور میں پاکستان چلا آیا۔ وہ جو کسی شاعر کی غزل کا مشہور مصرع ہے ؎

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

تو میرے زیر تعمیر نشیمن کو آگ تو نہیں لگائی گئی مگر اس میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔

شورہ کوٹھی میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی، اس محلہ کے مسلمانوں نے مجھے بتایا کہ مولانا احتشام الحق تھانوی آپ کے یہاں آنے سے پہلے اس مسجد کے پیش امام تھے۔ اب وہ سیکرٹریٹ (نئی دہلی) جامع مسجد کے خطیب و امام ہیں۔ اُن کے بڑے بھائی سیکرٹریٹ میں سینئر آفیسر ہیں! یہ سینئر آفیسر مولوی عزیزالحق صاحب تھے۔ جب وہ پاکستان آئے ہیں تو ہندوستان کے سیکرٹریٹ میں غالباً اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔

مولوی عزیزالحق صاحب سے پاکستان بننے کے دو تین برس بعد ملاقات ہوئی اور پھر ان کی وفات سے کچھ دن پہلے تک ملنے جُلنے کے مواقع ملتے رہے! ان کے نورانی چہرے کو دیکھ کر ہی دل اچھا اثر قبول کرتا تھا، اپنی دیانت، محنت اور فرض شناسی کی بدولت جوائنٹ سیکرٹری کے مساوی عہدے تک ترقی کی، جس جگہ بھی رہے نیک نام رہے۔ خیر پسند طبیعت پائی تھی، کسی ضرورت مند کی کارروائی اور معاملے میں روڑے نہیں اٹکاتے تھے، اُن کے جو کچھ بس میں تھا اُس سے دریغ نہ کرتے۔ کے۔ ڈی۔ اے میں چیئرمین کے بعد انہی کا سب سے بڑا عہدہ تھا۔ ملازمت کا مسئلہ ہو یا پلاٹس کا معاملہ، راقم الحروف کی گزارش اور سفارش کو انہوں نے کبھی نہیں ٹالا۔

مولوی عزیز الحق مرحوم حکیم الامت حضرت مولینا اشرف علی تھانویؒ کے بھانجے تھے، اُن کا وطن کیرانہ تھا، اس لیے اپنے نام کے ساتھ انہوں نے تھانوی کبھی نہیں لکھا۔ کتابی چہرے پر ڈاڑھی خوب بہار دیتی تھی، دین ان کی گھٹی میں پڑا تھا، صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند، گھر میں پردے کا پورا اہتمام! اولاد کی تربیت دینی اخلاق کے خطوط پر کی! اس اپنی دینداری بلکہ یوں کہنا چاہیئے مولویت کے باوجود دفتری کام میں بڑے بڑے "مسٹروں" پر فائق تھے ان کے دفتر کے اہل کاروں نے بتایا کہ مولوی عزیز الحق کی انگریزی اونچے درجہ کی ہے جو نوٹ مسل میں لکھ دیتے ہیں بس وہ حرفِ آخر ہوتا ہے۔

شاعری کا بھی شوق تھا، غزلیں بھی کہتے اور اصلاحی نظمیں بھی! ان کے صاحبزادے سولہ سترہ برس سے نیر دہلی میں ڈاکٹری کرتے تھے اُن سے ملنے کے لیے گئے تو وہاں میری نظم "قرآن کی فریاد" سن کر اسی بحر اور زمین میں نظم کہی! مسٹر ابوطالب نقوی جب محکمہ ڈیفنس میں جوائنٹ سکرٹری تھے تو ان کی کوٹھی پر الہ آباد یونیورسٹی کے طلبۂ قدیم کا ایک اجتماع ہوا جس میں عشائیہ کے علاوہ مشاعرہ بھی شامل تھا، مولوی عزیز الحق مرحوم نے اپنی ایک غزل ترنم کے ساتھ سنائی، اُس غزل کا ایک مصرع تھا ؎ دل حریصِ نگاہِ ثانی ہے

میں نے برجستہ عرض کیا "نگاہِ ثانی" کیا؟ یوں کہیئے :؎ دل حریصِ نکاحِ ثانی ہے
اس پر قہقہوں کی گونج اٹھی اور مولوی عزیز الحق بھی ہنس پڑے

وہ مشاعروں کے شاعر نہیں تھے مگر مشاعروں اور شعری نشستوں میں شریک ہونے اور کلام سنانے کا شوق تھا! شاعر کسی درجہ کا بھی کیوں نہ ہو وہ اپنی ذات کے بارے میں خاصا خوش فہم ہوتا ہے!

ملازمت ہی کے زمانے میں اُن پر دل کا دورہ پڑا، پھر فالج کا اثر بھی ہو گیا مگر علاج معالجہ سے اچھے ہو گئے لیکن تیور بجھے بجھے سے رہتے، دوا اور پرہیز کے بڑے پابند تھے مگر موت کا کوئی علاج نہیں، جب یہ آتی ہے تو پلک جھپکنے کی بھی مہلت نہیں دیتی یہ جانتے ہوئے کہ موت یقینی ہے اور ایک نہ ایک دن مرنا ہے سو سال کا بوڑھا بھی مرنا نہیں چاہتا۔

مولوی عزیز الحق کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی، اُن کی جان لیوا علالت کا راقم الحروف کو کوئی علم نہ تھا، اپنے پسماندگان کو انہوں نے ترفہ و خوشحالی کے عالم میں اور گھر کو بھرا پُرا چھوڑا۔ برزخ و حشر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت ان کی حامی و ناصر رہے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران"، جون ۱۹۷۶ء)

مولانا سیّد عطاءُاللہ شاہ بُخاری

میری جوانی کا زیادہ تر حصّہ حیدر آباد دکن میں گزرا ہے، یو۔پی، پنجاب، بہار اور دوسرے صوبوں کے مشاہیر کے حالات اور خبریں، دکن ہی میں دوسروں کی زبانی سُنا کرتا تھا، مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریر و خطابت کی شہرت میں نے وہیں سُنی، اور تواتر کے ساتھ اہلِ علم کی زبانی سُنی، اخبارات میں بھی اُن کا ذکر آتا تھا، دل چاہتا تھا کہ شاہ صاحب (مرحوم) سے ملوں، بات چیت کروں اور اُن کی تقریر سُنوں! مگر شاید میری یہ تمنّا خام تھی، اس لیے مشیت کا ایما، تھا:۔

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

میں حیدر آباد دکن سے اپنے وطن سال کے سال آیا کرتا تھا، ایک بار اپنے ایک عزیز کے یہاں علی گڑھ میں آکر ٹھہرا، تو ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پرسوں مسلم یونیورسٹی میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریر تھی۔ یہ خبر سُن کر اپنی محرومی پر افسوس ہوا کہ میں آج کی بجائے، دو دن پہلے آجاتا، تو شاہ صاحب کی تقریر سننے کا ارمان پورا ہوجاتا، یہ میں بائیس برس پہلے کی بات بیان کر رہا ہوں۔

اُن صاحب نے بتایا کہ شاہ صاحب کی خطابت نے سُننے والوں پر جادو سا کر دیا، خاصی طویل تقریر فرمائی، مگر سامعین نے ذرا سی بھی اُکتاہٹ محسوس نہیں کی، شاہ صاحب نے فرمایا:۔

"سیفٹی ریزر سے گالوں کو کھُرچنے سے جوانی ظاہر نہیں ہوتی، جوانی تو وہ ہے جو رُخساروں کے بال بال سے پھُوٹ نکلے ......"

طلبا، اور پروفیسروں کی غالب اکثریت "ڈاڑھی مُنڈوں" کی تھی، شاہ صاحب کے یہ جُملے سُن کر وہ نادم سے ہو گئے، اور کسی کسی کے تو سُنا ہے کہ ماتھے پر پسینہ آگیا۔

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم، جو خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی تقریر سننے کا اشتیاق رکھتے تھے، ایک بار انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا آزاد سے ٹرین میں ملاقات ہوگئی، کئی گھنٹے اُن کا ساتھ رہا، میں نے اُن سے "اجتہاد" کے بارے میں دریافت کیا، بولے:۔

"نواب صاحب! اگر دین میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "سعادت و فلاح" کی راہ میں دیواریں کھڑی کر دی گئیں ...."

نواب صاحب مرحوم نے فرمایا کہ مولانا آزاد کی بات چیت ہی میں "تقریر و خطابت" کا لُطف آ گیا۔ مگر نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی، خود شاہ صاحب بھی نواب صاحب سے ملنے کی تمنا رکھتے تھے!

بعض اربابِ ذوق شاہ صاحب مرحوم کے جُملوں کی نقل اُنہی کے لہجہ میں کرتے، ایسی باتوں نے میری آتشِ شوق کو اور تیز کر دیا۔ ایک صاحب نے بیان کیا کہ گونڈے میں شاہ صاحب نے عشاء کے بعد تقریر شروع کی ہے، تو فجر کے وقت یہ شعر ؎

محفل خموش، صبح کے آثار جلوہ گر
اب حکم ہو تو ختم کروں داستاں کو میں

اپنے مخصوص دل کش ترنم میں پڑھا اور تقریر جب ختم کی ہے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا، اور لوگ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کا سامعہ صبح تک رات بھر "کوثر و تسنیم" میں ہلکورے لیتا رہا ہے —— "خطابت شاہ صاحب کی کرامت تھی!"

(غالباً) ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں میرا لائل پور[1] جانا ہوا، اور وہاں جا کر یہ مژدہ ملا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں! جناب انور صابری پہلے سے لائل پور میں براجمان تھے، وہ شاہ صاحب سے مل بھی چکے تھے، میں نے شاہ صاحب کا ذکر چھیڑا تو بولے، میں تمہیں لے کر ابھی ابھی شاہ صاحب کی قیام گاہ پر چلوں گا، وہ بھی تم سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب مرحوم کے یہاں جو پہنچنا ہوا، تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، اور خوب بھینچ بھینچ کر بغل گیر ہوئے۔ اُن کی اس پذیرائی، غیر معمولی شفقت اور خُرد نوازی کو دیکھ کر میں "فرشِ پا انداز" ہوا جاتا تھا۔ بیٹھتے ہی بولے:۔

---

[1] اب اس کا نام فیصل آباد ہو گیا ہے۔ (ت۔م)

"..... تمھارے شعروں سے میں کیا کام لیتا ہوں ..... یہ میری تقریروں سے معلوم ہوگا۔"

پھر اُن کے ایماء پر شعر خوانی ہوئی، ایک غزل سُنا چکتا، تو دوسری کے لیے فرمائش کرتے، داد دینے کا انداز والہانہ تھا، میں نے زندگی میں بہت ہی کم لوگوں کو اتنی صحیح اور معقول داد دیتے ہوئے دیکھا ہے!

دوسرے دن شام کو شاہ صاحب کی تقریر تھی، اُن کی تقریر سُننے کا اشتیاق کشاں کشاں مجھے جلسہ گاہ میں لے گیا، شاہ صاحب نے تقریر کے آغاز ہی میں فرمایا:۔

"دو آدمیوں کی دو تمنائیں تھیں ..... ایک کی تمنا پوری ہوگئی یعنی میں نے ماہر القادری کا کلام اُن کی زبان سے سُن لیا، ماہر القادری میری تقریر سننے کی تمنا رکھتے ہیں، مگر میں اتنے بہت سے پنجابی بولنے والوں کو نظر انداز کرکے صرف اُن کے لیے "اردو" میں تقریر کیسے کروں؟! مگر پھر بھی میں اپنی تقریر میں ماہر القادری کے ذوق و تمنا کی رعایت ملحوظ رکھوں گا۔"

حضرت شاہ صاحب نے ملی جلی" اردو اور پنجابی" میں تقریر کی، یہ غالباً اُن کا پہلا تجربہ تھا، زبان کی اس دورنگی اور "دوعملی" نے تقریر میں خاصا تکلّف پیدا کردیا، اتنے میں ایک صاحب کار لے کر مجھے لینے کے لیے آگئے۔ ڈپٹی کمشنر کے یہاں شاعروں کا ایٹ ہوم تھا۔

اس واقعہ کے کوئی دو ڈھائی سال بعد، دلّی میں شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان ایک پوسٹر میں نظر سے گزرا، میں رات کو ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں پہنچا، ہزاروں کا مجمع پہلے سے موجود تھا اور لوگ آئے چلے جارہے تھے، شاہ صاحب نے کلام پاک کی تلاوت کے بعد میرؔ کے اس شعر سے اپنی تقریر کا آغاز کیا ؎

اک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

یہ وہ زمانہ تھا جب وہ مسلم لیگ کے شدید مخالف تھے اور سیاست میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے مسلک کے پورے پورے مُتبع اور مُقلد تھے، شاہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"... اتنا بڑا مجمع ——— کہ یہاں سے تھالی اُچھال دوں، تو شاید ایک فرلانگ تک وہ تھالی سروں ہی پر اُچھلتی اور تیرتی رہے ——— مگر میں سُننے والوں کی اِس بھیڑ سے کچھ خوش نہیں ہوں، تم لوگ کانوں کے عیاش ہو.... تم تقریر کے چٹخاروں کی خاطر یہاں آئے ہو..... دوسرے کیمپ والوں کا جلسہ ہوتا ہے، تو وہاں بھی تم اسی ذوق و شوق کے ساتھ جاتے ہو....."

شاہ صاحب نے جب تقریر ختم کی ہے، تو تین گھنٹے ہو چکے تھے، مگر محسوس یہ ہو رہا تھا کہ تقریر شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ شاہ صاحب کی شگفتہ بیانی نے وقت کی طوالت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا ورنہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد، بڑے سے بڑے خطیب اور مقرر کی تقریر کھلنے لگتی ہے!

اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں انہیں ملتان میں بسوں کے اڈے پر اس حالت میں کھڑے دیکھا کہ ملگجے کپڑے پہنے تھے اور ہاتھ میں خاصا لمبا لٹھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ضلع مظفر گڑھ کے کسی گاؤں یا قصبہ میں قیام پذیر تھے، اور مشہور یہ تھا کہ سیاست سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں ——— پھر شاہ صاحب نے ملتان کو اپنی اقامت گاہ بنا لیا۔ بستی شیر خاں کے ایک معمولی سے کچے مکان میں رہتے تھے، میں دو بار اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے مزے کی چائے پلائی، چائے کے ساتھ کچھ "لوازمات" بھی تھے، اور ان سب سے بڑھ کر اُن کے لطیفے اور چٹکلے (چائے کی پیالی میں اُن کے تبسم کی شکر گھل جانے سے، لطف دوبالا ہو گیا، پہلی بار کی حاضری میں مجھ سے کہا اپنا "سلام سُناؤ"، میں نے عرض کیا: آپ تو کئی بار سُن چکے ہیں، فرمایا..."بھئی! کچھ پیرنے میں رہنے والے بھی آپ کا "سلام" سُننا چاہتے ہیں"۔

خاصی دیر تک شعر خوانی رہی، میرے اصرار پر اپنی فارسی نعتیہ غزلیں بھی سنائیں! شاہ صاحب کے بوریے پر بیٹھ کر، شعر سننے اور سُنانے کا جو لُطف آیا، وہ لُطف قیمتی صوفوں اور بیش قیمت قالینوں پر بھی میسّر نہیں آیا، یہی وہ شانِ فقر ہے جس کے آگے سطوتِ شاہی دبتی اور مجرموں کی طرح شرماتی نظر آتی ہے۔

کراچی میں "تحفظِ ختمِ نبوّت" کا دفتر میرے مکان سے قریب ہی تھا، جب بھی شاہ صاحب کراچی تشریف لاتے، میں اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا، ایک بار اُن کا

ملتان سے آنا ہوا، مجھ سے پہلی ملاقات میں فرمایا:-

"آپ کا لکھا ہوا افسانہ ابوذر (شاہ صاحب کے صاحبزادے) نے مجھے راستہ میں سُنایا تھا۔ افسانہ خوب تھا..... مگر افسانہ پھر افسانہ ہے اُس میں جھوٹ ہی تو ہوتا ہے"

پاکستان اور مسلم لیگ کا ایک بار ذکر چھڑا، تو کہنے لگے :-

"بھائی! پاکستان کے معاملہ میں ہمارا معاملہ ابوسفیان کے ایمان جیسا ہے....."

تقریباً ڈیڑھ سال اُدھر کی بات ہے کہ میرا مظفرگڑھ کے مشاعرے میں جانا نکل آیا، وہاں آتے جاتے، جناب صابر دہلوی کے یہاں ملتان ٹھہرنا ہوا، پتا لگا کہ شاہ صاحب بیمار ہیں۔ میں عاصی کرنالی صاحب کو ساتھ لے کر بٹی شیر خاں پہنچا، وہاں جا کر پتا لگا کہ شاہ صاحب لاہور تشریف لے گئے ہیں! اُن سے نہ ملنے کا اُس وقت بھی افسوس رہا، اور اب جب کہ وہ اس دُنیا میں نہیں رہے، یہ افسوس رنج و ملال میں بدل گیا۔

میرا ہی شعر ہے :-

کیا کام اُسے معرکۂ تیغ و سناں سے
واعظ تو فقط زینتِ منبر کے لیے ہے

مگر شاہ صاحب ایسے واعظ تھے، جو منبر کی زینت بھی تھے، اور معرکۂ تیغ و سناں میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، انگریز کے مستبد دَور میں حق گوئی کی بدولت جوانی کا آخری زمانہ اور اس کے بعد کے چند سال قید و بند کی مصیبت میں بسر کیے، چھوٹتے اور پھر گرفتار کر کے بند کر دیے جاتے، یہ سلسلہ ایک دو نہیں اٹھارہ سال تک چلتا رہا، توپ، بندوق اور بم کے گولے تو گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے بھی نہیں چھوڑے، انگریز کی مخالفت اور اس کی پاداش میں جیل خانہ، تمام آزادی پسند لیڈروں کا یہی حال رہا ہے! عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم قربانی اور آزادی کی جدّ و جہد کی منزل میں "مقدمۃ الجیش" سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔

عشقِ رسولؐ اُن کی سیرت و کردار کا سب سے بڑا نمایاں وصف ہے، حضورؐ خاتم النبیین کی محبت اُن کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی، قادیان کی جھوٹی نبوت

کے خلاف انہوں نے "لسانی جہاد" کیا ہے، بس یہی عملِ خیر اُن کی مغفرت کے لیے کافی ہے! (انشاء اللہ العزیز)

شاہ صاحب کو جو غیر معمولی شہرت ملی اور قبولِ عام حاصل ہوا، اُس کا سبب اُن کی خطابت تھی جس نے اُن کی شخصیت کو اُبھارا۔ وہ بڑے حسین وجیہہ اور خوش شکل انسان تھے، سُرخ سپید رنگ، خوب صورت ناک نقشہ، آواز میں درد اور لہجہ میں شیرینی! تقریر کرنے کے لیے اسٹیج پر آتے، تو ان کی صورت دیکھتے ہی لوگوں کے دل کھنچنے لگتے۔ سُننے والوں کی دلچسپی کے لیے ہر چیز اُن کے پاس تھی ـــــ شکل وصورت، آواز، لہجہ، طرزِ ادا، شیرینی، نغمگی، طنز، لطیفے، چٹکلے ـــــ کلام پاک کی تلاوت میں کس قیامت کا سوز اور درد تھا ؎

وہ پڑھیں اور سُنا کرے کوئی

شعر پڑھنے کا انداز اور زیادہ دل نشین تھا۔ تقریر کرتے کرتے موضوع سے دُور چلے جاتے، تو ان کی خطابت کا زور اور بیان کی دل نشینی اس کا احساس بھی نہ ہونے دیتی! ایسا بھی ہوتا کہ کسی پر طنز کرتے ہوئے، ملاّحیوں سے بھی بہت آگے تک پہنچ جاتے۔ میں نے خود دیکھا کہ کراچی کے آرام باغ میں شاہ صاحب تقریر کر رہے ہیں اور قادیانیت کے سلسلہ میں طنز عریاں ہوتی چلی جا رہی ہے، اس پر مولانا محمد علی جالندھری نے اُن کے کُرتہ کو دو بار آہستہ سے کھینچا، اس کے بعد وہ فوراً سنجیدہ بن گئے۔

حضرت شاہ صاحب اپنی ذات سے نیک اور خیر پسند تھے، لیکن بعض غلط اندیش ساتھیوں اور رفیقوں سے متاثر بھی ہو جاتے اور اُن کی بنائی ہوئی اسکیم کی تائید فرماتے، یہ حقیقت عالم آشکارا ہے کہ تحریک "تحفظِ ختمِ نبوت" نے لاہور میں جو ہنگامہ آفریں صورت اختیار کی تھی، اُس کی ناکامی نے پاکستان میں دینی محاذ کو کس قدر کمزور کر دیا، اُس کے بعد سے اسلام پسندوں اور دینداروں کی مشکلات اور اُلجھنیں بڑھتی ہی چلی گئیں اور اب یہ حال ہے ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اللہ تعالیٰ شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ کی قبر کو خنک اور روشن رکھے کہ وہ اپنی ذات سے سچ مچ انجمن واقع ہوئے تھے! ان کی زندگی جفاکشی اور مجاہدانہ زندگی تھی۔ آدابِ شریعت کی وہ نگہداشت نہ کرتے تو اور کون کرتا کہ وہ "امیرِ شریعت" تھے۔ (بَرّد اللہ مضجعہٗ نوّر اللہ قبرہٗ)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۱ء)

عطیہ فیضی

یہ نشاطیہ (کمیڈی) تو ہے ہی مگر کسی حد تک المیہ (ٹریجڈی) بھی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کے تذکرے کے ساتھ عطیہ فیضی کا نام آتا ہے۔ علامہ شبلی سے راقم الحروف کو بے انتہا محبت بھی ہے اور عقیدت بھی۔ اس نسبت اور تعلق کے سبب عطیہ فیضی کے نام سے میں بہت دنوں سے واقف تھا فنونِ لطیفہ سے عطیہ کو جو خاص شغف تھا، اس کے تذکرے بھی لوگوں کی زبانی سُنے تھے۔

(غالباً) ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب بمبئی میں "یومِ اکبر"[۱] منایا گیا اور اس سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا، مشہور اہلِ قلم جناب ضیاء الدین احمد برنی اس مشاعرے کے داعی تھے۔ انہی کی دعوت پر میں حیدرآباد دکن سے بمبئی پہنچا۔ کرافٹ مارکیٹ سے متصل شاہجہاں ہوٹل تھا۔ وہاں مجھے ٹھہرایا گیا۔ صابو صدیق ہال میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، اُن دنوں مجھ پر کبھی کبھار دل کا دورہ پڑجایا کرتا تھا، مشاعرے میں پہلی غزل کے بعد سامعین نے دوسری غزل کی فرمائش کی، دوسری کے بعد تیسری کی! چوتھی غزل پر میں دل میں گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا، تکلیف بڑھنے لگی! میں نے جیسے تیسے غزل ختم کی، اسی عالم میں ہال سے باہر آکر سبزے پر لیٹ گیا۔ شدید قسم کی قے ہوئی بدن پسینہ میں شرابور! میں سبزے پر بے قابو ہو کر لوٹ رہا تھا اور ایک مجمع میرے اردگرد تھا، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "ہزار منہ ہزار باتیں!" — لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ! مگر زیادہ لوگوں کا گمان یہ تھا کہ ماہر نے زیادہ شراب پی لی تھی، اُس کے سبب یہ حادثہ پیش آیا۔

مشاعرے کے بعد دعوتیں اور ادبی نشستیں رہیں! بمبئی کے مشہور خاندان طیب جی کا

---

[۱] اکبر الٰہ آبادی نہیں۔ مغلیہ شہنشاہ جلال الدین اکبر۔

کی خواتین نے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی۔ اُس کا نام "عقدِ ثریا" تھا، اس بزم میں مجھے بُلایا گیا۔ چائے نوشی کے بعد شعر خوانی ہوئی۔ آصف فیضی جو مصر میں حکومتِ ہند کے سفیر رہے ہیں اُن دنوں لا کالج بمبئی کے پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے، اُن سے بھی اسی انجمن میں تعارف ہوا، نواب ہاشم یار جنگ بہادر حکومت حیدرآباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج تھے پھر وہ مشیر قانونی ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سر اکبر حیدری کا حیدرآباد میں طوطی بولتا تھا، انھی ہاشم یار جنگ کی صاحبزادی مسز زینت فتح علی، اس علم دوست خانوادے کی ادبی سرگرمیوں کی روحِ رواں تھیں۔ عطیہ فیضی سے تعارف کا ذریعہ شعر و ادب کے یہی اجتماعات تھے۔

میں دو سال کے بعد پھر بمبئی آیا تو عطیہ فیضی نے انجمن اسلامیہ کے ہال میں بڑے پیمانے پر "سفری آرٹس سرکل" کی جانب سے بزمِ شعر و طرب کا اہتمام کیا۔ میں خصوصی مہمان تھا، پھر ان سے بمبئی میں بارہا ملنا ہوا اس زمانہ میں مرحومہ نے اپنی شاندار کوٹھی (ایوانِ رفعت) فروخت کر دی تھی۔ والکیسر کے مشہور باغ (Hanging Garden) کے متصل ایک کرایہ کے بنگلہ میں رہتی تھیں اور ہر ہفتہ بدھ کے دن شام میں ان کے یہاں احباب جمع ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں فلمی دنیا سے میرا تعلق ہو گیا۔ سب سے پہلے مشہور ڈائرکٹر محبوب مرحوم کی فلم "تقدیر" کے لیے گانے لکھے۔ اس سلسلہ میں ہفتوں بمبئی ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا، عطیہ فیضی اصرار کر کے اپنے یہاں کی چہار شنبہ کی نشست میں بلاتیں۔ ایک بار انھوں نے بمبئی بلکہ یوں کہنا چاہیے متحدہ ہندوستان کے سب سے شاندار اور مشہور ہوٹل "تاج" میں اس خاک نشین کے لیے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا، جن دنوں وہ اس پارٹی کے اہتمام میں مصروف تھیں، اُن کی بڑی بہن نازلی بیگم ہر ہائنس بیگم جنجیرہ نے مجھ سے فرمایا کہ عطیہ اس دعوت کے انتظام میں اس طرح لگی ہوئی ہیں کہ سر پیر کا ہوش تک نہیں ہے میں نے اتنا مصروف انہیں کبھی نہیں دیکھا۔

مشہور انگریز جرنلسٹ مسٹر ہارنیمن کے اخبار (Sentinel) کے پہلے صفحہ پر عطیہ فیضی نے میرا فوٹو شائع کرایا۔ مہمان ڈھائی سو کے قریب ہوں گے۔ ہر طبقہ کی بلند شخصیتیں جمع تھیں یہاں تک کہ لیڈی ٹاٹا بھی موجود تھیں۔ میں نے "اردو زبان" کی اہمیت پر تقریر کی اُس کے بعد بیسوں غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ اتنے اونچے درجہ

کے سامعین ہر شاعر اور مقرر کو کہاں میسر آتے ہیں۔

ایک صاحب تھے انیس الرحمٰن غالباً پٹنہ کے رہنے والے تھے اور "زندگی" نام کا ایک پرچہ نکالتے تھے۔ اُن کے افکار قوم پرستی، کمیونزم اور تجدد و آزاد خیالی کا ملغوبہ تھے۔ میری تقریر کے دوران انہوں نے ٹوکا، میں نے اُن کے اعتراض کا جواب دیا! انہوں نے اس پر اور کوئی بے تکی بات کہہ دی جس نے میرے جذبات میں شتابہ لگا دیا، میری تقریر کا پھر رنگ ہی بدل گیا۔ اس دخل در معقولات اور خواہ مخواہ کی بدمزگی کو سب نے محسوس کیا۔

جب بمبئی میں میرے قیام وہاں کی صحبتوں اور طیب جی کے خانوادے کا ذکر چھڑا ہے تو ایک دلچسپ سفر کا تذکرہ کیے بغیر رہوار قلم آگے نہیں بڑھ سکتا! نواب ہاشم یار جنگ بہادر کے صاحبزادے (مسز زینت فتح علی کے چھوٹے بھائی) میرے پاس ایک دن آئے کہ بمبئی سے تقریباً پچاس میل دور کیہیم آپ کو چلنا ہے، وہاں ایک شب آپ کو رہنا ہوگا! میں نے وہاں چلنے کی ہامی بھر لی۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر وہ صاحب تشریف لے آئے۔ گیٹ آف انڈیا کے متصل ساحل پر کیہیم جانے کے لیے لانچ کھڑی تھی فرسٹ کلاس میں نشستوں کا پہلے سے انتظام کر لیا گیا تھا۔ مسٹر المالطیفی جو ایک زمانہ میں حیدرآباد دکن میں ناظم تعلیمات رہ چکے تھے، وہ بھی ہمسفر تھے۔ تقریباً دو گھنٹہ بحری سفر رہا، سمندر اتفاق سے پرسکون تھا، یہ چھوٹا سا جہاز پانی پر بط کی طرح تیرتا ہوا ساحل مراد تک پہنچا، پھر وہاں کار کے ذریعہ جنگل میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سفر کیا۔ اس کے بعد وہاں پہنچ گئے جہاں کے لیے آئے تھے۔ سب لوگوں نے راقم الحروف کا انتہائی مسرت اور خلوص و محبت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ چھوٹے بچوں کی خوشی کا عالم دیکھنے کے قابل تھا۔

چاروں طرف ناریل کے درخت، سبز جھاڑیاں ان درختوں کے جھرمٹ میں سمندر کے مرتفع ساحل پر بنگلوں اور شبستانوں (COTTAGES) کی قطار سامنے چمکتی ہوئی ریت اور اُس کے بعد مواج سمندر! رات کے وقت سمندر کی ریت پر ننگے پاؤں ٹہلنے اور دوڑنے میں بڑا لطف آیا، پھر سمندر میں مد شروع ہو گیا۔ موجیں ساحل کی طرف بڑھ بڑھ کر پلٹنے لگیں اور ذرا سی دیر میں ماحول ہی کچھ سے کچھ ہو گیا۔

بمبئی میں برسات کا موسم زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا، اسی زمانے میں آبادی سے دور اس پرسکون ماحول میں دو تین مہینے ہنسی خوشی گزارنے کے لیے یہ خوشحال لوگ یہاں آجاتے ہیں۔

میرے ٹھہرنے کے لیے انہوں نے ساحل پر ایک چھولداری نصب کرائی جس کا دروازہ سمندر کی جانب تھا، اندر سفری پلنگ، دو کرسیاں، چھوٹی سی تپائی، جس پر کاغذ، پنسل اور ٹارچ رکھی ہوئی، شب میں پرتکلف کھانے کے بعد شعر و سخن کی محفل کا آغاز ہوا اسی خاندان کے ایک فرد جن کا پورا نام یاد نہیں رہا جو آئی سی ایس تھے۔ انہوں نے بڑے شاندار الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ چہرے مہرے سے لے کر میرے لباس وضع قطع اور شاعری کا مزے لے لے کر اپنی تقریر میں نقشہ کھینچا۔ پھر میں نے جو کلام سنانا شروع کیا ہے تو بقول شخصے سویرا کر دیا۔ سب لوگ آخر وقت تک بیٹھے رہے اور لطف لیتے رہے! جیسے بدمزگی، اکتاہٹ اور بے کیفی کو ان شبستانوں سے دیس نکالا مل چکا ہے۔

دوسرے دن میں وہاں سے اُسی راستے سے بمبئی واپس ہوا، یعنی خشکی کے ساتھ بحری سفر بھی! چلتے وقت بڑے احترام کے ساتھ "نذرانہ" بھی دیا گیا۔

تقسیم ہند سے قبل بزم اقبال مسلمانانِ پنجاب کی جانب سے آخری مشاعرہ اپریل ۱۹۴۷ء میں ہوا، پھر چند ماہ کے بعد ملک کے طول و عرض میں جو قیامت برپا ہوئی اس کا ذکر کرنے کے لیے لوہے کا کلیجہ اور پتھر کا دل چاہیے۔ دوست، احباب اور عزیز و شناسا اس طرح منتشر اور تتر بتر ہوئے کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں کہ کون مرا، کون جیا اور جی رہا ہے تو کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

عطیہ فیضی، اُن کے شوہر مسٹر رحمین اور عطیہ کی بڑی بہن بیگم جنجیرہ سے ۱۹۴۸ء میں ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ اُن دنوں کراچی کینٹ اسٹیشن کے قریب کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسٹر غلام محمد مرحوم سابق گورنر جنرل پاکستان جو اُن دنوں وزیر خزانہ تھے، ان کی کوٹھی کے قریب عطیہ فیضی نے ایک فلیٹ کرایہ پر لیا تھا۔

ــ غالباً یہ صاحب وہ تھے جو چند سال قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں

یہاں بھی بمبئی کی روایت کو باقی رکھا گیا۔ ہر ہفتہ بدھ کے بدھ اہلِ ذوق کا اجتماع ہوتا۔ ایک بار بھارت کے ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش اپنی صاحبزادی کے ساتھ تشریف لائے، چائے نوشی کے بعد میں نے اشعار سنائے جب وہ چلے گئے تو عطیہ فیضی نے مجھ سے کہا کہ جب تم اپنا کلام سنا رہے تھے تو سری پرکاش صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ صاحب (میری طرف اشارہ تھا — م ق) اب جب آئیں تو مجھے اطلاع کرنا میں اس نشست میں ضرور آؤں گا۔

بارنس گارڈن میں جہاں اب آرٹ کونسل کی شاندار عمارت ہے اس کے عقب میں عطیہ فیضی نے اپنے رہنے کے لیے خالص مشرقی طرز کا آرام دہ کشادہ مکان اور اُس کے قریب چند قدم کے فاصلے پر آرٹ گیلری تعمیر کرائی تھی، جس میں اُن کے شوہر فیضی رحمین کی مصوری کے اعلیٰ نمونے آویزاں تھے۔ خاص طور سے مولانا شوکت علی کی قدِ آدم تصویر قابلِ دید تھی۔ دیکھنے والے کو پہلی نظر میں دھوکا ہوتا تھا جیسے عین مین مولانا شوکت علی (مرحوم) چُغا پہنے کھڑے ہیں۔ ان دونوں عمارتوں کی دیواروں کے بیرونی حصہ کا رنگ دلی کے لال قلعہ کی دیواروں کی طرح سُرخ تھا۔

یہ لوگ زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین سال اُس مکان میں رہے ہوں گے پھر ان پر ایسی بپتا پڑی کہ اس مکان سے انہیں اٹھ جانا پڑا، اس باغ میں عطیہ فیضی اُن کے شوہر اور ہمشیرہ نے حکومت سے اجازت لے کر ہی عمارت بنائی ہوگی۔ پھر وہ اس سے بے دخل کس طرح کر دیئے گئے؟ وہ دونوں عمارتیں غالباً اب تک خالی پڑی ہوئی ہیں۔ دفتری کارروائیوں کے بھی عجیب چکر اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں اور حکومتوں کی تبدیلیاں بھی بعض معاملات، مسائل اور حالات پر خاصی اثر انداز ہوا کرتی ہیں بہرحال یہ بہت بڑا سانحہ تھا جو اُن کے ساتھ پیش آیا۔

اس طرح گھر سے بے گھر ہو جانے کے بعد یہ مختصر سا خاندان جس کا ہر فرد ضعیفی کی عمر کو پہنچ چکا تھا اور کسی عزیز رشتہ دار اور اولاد کا سہارا بھی اُنہیں میسر نہ تھا، ہوٹلوں میں رہنے لگا، جمع کیا ہوا اندوختہ آخر کہاں تک ساتھ دیتا، کسی قسم کا کوئی روزگار نہیں، وہ جو مثل مشہور ہے کہ مفلسی میں آٹا گیلا، آئے دن کی بیماریوں نے مالی حالات کو اور زیادہ سقیم کر دیا۔

صدر بازار میں قالینوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ میں نے اُس میں صوفوں، الماریوں اور میزوں کا دیدہ زیب اور خوبصورت قیمتی نقشین سیٹ دیکھا، جو عطیہ فیضی اپنے ساتھ بمبئی سے لائی تھیں۔ لکڑی کا آبنوسی رنگ اُس پر پھول پتوں کی انتہائی دیدہ زیب منبت کاری، خوشنما ڈیزائن! یہ فرنیچر یادگار کے طور پر دراصل کسی میوزیم کی زینت بننے کے قابل تھا، مگر حالات سے مجبور ہو کر اسے سستے داموں بیچ دینا اور علیحدہ کرنا پڑا۔ جس نے اُسے خریدا، اُس نے نہ جانے کتنا نفع کمایا۔

ابھی چند دن کی بات ہے ایک صاحب سے جو کراچی میں ایک فرم کے مالک ہیں اور تقسیم ہند سے قبل اپنے والد کے ساتھ بمبئی میں رہتے تھے ملاقات ہوئی اور دوران گفتگو میں عطیہ فیضی کا ذکر نکلا تو غمگین لہجہ میں بولے کہ وہ ایک دن میرے دفتر میں تشریف لائیں اور مجھ سے پچاس روپیہ قرض کے طور پر مانگے۔ وہ کہنے لگے کہ بات کرتے میں عطیہ فیضی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے میں بھی آبدیدہ ہو گیا اور میں نے پچاس کی جگہ سو روپے اُن کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کر دیے۔

اسی پریشان روزگاری اور نکبت و افلاس کے عالم میں ڈیڑھ دو سال ہوئے اُن کے شوہر — فیضی رحیمن — نے وفات پائی، پھر خود عطیہ فیضی پر فالج کا حملہ ہوا۔ پانچ دن ہسپتال میں بیہوش رہیں اور ۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو:

ع اک عمر سے جو تکلیف میں تھا کل رات وہ قیدی چھوٹ گیا

عمر خاصی طویل پائی، ۱۸۸۱ء اور ۱۹۶۷ء کے مابین ۸۶ سال کا فصل ہے، اس عمر کو "ارذل العمر" کہا گیا ہے۔

کراچی کے اخباروں میں اُن کی موت پر بڑا ماتم کیا گیا۔ شذرات، اداریے، لمبے چوڑے مضامین اور تصویریں شائع ہوئیں۔ اُن کی شہرت اور شخصیت میں بہت کچھ دخل علامہ شبلی نعمانی کی ذات سے اُس نسبت کو ہے جس پر یار لوگوں نے "معاشقہ" کا رنگ چڑھا دیا اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "........ بدگمانوں کو بدنامی کی حد تک موقع مل گیا۔"

عطیہ فیضی کے گھرانے کی امارت و عظمت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب سے اسی نوے سال پہلے اُن کے والد سلطان عبدالحمید خاں کے مشیر تھے۔ عطیہ

اسی زمانے میں ترکی میں پیدا ہوئیں اور امارت و خوشحالی کی فضا میں پرورش پائی۔ یہ وہ دَور تھا جب کہ پورے ہندوستان میں تعلیم نسواں کے لیے کالج تو کیا شاید کوئی ہائی اسکول بھی نہ ہوگا۔ عطیہ فیضی نے اس زمانہ میں جو زیادہ سے زیادہ تعلیم مسلمان لڑکیوں کو میسر آ سکتی تھی، حاصل کی اور پھر بڑے ہو کر ایڈورڈ ہفتم کے عہدِ شہنشاہی میں یورپ کا سفر کیا اور مغرب کے مشاہیر سے ملاقاتیں کیں۔ اس سفر نے "نسوانی آزادی" کے جذبہ کو اور زیادہ افرنگ زدہ بنا دیا۔ خاندان طیب جی میں پردہ پہلے ہی سے نہ تھا، یورپ کے سفر نے عطیہ فیضی کی بے نقابی اور بے حجابی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور سندِ جواز بلکہ تحسین و خوشنودی کا سرٹیفیکٹ دے دیا۔

علامہ شبلی نعمانی کا بمبئی کے اس تعلیم یافتہ اور (Advanced) گھرانے میں جب آنا جانا ہوا ہے تو عطیہ فیضی کی عمر بیس بائیس سال کی ہوگی۔ شبلی مولانا ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے اور شاعر کتنا ہی پارسا اور صاحبِ تقویٰ کیوں نہ ہو رنگین مزاج بھی ہوتا ہے۔ یہ تو یار لوگوں کی شوخیٔ مزاج ہے کہ انہوں نے اس ربط و تعلق پر حاشیہ آرائیاں کر کے بدگمانیوں کے دروازے چوپٹ کھول دیئے ہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ علامہ شبلی کی شاعری کو اس دلچسپی نے خاصی شوخی اور رنگینی عطا کی اور ایک خوبرو تعلیم یافتہ جوان لڑکی کی قربت، دیدار اور ہم کلامی کے لطف نے مولانا شبلی کے دامنِ تقویٰ کو تھوڑا بہت رنگین بنا دیا۔

؎ یہ واقعہ بھی خوب ہے تہمت بھی خوب ہے

مسٹر رحمین ایک مصوّر تھے اور غالباً مذہباً یہودی تھے، اُن سے عطیہ فیضی کی شادی ہوئی۔ یہ شادی بھی بہرحال ایک رومان ہی تھا، اس گھرانے میں کل تین افراد تھے، ہر ہائی نس بیگم جنجیرہ، عطیہ فیضی اور اُن کے شوہر رحمین فیضی! ان میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی اور اس معنیٰ میں یہ گھرانا سدا بے چراغ ہی رہا۔ شوہر سے بیگم جنجیرہ کے اختلاف کے بعد ان کی عمر کا زیادہ حصہ بے شوہری کے عالم میں گزرا، جو ایک طرح کی بیوگی ہے۔ بیگم جنجیرہ جتنی خاموش طبع اور سنجیدہ تھیں عطیہ فیضی اتنی ہی شوخ اور تیز طرار تھیں! ہز ہائی نس نے بمبئی میں دا الکیسر پر خوشنما کوٹھی تعمیر کرائی۔ "ایوانِ رفعت" نام رکھا مگر پھر اسے فروخت کر دیا۔ اُن کے پاس زمرّد اور

ہیرے کے سیٹ تھے۔ دعوتوں میں لباس کی مناسبت سے زیور پہنتیں۔ خالص ریشم کے کرتے اور دوپٹے جن پر لکھنؤ کی کشیدہ کاری، ایک ایک کپڑا سینکڑوں روپیہ کی قیمت کا تھا۔

عطیہ فیضی کا لباس ستر پوشی میں ملکہ وکٹوریہ کے لباس سے ملتا جلتا تھا۔ چہرے کے سوا جسم کا ہر حصہ ڈھکا چھپا اور سر پر عربوں کی طرح رومال جس پر عقال بندھا ہوا نیچے کرتا پر لمبی سی عبا، گلے میں سیاہ پوتھ کی مالا، پہلی نگاہ میں وہ چرچ کی راہبہ (Nun) جیسی نظر آتی تھیں، خرچ اخراجات کے معاملہ میں محتاط، میں نے بمبئی میں انہیں بارہا بس میں بیٹھا دیکھا، بعض اوقات بس میں سوار ہونے کے لیے کافی دیر تک کیو میں کھڑی رہتیں۔

فنون لطیفہ سے خاصا شغف تھا۔ شاعری اور مصوری اور رقص و موسیقی یہ سب اُن کے شوق اور دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ راگ راگنی سے واقف تھیں، پاکستان آنے کی بجائے بھارت ہی میں رہتیں اور کوئی "کلا مندر" ان کو سونپ دیا جاتا تو وہاں اُن کے ذوق اور طبیعت کے جوہر کھلتے! انگریزی کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ انگریزی میں رواں اور شگفتہ تقریر کرتیں اور مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتی جاتیں۔ ایک بار ایک پارٹی میں میرا تعارف کراتے ہوئے کہا:

If he is Mahir-ul Khadri then he is from Hyderabad — If he is Mahir-ul Qadri them he is from U.P.

[1] [2]

کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اس پر طنز کرنے اور ٹوکنے بلکہ بعض اوقات ڈانٹنے ڈپٹنے سے نہ چوکتیں۔ اس لیے اُن کے جاننے والے محفلوں اور پارٹیوں میں عطیہ فیضی کے قریب آتے ہوئے کتراتے تھے۔ تاج محل ہوٹل میں عطیہ فیضی نے ایک

---

[1] یہ ماہر الخادری ہیں تو حیدرآبادی ہیں — اور ماہر القادری ہیں۔ تو پھر یو۔ پی کے ہیں۔
[2] حیدرآباد دکن میں ق کو خ اور خ کو قاف بولتے ہیں۔

بار لنچ دیا، اس میں سروجنی نائڈو بھی تھیں۔ شاعروں میں ساغر نظامی اور راقم الحروف تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر مراد نے انگریزی تقریر میں علی گڑھ کا جو ذکر چھیڑا تو عطیہ فیضی نے بھری محفل میں انہیں ٹوکا بلکہ جھاڑ دیا اور وہ بے چارے خفیف سے ہو کر رہ گئے۔ بعض اوقات اپنے شوہر کو بھی ڈانٹ دیتیں، مسٹر رحمین نیاز مند شوہر کی طرح اُن کے پیچھے چھتری لیے ہوئے ہوتے۔ —— سیاسی مسلک اور عملی سرگرمیوں کے اعتبار سے نہ وہ کانگریسی تھیں اور نہ مسلم لیگی! وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن واقع ہوئی تھیں، ایک بار مجھ سے دریافت فرمایا کہ "ذٰلک الکتاب" میں "ذٰلک" کس کی طرف اشارہ ہے، میں نے جواب دیا کہ "الکتاب" یعنی قرآن کریم کی طرف! بولیں نہیں یہ بات نہیں "ذٰلک" تو دور کی چیز کے اشارے کے لیے عربی میں بولا جاتا ہے، پھر کچھ ایسی باتیں کیں، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے معتقدات میں "باطنیت" کی آمیزش ہے، اُن کے شوہر فیضی رحمین بھی باطنیت زدہ تصوف سے متاثر تھے۔ دو تین بار ان سے گفتگو ہوئی تو اُن کے خیالات میں عجیب الجھاؤ پایا۔ مسٹر رحمین نے انگریزی میں ایک ڈرامہ (دختر ہند —— Daughter of India) لکھا تھا جو کتابی شکل میں چھپوایا گیا عطیہ فیضی اور ان کے شوہر کے اصرار پر میں نے اردو میں اس کا ترجمہ قیام بمبئی کے زمانہ میں کیا نہ معلوم اس ترجمہ کا پھر کیا حشر ہوا۔

عطیہ فیضی کے پاس مشاہیر کے خطوط کا خاصا ذخیرہ تھا، انہوں نے مجھے ایک خوبصورت سی بیاض دکھائی، جس کا سنہری حاشیہ تھا اس پر نواب حامد علی خاں والی رامپور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر تھا۔ یہ بیاض نواب صاحب رام پور نے انہیں تحفہ کے طور پر دی تھی۔

راقم الحروف نے سینکڑوں نہیں ہزاروں کاپیوں پر اپنے اوٹوگراف دیئے ہیں لیکن عطیہ فیضی نے جس اوٹوگراف بک پر مجھ سے لکھوایا وہ اپنی نوعیت کی نادر اور بیش قیمت "بیاضِ امضا" (Autograph Book) تھی! اس پر ہندوستان، انگلستان، ترکی اور بعض دوسرے ممالک کے مشاہیر کی تحریریں اور دستخط تھے، مہاتما گاندھی جب پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد بحری جہاز سے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو عطیہ بھی اُسی جہاز میں تھیں، انہوں نے اصرار کر کے گاندھی جی کی انگلی میں آلپین چبھوئی اور گاندھی جی نے اپنی انگلی کے خون کا نشان عطیہ فیضی کی اوٹوگراف بک پر ثبت کر کے اپنے دستخط کیے، آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے جو ارکان اس جہاز سے گاندھی جی کے ہمسفر تھے۔ ان سے بھی اس صفحہ پر دستخط لیے گئے، اس قسم کی نادر و عجیب اور فنکاری کی باتیں عطیہ فیضی کو خوب سوجھتی تھیں۔ عطیہ فیضی کی زندگی صفحۂ رنگین بھی ہے اور ورقِ عبرت بھی! (ماہنامہ فاران "مارچ ۱۹۶۷)

چوہدری علی احمد خاں

فروغِ شمع تو باقی رہے گا صبحِ محشر تک   مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

چوہدری علی احمد خاں مرحوم سے پہلے پہل میری ملاقات اب سے تقریباً چھ سال قبل ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بہت ہی مختصر سی تھی۔ وہ دفتر "فاران" میں تشریف لائے، گوجرانوالہ کے اسلام پسند نوجوان انشا پرداز سید عبدالطیف صاحب غالباً ہمراہ تھے۔ تعارف بس اتنا ہوا کہ جماعتِ اسلامی سے تعلق ہے، اور پولیس کی ملازمت ترک کر کے اقامتِ دین کی جدوجہد میں شریک ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بات چیت ہی پھر وہ چلے گئے مگر یونہی نہیں اپنی شخصیت کا میرے قلب و دماغ پر ایک نقش چھوڑ کر! یہ نقش اس وقت دھندلا تھا مگر پھر روشن اور گہرا ہوتا چلا گیا۔

ایک سرو قامت، گداز بدن، وجیہہ انسان، لہجہ میں گرمی، آنکھوں میں چمک اور چہرے پر یقین و صداقت کا غازہ! میں سوچتا رہا کہ جماعتِ اسلامی میں کس کس گوشہ سے اخلاص اور دردمندی کھنچی چلی آرہی ہے اور تحریکِ اسلامی کیسے کیسے لوگوں کو متاثر کر رہی ہے۔

چودھری صاحب مرحوم نے کراچی میں کپڑے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ گوردھن داس مارکیٹ کے قریب کسی گلی میں ایک فلیٹ میں قیام تھا۔ ایک دن شب میں اُن کی قیام گاہ پر جانا ہوا۔ دعوت کا خاصا اہتمام تھا۔ کھانے کے بعد شعر خوانی بھی رہی۔ اُن کے داد دینے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ شعر سمجھتے ہیں بلکہ شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مہینہ دو مہینے میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اُن کی زندگی مجھ سے بھی زیادہ مصروف تھی اس لیے تفصیلی ملاقات کا شاذ و نادر ہی موقع میسر آتا! مگر جب بھی اُن سے ملنا ہوتا میں یہ بات واضح طور پر محسوس کرتا کہ اُن کے دینی شغف میں

ترقی ہوتی جارہی ہے اور ہر طلوع ہونے والی صبح اُن کے ایمان کو گرما دیتی ہے!

اُن کی استقامت، ایمانی فراست اور ضبط و وقار کا سب سے زیادہ اندازہ اس دن ہوا جس دن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو فوجی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ میں جماعت اسلامی کے دفتر میں پہنچا تو بعض افراد کافی ملول بیٹھے تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ چیخ نکل گئی اور آنکھوں سے جذبات آنسو بن کر بہنے لگے۔ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا:

"اس راہ میں سب کچھ پیش آتا ہے ...... یہ مرحلہ بھی آتا ہے.... .... یہ بھی....."

ان لفظوں میں صبر کی کافی تلقین تھی مگر چودھری علی احمد خاں جو آئے تو اُن کے چہرے پر سکون واطمینان کا جلال دمک رہا تھا۔ اپنی طاقتور اور توانا مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے بولے:

"ماہر صاحب! ان شاء اللہ کچھ نہیں ہو سکتا یہ لوگ مولانا مودودیؒ کو قیامت تک پھانسی نہیں دے سکتے، نہیں دے سکتے......"

کتنی تسکین تھی ان جملوں میں، جیسے کسی نے ایک بیمار کو آبِ حیات پلا دیا۔

ایک دن غریب خانہ پر رات کے وقت تشریف لائے، اپنے ایک مضمون کا مسودہ مجھے دیا کہ "اسے دیکھ لیجیے۔" میں نے مضمون پڑھا تو اندازہ ہوا کہ انشاء پردازی کی صلاحیت سے تو انہوں نے اب تک کام ہی نہیں لیا۔ یہ جوہر تو اب جا کر ابھرا ہے، خاصا مضمون تھا۔ مشکل سے دو چار جگہ قلم لگانے کی نوبت آئی۔

جماعت اسلامی میں آنے کے بعد صرف اشاعتِ حق اور اقامتِ دین کی خاطر مرحوم نے تقریر اور تحریر کی مشق پیدا کی۔ یہ صلاحیتیں اُن میں پہلے سے موجود تھیں مگر معطل پڑی تھیں۔ جذبۂ اخلاص اور دل کی لگن نے جب انھیں ابھارا تو یہ جوہر تابناک ہوتے چلے گئے۔ وہ اوسط درجہ کے ایک اچھے مقرر تھے اور اُن کی تحریر دیکھ کر کوئی یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کی مضمون نگاری کی عمر بہت سے بہت پانچ چھ سال کی ہو گی۔ اُن کے مضامین میں پختگی اور مشاقی جھلکتی تھی۔ کثرت مطالعہ نے اُن کی تحریر اور تقریر کو کافی وزنی بنا دیا تھا۔ اُن کے حوصلے کی طرح اُن کے افکار د

خیالات بھی بلند تھے۔ مشرقی پاکستان پہنچے تو وہاں جاکر انگریزی میں تقریر کرنے کی بھی مشق پیدا کرلی۔ انگریزی میں اُن کے لکھے ہوئے ایک دو کتابچے بھی شائع ہوئے۔

چوہدری علی احمد خاں مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ بلکہ یوں کہیے "صدقہ جاریہ" مشرقی پاکستان میں جماعتِ اسلامی کی تنظیم کا کام ہے۔ وہ دو سال کے قریب وہاں رہے اور اس زمانہ میں جماعتِ اسلامی کا کام کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان سے واپس ہوئے تو صحت خاصی متاثر تھی۔ ڈاڑھی میں اِکا دُکا بال تک سپید ہو گئے۔

مرحوم سے میری آخری ملاقات مارچ ۵۶ء کے وسط میں ہوئی۔ لائلپور کے مشاعرے سے فارغ ہوکر میں لاہور گیا۔ انہی دنوں جماعتِ اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا اجتماع تھا۔ ایک دن شب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے یہاں دعوت تھی۔ دعوت کے بعد شعر خوانی بھی ہوئی اور شعر و شاعری کے درمیان ہلکا سا مزاح بھی۔ چوہدری صاحب مرحوم سے وہیں ملنا ہوا۔ سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ اُن سے آخری بار ملنا ہو رہا ہے اور آج کے بعد اس دنیا میں تو پھر ملاقات ہوگی نہیں!

اُن کی زندگی میں اُن کے منہ پر نہ کہتا تھا مگر اب کہتا ہوں کہ چوہدری علی احمد خاں کو دیکھ کر اور اُن سے مل کر میں خود اپنے حوصلہ میں قوت محسوس کرتا تھا اور ماحول کو دیکھ کر طبیعت میں جو افسردگی پیدا ہو جاتی تھی وہ جاتی رہتی تھی، کیا عزم تھا، کیا بیباک طبیعت پائی تھی، کس قیامت کا حوصلہ تھا، خطروں کو تو وہ خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ گفتار سے لے کر کردار تک عزیمت ہی عزیمت! اقامتِ دین کی تحریک میں صفِ اوّل کے کارکن مگر اس کی تمنا ہی نہ رہی کہ کوئی اُن کے کارناموں کو جانے ــــ جو کچھ کیا اللہ کے لیے کیا اور لوگوں کی داد و ستائش اور خوشی و ناخوشی سے بے پروا ہو کر کیا!

اللہ کی راہ کے مسافر ناکام تو ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ پہلے قدم ہی پر اس راستہ میں گرد و غبار بن کر بھی اڑ جائیں تو بھی کامیاب ہیں۔ مگر چوہدری علی احمد خاں مرحوم ظاہری اسباب کے اعتبار سے بھی کامیاب رہے۔ اسلامی دستور سازی جو اقامتِ دین کا پہلا مرحلہ ہے اس کی کامیابی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے۔

دوسرا مرحلہ آیا تو رفیق اعلیٰ کی طرف سے پیغامِ طلب آگیا۔ ایسی زندگی بھی کامیاب اور ایسی موت بھی کامیاب! اور ان شاء اللہ آخرت کی زندگی کامیاب تر ہوگی۔

جانے والے! ہم بھی تیرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ بس آگے پیچھے کی دیر ہے، موت ہر جان کے لیے مقدر کر دی گئی ہے۔ یہ دن ہر کسی پر آنے والا ہے۔ ہر موت زندہ انسانوں کے لیے عبرت ہے!

جانے والے! قبر سے لے کر یومِ حساب تک کی ہر منزل تجھ پر آسان ہو اور قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی رفاقت تجھے نصیب ہو۔ (آمین)

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۵۶ء)

عمر مہاجر

یہ اب سے چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے عمر مہاجر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں تعلیم پا رہے تھے طالب علمی کے زمانے میں اُن کی تحریر اور تقریر کی شہرت ہو گئی تھی۔ حیدرآباد دکن کے مشہور شاعر نظر حیدرآبادی کا آغازِ شباب تھا اور ان کی شاعری دورِ مراہقت میں تھی، نظر، عمر مہاجر کے انتہائی گہرے دوست تھے، یہ دونوں اور ایک دوسرے نوجوان جن کا نام ذہن سے نکل گیا، اکثر و بیشتر راتیں ہوٹلوں اور چائے خانوں میں گزارتے اور جب بھی میرے یہاں آتے تو رات میں بارہ بجے کے بعد آتے اور فرمائش کرکے مجھ سے میری نئی غزلیں اور نظمیں سُنتے! شعر خوانی کے دوران چائے کا دَور بھی چلتا۔ عمر مہاجر کے چچا سے راقم الحروف کا یارانہ تھا، نظر حیدرآبادی کے والد علی اختر، مہاجر کے چچا اور راقم الحروف کٹ تھروٹ کھیلتے، اس طرح طبیعت تو بہل جاتی مگر وقت کا یہ صحیح مصرف نہیں تھا۔

اُن دنوں مشہور شاعروں کے "سو اشعار" (جگر کے سو اشعار، فانی کے سو اشعار، حسرت موہانی کے سو اشعار) چھپ کر مقبول ہو رہے تھے۔ راقم الحروف کو بھی اپنے سو منتخب اشعار چھپوانے کا شوق چرایا، میرے اس کتابچہ پر عمر مہاجر نے مقدمہ لکھا، اس وقت وہ بی۔ اے ہو چکے تھے، یہ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے۔

عمر مہاجر پھر مجلس اتحاد المسلمین کے جلسوں میں تقریریں کرنے لگے، اُن کی تقریریں خاصی مقبول ہونے لگیں۔ لسان الامت نواب بہادر یار جنگ اُن کے قدر شناس تھے! تقریروں نے عمر مہاجر مرحوم کو نام اشہور کر دیا! گلبرگہ شریف کے عرس میں ایک بار جانا ہو گیا، وہاں سیرۃ النبیؐ کے جلسوں کا پروگرام تھا۔ روضۂ بزرگ کے سجادہ نشین جو خاصے بڑے جاگیردار تھے، علماء، شعراء اور مقررین و واعظین کے میزبان تھے، عمر مہاجر کی تقریر میں خاصا مجمع تھا مگر تقریر دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی تھی، میں اُن کی تقریر کی داد دیتے

ہوئے ہاتھ اٹھاکر دُعا مانگنے یعنی تقریر ختم کرنے کا اشارہ کرتا، اس پر وہ مجھ سے نگاہیں چرانے کی کوشش فرماتے مگر میں اُن کے سامنے بیٹھا تھا، پھر بھی نگاہیں دو چار ہو جاتیں، اس واقعہ کو وہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں لطف لے لے کر بیان کیا کرتے تھے ——— عمر مہاجر اپنی تقریروں کے ذریعہ حیدر آباد دکن کے مسلمانوں میں مقبول ہوتے جارہے تھے ——— ایکا ایکی یہ خبر سننے میں آئی کہ اُن کا تحصیلداری کی پوسٹ پر تقرر کردیا گیا اور اس طرح حکومت نے مجلس اتحاد المسلمین کے ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان لیڈر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ تحصیلدار ہونے کے چند مہینہ بعد عمر مہاجر، غریب خانہ پر تشریف لائے، میں نے اُن سے کہا کہ آپ ترقی کرکے صدر المہام (وزیر) بن سکتے ہیں مگر قوم کی خدمت آپ کو قائد بنا دیتی یہ آپ نے کیا کیا۔ اس پر وہ مسکرانے لگے۔

جب پاکستان بن چکا تو کئی برس کے بعد اُن سے کراچی میں ملاقات ہوئی جس نے دکن کی اگلی صحبتوں کے نقوش ابھار دیے، ہم دونوں کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل رو رہے تھے۔ پھر ان سے برس دو برس کے وقفہ سے کبھی کبھار ملاقات ہوجاتی، میں نے اُن کا گھر نہیں دیکھا اور وہ میرے یہاں کبھی نہیں آئے۔ کراچی میں تعلقات و روابط کی یہی صورت رہ گئی ہے۔

عمر مہاجر مرحوم ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری سے بھی زیادہ صحیح اور جاندار اردو لکھتے تھے، سرکاری ملازمت سے وابستگی نے اُن کی ادبی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ اگر وہ قرطاس و قلم ہی کے ہوکر رہ جاتے تو صفِ اوّل کے انشاپردازوں میں جگہ پاتے۔ غالب کی مشہور فارسی کتاب "پنج آہنگ" کا اردو ترجمہ اُن کی یادگار ہے، اس ترجمہ کی سلاست و روانی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے!

پاکستان ریڈیو میں انہوں نے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوشی حاصل کی، بڑے محنتی فرض شناس اور ذہین و معاملہ فہم افسر تھے، عملہ اُن سے ہمیشہ خوش رہا اور کسی ماتحت کو اُن کی ذات سے تکلیف نہیں پہنچی۔ ہاں! ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں اداکار اور گانے والی عورتوں سے جو خلا ملا رہتا ہے اس دھندلکے کی وہ اپنے قلم سے اپنے ذاتی تجربہ کی بناپر عکاسی کرتے تو یہ ایک ورق عبرت ہوتا۔ ریڈیو ہی کے کسی پروگرام کے سلسلہ میں کوئٹہ گئے ہوئے تھے کہ ایکا ایکی دل میں چبھن محسوس کی اور یہی تکلیف موت کا سبب بن گئی۔

(ماہنامہ فاران، دسمبر ۱۹۷۰ء)

علی اختر

ایک غم دوسرے غم کو تازہ کر دیتا ہے، اور ایک بات دوسری بات کو یاد دلا دیتی ہے، علی اختر مرحوم کا ذکر نکلا تو حافظہ نے اب سے ستائیس سال پہلے کی یادداشت کے اوراق الٹ دیے اور اس زمانہ کی ایک ایک یاد اور ایک ایک صحبت نگاہوں کے سامنے مجسم ہو گئی۔

۱۹۲۸ء میں سب سے پہلے میرا حیدرآباد دکن جانا ہوا تو شروع شروع میں کئی مہینے مولانا مفتی عبدالقدیر صاحب بدایونی کے ساتھ مہمانداری اور دعوتوں میں گزارے، مولانا موصوف بدایوں چلے آئے تو مرتضیٰ احمد صاحب انصاری وکیل ہائی کورٹ کے بنگلہ میں میرا قیام رہا، وہ اس زمانہ میں جام باغ میں رہتے تھے، خاصا آرام دہ مکان تھا، ان کی آمدنی اور حالات کا جزر و مد بڑا پُر لطف تھا، کبھی روپیہ کی وہ ریل پیل کہ جیسے آسمان سے ہن برس رہا ہے اور کبھی "خشک سالی" کا سماں! انہی دنوں مولانا حمیدالدین قمر[1] فاروقی سنبھلی سے ملاقات ہو گئی، قمر صاحب نے ابھی تک "ادارہ شرقیہ" قائم نہیں کیا تھا، صدر محاسبی میں ملازم تھے اور جدید ملک پیٹ کے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے! ان

---

[1] مولانا حمیدالدین قمر فاروقی سنبھل ضلع مرادآباد کے رہنے والے ہیں، اور دیوبند کے فارغ التحصیل عالم! پنجاب یونیورسٹی کے "مولوی فاضل" حضرت فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے خاندانی نسبت رکھتے ہیں، حیدرآباد دکن میں ان کے قائم کردہ "ادارہ شرقیہ" نے برسوں علوم شرقیہ کی خدمت انجام دی اور سیکڑوں طلباء کو ادیب فاضل اور منشی فاضل بنا دیا، فن تعلیم اور درس و تدریس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، سیر چشم اور حوصلہ مند دوست ہیں، تعدد ازدواج کے معاملہ میں "بھارت ایکٹ" کے عملی مخالف بلکہ "قانون شکن" تقسیم ہند کے بعد سے دکن کی جمعیۃ علماء کی زمام کار کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

سے اتنا ربط ضبط بڑھا کہ انصاری وکیل کے بنگلہ سے اٹھ کر انہی کے یہاں آ گیا چند دن مہمانی میں گزرے، پھر مشترکہ (Mess) کا بندوبست ہو گیا، کئی دوست مل کر کھانا کھاتے تھے، سستے کا زمانہ، یار دوستوں کا جگمگھٹا بے تکلفی کی صحبتیں، خوب مزے سے گزرتی تھی!

مولانا قمر کے یہاں ایک دن ان کے ایک دوست آئے، ان کے ہاتھ میں بہت سے رسالے دیکھ کر میں نے پوچھا تو بولے:

"علی اختر صاحب کے یہاں سے یہ رسالے لایا ہوں، رسالے والے تو ان کے مرید ہیں۔"

جناب علی اختر کی نظمیں رسالوں میں پڑھی تھیں مگر یہ اسی دن معلوم ہوا کہ وہ اسی محلہ (جدید ملک پیٹ) میں رہتے ہیں، اور ہمارا ان کا ابھی تک "چراغ تلے اندھیرا" والا معاملہ ہے! اس کے بعد میں علی اختر مرحوم کے یہاں پہنچا، ملے اور بڑے تپاک سے ملے، بس پھر مسلسل ملنا جلنا رہا، اور تعلقات بڑھتے اور استوار ہوتے چلے گئے!

یہ وہ زمانہ تھا کہ میری نومشقی کا دور ختم ہو چکا تھا اور دوسرے دور کو شروع ہوئے بھی دو تین سال گزر چکے تھے، اس وقت میری شاعری کا یہ رنگ تھا:

میں محوِ خودی ہوں کہیں ایسا تو نہیں ہے　　اپنے پہ مجھے یار کا دھوکا تو نہیں ہے
ہاں! ماہرِ ناشاد سے کچھ تم نے کہا تھا　　تم بھول گئے ہو، کہیں ایسا تو نہیں ہے

اور اس دور میں مشاہیر شعراء اور ارباب فکر و نظر کی صحبت سے استفادہ کا ارادہ کیے بغیر بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ ہی جاتا ہے علی اختر مرحوم تازہ غزلیں اور نظمیں مجھے سناتے اور اپنی محبت سے میرا تازہ کلام بھی فرمائش کر کے سنتے، ایک بار میں نے اپنی نئی غزل سنائی جس کا مقطع تھا:

حیاتِ ماہرِ حزیں رہینِ دردِ عشق ہے
وگرنہ مشتِ خاک کی، اساس کیا نمود کیا؟

میری اس غزل کی انھوں نے بہت تعریف کی، نیاز فتحپوری ان دنوں بلدہ حیدر آباد آئے ہوئے تھے، ان سے بھی میری اس غزل کا تذکرہ کیا، علی اختر مرحوم کی حوصلہ افزائی نے مجھے ابھارا اور میں نے یہ غزل رسالہ "ہمایوں" میں چھپنے کے لیے بھیج دی اور دوسرے مہینہ ہی میری یہ غزل "ہمایوں" میں شائع ہو گئی!

ایک بار انھوں نے اپنی ایک مسلسل غزل

"سحر کل رات کو —— خیر و شر کل بات کو"

سنائی، اس کے بعد میں نے اسی زمین میں غزل کہی اور ہمایوں میں یہ چھپ بھی گئی۔ "ہمایوں" میں میری اس غزل کو پڑھ کر علی اختر صاحب بولے :

"بھئی! تمہاری غزل خوب رہی، مگر میں نے اپنی غزل اس کے بعد چاک کر دی، کیونکہ جو کچھ میں نے کہا تھا، وہ سب تم نے اپنی غزل میں بیان کر دیا۔"

علی اختر مرحوم کا مکان میرے گھر سے بہت قریب تھا، ایک فرلانگ سے بھی کم! دن رات اُن کے یہاں اٹھنا بیٹھنا رہتا، اس دلچسپی اور ہم جلیسی میں "برج" کا شوق بھی شامل تھا۔ تاش کھیلنے کی آج کل جیسی لت حضرت جگر مراد آبادی کو ہے، اتنی تو نہ تھی مگر علی اختر کے یہاں بعض دن آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے مسلسل "برج پارٹی" کا جماؤ رہتا۔ وہ بڑے انہماک کے ساتھ پتے کھیلتے اور ان کے ساتھی (Partner) سے پتہ چلنے میں چوک ہو جاتی تو اس پر بہت بگڑتے اور کبھی کبھار بد مزگی کی نوبت آجاتی! حضرت فانی بدایونی سے حیدر آباد دکن میں میری پہلی ملاقات اسی عالم میں ہوئی کہ ہوش بلگرامی اُن کو لے کر آئے اور نیاز فتح پوری، علی اختر اور میں "برج" (کٹ تھروٹ) کھیل رہے تھے۔

علی اختر مرحوم پُرسوز انداز میں ترنم سے شعر پڑھتے، مشاعروں کے وہ مردِ میدان شروع ہی سے نہ تھے، پنڈت دتاتریہ کیفی ایک بار حیدر آباد دکن گئے، مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت نے اُن کے اعزاز میں بڑے دھوم کا مشاعرہ کیا، طرحی مصرع تھا:

؎ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اس مشاعرے میں وہ شریک ہوئے اور غزل پڑھی، مشاعروں کی ہنگامہ آرائی سے اُن کا جی اُلجھتا تھا!

مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کے نانا نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج علی اختر کے حقیقی چچا تھے، داغ دہلوی سے تلمذ تھا، حکومتِ دکن میں کلکٹر تھے۔ بڑے وضع دار، ملنسار، خوش مزاج اور خود دار! اُن کا دیوان "کیفیاتِ مزاج" چھپ چکا ہے، جس پر میرا مقدمہ ہے، نواب صاحب مرحوم سے میرے اس قدر محبت، خلوص کے روابط

تھے کہ اسے "مثالی دوستی" کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا، نواب صاحب مرحوم اور علی اختر کے درمیان کئی سال سے کشیدگی تھی، میری کوشش سے یہ کھنچاوٹ اور تناتنی دُور ہوئی، اور چچا اور بھتیجے میں ملاپ ہوگیا۔

اب سے چند دن قبل ایک رسالہ میں علی اختر کو باغ سنبھلی کا فرزند لکھا ہوا دیکھا۔ یہ التباس مضمون نگار کو تخلص (باغ) کے سبب ہوگیا، وہ باغ سنبھلی کے نہیں سید کاظم علی باغ کے بیٹے تھے، باغ مرحوم کو جہاں استاد داغ دہلوی سے نسبتِ تلمذ تھی۔ سادات کا یہ خاندان مغلیہ بادشاہوں کے دور میں سبزوار سے ہندوستان آیا اور مغلیہ حکومت نے کاسگنج ضلع ایٹہ کے قریب دو تین گاؤں اُن کو جاگیر میں عطا کیے، سید کاظم علی باغ کی پیدائش علی گڑھ میں ہوئی۔ ریاست رامپور اور ریاست گوالیار سے ملازمت کا تعلق رہا، پھر دکن چلے گئے، وہاں ٹھیکیداری کرتے تھے، داغ کے رنگ میں کامیاب غزل گو تھے، مشاعرے میں بڑے ٹھاٹ کے ساتھ غزل پڑھتے، خوش طبع خوش لباس، خوش خوراک اور شاہ خرچ تھے، علی اختر مرحوم کا مولد رامپور ہے، حیدرآباد دکن جب وہ یو۔ پی سے گئے ہیں تو میٹرک پاس کرچکے تھے، اُن کی ملازمت کی ابتدا محکمہ آبکاری سے ہوئی۔ مدراس میں (غالباً) ٹریننگ حاصل کی اور پھر محکمہ آبکاری کے انسپکٹر ہوگئے۔ اس محکمہ میں "دستِ غیب" کے قدم قدم پر مواقع تھے، وہ چاہتے تو ہزاروں نہیں لاکھوں روپے پیدا کرلیتے مگر وہ اس دلدل میں کنول کی طرح رہے، حالانکہ وہ کثیر الاولاد تھے اور تنخواہ میں کسی طرح گزر نہ ہوتی تھی، اکثر پریشان بلکہ قلاش رہتے۔ ان کی دردانگیز نظم —— فاقہ کی ایک شام —— اسی زمانہ کی یادگار ہے، اور یہ جگ بیتی نہیں سچ مچ آپ بیتی ہے!

حیدرآباد دکن میں ہوش بلگرامی مرحوم (نواب ہوش یار جنگ) سے علی اختر مرحوم کا بڑا یارانہ تھا۔ ہوش صاحب نے بھی اپنی دوستی کا حق ادا کردیا، ہوش بلگرامی جس محکمہ (تعمیرات) کے معتمد (سکریٹری) تھے، علی اختر پنشن کے وقت اسی محکمہ میں مددگار معتمد (اسسٹنٹ سکریٹری) تھے، ایک ہزار روپیہ ماہوار سے اوپر تنخواہ ملتی تھی، یہ ان کا سب سے زیادہ خوشحالی کا دَور تھا، مگر ؎

قرار در کفِ آزادگاں نہ گیرد مال ؎ نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

علی اختر دفتری صلاحیت میں اپنی آپ مثال تھے، قلم کے دھنی اور معاملہ فہم! اُن کے لکھے ہوئے مسودوں میں ادبیت بھی ہوتی تھی، ہوش بلگرامی کے مضامین اور اُن کے نام سے چھپی ہوئی مثنوی میں علی اختر کی فکر و کاوش کا بہت کچھ ہاتھ تھا، ڈیڑھ دو سال نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں مسلسل حاضر باشی رہی اور دس بیس نہیں سینکڑوں غزلیں ان کی "نذر" کر دیں!

اردو دُنیا میں علی اختر مرحوم کا تعارف رسالہ "نگار" کے ذریعہ ہوا، اُن کی خاصی طویل نظمیں "نگار" میں برسوں چھپتی رہی ہیں، نیاز فتح پوری ان کی شاعری سے بہت متاثر تھے، ایک بار نیاز صاحب نے اپنے ایک مضمون میں یہاں تک لکھ دیا۔

"علی اختر آج بھی جوش ملیح آبادی سے زیادہ اچھا شعر کہتے ہیں ــ"

اس پر ادبی حلقوں میں، خاصی چہ میگوئیاں رہیں!

نیاز فتح پوری نے حدیث و فقہ کے خلاف جو طوفان اٹھایا تھا، اس سے شروع شروع میں علی اختر بھی متاثر ہو گئے، مجھ سے کئی بار اس ضمن میں گرما گرم بحث ہوئی مگر اللہ کے فضل سے یہ رنگ بہت جلد اتر گیا پھر تو وہ مذہب میں غرق ہو کر رہ گئے اور رہ کہاں گئے یوں کہیے ساحلِ مراد تک پہنچ گئے!

جہاں تک مجھے علم ہے، علی اختر مرحوم کو شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا، اُن کی ابتدائی غزلوں کا یہ رنگ تھا:

ڈوبی ہوئی پاتا ہوں، نبضِ دلِ دیوانہ
ہلکی سی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ!

پھر تغزل میں "نظم" کا رنگ پیدا ہو گیا:

عوضِ لہو کے اگر بجلیاں نہ رقصاں ہوں
تو وہ شباب کا اک وہم ہے شباب نہیں

علی اختر کو زندگی کی شدید کشمکش سے سابقہ پڑا۔ اُن پر بڑے سخت وقت آئے، اس چیز نے اُن کو دُنیا سے بہت بیزار کر دیا، اُن کی بیسیوں نظموں میں دنیا سے بیزاری کی نمایاں جھلک ملتی ہے، اور بعض نظموں میں تو وہ نرے "سوفسطائی" نظر آتے ہیں کہ اُن کی نگاہ میں ہر "حقیقت" ایک فریب اور دنیا کی ہر لذت سراب اور ہر تصور و خیال

ایک دھوکا معلوم ہوتا ہے! زندگی کے اسی مسلسل کرب نے ان کے جذبات میں سرور و نشاط پیدا ہوتے نہیں دیا۔ وہ دراصل ایک مفکر شاعر تھے اور جذبات پر اُن کی فکر کا غلبہ تھا، ان کے کلام میں جذبات ہیں مگر شریفانہ جذبات! سنجیدہ اور متوازن شاعری بلند افکار! وہ اونچی فضا میں پرواز کرتے ہیں اور کہیں کہیں اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ اقبال کی لَے میں لَے ملا دیتے ہیں! جوش ملیح آبادی کی نظم "حرفِ آغاز" کے جواب میں "قولِ فیصل" بڑے معرکہ کی نظم کہی!

اُن کے کلام کے دو مجموعے — "اسرار" اور "انوار" — شائع ہو چکے ہیں۔ افسوس ہے پاکستان کے کسی پبلشر کو اُن کے مجموعۂ کلام کو چھاپنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اُن کے ہزاروں اشعار (نظمیں، غزلیں، رباعیات، قطعے) ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں! اس اعتبار سے وہ خوش قسمت تھے کہ اپنے جیتے جی اپنے فرزند نظر حیدر آبادی کی شہرت دیکھ لی! دوسروں کا کیا گلہ کیجیے خود ہم اُن کے دوستوں اور شناساؤں نے اُن کی خاطر خواہ قدر نہیں کی، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، تو محسوس ہوا کہ کتنی بڑی دولت کو ہم ناقدروں نے کھو دیا، "قدرِ نعمت بعدِ زوال" کی ضرب المثل سچ ثابت ہوئی۔

حیدر آباد دکن کی تباہی کے بعد وہ بھی ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے، اور یہ سات آٹھ سال کا زمانہ بیماری ہی میں گزرا، ان کی صحت کئی برس سے جواب دے چکی تھی آخر میں بینائی تک جاتی رہی، اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، آنکھوں کا آپریشن کرانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر نے کہا کہ ان کی کھانسی کو جب تک آرام نہ ہو جائے، آپریشن خطرہ سے خالی نہیں۔ ان کی علالت کے دوران میں ایک بار مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی بیمار پُرسی کے لیے آئے، مولانا موصوف سے اُن کی حیدر آباد کی ملاقات تھی، جناب جوش ملیح آبادی اُن کے یہاں اکثر آتے رہتے اور اپنی دوستی آخر وقت تک نباہتے رہے!

مذہب سے تو اُن کو ہمیشہ شغف رہا مگر پاکستان آنے کے بعد وہ سراپا رکوع و سجود بن کر رہ گئے، کس خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتے، کس عاجزی کے ساتھ دعا مانگتے، فجر کی نماز کے وقت سے جو اوراد و وظائف اور نوافل کا سلسلہ شروع ہوتا تو نو بجے جا کر کہیں ختم ہوتا، اُن کی نماز دیکھ کر مجھ تن آسان اور آوارہ مزاج کو اپنی بے دلی کی نماز پر شرمندگی ہوتی اور اُن کی حالت پر رشک آتا، شاعروں میں ایسی خشیت اور

توجہ الی اللہ کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہو گی۔

میں جب بھی جاتا، مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے، اور گھنٹوں گفتگو رہتی، میں جانے کے لیے جلدی کرتا تو اصرار کر کے روک لیتے، اُن کے یہاں جانے میں تاخیر ہو جاتی تو دوسروں سے میرا تذکرہ کرتے اور میرے آنے کے منتظر رہتے، اُن سے آخری ملاقات اُن کے مرنے سے دس بارہ دن پہلے ہوئی۔ نظر حیدر آبادی نے اپنے یہاں صبح سویرے آنے کے لیے کہا، نہاری کی دعوت تھی، میں اُن کے یہاں آٹھ بجے کے بعد پہنچا، حیدر آبادی ذائقہ کی نہاری کھائی، پھر میں علی اختر کے کمرے میں آ گیا، نو بجے ہوں گے مگر وہ وردو وظائف میں مشغول تھے اس سے فارغ ہوئے تو ناشتہ کے لیے آواز دی، ناشتہ آنے میں ذرا سی تاخیر ہوئی تو آتے ہوئے ناشتہ کو پھیر دیا، مریض کی طبیعت یوں بھی نازک ہوتی ہے اور وہ تو شاعر بھی تھے! اندر سے اصرار ہوا تو پھر ناشتہ کیا، دودھ میں کورن فلیک (CORN FLAKES) بھیگے ہوئے، یہ ان کا ناشتہ تھا! کہنے لگے معدہ جواب دے گیا ہے۔ پھر مجھ سے محبت آمیز شکایت کی: —— "ماہر! بہت دن کے بعد آئے ——"

باتوں باتوں میں کہنے لگے: —— "اس جوش (ملیح آبادی) سے میں نے بارہا کہا ہے کہ خدا کے بندے اب تو توبہ کر کے راہِ راست پر آ جا —— "

میں نے کہا، حضرت علیؓ کی شان میں تو قصیدے کہتے ہیں مگر خدا کا اور اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس پر وہ کڑک کر بولے: "یہ رفض ہے!" —— اتنے میں اُن کے شاگرد سالک صاحب آ گئے ——

چلتے وقت مجھ سے دوبارہ جلد آنے کا وعدہ لیا، میں سوچتا ہی رہا کہ آج جاؤں، کل جاؤں، اسی عرصہ میں صبح سویرے اخبار میں ان کی موت کی خبر پڑھی جو غیر متوقع نہ تھی، مگر دل کو دھچکا لگا، اُسی وقت ان کے یہاں پہنچا، چند احباب تعزیت کے لیے آئے ہوئے تھے، نظر حیدر آبادی اداس بیٹھے تھے اور راغب مراد آبادی رو رہے تھے، اُن کا کمرہ بند تھا، اب میں دستک کیوں دیتا، جن سے ملنے کے لیے آیا کرتا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے اس مکان ہی سے نہیں اس دنیا سے جا چکے تھے پنچھی اڑ گیا اور پنجرے کو لوگوں نے پیوندِ زمین کر دیا۔ رہے نام اللہ کا (اللھم اغفرہٗ)

جانے والے! تجھ پر اللہ کی رحمت ہو، ہم بھی تیرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں، بس اویر سویر کا معاملہ ہے منزل سب کی یہی ہے، اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ اٹھائے اور آخرت کی رسوائی سے بچائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۵۸ء)

ڈاکٹر عندلیب شادانی

ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کے تنقیدی مضامین ماہنامہ "ساقی" دہلی میں شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ اب سے ۴۲ سال پہلے کی بات ہے۔ انہی مضامین کے ذریعہ اُن سے غائبانہ تعارف ہوا، جگر، فانی اور بعض دوسرے غزل گو شعراء کے کلام پر طنز آمیز تنقید تھی۔

سنہ ۴۰ء یا سنہ ۴۱ء میں علی گڑھ نمائش کے مشاعرے میں میرا آنا ہوا، نمائش میں مسلم یونیورسٹی کلب کا شامیانہ لگا ہوا تھا وہاں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا اور فرمایا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی بھی اس دعوت میں ہوں گے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا ہے کہ ماہر القادری کو میرا نام نہ بتانا، شعراء مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں، میں نے جواب میں عرض کیا ——— مگر میں اُن شاعروں میں نہیں ہوں، آپ شادانی صاحب سے بلاجھجک تعارف کرائیں! اس دعوت میں یونیورسٹی کے چند اساتذہ بھی تھے، کھانے میں خان کی دُکان کے مشہور پراٹھے، کباب اور حلوہ اور خورجہ کا شلجم کا اچار! دعوت کے بعد شعر و شاعری بھی رہی۔

ڈاکٹر شادانی مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ پھر دس سال بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ کے مشاعرے میں اُن سے نیاز حاصل ہوا، جناب فضل کریم فضلی ان دنوں مشرقی پاکستان میں محکمہ تعلیم کے سیکرٹری تھے، انہی کے ایماء سے ہر سال ڈھاکہ میں "انڈو پاک" مشاعرہ ہوا کرتا تھا، حضرت جگر مرادآبادی نے کئی مشاعروں میں شرکت فرمائی، فنا نظامی کانپوری بھی ان کے ہمراہ تھے، اور یہی مشاعرے فنا صاحب کے تعارف اور شہرت کا ذریعہ قرار پائے، ایک مشاعرے کی صدارت سر فیروز خاں نون نے کی جو اُس زمانے میں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے!

ڈاکٹر شادانی صاحب مشاعروں اور ترقی اردو بورڈ کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لاتے رہتے اور اُن سے مشاعروں، پارٹیوں اور ادبی نشستوں میں

بار بار ملاقات ہوتی رہتی ، زبان و ادب کے بعض مسائل پر اُن سے تبادلہ خیال بھی ہوا ، اور راقم الحروف نے انہیں وسیع المطالعہ اور صاحب نظر پایا۔

ایک بار حیدر آباد کے مشاعرے میں شرکت ہونے کے لیے کراچی سے ایک ہی ٹرین میں سفر کیا ، مگر وہ فرسٹ کلاس میں تھے اور ہم باقی شعراء سیکنڈ کلاس میں! نو دس سال سے مشرقی پاکستان میں جو مشاعرے ہو رہے ہیں —— ایک دو کے علاوہ ڈاکٹر شادانی صاحب ان مشاعروں میں نظر نہیں آئے ۔ اُن کو اس بات کی سخت شکایت تھی کہ لاہور ، کراچی وغیرہ مقامات سے جو شعراء ڈھاکہ آتے ہیں وہ مجھ سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آتے ! ملاقات اور ملنے ملانے کا بہت کچھ تعلق طبیعتوں اور مزاجوں کی مناسبت سے ہے یا پھر جگر مراد آبادی جیسی محبوب شخصیت ہو کہ ان کی بے پڑائی کے باوجود لوگ اُن سے ملنے کا اشتیاق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر شادانی بلند پایہ شاعر تھے۔ شعر ترنم سے پڑھتے ان کے لہجہ میں خاص کھٹکا تھا مگر بعض اوقات ایسی دھن اختیار کرتے اور لفظوں کو ٹکڑے کر کے شعر پڑھتے کہ شعر بے وزن اور بحر سے خارج ہونے کا امکان ہوتا! اچھے شاعر ہونے کے علاوہ اچھے نثر نگار بھی تھے! ان کا آخری مضمون حضرت ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ پر نظر سے گزرا جس میں انہوں نے تحقیق کے ساتھ لکھا کہ جو فارسی رباعیات حضرت ابوالخیر کے نام سے منسوب ہیں وہ ان کی نہیں ہیں ، حضرت موصوف کے زمانہ میں یا ان کے بعد کسی تذکرہ نگار نے ان کے شاعر ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ اس مضمون کا جواب کسی نے نہیں دیا اور دیا ہو تو میرے مطالعہ میں نہیں آسکا۔ بہر حال شادانی مرحوم کی یہ عجیب تحقیق تعاقب کی مستحق ہے۔

ڈاکٹر شادانی ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے ، ان کی ساری زندگی شعر و ادب اور تعلیم و تعلم میں بسر ہوئی ، یونیورسٹی کے امتحانات کے پرچے سیٹ کرتے اور امتحانات کی کاپیاں بھی دیکھتے ، ممتحن ہونے کے علاوہ نہ جانے کتنی کمیٹیوں کے صدر ، رکن اور مشیر تھے ، مرنے کے دن نہ تھے مگر موت کو صحت و جوانی کے حصار بھی نہیں روک سکتے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۹ء)

عیشؔ فیروزپوری

اُن کے نام کے ساتھ "علامہ" لکھا جاتا تھا، بڑے مشاق، پُرگو اور زود گو شاعر تھے، طبیعت میں انکسار کے ساتھ بے نیازی بھی سموئی ہوئی تھی، اپنے بعد شاگردوں کی خاصی بڑی تعداد چھوڑی، جن میں سے بعض فارغ الاصلاح ہو چکے تھے، اُن کے دم سے قدیم اساتذہ کی یاد تازہ تھی، مرحوم کی استادانہ حیثیت اپنی جگہ مسلّم تھی، بہت سے اہلِ سخن نے اُن سے استفادہ کیا۔

جناب مذاقؔ العیشی نے ملتان سے اپنے استاد حضرت عیشؔ فیروزپوری کا کلام عنایت فرمایا ہے جس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے:-

نظارۂ رُخِ ساقی کمالِ مستی ہے
شراب مینہ کی طرح عیشؔ پر برستی ہے

بہ شکل دیدۂ حیراں ہے دامنِ یوسفؑ
عجب اے عشق! یہ تیری دراز دستی ہے

حق اس کی دوستی کا ادا ہو سکے جہاں تک
یہ زندگی وہیں تک وابستۂ سفر ہے

ایسے میں آپ آئیں، آئیں ضرور آئیں
بیمارِ جاں بلب ہے مشکل میں چارہ گر ہے

نظر سے جلوۂ رنگینِ یار گزرا ہے
مرے قریب سے عہدِ بہار گزرا ہے

اُسی کو ڈھونڈنے اک دن قیامت آئے گی
گزار کر جو شبِ انتظار گزرا ہے

تبسم سے دیا میں نے جواب اس کے تبسم کا
خود اپنے ہاتھ سے تہہ کر کے غم کی داستاں رکھ دی

رُباعی

مدہوش اِنہی باتوں سے ہو جاؤں گا
تم سامنے بیٹھے ہو میں کھو جاؤں گا!
افسانہ سناؤ نہ شبِ وصل مجھے
برسوں کا ہوں جاگا ہوا سو جاؤں گا!

(ماہنامہ فاران، ستمبر ۱۹۶۸ء)

مولانا محی الدین غازی اجمیری

۱۹۳۳ء میں مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی معیت میں راقم الحروف نے عراق کا سفر کیا، جب ہم سفر سے واپس ہوئے تو دو ہفتہ کے قریب بمبئی میں ٹھہرے۔ میں نے روزنامہ ”خلافت“ کے لیے ایک مقالہ لکھا جس میں برطانوی سیاست پر شدید تنقید کی، یہی مقالہ مولانا شوکت علی مرحوم سے تعارف کا سبب بنا۔ خلافت ہاؤس میں ایک صبح کو مولانا شوکت علی کے ہمراہ ناشتہ کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا، وہیں مولانا محمد عرفان اور مولانا محی الدین غازی اجمیری سے ملاقات ہوئی، پھر میں بمبئی سے حیدرآباد دکن چلا گیا۔

مولانا محی الدین غازی نے حیدرآباد مجھے کئی خط لکھے، اُن کی بڑی تمنا تھی کہ روزنامہ خلافت کے ادارہ سے میری وابستگی ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، تنخواہ کی شرط نے معاملہ کو ٹھپ کر دیا! —— زمانہ گزرتا گیا، غیر منقسم ہندوستان میں سیاست کی پُر شور آندھیاں چلتی رہیں یہاں تک کہ ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آگیا۔

مولانا محی الدین غازی اجمیری سے نظامی دواخانہ میں سولہ سال کے بعد ملاقات ہوئی، بڑے تپاک اور محبت سے ملے: بمبئی کی ملاقات اور اپنی مراسلت کا ذکر کیا، مولانا مرحوم حیدرآباد (سندھ) میں رہتے تھے۔ شہید سہروردی جب پاکستان کے وزیراعظم تھے تو اُن کی حمایت میں غازی صاحب نے ایک کتابچہ لکھا تھا اس پر اُن سے سخت گفتگو کی نوبت بھی آگئی! نظامی دواخانہ ہی ہم دونوں کا نقطۂ اتصال اور مرکز ملاقات تھا۔ مگر وہاں انہوں نے آنا جانا ترک کر دیا۔ خاندانی قضیے ترک تعلقات کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔

مولانا غازی اجمیری کی سیاسی روش میرے نزدیک محلِ نظر تھی، اس لیے اُن سے معاملہ حسن ظن کا نہیں رہا، چار سال ہوئے کئی برس کے بعد اردو ترقی بورڈ میں اُن سے ملاقات ہوئی، علامہ عبدالعزیز میمن عربی ادب پر تقریر فرما رہے تھے۔ تقریر کے بعد غازی صاحب سے تھوڑی دیر گفتگو رہی۔

مولانا غازی حیدرآباد چھوڑ کر اب مستقل طور پر کراچی میں آباد ہو گئے تھے اور سیاسی

مشاغل سے پوری طرح ترکِ تعلق کر چکے تھے، علم وادب کی خدمت اب اُن کا مشغلہ تھا، اُن کے حالات کی اس تبدیلی نے مجروح حسنِ ظن کو بحال کر دیا!

بعض اوقات جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر تنقید کرنے سے پہلے میری بہت کچھ تعریفیں کرتے مگر انہوں نے جماعت اور مولانا مودودی کی مدافعت میں مجھے ہمیشہ فولاد کی مانند بے لچک پایا۔ یہ چوٹیں چلتی رہتیں۔ لیکن بعد میں وہ محتاط ہو گئے۔ مولانا مودودی کی کتاب "جبر و قدر" میں نے اُنہیں پڑھنے کے لیے دی تو کتاب واپس کرتے ہوئے اُن کے علم و فضل اور ذہانت و تحقیق کو سراہا

مولانا غازی مرحوم نے مختلف علوم و فنون کی "مصطلحات" کتابی صورت میں مدون کی تھیں۔ آخر عمر میں یہ بہت بڑا علمی کارنامہ انجام دیا، اردو زبان وادب میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب مرتب ہوئی ہے، فلسفہ، منطق، تصوف، علمِ کلام اور فقہ و حدیث کی کیسی کیسی نازک اور بسیط و جامع اصطلاحات کی انہوں نے سلیس اُردو میں دل نشین شرح کی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے کئی ہزار روپیہ میں اس کتاب کے حقوق اُن سے خرید لیے تھے مگر ابھی تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی، مجھ سے بڑے دل گرفتہ انداز میں فرمایا کہ تم انجمن ترقی اردو کے اربابِ حل و عقد کو توجہ دلاؤ یا پھر اپنے رسالہ میں نوٹ لکھو۔ میں نے عرض کیا کہ اس سلسلے میں میری طرف سے سلسلہ جنبانی مفید ہونے کی بجائے اُلٹی مضر ثابت ہوگی!

مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ خیرآبادی مکتبِ فکر و دانش کی شمع فروزاں تھے۔ علامہ سید برکات احمد نوراللہ مرقدہٗ کے ارشد تلامذہ میں اُن کا شمار ہوتا تھا مولانا محی الدین غازی نے حضرت مولانا معین الدین اجمیری سے جو اُن کے بڑے بھائی بھی تھے درسِ نظامی پڑھا تھا! مگر تحصیلِ علم کے بعد اُن کی ساری ذہانت اور توانائی سیاسیات کی نذر ہو کر رہ گئی، اپنی عمرِ عزیز کا بہترین حصہ انہوں نے سیاست کی دشت نوردی میں گزارا۔ یہی مشغلہ اُن کا ذریعۂ روزگار بھی تھا۔

پھر ایسا خوشگوار انقلاب آیا کہ عمر کے آخری دور میں علم وادب کی قلمی خدمت اُن کی زندگی بن کر رہ گئی۔ مجھے جب انہوں نے سب سے پہلے اپنی "کتاب مصطلحات" کے کچھ اجزاء سُنائے اور میں نے چند مقامات پر اپنی رائے عرض کی تو چونک پڑے۔

تھوڑی دیر کے غور و تامّل کے بعد فرمایا، تمہاری رائے درست ہے۔ "فاران" میں ان کی کتاب کے اقتباسات کئی قسطوں میں شائع ہوئے۔ میں نے کہیں کہیں قلم لگا دیا تھا! اپنے مضامین پڑھ کر دیے انہیں میں اجازت دیتا ہوں جہاں مناسب سمجھو میری تحریر میں تم رد و بدل کر سکتے ہو!

غریب خانہ پر جب بھی تشریف لاتے تو مضامین کے مسودے اُن کے ہاتھ میں ہوتے، بہت تھوڑی دیر بیٹھتے، اپنا کوئی مضمون حوالہ کیا یا کام کی دو چار باتیں کیں اور چل دیے۔ علامہ اقبالؒ کے فرزندِ اکبر آفتاب اقبال صاحب سے ان کے مراسم تھے۔ میں نے اُن سے تاکید کے ساتھ عرض کیا کہ علامہ کی خانگی زندگی کو منظرِ عام پر نہ لائیے، مگر عالمی ڈائجسٹ والے اُن کو شہہ دیتے رہے۔

اُن کی گھریلو زندگی بہت پُرسکون تھی۔ بیوی سے والہانہ محبت تھی، اللہ تعالیٰ کا اُن پر خاص فضل تھا کہ پیرانہ سالی میں حرص جوان ہونے کی بجائے بوڑھی ہو گئی تھی۔ اپنے حالات میں قانع تھے، اُن کی یہ تمنا تھی کہ آذوقہ حیات کی کوئی مستقل صورت پیدا ہو جائے تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام کو جاری رکھ سکیں! نشر و اشاعت کے ایک بہت بڑے ادارے کے مالک سے میں نے مولانا غازی کے بارے میں عرض بھی کیا مگر ناکامی ہوئی۔

سن ستر سال سے متجاوز تھا مگر صحت بہت اچھی تھی اور کام کرنے کا ولولہ رکھتے تھے! موت کو تو کوئی بہانہ چاہیے، پیر ہاشم جان مجددی صاحب سے جو اجمیر شریف میں اُن کے ہم درس رہ چکے ہیں ملنے کے لیے گئے، پیر صاحب کو اپنی کتاب کے چند اقتباسات سنائے، پیر صاحب قبلہ کے نو تعمیر مکان میں پانی کے لیے جو حوض بنایا گیا تھا اُسے بھرا نہیں گیا وہی حوض اُن کی موت کا سبب ٹھہرا اس میں گر جانے سے ایسی چوٹ لگی کہ پھر چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے، بہت علاج معالجہ ہوا مگر دوا دارو کے ساتھ ساتھ مرض اور بڑھتا گیا۔ میں اُن کے مکان پر عیادت کے لیے حاضر ہوا جسم پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ مجھ سے "ظہورِ قدسی" سننے کی فرمائش کی، میں نے نعتیہ اشعار سنائے تو رونے لگے عشقِ رسولؐ ان کی سیرت کا سب سے روشن اور مقدس باب ہے یہی عشق آخرت میں انشاء اللہ العزیز ذریعہ نجات اور وسیلہ مغفرت ثابت ہوگا۔

مرض نے طول کھینچا یہاں تک کہ اُنہیں ہسپتال میں داخل کرنا پڑا، میں ہسپتال دیکھنے کے لیے گیا تو بے ہوش تھے، آکسیجن دی جا رہی تھی۔ آکسیجن سے اعصاب میں تو انتعاش پیدا ہو جاتا ہے مگر ضعفِ قلب بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ڈاکٹروں کی تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں اور مریض چند دن کے بعد "مرحوم" بن گیا۔ (ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۷۰ء)

پروفیسر حبیب اللہ غضنفر

اردو کالج کے مشاعروں اور ادبی تقریبوں میں اکثر جانا ہوتا رہتا، بابائے اردو مولوی عبدالحق خاص طور سے خاکسار کو ایسے موقعوں پر یاد فرماتے، وہیں پروفیسر غضنفر سے علیک سلیک ہو جاتی، اُن سے بات چیت اور ادبی مسائل پر تبادلۂ خیالات کا کبھی موقع نہیں ملا۔

کئی سال ہوئے کسی رسالہ میں عروض پر اُن کا مضمون پڑھا اور اُسے پڑھ کر دنگ رہ گیا کہ عروض میں اتنی بصیرت، درک اور معلومات رکھنے والا شخص اپنی کراچی ہی میں موجود ہے! مولوی معشوق حسین اطہر ہاپوڑی عروض میں بڑی شہرت رکھتے تھے، کراچی ہی میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کے عروض کے سب سے بڑے استاد جن کے قولِ سند پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، یہی پروفیسر غضنفر تھے! پھر تو جہاں کہیں اُن سے ملنا ہوتا تو میں خود بات کرنے میں پہل کرتا!

اُردو کالج کی پروفیسری سے سبکدوش ہونے کے بعد پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے اُن کی وابستگی ہو گئی تھی، میں ٹیلی فون کے ذریعہ عروض کے بارے میں کوئی بات دریافت کرتا تو بڑی شفقت سے جواب دیتے اور ایسی وضاحت کرتے کہ میں مطمئن ہو جاتا! اس بات کو دو مہینے ہوئے ہوں گے میں نے ایک دن صبح نو بجے کے قریب اُن سے گفتگو کرنے کے لیے ٹیلیفون کیا، ہسٹاریکل سوسائٹی کے کسی کارکن نے میرا نام پوچھا۔ نام بتلانے پر وہ صاحب بولے کہ میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتا ہوں، ڈیڑھ دو منٹ کے انتظار کے بعد ڈاکٹر معین الحق صاحب نے رسیور اٹھا کر یہ غمناک خبر سنائی کہ پروفیسر غضنفر صاحب کا تو شب میں انتقال ہوگیا۔ بالکل غیر متوقع خبر! میں نے اس اُمید کے ساتھ ٹیلی فون کیا کہ پروفیسر غضنفر صاحب سے چند مصرعوں کی تقطیع کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ بات تشنہ رہ گئی اور ضرورت پڑی تو اُن کے دفتر یا مکان پر حاضری

دوں گا —— مگراب وہ اس دنیا میں کہاں تھے، پنچھی اڑ گیا، بس پنجرا رہ گیا سو اُس کے بھی کفن دفن کی تیاری ہو رہی تھی! اس قحط الرجال میں ایسے ارباب علم و فن کا اٹھ جانا علم و فن کا سانحہ ہے! جو جاتا ہے وہ ایک خلا چھوڑ جاتا ہے، اس دور میں اہلِ کمال کا نعم البدل تو کیا بدل بھی مشکل ہی سے ملتا ہے! غفرلہ اللہ تعالیٰ۔

موت سے کسی جاندار کو مفر نہیں بس آگے پیچھے کی بات ہے۔ مگر واہ ری! دنیا اور تیری شیشہ گری کہ آدمی آخر دم تک دنیا ہی میں اُلجھا رہتا ہے۔ سو سال کے بوڑھے کی بھی یہی تمنا ہوتی ہے کہ کچھ دن اور جی لوں —— ! مگر وہ جو شیفتہ نے کہا تھا ۔

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے

فوز و فلاح اُس کے لیے جس نے دُنیا سے آخرت کے لیے زادِ سفر ساتھ لے لیا! اور نیک اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا طلب گار رہا۔

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۲ء)

چوہدری غلام محمد

پاکستان بننے کے بعد کراچی میں چوہدری[1] غلام محمد صاحب سے ملاقات ہوئی یہ غالباً ۱۹۴۹ء کے اوائل کا واقعہ ہے، "فاران" ابھی تک نکلا نہ تھا، تیاریاں ہو رہی تھیں، اس کے بعد چوہدری غلام محمد صاحب مرحوم سے تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے۔ خلوت میں، جلوت میں، سفر میں، جلسوں اور دعوتوں میں، جیل خانے کے پھاٹک پر اور عدالت فوجداری کے کمرے میں غرض زندگی کے ہر اسٹیج اور ہر موڑ پر چوہدری صاحب سے ملنا جلنا ہوتا رہا، اُن کی شخصیت میں بڑی کشش تھی، جو شخص بھی اُن سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

گزشتہ سال جولائی میں افریقہ اور یورپ کے سفر کے بعد جب میں جدہ ایرپورٹ پر اترا تو چوہدری صاحب دوسرے احباب کے ساتھ موجود تھے، میں نے عرض کیا "آپ نے کیوں زحمت کی؟" ہنستے ہوئے فرمایا ——— "بھئی! یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ جدہ آئیں میں یہاں موجود رہوں اور آپ کی آمد کی خبر سن کر آپ کو لینے کے لیے نہ آؤں!"

تقریباً سوا سال ہوا، لندن کے ہسپتال میں اُن کا آپریشن ہوا تھا اور اس کے بعد وہ اچھے ہو گئے، کمر کی برسوں کی تکلیف بھی جاتی رہی۔ مگر صحت کی یہ بحالی کینسر کے مریض کے لیے سنبھالا ثابت ہوئی، وہ پھر بیمار ہو گئے، جناح ہسپتال میں تین چار ہفتہ رہنا پڑا، وہاں ٹیوب کے ذریعہ دوا پہنچائی گئی، صابر حسین صاحب شرقی کی معیت

---

[1] اس لفظ کا املا "چودھری" کیا جاتا ہے۔ لیکن پنجاب میں "چوہدری" لکھتے ہیں، غلام محمد مرحوم بھی اس لفظ کا املا "چوہدری" کرتے تھے اور فرماتے تھے یہی صحیح املا بھی ہے! مرحوم کی پسند کی رعایت سے میں نے بھی یہی (چوہدری) املا اس مضمون میں اختیار کیا ہے (م۔ق)۔

میں انہیں دیکھنے کے لیے گیا تو اُن کے چہرے پر بحالی دیکھ کر جی خوش ہوگیا، وہ خود بھی توانائی محسوس کر رہے تھے مگر ہسپتال سے مکان واپس آنے کے بعد مرض پھر عود کر آیا۔ ڈاکٹروں نے اس کا اعتراف کیا کہ جو دوا اُنہیں ہسپتال میں دی گئی تھی وہ مضر ثابت ہوئی! اس کے اثرات جب تک باقی ہیں دوسری دوا نہیں دی جا سکتی، کئی بار اُن کے مکان پر جا کر میں نے عیادت کی اور ہر بار یہی محسوس کیا کہ اُن کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی چلی جا رہی ہے، اُن کی آنکھوں کی چمک دھندلا رہی تھی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ میں پہلی سی جان نہیں رہی تھی مگر بیماری اور صحت کی ابتری کے کسی کرب انگیز مرحلے میں بھی اُن کے لبوں پر شکوہ و شکایت کا کوئی حرف نہیں آیا، اُن کی زبان آخر دم تک اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر سے تر و تازہ رہی! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ڈھاکہ سے کراچی صرف اُن کی عیادت کے لیے تشریف لائے تو کئی دن کی بے ہوشی کے بعد اُنہیں افاقہ ہو گیا، مگر یہ "افاقۃ الموت" تھا۔

——— اور پھر ———

وہ وقت آ گیا، جس سے کسی جان دار کو مفر نہیں، یہ دن تو ہر کسی کو دیکھنا ہے، زندگی کے ڈرامہ کا ڈراپ سین موت ہی پر ہوتا ہے۔ میں اپنے مکان پر تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا، یہ دفتر جماعت اسلامی کا ٹیلی فون تھا، دفتر جماعت کے کارکن مسلم صاحب نے غمناک لہجہ میں کہا کہ چوہدری غلام محمد صاحب کا انتقال ہو گیا، یہ خبر غیر متوقع نہ تھی، مگر پھر بھی ایسا لگا جیسے اُفق سے ایک تابناک ستارہ ٹوٹا اور فضا میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

چوہدری غلام محمد مرحوم کا جنازہ دوسرے دن اٹھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ رات کے جہاز سے تشریف لا چکے تھے، مرحوم کے نو تعمیر مکان کے سامنے شامیانہ لگا تھا اور سوگواروں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا، مولانا مودودی کرسی پر مغموم بیٹھے تھے۔ سنجیدگی میں غم بھی شامل ہو جائے تو یہ نظارہ بڑا الم انگیز ہوتا ہے! میت کا آخری دیدار صبر و ضبط کا انتہائی نازک اور سخت امتحان تھا نہ جانے کتنی بہت سی آنکھیں اشکبار تھیں، شریعت اجازت دیتی تو ماتم اور گریہ و بکا کے شور کی در و دیوار سے صدائے بازگشت آتی ——— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے چوہدری صاحب مرحوم کی دینی خدمات کا اعتراف نہایت ہی مختصر الفاظ میں کیا مگر پھر بھی بہت کچھ کہہ دیا، یہ موقع کسی لمبی چوڑی تقریر

کے لیے موزوں نہ تھا، انہوں نے رُک رُک کر چند جملے کہے جیسے جذباتِ غم کی شدّت الفاظ میں ڈھلتے ڈھلتے رہ جاتی ہے۔

جمعہ کا مبارک دن تھا، نمازِ جنازہ اور دفن میں ہزاروں آدمی شریک تھے۔ ناظم آباد کی جامع مسجد سے لاری کی بجائے لوگ فرطِ محبت و احترام سے بےتاب ہو کر جنازہ قبرستان تک کاندھوں پر لے گئے! اخبارات نے چوہدری صاحب کی موت پر غم انگیز اداریے لکھے، ملک کی نامور شخصیتوں نے تعزیت کی! مرحوم کے انتقال کے بعد اس کا اندازہ ہوا کہ عوام کے دلوں میں اُن کی کتنی محبت اور عزت تھی۔

چوہدری صاحب اب سے تقریباً تیس سال پہلے محکمہ ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے، اسی زمانے میں مولانا مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ کر اُن کے ذہن و فکر میں انقلاب پیدا ہوا، یہاں تک کہ انہوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور ۱۹۴۴ء میں جماعت اسلامی کے رُکن بن گئے۔ اور ۴۴ء سے لے کر مرتے دم تک جماعت سے وابستہ رہے، جماعت پر بڑے سخت اور نازک وقت آئے مگر چوہدری صاحب کی وفاداری میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، جماعتِ اسلامی کے بارے میں انہیں پورا یقین اور اطمینان تھا کہ یہ حق پسند جماعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم و برپا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اس لیے جماعت اسلامی سے ان کا پیمانِ وفا محکم تر ہوتا چلا گیا۔ صوبہ کی جماعت کے قیم اور امیر رہے اور ۱۹۵۷ء میں دو مہینہ کے لیے جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کی خدمت انجام دی، دین و دنیا کا یہ بہت بڑا اعزاز تھا، جو انہیں کسی کوشش اور خواہش کے بغیر میسر آیا۔

ظرف و تحمل کا یہ عالم کہ حالات کیسے ہی ناساز گار بلکہ ہمت شکن کیوں نہ ہوں وہ نہ گھبراتے نہ ہراساں ہوتے اور نہ اُن کے کام کرنے کی رفتار کسی حادثہ، مشکل، دشواری اور مصیبت کا کوئی اثر قبول کرتی! اُن کی کمر میں برسوں شدید درد رہا ہے مگر درد و کرب کی حالت میں گھنٹوں جم کر کام کرتے رہیں نے انہیں سیاسی ملزم کی حیثیت سے عدالت فوجداری کے کمرے میں اور قیدی کی حیثیت سے جیل خانہ کے دروازے پر دیکھا ہے مگر اُن کے ماتھے پر شکن تک محسوس نہیں کی!

انتظامی قابلیت میں آپ اپنا جواب! کراچی کی جماعت کے ہزاروں کے بجٹ کو لاکھوں تک پہنچا دیا، پھر جہاں تک دیانت کا تعلق ہے تو اُن کی دیانت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ جماعت اسلامی کراچی

کے کارکن بلکہ کتنے عہدیدار اور اکابر ہیں جو چوہدری صاحب کے تربیت یافتہ ہیں ——— وہ مردم شناس بھی تھے، اب سے چند سال قبل ایک صاحب جو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تھے اُن کے بارے میں چوہدری صاحب سے میں نے کہا اُنہیں جماعت اسلامی سے اور خاص طور سے آپ سے کچھ شکایتیں ہیں، مگر میری گفتگو کے بعد وہ اس بات پر مطمئن ہو گئے ہیں کہ مجموعی طور پر جماعت اسلامی دین کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ آپ حضرات بھی اُن سے سوءِ ظن نہ رکھیں اور جماعت اسلامی سے علیحدگی کو "جرم" خیال نہ کریں، چوہدری صاحب نے اس پر قدرے تیز لہجے میں فرمایا: "وہ ماہر صاحب! یہ شخص جماعت اسلامی کی مخالفت میں نہ جانے کہاں تک جائیگا"

تجربہ کے بعد راقم الحروف کو اپنی رائے اور سفارش پر ندامت ہوئی، چوہدری صاحب مرحوم نے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک ثابت ہوا اس شخص نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت و تضحیک، دروغ بافی، الزام تراشی، تہمتیں جوڑنے اور بدنام و بے آبرو کرنے میں آدابِ اخلاق اور شرم و حیا کی ساری حدیں مسمار کر دیں۔

چوہدری غلام محمد مرحوم نے اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی مگر کتابوں کے مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ نے اُن میں وہ ذہانت، بصیرت، معاملہ فہمی اور فراست و تدبر پیدا کر دیا تھا، جو تعلیم کا غایت و مقصود ہے، بولتے بولتے انہیں تقریر کی خاصی اچھی مشق ہو گئی تھی، اخبارات میں سیاسی مباحث و مسائل پر اُن کے جو بیانات شائع ہوا کرتے تھے وہ بڑے محتاط، جامع اور فکر انگیز ہوتے تھے۔ تحریر سلجھی ہوئی، ذہن و فکر مرتب، سوچنے کا انداز خالص دینی، قول و عمل میں یک رنگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صاحب عزیمت و استقامت!

کتنے ہی تعلیمی اداروں کے مرحوم سرپرست اور صدر تھے، کراچی کی اسلامی تحقیقاتی اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری کے منصب پر بھی وہ فائز تھے۔ اردن سے لے کر سوڈان تک اسلامی ممالک کا دورہ کیا، نہ جانے کتنی بین الاقوامی اور عالمی کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ عرب ممالک کے مشاہیر سے تعارف ہی نہیں دوستانہ روابط تھے، حجاز کے عربی اخبارات میں اُن کے انٹرویو نمایاں طور پر شائع ہوتے تھے۔ عرب ممالک کے مسائل سے جتنی انہیں واقفیت تھی اتنی واقفیت کم ہی لوگوں کو ہوگی! ان کی موت جماعت اسلامی ہی کا نہیں ملتِ اسلامیہ کا سانحہ اور نقصان ہے! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو منور فرمائے، اُن کا حشر صالحین کے ساتھ ہو اور آخرت میں قربِ حق میسر آئے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۷۰ء)

نواب[۱] فخر یار جنگ بہادر

نواب فخر یار جنگ بہادر سے پہلی بار ۱۹۲۹ء میں نیاز حاصل ہوا۔ مرحوم ان دنوں دولتِ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے معتمد امور مالیہ (فینانس سیکرٹری) تھے۔ میری اُن سے پہلے کی نہ کوئی شناسائی تھی اور نہ وہ مجھے جانتے تھے۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ہمراہ ان کی کوٹھی پر جانا ہوا اور پھر اس کے بعد تقریباً ۱۹۴۳ء تک اُن سے ملنا ہوتا رہا، کسی مذہبی جلسہ میں، پارٹی میں، دفتر میں اور خود ان کے مکان پر۔

فخر الدین احمد نام تھا۔ ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے، سر سید احمد خاں کے دور میں علی گڑھ کالج کے ممتاز طالب علم رہے اور یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی کے بعد حکومتِ انگریزی کے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں گزیٹڈ پوسٹ پر تقرر ہو گیا۔ وہاں چند برس گزار دینے کے بعد، حکومتِ نظام (حیدرآباد دکن) نے ان کی خدمات حاصل کر لیں، اور "صدر محاسب" (Chief Accountant) کے عہدہ پر ان کو فائز کیا گیا۔ پھر نواب صاحب فینانس سیکرٹری ہوئے اور اس کے بعد وزیر فینانس۔

نواب فخر یار جنگ بہادر مرحوم انتہائی دیانت دار اور فرض شناس حاکم تھے، اپنے عہدہ ہائے جلیلہ سے جلب منفعت کے لیے ذرا سی بھی ڈھیل برتتے تو چاندی سونے کی اینٹوں سے تجوریاں بھر لیتے۔ مگر دیانت و راستبازی کے معاملہ میں وہ فولاد کی طرح بے لچک تھے۔ حکومتِ نظام کے امورِ مالیہ کی کنجی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ریاست کے ہر محکمہ کا ان سے واسطہ پڑتا تھا اور وہ مشائخ ہوں، درگاہیں اور دینی مدرسے ہوں یا اسکول اور کالج، سب کی مالی امداد کی منظوری انہی سے متعلق تھی، اس لیے ان سے ہر کوئی ملنا اور قریب تر ہونا چاہتا تھا۔ مگر اس اعزاز و منصب اور اختیار کے باوجود

۱؎ یہ تاثرات اب سے بہت پہلے آنے چاہیے تھے۔ مگر یہ تاخیر بھی مقدر کر دی گئی تھی، یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا اختیار جبر و مشیت کے سامنے عاجز نظر آتا ہے۔ (م۔ ق)

نواب صاحب مرحوم ہر کسی سے جھک کر ملتے۔ نہ رعونت، نہ تکبر نہ کوئی طمطراق۔ ایک شریف باوقار ذمہ دار انسان کی طرح، اہلِ معاملہ اور غرض مندوں سے شریفانہ برتاؤ۔ عید کی تقریب پر اپنے محکمہ کے چپراسیوں تک سے بغل گیر ہوتے اور مصافحہ کرتے۔

وزیر خزانہ اگر مالی معاملات میں نرمی اور فراخدلی سے کام لے تو حکومت کا خزانہ خالی ہو جائے۔ نواب فخر یار جنگ بہادر مالی کارروائیوں میں بڑی چھان بین کرتے اس لیے بعض اہلِ معاملہ کو ان سے شکایت بھی ہو جاتی۔ فرض شناسی، مستعدی اور محنت کا یہ عالم تھا کہ جن دنوں انگریزی کمپنی سے محکمۂ ریل اپنے تمام اختیارات و متعلقات کے ساتھ حکومتِ نظام کو منتقل کیا جا رہا تھا، تو ہفتوں راتیں کو مسلسل جاگ جاگ کر کاغذات پڑھے، مسلیں دیکھیں اور شرائط کا مطالعہ کیا اور اس طرح انگریزی کمپنی کو جو رقم دی گئی اس میں لاکھوں روپیہ کی کمی کرالی، اس شب بیداری، مطالعہ اور محنت نے ان کی بینائی کو متاثر کر دیا۔ درمیانہ قد، گوری رنگت، دل کش خد و خال چہرے پر ڈاڑھی اور بہار دیتی تھی، صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند، وضع دار، اور نیک سیرت، لایعنی باتوں سے طبعاً نفور، ایک بار کسی صاحب نے ان کے تقوے کی تعریف کی، تو بڑی حسرت اور ندامت کے لہجہ میں بولے۔ "جی، تقویٰ — خوب! اور یہ مجھے کروڑوں روپیہ کا سود کا حساب جو کرنا پڑتا ہے —" ضمیر کی یہ بیداری اور خود شناسی ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔

سیرۃ النبیؐ کے کئی جلسوں میں نواب صاحب مرحوم کی صدارت میں راقم الحروف نے نعتیہ نظمیں بھی پڑھی ہیں عشقِ رسولؐ تو ان کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن باب تھا ؎

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

تقسیمِ ہند سے تین چار سال قبل معدہ کے مریض ہو گئے تھے اور اسی زمانے میں سننے میں آیا تھا کہ پونا کے علاقہ میں مہابلیشر میں کسی ڈاکٹر کے زیرِ علاج رہے۔ ان نے مسلسل فاقے کرائے تو معدہ اور ضعیف ہو گیا اس کے بعد انہوں نے پندرہ سال صاحبِ فراش ہو کر گزارے، ان کے لائق صاحبزادے اور بہت سی خوبیوں میں باپ کے وارث و جانشین جناب مشتاق احمد خاں صاحب جب کراچی میں نظام گورنمنٹ کے نمائندے (ایجنٹ جنرل) تھے تو میں نے "حیدرآباد ہاؤس" میں نواب صاحب مرحوم کو آخری بار دیکھا تھا مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مولانا عبد القدیر بدایونی کا حال پوچھا کہ انہی کے ساتھ آج سے اکتیس سال قبل نواب صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تھا۔

ڈاکٹر مولانا فضل الرحمٰن انصاری

جمعیۃ الفلاح کے بانی مبانی مولوی تمیز الدین خاں مرحوم و مغفور (اسپیکر نیشنل اسمبلی پاکستان) تھے۔ اب سے تقریباً بیس بائیس برس پہلے اس جمعیۃ کے ماہانہ آرگن VOICE OF ISLAM کی ادارت مولانا فضل الرحمٰن انصاری (ایم۔اے) سے متعلق تھی۔۔ جمعیۃ الفلاح کے جلسوں اور تقریبوں میں مولانا مرحوم سے راقم الحروف کی ملاقات ہوتی رہتی، یہ زمانہ اُن کی شہرت کے آغاز کا تھا۔ میں نے جب پہلی بار انہیں دیکھا ہے تو اُن کی پاکیزہ صورت، شرعی وضع قطع اور سنجیدہ چال ڈھال کا، دل نے اچھا اثر قبول کیا۔ اس کے بعد سیرت النبیؐ کے جلسوں میں اُن سے ملنے اور بات چیت کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں ساؤتھ افریقہ اور نیروبی کے سفر کے بعد جب میں نے یورپ کی سیر و سیاحت کی تو جنیوا بھی جانا ہوا اور اُسی اسلامی سینٹر میں ٹھہرا جہاں مولانا فضل الرحمٰن انصاری مرحوم قیام فرما تھے! کئی دن اُن کا ساتھ رہا، کراچی کے مشہور تاجر ابراہیم باوانی اپنے بال بچوں کے ساتھ جنیوا میں مقیم تھے انہوں نے شام کے وقت اس بین الاقوامی باغ و بہار شہر کی اپنی کار میں سیر کرائی! اس ادارے کی جانب سے ایک نشست کا اہتمام ہوا، مولانا فضل الرحمٰن انصاری نے انگریزی میں خاصی اثر انگیز تقریر کی۔ اس کے بعد میں نے نعتیہ غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ سوڈان کے ایک دولت مند شخص جو حکومت میں وزیر یا نائب وزیر بھی رہ چکے تھے، اپنے فرزند کے علاج کے سلسلہ میں جنیوا میں اقامت گزیں تھے، انہوں نے اپنے یہاں دوپہر کے کھانے پر بلایا، مولانا فضل الرحمٰن انصاری، سیٹھ ابراہیم باوانی اور راقم الحروف اس دعوت میں شریک ہوئے۔ خاصی پُرتکلف دعوت تھی! ہمارے یہ میزبان مولانا انصاری سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے مولانا مرحوم کو سوڈان آنے کی دعوت بھی دی تھی۔

میرا سفر تو سیر سپاٹے کا سفر تھا۔ جنیوا کے بعد یورپ کے کسی شہر کے لیے پرواز کی جہاں کوئی دینی کانفرنس ہو رہی تھی۔ کراچی میں سیرت النبیؐ کے ایک جلسہ میں انہوں نے فرمایا کہ میں بریلوی عقائد رکھتا ہوں، مگر اکابر دیوبند کا نام "حضرت" اور "رحمۃ اللہ علیہ"

کے آداب والقاب کے ساتھ لیا۔ ٹیلی فون پر وقت مقرر ہونے کے بعد میں ایک دن اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، بڑے تپاک کے ساتھ معانقہ کیا، چائے اور خوش ذائقہ لوازمات سے تواضع کی۔ پھر میں نے قیام میلاد، عرس، نیاز، فاتحہ، استمداد لغیر اللہ وغیرہ مسائل پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی اور عرض کیا کہ دین میں کیسے کیسے حشو و زوائد داخل ہو گئے ہیں جن کی کتاب و سنت سے تائید نہیں ہوتی۔

راقم الحروف ایک گھنٹہ تک بولتا رہا مگر مولانا فضل الرحمن انصاری مرحوم نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہا نہ "ناں" اور نہ "ہاں"! کس ضبط و تحمل کے آدمی تھے کہ میری باتیں خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ میری باتوں کا انہوں نے کیا اثر قبول کیا؟ میں اٹھا اور مصافحہ کے بعد انہوں نے خدا حافظ کہا، میری گزارشوں پر اپنی رائے محفوظ رکھی، پھر اس موضوع پر اُن سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا۔

مولانا فضل الرحمن انصاری "وائس آف اسلام" کی ایڈیٹری سے سبکدوش ہو کر کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے، یہیں سے انہوں نے پی، ایچ، ڈی کیا۔ اس عرصہ میں انہوں نے "المرکز العالم الاسلامی" کی بنا ڈال دی۔ خیر پسند دولت مند طبقہ نے تعاون کیا۔ کئی لاکھ روپے کی عمارتیں بن گئیں، جن میں مسجد خاص طور سے قابل ذکر ہے! کراچی یونیورسٹی میں ان کی تنخواہ بارہ سو روپیہ سے شاید کچھ زائد ہی ہو گی، مگر مرکز کے تعلیمی، تبلیغی اور تصنیفی امور کے لیے پوری یکسوئی کی ضرورت تھی اس لیے وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے! مرکز کے انگریزی آرگن (Minaret) میں تقریباً ہر مہینہ اُن کا کوئی نہ کوئی مقالہ ضرور ہوتا۔ دین و اخلاق پر کئی کتابیں لکھیں۔ تقریر و تحریر میں سائنس اور فلسفہ سے استشہاد و استدلال اُن کے مطالعہ کی وسعت اور ذہانت کا ثبوت ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیمات پر انگریزی میں اُن کی آخری معرکہ آرا تصنیف گزشتہ سال شائع ہوئی جس کا علمی حلقوں میں چرچا ہے۔ دو ضخیم جلدیں جن کی قیمت سو روپیہ سے کچھ زائد ہی رکھی گئی ہے۔

مولانا انصاری مرحوم اردو کے سوا انگریزی کے بلند پایہ انشا پرداز اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ تقریباً ہر سال بیرونی ممالک کا تبلیغی دورہ فرماتے، ساؤتھ افریقہ کے مسلمانوں کی دعوت پر کئی بار وہاں گئے اور اپنی تقریروں کا گہرا نقش چھوڑا۔ جون کے مہینہ میں ساؤتھ افریقہ کے دو صاحبان راقم الحروف سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے

مولانا کے مواعظ وتقریر کی بڑی تعریف کی! مولانا فضل الرحمٰن انصاری کے قائم کیے ہوئے مرکز میں بیرونی ممالک کے مسلمان طلبہ کی تعلیم وتربیت ہوتی ہے!

محمد جعفر صاحب (ایم۔اے) مولانا مرحوم کے دستِ راست تھے، جو اخلاص و عمل میں اپنی آپ ہی مثال ہیں۔یہی صاحب مولانا کے جانشین مقرر ہوئے ہیں اور مرحوم کی اس معنوی یادگار کے امین و منتظم ہیں!

مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری کے خسر اور مولانا شاہ احمد نورانی کے والد محترم تھے ــــــ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی کی قبر تو مدینہ منورہ کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں ہے مگر جانشینی کے معاملے میں اُن کے فرزند مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کے داماد ڈاکٹر مولانا فضل الرحمٰن صدیقی کے مابین اختلافات نے اس قدر طول کھینچا کہ سالے اور بہنوئی کے تعلقات منقطع ہو گئے[1]

۱۹۷۱ء کے انتخاب میں مولانا مرحوم نے جماعتِ اسلامی کی حمایت کی۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں اُن کی زبان سے کلمۂ خیر ہی سننے میں آیا۔انتخابات کے چند ماہ بعد اسلامی جمعیتہ طلبہ کا ایک نوجوان رکن ایک جلسہ کی دعوت دینے کے لیے میرے یہاں آیا۔ وہ بولا میں مولانا فضل الرحمٰن انصاری کے پاس سے آرہا ہوں میں انہیں جمعیتہ طلبہ کے اجتماع میں مدعو کرنے کے لیے گیا۔مگر انہوں نے عجیب بات کہی کہ ہم نے جماعتِ اسلامی کا ساتھ دیا مگر اُدھر سے کوئی پزیرائی اور قدر دانی نہیں ہوئی۔

(غالباً) فیلڈ مارشل ایوب خاں مرحوم کے دورِ حکومت میں اسلامی علوم کی تحقیقات کا جو مرکز قائم ہوا تھا، اس کے ڈائرکٹر تھے ڈاکٹر فضل الرحمٰن! جن کی تجدد پسندی اور دینی مسائل میں حد سے بڑھی ہوئی آزادیٔ رائے کی سرحد بے دینی سے ملتی تھی، ایوب خاں کے آخری زمانے میں علماء اور عوام مسلمانوں کے شدید احتجاج پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو ان کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا۔اخبارات و رسائل میں اُن کے خلاف مضامین کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مولانا فضل الرحمٰن انصاری فرماتے تھے کہ بھئی! نام کی مشابہت نے مجھے عجیب پریشانی میں ڈال دیا ہے بہت

---

[1] مگر مولانا نورانی میاں جنازے میں شریک تھے۔

سے ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ " فضل الرحمٰن " میں ہی ہوں۔ روزانہ ٹیلی فون آتے ہیں۔ گالیاں بھی سننی پڑتی ہیں، میں تردید کرتے کرتے تھکا جاتا ہوں۔

مولانا فضل الرحمٰن انصاری مرحوم لباس اور وضع قطع میں اپنے خسر مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔ وہی نیچی عبا اور اسی طرح عمامہ کی ساخت اور ویسا ہی کشمشی رنگ! پان کے بہت زیادہ شوقین تھے مگر برسوں سے گٹکا استعمال کرتے تھے۔ جسم چھریرا، قد متناسب اور چہرہ پُرکشش، علم فضل ذہانت اور جذب سوز ان کے بشرے سے نمایاں تھا۔ لباس مکان اور رہن سہن صاف ستھرا، معاش اور روزگار کی طرف سے بے فکری اور اطمینان! برسوں سے ذیابیطس کے مریض تھے۔ دوا اور پرہیز سے غافل نہیں رہے مگر موت کا علاج کس کے پاس ہے۔ جنازے میں زیادہ تعداد لکھے پڑھے اشخاص اور دولت مند طبقہ کی تھی۔ مرکز اسلامی کی عمارت کے صحن ہی میں دفن ہوئے ——— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۷۴ء)

قابلؔ اجمیری

غزل سرا بھی رہا، ذکرِ یار بھی نہ کیا (قابلؔ)

اجمیر شریف میں مشاعرہ تھا، یہ اب سے سترہ (۱۷) سال پہلے کی بات ہے اسی سلسلے میں میرا وہاں جانا ہوگیا۔ حکیم نصیر الدین ندوی اجمیری جن کا نظامی دواخانہ کراچی میں خاصی شہرت رکھتا ہے، ان سے پہلی ملاقات اسی مشاعرے میں ہوئی۔ مشاعرے کے دوسرے دن مجھے بخار آگیا۔ حکیم صاحب موصوف میری قیامگاہ پر تشریف لائے اور اصرار کرکے اپنے یہاں لے گئے۔

ایک دن شام کو چند احباب کے ساتھ میں حکیم نصیر میاں کے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا اتنے میں تین چار نوجوان آئے، علیک سلیک کے بعد مصافحہ ہوا، ان میں سے ایک صاحب بولے کہ میں فلم لائن میں جانا چاہتا ہوں، آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں! میں نے اس پر لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا کہ میں فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو چکا ہوں، اس لائن میں کوئی شک نہیں دھن برستا ہے، روپیہ پیسہ کی بڑی ریل پیل رہتی ہے اور ہر طرح کا لطف اور عیش میسر آتا ہے لیکن اخلاقی اعتبار سے آدمی گھاٹے میں رہتا ہے اور شاعر کی شعریت اور ادیب کی ادبیت کو بڑا نقصان پہنچتا ہے، میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس چکر میں نہ پڑیں، رزق کے لیے اور بہت سی راہیں کھلی ہوئی ہیں!

اس پر وہ نوجوان ایک خاص تاثر کے ساتھ بولا:۔

"جی، یہ تو میری موت اور زندگی کا سوال ہے، مجھے اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو خودکشی کرلوں گا۔"

اس پر سب لوگ مسکرانے لگے اور اس نوجوان کی یہ گفتگو جب بھی ہماری بے تکلف صحبتوں میں دہرائی جاتی، تو سننے والے بے اختیار مسکرا دیتے اور کوئی کوئی من چلا قہقہہ بھی لگا دیتا۔

اس واقعہ کے دو ڈھائی سال بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی، پاکستان بنا اور اس طرح بنا کہ مسلمانوں کو آگ اور خون کے دریا سے گزرنا پڑا۔ اسے ہجرت سمجھیے یا فرار کہیے میں بھی وطنِ عزیز کو چھوڑ کر کراچی آگیا۔ کس بے سروسامانی کے عالم میں [illegible]

مگر ـــــــ ہ یہ کہتے چل دیے کہ خدا کارساز ہے

اللہ تعالیٰ کی کارسازی اور اس کی بندہ نوازی کے قربان جائیے سب کام بنتے اور تمام سلسلے جڑتے چلے گئے یہاں تک کہ ماہنامہ "فاران" بھی شائع ہونے لگا! انھیں دنوں دفتر "فاران" میں ایک صاحب تشریف لائے اور کہا کہ میں اجمیر کا رہنے والا ہوں، قابلؔ تخلص ہے، آپ سے حکیم نصیر میاں کے مکان پر ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کی شکل وصورت اور چہرے مہرے کی یاد جو چار پانچ سال کی مدت میں دھندلی پڑ گئی تھی، اور دب سی گئی تھی اُن کے یاد دلانے پر ایکا ایکی اُبھر آئی۔ انھوں نے پھر اپنی کئی غزلیں سنائیں، اُن کے کلام کو سن کر میں چونک پڑا کہ یہ تو آہنگ ہی عجیب ہے اور شاعری کی پیشانی سے سچ مچ "ستارۂ ہوش مندی" طلوع ہو رہا ہے: اب نہ وہ "فلم" کا تذکرہ تھا نہ اس قسم کی کوئی اور بات تھی۔ سنجیدہ گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں شائستگی کا انداز! ان سے مل کر طبیعت نے مسرت بلکہ قربت اور ہم خیالی سی محسوس کی!

حیدر آباد پہنچ کر انھوں نے خط لکھا، غزل بھیجی اور اس طرح خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا، پھر وہ کراچی تشریف لائے، اور بہ ایں "حالِ زار" تشریف لائے کہ منہ سے خون آتا تھا، دو چار قدم چلتے تو لڑکھڑا جاتے۔ آواز بہت ہی کمزور اور نقیہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر بالاتفاقِ رائے "دق" (T. B) تجویز کر چکے تھے! اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ اُن کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا! "براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو" والا معاملہ تھا!

قابلؔ اجمیری کئی مہینے دفتر "فاران" میں رہے، میرے چھوٹے بھائی (مسرور) نے ان کی بڑی دلسوزی کے ساتھ ٹہل اور تیمار داری کی جب وہ حیدر آباد کو واپس گئے ہیں تو اُن کی حالت بہتر تھی۔ مرض میں بھی ایک حد تک افاقہ تھا اور اپنے قوا میں بھی وہ پہلے کے مقابلہ میں توانائی محسوس کرنے لگے تھے۔

ڈاکٹروں نے بعض امراض کی "چھوت" سے بڑا ڈرا رکھا ہے، مگر قابلؔ اجمیری کی تیمار داری اور بیماری کے تجربے نے اس "چھوت" کو بھی ایک "وہم" ثابت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے گھر کے ایک فرد کو بھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور دق کا ایک جرثومہ بھی کسی دوسرے کو متاثر نہ کر سکا۔

حیدرآباد میں چند دن تو وہ اچھے رہے، مگر پھر مرض عود کر آیا، دق کے مریض کے لیے دوا کے علاوہ سب سے پہلی چیز جو چاہیے وہ اچھی خوراک ہے! اس کا بھی اللہ تعالیٰ کے کرم سے کچھ دنوں کے لیے بندوبست ہو گیا، اس کارِ خیر میں سب سے زیادہ حصہ جناب اسمٰعیل احمد تسنیم مینائی[1] نے لیا۔ خود بھی مدد کی اور اپنے احباب سے بھی رقمیں بھجوائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ قابلؔ اجمیری اپنے کلام کی بدولت خاصے متعارف ہو چکے تھے اور لوگوں کے دلوں میں انھوں نے عزت و محبت کا مقام حاصل کر لیا تھا اخبارات میں ان کے لیے اپیلیں شائع ہوئیں کہ حکومتِ پاکستان کو اس جوہرِ قابل کی مدد کرنی چاہیے، اس پر پیر علی محمد راشدیؔ نے جو اُن دنوں پاکستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تھے قابلؔ اجمیری کے علاج اور گزر بسر کے لیے نقد روپیہ اور ماہانہ وظیفہ کا اعلان کیا —— مگر اس اعلان کو عمل میں آنے کی توفیق میسر نہ آسکی، خود قابلؔ صاحب اور اُن کے ہمدرد بس وقتی طور پر خوش ہو کر رہ گئے! مارشل لا کے دَور میں البتہ اتنا ہوا کہ رائٹرز گلڈ کی سفارش پر محترم صدرِ پاکستان نے ان کے علاج کے لیے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ مرحوم کوئٹہ سینی ٹوریم میں داخل ہوئے اور وہاں سے خاصے توانا اور صحت مند ہو کر واپس ہوئے!

قابلؔ اجمیری شاعر تھے اور شاعر کی زندگی کو کسی نہ کسی عنوان سے "رومان" سے ضرور سابقہ پڑتا ہے، قابلؔ مرحوم کے کردار کی یہ خوبی تھی کہ اُن کے "رومان" کا انجام بخیر ہوا۔ ایک عیسائی نرس کو اُن کی شریکِ زندگی بن کر ایمان و اسلام کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُن کے دو سال پسندیدہ بیوی کی رفاقت میں مسرّت و اطمینان کے ساتھ بسر ہوئے اور اب سے چند مہینے پہلے بچے کی ولادت نے مودت و محبت کے اس رشتہ کو قوی تر بنا دیا۔

اسی سال اگست کے مہینے میں ٹنڈو آدم میں جناب دردؔ سعیدی کے زیرِ اہتمام مشاعرہ ہوا۔ قابلؔ اجمیری مرحوم سے آخری بار اسی اجتماع میں ملاقات ہوئی، انھوں نے سامعین کے اصرار پر کئی غزلیں[2] سنائیں! مشاعرے کے بعد مجھ سے دیر تک گفتگو کرتے رہے، اس

---

[1] امیر مینائی کے پوتے اور کراچی کارپوریشن کے سابق چیف آفیسر

[2] قابلؔ مرحوم کی غزل کا ایک شعر یاد رہ گیا! ؎

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۱۸۱ پر)

گفتگو میں انھوں نے حیدرآباد کے چند شاعروں کے نام لے کر گلہ کیا کہ وہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں، اور ان کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم ہو چکا ہے، جام شورو کے کسی مشاعرے کی روداد بھی انھوں نے سنائی۔

قابل اجمیری اب شہرت اور ہر دلعزیزی کے اس دور سے گزر رہے تھے کہ رسالوں اور اخباروں میں اُن کی غزلیں اہلِ ذوق تلاش کر کے پڑھتے تھے، شعر و ادب کی محفلوں میں اُن کا چرچا ہوتا تھا۔ غزل میں اُن کی انفرادیت کو بڑے بڑے اساتذہ اور فنکار تسلیم کرتے تھے، شاعرانہ شہرت کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر اُن کی حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی ـــــ انھوں نے تغزل کے جس باغ کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا، اُس کی بہار سے لطف اندوز ہونے کا وقت آیا، تو موت نے اُن کی کتابِ زندگی پر خاتمہ کی مُہر لگا دی ـــــ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۲ء)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں نے اس کے لب و رخسار کو چھو کر دیکھا
حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

اسی مشاعرے میں ایک شاعر کی غزل کے مطلع نے مشاعرے کو لوٹ لیا:

ٹھہر بھی جا در ساقی پہ دو گھڑی کے لیے ۔۔۔ تمام عمر پڑی ہے روا روی کے لیے

افسوس ہے کہ ان کا تخلص یاد نہیں رہا، جب یہ صاحب اسٹیج پر آئے تو قابل مرحوم نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ..." ان کو سنیے !

اُستاد قمر جلالوی

میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب اُن کی غزل کا یہ مطلع ؎

کچھ تو منہ سے بول مجھ کو دیکھ دن بھر ہو گیا
او بُتِ خاموش کیا سچ مچ کا پتھر ہو گیا

ایک صاحب کی زبانی سُنا اور سنتے ہی ازبر ہو گیا، اس کے تقریباً دو سال بعد قصبہ گنور ضلع بدایوں کے مشاعرے میں قمر صاحب کو دیکھا، اُن کی کئی غزلیں سُنیں، اُن کے اس شعر ؎

بس آج چین سے تیماردار سو جائیں
مریض اب نہ کہے گا، سحر نہیں ہوتی

نے بہت متاثر کیا ــــــ

۱۹۲۶ء میں راقم الحروف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان دیا، علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں قمر جلالوی مرحوم کو بار بار مشاعروں میں سُنا!

ایک بزرگ تھے محمد داؤد خاں، فغاں تخلص کرتے تھے۔ علی گڑھ کے پٹھان محلہ میں سکونت تھی، شہر کے سب سے زیادہ معمر شاعر بلکہ استاذ الاساتذہ، شاعری کا رنگ امیر مینائی سے ملتا جلتا، اُن کے صاحبزادے سلیمان خاں آرزو کے اہتمام سے مہینے میں ایک دو مشاعرے ہوتے ــــ طرحی بھی اور غیر طرحی بھی! اُن مشاعروں میں استاد قمر جلالوی سب پر چھائے رہتے اور جتنی داد تمام شاعروں کو ملتی اُس سے زیادہ داد تنہا قمر صاحب کے حصہ میں آتی۔ مرحوم ان دنوں غزل سنانے سے پہلے قطعے پڑھتے، قطعوں سے جب رنگ جم جاتا تو غزل شروع فرماتے اور مشاعرے کو سچ مچ لوٹ لیتے، ایک قطعہ کے تین مصرعے یاد رہ گئے ہیں ــــ

.. بہ رنگِ سبزہ مجھے پائمال کر دو گے
لبِ عنبر نرگس کا حال کر دو گے
....
گھٹا گھٹا کے قمر کو ہلال کر دو گے

میں بھی ان مشاعروں میں ایک نو مشق شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا!

قمر جلالوی کی عمر اس وقت چالیس بیالیس سال کی تھی، شہر کے دسیوں نوجوان ان کے شاگرد تھے، اُن میں نمایاں اور ممتاز ایک ہندو شاگرد بہار تھا، فیض محمد فیض بھی قمر صاحب کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے، پیشہ کے لحاظ سے حجام مگر شرافت میں سیدوں اور شیخوں سے بڑھ کر شریف اور عالی ظرف، اُن کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

یوں تو وہ مالک ہے چاہے ڈال دے تنکے میں جان
ورنہ اب حالت ترے بیمار کی اچھی نہیں!

سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ کا مشہور قصبہ ہے، وہاں یوسف ڈبالوی مرحوم میونسپلٹی کے سکتر تھے، اُن کے زیر اہتمام بڑے دھوم کا سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب شعراء صاحبان اپنے کرایہ سے مشاعروں میں جاتے تھے، اتنے بڑے مشاعرے میں راقم الحروف کو طرحی غزل پڑھنے کا پہلا موقع میسر آیا۔ قمر جلالوی کی غزل خاصی کامیاب رہی۔ اسی مشاعرے میں حضرت دلیر مارہروی مرحوم کو سُنا۔ سن ستر سال سے بھی متجاوز، جوان بیٹے کی موت نے کمر جھکا دی تھی مگر ترنم کس قدر جاندار اور پُرسوز تھا، اور کلام غزل کی آبرو!

جو خون دل میں تھا وہ مری چشم تر میں ہے — اے ضبط! روکنا کہ ابھی گھر کے گھر میں ہے
پہلے ہی خاکِ دل تھی مری فخر کائنات — اب پوچھنا ہی کیا کہ تری رہگزر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اُسے عمر بھر میں ہے

قمر جلالوی کا اُس زمانے میں رنگ شاعری یہ تھا:۔

عندلالہ کے کلیاں چن رہے ہیں اُن کے داماں پر — اب ایسے میں کوئی بجلی نہیں گرتی گلستاں پر
روکتا تھا ناخدا کشتی کہ طوفاں آگیا — تم جہاں پر ہو بس اتنی دور تھے ساحل سے ہم
شکریہ! اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ — اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

پاکستان آنے کے بعد اُن کی شاعری میں اور زیادہ نکھار پیدا ہو گیا، فرماتے ہیں:

اس ترے سر کی قسم فرق سر مُو بھی نہیں — جس قفس میں ہوں پریشاں ہے تیرے گیسو بھی نہیں
بزم میں اُس جگہ ساقی نے بٹھایا ہے مجھے — ہاتھ پھیلاؤں تو جاتا نہیں پیمانے تک
راستے بند کیے دیتے ہو دیوانوں کے — ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے

کسی کا نام لو بے نام افسانے بہت سے ہیں
نہ جانے کس کو تم کہتے ہو دیوانے بہت سے ہیں

بنائے دے رہی ہیں اجنبی ناداریاں مجھ کو
تری محفل میں ورنہ جانے پہچانے بہت سے ہیں

لکھی ہے خاک اڑانی ہی اگر اپنے مقدر میں
ترے کوچے پہ کیا موقوف ویرانے بہت سے ہیں

ہوئی ہے ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے
جاتے میں قدم اور اٹھے آتے میں قدم اور

کہا کسی سے نہ میں نے ترے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو!!

دعا بہار کی مانگی تھی اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

تخلص (قمر) کی معنویت سے مقطع میں خوب کام لیتے، ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔

؎ گنواؤں نہ تارے تو قمر نام نہیں ہے

جلالی ضلع علی گڑھ کا مشہور قصبہ ہے، شیعہ سادات وہاں کے زمیندار رؤسا ہیں، قمر صاحب اسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد جو جائداد ورثہ میں ملی وہ جوانی کی ترنگ میں بہت جلد ٹھکانے لگا دی یہاں تک کہ وطن چھوڑ کر علی گڑھ میں سکونت اختیار کرنی پڑی، علی گڑھ میں تیس پینتیس سال تک سائیکلوں کی دکان کی، سائیکلوں کی مرمت اور اُن کو کرایہ پر چلانا، یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ اس فن میں بھی شہر بھر میں کوئی ان کے مدِ مقابل نہ تھا جس سائیکل کا عیب کوئی نہ نکال سکتا اس کو قمر صاحب اپنی چابکدستی سے ٹھیک کر دیتے، وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ مشینوں کے کل پرزوں میں میرا دماغ خوب چلتا ہے، کوئی انجینئر ہوائی جہاز کے پرزے میرے سامنے کھول دے تو میں پرزوں کو اُن کی جگہ پر ٹھیک بٹھا دوں گا۔ وہ جو ایرانی شاعروں نے محبوبوں کے "سبزۂ خط" کی تعریفیں کی ہیں قمر جلالوی کا یہ ذوق سارے شہر میں اُن کی شاعری کی طرح مشہور تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں وہ غیر معروف رہے۔ کسی اخبار یا رسالے میں ان کی غزل دیکھنے میں نہیں آئی اور نہ ریڈیو سے اُن کی آواز سنی گئی۔ علی گڑھ اور اس کے نواح کے مشاعروں میں وہ بُلائے جاتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں میرٹھ کے آل انڈیا مشاعرے میں مرحوم پہلی بار شریک ہوئے، اور اُن کی غزل اور خاص طور سے مطلع خوب چمکا:

گلستاں سے مجھ کو کیا جب زیرِ دام آ ہی گیا
اک نشیمن تھا سو وہ بجلی کے کام آ ہی گیا

علی گڑھ میں رہتے تھے مگر مسلم یونیورسٹی کی علمی فضا سے غیر متعلق —— شہر کی اونچی سوسائٹی میں ان کا اٹھنا بیٹھنا کم ہی ہوتا تھا۔ علی گڑھ میں ایک ہندو ٹھاکر ڈپٹی کلکٹر استاد قمر کی شاعری سے بہت متاثر تھا، وہ پھر ریاست الور میں وزیر ہو گیا، وہاں اُس نے قمر صاحب کو بُلایا، ریاستوں میں کامیابی اور فتوحات کے لیے خاصی امیدواری کرنی پڑتی ہے، استاد قمر اس مدتِ انتظار کی تاب نہ لا کر الور سے چلے آئے۔ اُن کی پیدائش امیرانہ ماحول میں ہوئی تھی، مگر جب اُن کی رنگ رلیوں کے ہاتھوں حالات ناساز گار ہو گئے تو انہوں نے قوتِ بازو سے کما کر زندگی بسر کی، کسی کے دستِ نگر نہیں رہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آئے اور گاندھی گارڈن کے قریب لکڑی کا ایک کیبن لگا کر سائیکلوں کی دکان قائم کی، اُن دنوں سائیکل رکشاؤں کا رواج تھا۔ انہوں نے دو رکشائیں بھی خریدلیں جو کرایہ پر چلتی تھیں، پاکستان ریڈیو پر مشاعروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو استاد قمر جلالوی کے کلام کی بڑی پذیرائی ہوئی، ان کا نمبر سب کے بعد آتا اور ان سے بعض اوقات دو دو تین تین غزلیں پڑھوائی جاتیں، اس سے ان کی شہرت ہوئی۔ پھر اُنہیں باہر کے مشاعروں میں بھی بلایا جانے لگا اور وہ مشہور اور مقبول ہوتے چلے گئے۔ کلام میں استادانہ پختگی و مشاقی کے ساتھ شوخی اور سادگی و پُرکاری بھی، ترنم میں سوز و درد، دلکشی اور انفرادیت، داد و تحسین کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی۔

اُستاد قمر کی زندگی کے آخری بارہ تیرہ سال شہرت، قدردانی اور راحت دینے والے ماحول میں بسر ہوئے، حکومتِ پاکستان سے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا، مشاعروں کی آمدنی چھ سو روپیہ ماہوار سے کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ کئی سال سے وہ شیعہ فرقہ کے مشہور خطیب جناب رشید ترابی کے بنگلہ میں رہتے تھے اور وہاں کی پذیرائی اور خاطر داری کی تعریف کرتے تھے۔ اہلِ خانہ کے لیے انہوں نے لالو کھیت (لیاقت آباد) میں بیس بائیس ہزار روپیہ کی لاگت کا مکان بنوا دیا تھا۔

دسیوں بیسیوں مشاعروں کے ساتھ سفر کرنے اور ساتھ ٹھہرنے کا موقع ملا کسی سفر میں ذرا سی بھی بدمزگی نہیں ہوئی، حساب کتاب کے معاملے میں کھرے، اسّی بیاسی سال کی عمر میں جوانوں کی طرح شوخ مزاج! ڈیڑھ دو سال سے بڑھاپے کے سبب آواز میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ دو چار طرحی غزلوں میں بھی صنعت کی کمزوری

پائی گئی، اس لیے بعض مشاعروں میں دادِ تحسین کے مد میں جزر بھی محسوس کیا گیا۔ مگر اسی سال ماہ صفر میں ڈاکٹر یاور عباس صاحب کی مجلس کے لیے ستر اسی بند کا زوردار مرثیہ کہا، اور اس قوت اور آن بان کے ساتھ پڑھا کہ دھوم مچ گئی، مرثیہ کا یہ رنگ تھا:

تارے تمام رات نہائے فرات میں

ہم اُن کے خُرد، اُن سے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ تین سال ہوئے ایک صاحب کے یہاں دعوت تھی، استاد قمر اور دوسرے شعراء کو لے کر موٹر کار روانہ ہوئی تو مجھے شوخی سوجھی! میں نے کہا — "استاد کیا آپ وہاں پہلی بار جا رہے ہیں؟"

اس پر وہ قدرے چونک کر بولے: — "پہلی بار جانے میں کیا بات ہے؟"

میں نے بات کاٹ کر عرض کیا: — "وہاں جا کر قدرے محنت کرنی پڑتی ہے۔"

استاد نے اس پر فرمایا: — "محنت کیسی — ایں!"

میں سنجیدہ بن کر بولا:

"اُن صاحب کے یہاں چمڑے کا کارخانہ ہے۔ جو شاعر پہلی مرتبہ ان کے یہاں جاتا ہے اُسے چمڑے کا پاجامہ پہنایا جاتا ہے۔"

میری بات ختم ہوتے ہی اقبال صفی پوری بول پڑے:

"پاجامہ پہننا تو آسان ہے مگر استاد! جب وہ اتروایا جاتا ہے، اس وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

مشاعروں میں شعراء سے جو آٹوگراف لیے جاتے ہیں، تو استاد قمر کا یہ معمول تھا کہ شعر، اپنا نام اور تاریخ رقم کرنے کے بعد اپنے مکان کا نمبر اور محلہ (لالوکھیت) کا نام بھی لکھ دیتے۔ ایک بار ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن میں "کنٹریکٹ فارم" پر دستخط کر رہے تھے۔ میں نے کہا اُستاد! اس پر کہیں اپنے مکان کا نمبر اور لالوکھیت نہ لکھ دیجیے گا، ورنہ یہ فارم بے کار ہو جائے گا۔

اب سے تیرہ چودہ سال پہلے (غالباً ۱۹۵۴ء) کی بات ہے، جامعہ اسلامیہ عارف والا میں مشاعرہ تھا، استاد قمر اور راقم الحروف کو پاک پٹن شریف کے اے، ڈی، ایم صاحب کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا، شام کو استاد قمر اور میں ٹہلنے کے لیے نکلے اور نہر کے پُل پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا استاد! آپ کا بچپن اور جوانی تو

بڑی آسودگی میں گزری ہے، بس میرا یہ کہنا تھا کہ استاد رنگ پر آگئے، فرمانے لگے — بھیا ماہر! مجھے میری پھوپھی نے پالا تھا، ہماری حویلی میں گھڑوں اور مٹکوں میں اشرفیاں بھری رہتیں۔ میں ہاتھ ڈال کر اشرفیاں مٹھی میں بھر لیتا اور بنیئے کی دکان پر جا کر اُن اشرفیوں کے چنے مرمرے اور مونگ پھلی لے آتا! —— میں نے پھر دوسرے دوستوں کو قمر صاحب کی زبان سے یہی گفتگو سنوادی! ہم بے تکلف احباب اس لطیفے کو دہرا کر خوب لطف لیا کرتے ہیں۔

دو سال ہوئے مرحوم اور راقم الحروف مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے مشاعرے سے واپسی میں اسلام آباد ٹھہرے۔ پاکستان کے نو تعمیر دارالخلافہ کی سیر کو نکلے تو ہمارے میزبان نے اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں پریسیڈنٹ ہاؤس بنے گا۔ استاد قمر نے اس پر فرمایا، صدر ایوب صاحب کا مکان! —— میں نے عرض کیا کہ یہ صدر ایوب خاں صاحب کا ذاتی مکان نہیں ہوگا، جو کوئی بھی پاکستان کا صدر بنے گا وہ اس میں رہا کرے گا۔

قمر جلالوی مرحوم نے مکتب کے ابتدائی درجوں میں تعلیم پائی تھی، کتابوں کے مطالعہ کا بھی انہیں شوق نہ تھا، عرب کے جاہلی شعراء کی طرح ان کی شاعری فطرت اور ذوق و وجدان کے سہارے پروان چڑھی، شاعری میں وہ کسی کے شاگرد بھی نہ تھے۔ فرماتے تھے کہ امیر مینائی کا دیوان آغازِ شباب میں پڑھا اور ان کو اپنا روحانی استاد مان لیا۔ وہ بہت جلد شعر کہتے تھے، زود گوئی اور خوش گوئی کا اجتماع کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ طرحی غزلوں کی تکمیل مشاعرے میں بیٹھ کر کرتے، شعراء کو داد بھی دے رہے ہیں اور شعر بھی کہتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا کلام جمع ہی نہیں کیا، غزل کہی، کاغذ پر لکھی اور کاغذ بے پروائی کے ساتھ کہیں ڈال دیا۔ ہزاروں شعر دوسروں کو کہہ کر دیے، ان کے کلام کا بہت کم حصہ بیاضوں اور کاغذ کے تراشوں میں محفوظ رہ سکا ہے۔ فضا علی گڑھی اُن کے محبوب شاگرد ہیں —— ان کی غزل کے مطلع میں

دشوار سرِ شام سے ایک ایک گھڑی ہے
بیمار کا یہ حال ہے اور رات پڑی ہے

استاد کا فیض و تصرف کس قدر نمایاں ہے۔

چار مہینے ہوئے ریڈیو پاکستان کراچی کے مشاعرے میں شریک ہوئے تو بہت زیادہ مضمحل نظر آئے۔ اُترا ہوا چہرہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا:

چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شدید یرقان میں مبتلا ہو گئے، اخباروں میں ان کی خبریں شائع ہونے لگیں۔ میں کئی بار عیادت کے لیے گیا۔ دو چار لفظ دھیمی آواز میں مشکل سے بول پائے، پھر انہیں افاقہ ہو گیا، مگر یہ موت کا سنبھالا تھا۔ ۲۵ اکتوبر کو مجھے باہر سفر پر جانا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے دو بجے کے قریب تابش دہلوی صاحب نے ٹیلی فون پر یہ غمناک خبر سنائی کہ اُستاد قمر کا انتقال ہو گیا —— ہم ساڑھے تین بجے کے قریب لیاقت آباد پہنچے تو جنازہ آ رہا تھا، مولانا رشید ترابی سوگواروں کے آگے آگے چل رہے تھے! ہائے! خود اُن کا یہ شعر:

موت نے کتنا کج اخلاق بنایا ہے مجھے
لوگ روتے ہیں مری آنکھ میں آنسو بھی نہیں

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۶۸ء)

مولانا حمید الدین قمرؔ فاروقی

یہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے، حیدرآباد گئے ہوئے مجھے ایک سال ہوا تھا۔ ۱۹۲۹ء کا اختتام ہوگا۔ یا ۱۹۳۰ء کا آغاز، اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ جاڑے کا موسم تھا، مولوی جمیل احمد قادری[1] نے مجھ سے فرمایا کہ بازار عیسٰی میاں میں ایک پرائیویٹ اسکول ہے جس میں شبینہ جماعتیں بھی ہوتی ہیں، میں بھی اس مدرسہ میں پڑھاتا ہوں، وہاں شب میں مختصر پیمانے پر شعر وسخن کی ایک نشست ہو رہی ہے اس میں آپ کو ضرور شریک ہونا پڑے گا۔ میں نے مشاعرے میں شریک ہونے کی ہامی بھرلی، وہ جو آج کل "مہمانِ خصوصی" کی اصطلاح چل پڑی ہے، تو یوں سمجھیے کہ اس بزمِ شعر وسخن کا مہمانِ خصوصی راقم الحروف ہی تھا — ان دنوں میری شاعری کا یہ رنگ تھا:

پتلیاں آخری گردش میں ہیں اب بھی جاؤ — رسم کی رسم، تماشے کا تماشا بھی ہے
جب کھلیں آنکھیں تو دیکھا وہ سرِ بالیں نہ تھے — ہوش آنا تھا کہ پھر بیمار غافل ہوگیا

اسی بزمِ سخن میں مولانا حمید الدین قمرؔ فاروقی مرحوم سے پہلی ملاقات ہوئی اور طرفین

۱؎ دکن کے باشندے ہیں، مدرسہ قادریہ بدایوں میں دینی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم کا امتحان پاس کیا، کچھ دنوں بلدہ حیدرآباد دکن کے مدرسوں میں معلم رہے پھر خود اپنا ذاتی مدرسہ قائم کیا، جو ہر اعتبار سے کامیاب اور فائدہ مند رہا، مولوی جمیل احمد قادری اب معلم نہیں ایک مدرسہ کے بانی اور نگراں تھے جن کی ماتحتی میں متعدد اساتذہ کام کرتے تھے۔ اس درسگاہ کی توسیع و ترقی کے ساتھ مولوی صاحب موصوف کے حالات بھی بہتر ہوتے چلے گئے، اچھا کھانا، اچھا پہننا، گھر میں نوکر چاکر، سواری کے لیے موٹر، دس بارہ سال سے وہ تبلیغی جماعت میں شامل ہوگئے ہیں اور تبلیغی وفود کے سلسلہ میں انڈونیشیا، سنگاپور، برما اور دوسرے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ ان کی زندگی کا یہ انقلاب بڑا مبارک انقلاب ہے۔

ایک دوسرے سے خلوص سے متاثر ہوئے۔ میں ان دنوں محلہ حمام باغ میں مرتضیٰ احمد انصاری وکیل ہائی کورٹ کے یہاں مقیم اور اُن کا مہمان تھا۔ اس میز بانی اور مہمانی میں مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی شخصیت درمیانی واسطہ تھی، ورنہ اس زمانہ میں مجھے کون جانتا تھا، شاعرانہ تعارف کا یہ دورِ آغاز تھا۔

اس ملاقات کے بعد سے مولانا قمر فاروقی صاحب کے یہاں آنا جانا ہوتا رہا، وہ جدید ملک پیٹ کے نو تعمیر کوارٹر میں رہتے تھے، پھر میں انصاری وکیل کے بنگلہ سے قمر صاحب کے یہاں چلا آیا، چھ سات دن تو مہمانی میں گزرے، اس کے بعد اُن سے درخواست کی کہ زیادہ دنوں کی مہمانی میزبان کو کھلنے لگتی ہے، اب میں آپ کے میس (Mess) میں برابر کا شریک رہوں گا، تھوڑی سی رد و کد کے بعد انہوں نے میری بات مان لی، ہم پانچ آدمی قمر صاحب کے یہاں کھانا کھاتے تھے، مہینہ کے اختتام پر جو مجموعی مصارف ہوتے، ہر شخص اپنے حصہ کی رقم ادا کر دیتا۔

تین چار مہینہ تک قمر فاروقی صاحب کے یہاں شراکت میں کھانے کا سلسلہ چلتا رہا، ساجھے کی ہانڈی کے بارے میں پرانی کہاوت ہے کہ وہ چوراہے پر پھوٹ کر رہتی ہے مگر ہمارے درمیان ساجھے کی ہانڈی صحیح سالم رہی، پرانی کہاوتیں اللہ اور رسول کے اقوال نہیں ہوتیں، یہ کبھی غلط بھی ہو جایا کرتی ہیں۔ انھیں دنوں وطن سے میری اہلیہ کے حیدرآباد آنے کی اطلاع آئی، وقت کے وقت کرایہ کے سستے آرام دہ اور صاف ستھرے مکان ملنے کا مسئلہ خاصا دشوار تھا، مگر قمر صاحب کے توسط اور سعی و توجہ سے یہ دشواری دُور ہو گئی، اُن کے ایک شاگرد نے اپنا کوارٹر خالی کر دیا۔

سال ڈیڑھ سال ہم ایک دوسرے کے ہمسایہ کی حیثیت سے اس محلہ میں رہے، دن رات کا ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا، شعر خوانی، لطیفے ہنسی خوشی کی باتیں، ساتھ ہی علمی اور ادبی تذکرے بھی! برج کی پارٹیاں بھی جمتیں! تاش ہو، شطرنج ہو، چوسر ہو، ان کھیلوں میں وقت بُری طرح ضائع ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان کے انہماک میں نماز کا بھی ہوش نہیں رہتا، پھر کوئی بیوی اس کو پسند نہیں کرتی کہ اُس کا شوہر دوستوں کے ساتھ گھنٹوں تاش اور شطرنج کھیلتا رہے، ان کھیلوں کی مصروفیت خانگی بدمزگی کا سبب بھی بن جاتی ہے؛ گھر کے علاوہ مردوں کی باہر کی دلچسپیاں پردہ نشین بیویوں کو پسند نہیں آتیں، اس

مرحلہ اور تجربہ سے بھی زندگی کو گزرنا پڑا۔

ریاست حیدرآباد دکن میں علوم مشرقی کی ڈگریاں تسلیم کی جاتی تھیں۔ مولانا قمر فاروقی پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل تھے۔[1] مگر انہوں نے نہ جانے کس توقع یا مجبوری کے تحت محکمہ تعلیمات کی بجائے صدر محاسبی (Accountant General Office) میں اہل کاری قبول کر لی۔ کئی سال تک وہ درجہ سوم کی اہلکاری (کلرکی) پر مامور رہے، پھر انہوں نے اپنے کوارٹر میں "ادارۂ شرقیہ" قائم کیا جس میں پنجاب یونیورسٹی کے علوم مشرقی کے امتحانات کی تعلیم دی جاتی تھی، شروع شروع میں گنتی کے چند طلبا تھے، اور اپنی درسگاہ کے وہ تنہا معلم تھے۔ پھر طلبا کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، جدید ملک پیٹ کا کوارٹر ناکافی ثابت ہوا، انہیں پتھر گٹی کے بنی خانہ میں منتقل ہونا پڑا، یہاں بڑی وسعت اور ہر طرح کی سہولت تھی، کئی سال تک وہ خود اپنے اہل و عیال سمیت اسی عمارت میں رہے اور ادارۂ شرقیہ کو یہاں منتقل ہونے کے بعد بڑی ترقی ہوئی۔ یہ سرکاری عمارت تھی، اس لیے بعد میں جا کر کچھ قانونی اور دفتری پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں اور پھر وہ نواب صادق جنگ کی ڈیوڑھی میں چلے گئے۔

میں نے بھی دو تین مہینہ قمر صاحب کے ادارے میں ادیب فاضل کی جماعت کو دیوان درد پڑھایا، ایک گھنٹہ ٹیوشن کی بیس روپیہ فیس اُس سستے زمانے (سنہ ۱۹۳۶ء) میں بہت بڑی رقم تھی! شروع شروع میں دیوان درد مطالعہ کیے بغیر اپنی شاعری کے غرے پر کلاس میں پہنچ کر پڑھانا شروع کر دیا، مگر بعض اشعار خاصے الجھے ہوئے تھے، اُن کا مطلب بیان کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ طلبا سے اپنے عجز کا اظہار کرتا کہ یہ اشعار میری سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں، تو بڑی سبکی ہوتی اور معلمی کا سارا وقار اور رعب ہی جاتا رہتا، میں نے لفظوں کی شیشہ گری کے پردے میں اپنی اس کمزوری کو چھپایا، اور پھر دیوان درد کا مطالعہ کر کے پڑھانے کے لیے جانے لگا، بعض اشعار زیادہ پیچیدہ ہوتے تو دوسرے حضرات سے پوچھ لیتا!

---

[1] مولوی کامل (نظامیہ) ایم۔ اے کے مماثل، پنجاب یونیورسٹی کا مولوی فاضل اور منشی فاضل بی۔ اے کے برابر، منشی عالم اور مولوی عالم ایف اے کے مساوی اور منشی اور مولوی میٹرک کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے تھے۔

مولانا قمر کے ادارے میں سات آٹھ معلم تھے، طلباء کی تعداد دو سو سے زائد،
اُن کی ماہانہ آمدنی ایک ہزار سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔ جب طلباء امتحان دینے کے لیے
لاہور جاتے تو نام پلی ریلوے اسٹیشن پر بہت بڑا ہجوم ہوتا، اس موقع پر انہیں
یکمشت کئی ہزار کی آمدنی ہو جاتی، مگر وہ بڑے فیاض، مہمان نواز اور سیر چشم تھے، جمع
خرچ برابر ہی رہتا بلکہ بعض اوقات خرچ آمدنی سے بڑھ جاتا، کتنے نادار طلبہ ادارہ شرقیہ
میں فیس کے بغیر تعلیم پاتے، بعض کی کتابوں کا بندوبست بھی قمر صاحب ہی کرتے، حرماں
خیرآبادی مرحوم دو سال اُن کے یہاں رہے۔ اُن کے تمام مصارف کے کفیل مولانا
قمر صاحب ہی رہے، نظر حیدرآبادی نے ادارۂ شرقیہ ہی میں تعلیم حاصل کی اور پنجاب
یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا، قمر صاحب نے نظر مرحوم کے والد (علی اختر)
پر تعلیمی اخراجات کا بار نہیں پڑنے دیا۔

مولانا قمر دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
مرحوم اُن کے ہم سبق رہے ہیں، پھر انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان
پاس کیا، وہ فطری طور پر معلم تھے، اور اُن کی یہی صفت اُن کے روزگار کی وسعت و
ترقی کا سبب قرار پائی۔ منشی فاضل کے نصاب میں تاریخ وصاف خاصی مشکل کتاب
تھی، مگر قمر صاحب کو پڑھاتے پڑھاتے اتنی مشق ہوگئی تھی جیسے وہ تاریخ وصاف
نہیں عبدالحلیم شرر کا کوئی ناول طلباء کو پڑھا رہے ہیں، عربی کی سمت الدور کے درس و
تعلیم میں بھی اُن کی ذہانت کا یہی حال تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے مگر اُن کے شعر اُن کی
نثر کی طرح مغلق ہوتے تھے۔ ہفتہ وار "القمر" انہوں نے خاصے اہتمام سے نکالا،
لیکن چار پانچ شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ حضرت فانی بدایونی جب آگرے سے حیدرآباد
آئے، تو اُن کے اعزاز میں دعوتیں، پارٹیاں اور شعر و سخن کی نشستیں ہوئیں۔ مولانا قمر
نے بھی اپنے یہاں انہیں بلایا اور دعوتی رقعہ جو چھپوایا، اس کی عبارت کا یہ رنگ تھا:

"مرجع اقاصی و دانی جناب شوکت علی خاں فانی"

راقم الحروف نے جب یہ رقعہ پڑھا تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ روزنامہ رہبر دکن کے "کالم نویس"
تک یہ رقعہ کسی طرح پہنچ گیا تو اُسے "مزاح و ظرافت" کا ایک نیا موضوع مل
جائے گا، چنانچہ یہی ہوا تیسرے دن روزنامہ "رہبر دکن" میں اس عبارت پر طنز کی گئی۔

ادارۂ شرقیہ میں مشاعرے ہوتے رہتے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ فجر کی نماز تک شعر و شاعری کا سلسلہ چلتا رہا اور شعراء اور سامعین صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس ہوئے، ایک بار مولانا حسرت موہانی مرحوم نے بھی مشاعرہ کی صدارت فرمائی۔

تقسیم ہند کے بعد مولانا قمر فاروقی پاکستان چلے آتے اور ادارہ شرقیہ جیسی کوئی پرائیوٹ درسگاہ کھول لیتے تو ان کو ہزاروں کی ماہانہ آمدنی ہوتی مگر وہ حیدرآباد ہی میں جمے رہے، ادارہ شرقیہ ختم ہوا تو دکن کی جمعیتہ علماء کے ناظم ہو گئے پھر اس خدمت سے بھی سبکدوش ہونا پڑا۔ ایک چھوڑ تین بیویاں، کشادہ دست، پیسہ بچا کر اور سینت کر کبھی رکھا ہی نہیں، ان کی آخری زندگی عسرت میں بسر ہوئی۔ مرنے سے چند مہینے پہلے اپنے آبائی وطن سنبھل چلے گئے۔ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے خاندانی نسبت تھی، سنبھل میں تھوڑی بہت زمین بھی تھی، بلدہ حیدرآباد میں عمر کے بیالیس سال بسر کیے مگر قسمت میں وطن کی مٹی لکھی تھی۔ غفرلہ اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۹ء)

قیسی رامپوری

دلی کے مشہور ماہنامہ "ساقی" میں سب سے پہلے قیسی رامپوری کا افسانہ پڑھا یہ ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کی بات ہے، پھر دوسرے رسالوں میں بھی اُن کے افسانے نظر آئے۔ ساقی میں راقم الحروف کا کلام اور مضامین بھی شائع ہوتے تھے! قیسی رامپوری سے برسوں کا یہ غائبانہ تعارف ۱۹۴۴ء میں بالمشافہ ملاقات بن گیا! ایک مشاعرے کے سلسلہ میں اجمیر شریف میرا جانا ہوگیا، درگاہ بازار کے جس مکان میں شعراء کو ٹھیرایا گیا تھا، وہاں قیسی صاحب تشریف لائے! یہ ملاقات اگرچہ مختصر رہی مگر بات چیت میں ایسا محسوس ہوا کہ ادب و تہذیب اور اخلاق و تمدن کے مسائل میں قیسی میرے ہم خیال اور ذہنی مزاج رکھتے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد کراچی کی ادبی نشستوں میں اُن سے بار بار ملنے کے مواقع میسر آئے، ادبی مذاکروں میں قیسی رامپوری مرحوم شریک ہوتے تھے اور ادبی مسائل پر بڑی جچی تلی رائے کا اظہار فرماتے تھے، نام نہاد ترقی پسند ادب سے خاصے بیزار تھے! اگر وہ ترقی پسندوں کے ہم مشرب اور ہم خیال ہو جاتے تو یہ گروہ اُن کی بڑی پزیرائی کرتا اور اُن کے فکر و فن کو خوب سراہا جاتا! قیسی رام پوری نے اپنے عقائد و اصول کا شہرت و مدح سرائی سے سودا نہیں کیا۔

قیسی رام پور کے رہنے والے تھے مگر اُن کی زندگی بعدِ شعور کے بعد وطن سے باہر ہی گزری۔ اجمیر شریف میں وہ برسوں رہے، کسی سرکاری یا نیم سرکاری محکمہ سے اُن کی ملازمت کا تعلق تھا، کراچی آکر وہ ایک کمپنی میں ملازم ہوگئے، تنخواہ گزارے کے لیے کافی تھی، ناظم آباد میں ذاتی مکان بھی بنا لیا، پھر وہ بیمار رہنے لگے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے، اب تقریباً چھ سات سال سے خانہ نشین تھے! اس بات کو دو سال ہوئے ہوں گے اپنے فرزند کی شادی میں مجھے یاد فرمایا، بہت دیر تک بات چیت رہی، مگر مرض اور نقاہت اُن کے چہرے سے نمایاں تھی اور اُن کی حالت دیکھ کر اس طرف ذہن جاتا تھا کہ ادب و انشا کا یہ چراغ بس بھڑکنے ہی والا ہے! ———

قیسی رام پوری پاکستان بننے سے قبل خاصے مشہور اور مقبول افسانہ نویس اور ناول نگار تھے، متعدد کتابوں کے مصنف! تقسیم ہند کے بعد بھی کئی سال تک اُن کی کتابوں کی مانگ رہی! ملازمت کی مصروفیت اور علالت کے سبب انہوں نے لکھنا لکھانا چھوڑ دیا تھا۔ مشہور کہاوت ہے کہ ــــ کرتے کی بتیا ہے ــــ! اور وہ ادبی زندگی سے ریٹائر ہو گئے تھے؛ اس سبکدوشی کے ساتھ اُن کی شہرت بھی گہنا گئی! اُن کی سوانح حیات اور ادبی زندگی میں یہ واقعہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ مُلّا واحدی مدظلہ، کے خویش (داماد) تھے! اُن کے ناولوں کے اشتہارات اب بھی بعض رسالوں اور فہرستوں میں نظر آجاتے ہیں ــــ ان کی موت یقیناً ادبی سانحہ ہے!

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۴ء)

حکیم کبیرالدین

حکیم کبیرالدین کو تقسیم ہند سے بہت پہلے دلی میں دیکھا تھا مگر وہ دیکھنا کچھ یوں ہی سا یاد رہ گیا ہے، اُن سے ملنے جلنے کے مواقع حیدرآباد دکن میں میسر آئے اُن کا لب و لہجہ، نشست و برخاست، لباس اور رہن سہن سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک تھا۔

ایک بار اُن کے یہاں چائے پی جو اس قدر لذیذ تھی کہ اُس کی لذت کا تذکرہ آج بھی بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں کرتا رہتا ہوں! نواب نثار یار جنگ مرحوم ذظیفہ یاب تعلقدار (پنشنر ڈپٹی کمشنر) میرے انتہائی مخلص دوست تھے۔ اُن سے میں نے حکیم صاحب کے یہاں چائے کا زور شور سے ذکر کیا تو بولے کہ اب کی بار تمہارا اُن کے یہاں جانا ہوا تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔

دوسری بار پھر حکیم صاحب نے یاد فرمایا، میں نواب صاحب کو ساتھ لے کر اُن کے یہاں پہنچا۔ حکیم صاحب سے نواب صاحب کا تعارف کرایا، پھر تھوڑی دیر بعد چائے آئی، نواب نثار یار جنگ بہادر چائے پی کر بہت خوش ہوئے انہوں نے اعتراف کیا کہ چائے کی تعریف میں راقم الحروف نے مبالغہ نہیں کیا تھا! نواب صاحب نے حکیم صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں کی چائے میں انڈے کا کوئی جُز یا باداموں کا سفوف وغیرہ جیسی کوئی چیز تو نہیں ملاتے! حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ہمارے یہاں کی چائے میں ایسی کوئی چیز نہیں ملائی جاتی، اصل چیز اچھی چائے کا انتخاب ہے پھر اُس کے پکانے کی ترکیب اور دودھ خالص اور گرم۔

حکیم کبیرالدین مرحوم شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اسی نسبت سے میری ذات سے انہیں لگاؤ تھا، اچھے شعر پر اُن کی داد بڑی سنجیدہ ہوتی تھی۔ عام مشاعروں میں وہ نہیں جاتے تھے، طبی کتابوں کے ترجمہ میں اُن کا بہت کچھ وقت صرف ہوتا تھا۔

حکیم کبیر الدین پٹنہ (صوبہ بہار) کے رہنے والے تھے انہوں نے لکھنؤ، دلی اور دوسرے شہروں میں رہ کر عربی تعلیم حاصل کی، پھر ۱۹۱۲ء میں مدرسہ طبیہ میں طب کے طالب علم کی حیثیت سے طبی درسیات کو سبقاً سبقاً پڑھا یہاں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد لاہور سے زبدۃ الحکما کا امتحان پاس کیا! اُن کا شمار مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے رفقاء میں ہوتا تھا! دہلی کے طبیہ کالج میں وہ کئی برس تک تشریح الابدان کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے پھر انہوں نے طبی تالیفات کا جو کام شروع کیا ہے تو برسوں اسی کام میں مصروف رہے اور طب کی امہات کتب (قانونچہ، میزان الطب، کلیات نفیسی، کلیات قانون، اکسیر اعظم ......) کے اردو میں ترجمے کیے اور یہ مرحوم کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جو اُن کے نام کو زندہ رکھے گا! اُن کے ترجموں نے اردو کی ثروت میں اضافہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے حکیم کبیر الدین کو نباضی تشخیص امراض، نسخہ نویسی اور دوا سازی کے لیے نہیں طب کی تعلیم و تشریح اور اردو ترجمہ و تالیف کے لیے پیدا کیا تھا! مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی وفات کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ حکیم صاحب مرحوم کو طبیہ کالج (دہلی) سے مجبوراً علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اس علیحدگی میں بعض اُن کے دوسرے رفقاء بھی شریک تھے، ۱۹۳۴ء میں مرحوم حیدر آباد دکن چلے گئے اور نظامیہ طبیہ کالج کی پروفیسری پر مامور ہو گئے! حیدر آباد دکن پر بھارت کی چڑھائی اور مسلح یلغار کے بعد جسے "پولیس ایکشن" کا نام دیا گیا ہے، دکن[1] کے حالات ابتر ہو گئے تو حکیم صاحب پھر دلی واپس آ گئے۔ دہلی میں کچھ دنوں قیام فرمانے کے بعد علی گڑھ طبیہ کالج سے وابستہ ہو گئے اور ۸۰ برس کی عمر میں انتقال فرمایا! حکیم کبیر الدین مرحوم و مغفور کی موت پاک و ہند میں مشرقی طب کے لیے عظیم سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ اُن کا نعم البدل عطا فرمائے (آمین)

(ماہنامہ فاران، مئی ۱۹۷۶ء)

---

[1] بعض اخبارات میں نظر سے گزرا کہ نظام دکن نے انہیں "شہنشاہِ طب" کا خطاب عطا فرمایا تھا! مگر نظام دکن کو تو وہاں کے اطبا نے "سلطان الطب" کا خطاب نذر کیا تھا! پھر انہوں نے اپنے خطاب سے بڑھ کر "شہنشاہِ طب" کا خطاب حکیم کبیر الدین کو کس جی سے عطا فرما دیا۔

حافظ مبارک علی شاہ

تقسیم ہند سے قبل جے پور کے دو عظیم الشان مشاعروں میں راقم الحروف کو شریک ہونے کا موقع ملا، پھر نواب ممتاز الدولہ مکرم علی خاں بہادر مرحوم والئ پہاسو سے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ اُن کے بلانے پر جے پور بار بار جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ نواب ممتاز الدولہ کے یہاں کسی تقریب یا محفل میلاد شریف میں حافظ مبارک علی شاہ کو دیکھا تھا۔ ان سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد ہوئی۔ ۱۹۴۹ء کے اواخر یا ۱۹۵۰ء کے آغاز میں میرا حیدرآباد جانا ہوا، وہاں جانے کی تقریب یہ تھی کہ میں نے اپنی اہلیہ کے نام سے دلی میں ادھ بنا مکان خرید کر بنوایا تھا اس سے کسی ہندو کے چھوڑے ہوئے مکان کا تبادلہ مقصود تھا۔ مگر اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔

کراچی سے ٹرین میں حافظ مبارک علی شاہ کے بھائی یا کسی قریبی عزیز کا ساتھ ہو گیا۔ وہ اصرار کر کے اُن کے یہاں لے گئے۔ حافظ صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ کئی دن اُن کے یہاں قیام رہا، خاصی خاطر مدارات کی۔ اُن کا مکان (موتی محل) چھوٹا موٹا محل ہی تھا۔ فرنیچر بھی رئیسانہ۔ اہلِ غرض، دوست احباب اور ملنے ملانے والوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا۔ دونوں وقت انگریزی اور مغلئی کئی طرح کے کھانے، دس بارہ آدمی کھانے کی میز پر ہوتے! امیرانہ رہن سہن اور خوش حالی کا دور دورہ!

پھر سال ڈیڑھ سال کے بعد اُن کا کوئی کارندہ یا عزیز پیغام لے کر آیا کہ حیدرآباد میں مشاعرہ ہو رہا ہے آپ کو اُس میں ضرور شرکت کرنی ہے۔ خود حافظ مبارک علی شاہ مرحوم بھی دفتر "فاران" میں تشریف لائے۔ مشاعرے کی بات پکی ہو گئی۔ حیدرآباد سندھ کی میونسپلٹی کے ہال میں خاصا کامیاب مشاعرہ ہوا۔ حافظ صاحب نے محبت کے انداز میں مجھ سے شکایت کی۔ ماہر! میں نے تمہیں بلایا تھا مشاعرے کے معاوضہ کی بات تم مجھ پر چھوڑ دیتے، مشاعرے کے کارکنوں سے اس کا تعین نہ کرتے تو اچھا تھا!

قاضی فضل اللہ صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ حافظ مبارک علی شاہ کے یہاں ان کا

ڈنر تھا میں نے بھی اُس میں شرکت کی۔ حافظ صاحب نے شاندار الفاظ میں میرا تعارف کرایا مگر میں طرح دے کر وزیرِ اعلیٰ سے قریب نہیں دُور بیٹھا!

درح راصحبت ناجنس عذابے است الیم

حیدر آباد کے مشاعروں میں سال میں ایک دو بار ضرور جانا ہوتا اور اس بہانے حافظ مبارک علی شاہ سے ملاقات ہوتی رہتی۔ ایک دفعہ باہر سے آئے ہوئے تمام شاعروں کو انہوں نے اپنے یہاں دعوت میں بُلایا تھا اور کئی گھنٹے "گمّت"[1] رہی۔

حافظ صاحب مرحوم کے بارے میں جے پور کے لوگوں نے بتایا جب سر مرزا محمد اسمٰعیل صاحب جے پور کے وزیر اعظم تھے تو اُن کی ذات سے حافظ صاحب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مگر پھر آگے چل کر ان روابط میں فرق آگیا۔ پاکستان آکر اُن کے ٹھاٹ باٹ امیرانہ ہو گئے۔ کئی موٹر، نوکر چاکر، سینکڑوں ایکڑ زمین، ٹھیکے! رہنے کے لیے شاندار مکان! بڑے بڑے حاکموں کے یہاں رسوخ! حافظ صاحب مرحوم کے عزیز (اور ہوا خواہوں نے مجھے بتایا کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم سے اُن کی ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی ہے۔ ضلع حیدر آباد کا ہر عہدیدار ان کا تعاون چاہتا تھا کئی سال حافظ مبارک علی شاہ مرحوم کی لیڈری خوب چمکی مگر پھر خود اُن کی روش نے شہرت و ہر دلعزیزی کے اس چڑھتے ہوئے پارے کو گرا دیا۔ اُن کا سیاسی موقف بھی ایک حالت پر نہیں رہا۔ چار سال ہوئے ہوں گے جب کسی ادبی اجتماع کے سلسلہ میں میرا حیدر آباد جانا نکل آیا، موتی محل میں حافظ صاحب سے ملنے کے لیے بھی گیا۔ مگر اب وہاں نہ پہلے کی طرح لوگوں کا مجمع تھا نہ ملازموں کی بھاگ دوڑ تھی۔ ڈرائنگ ہال کے صوفے مرمت کے محتاج تھے۔ موتی محل کی وہ اگلی سی رونق ہی جاتی رہی! در و دیوار پر فلاکت سی چھا رہی تھی۔

حافظ مبارک علی شاہ بڑے ذہین شخص تھے۔ غالباً چیچک میں اُن کی بینائی جاتی رہی مگر انہوں نے اس معذوری کے باوجود تعلیم حاصل کی۔ وہ بڑے جوشیلے مقرر تھے۔ افسانہ ہو، شعر و ادب ہو، سیاست اور فلسفہ ہو ہر موضوع پر گفتگو کرتے۔ شعر فہم اور سخن سنج بھی تھے۔ جگر مراد آبادی مرحوم نے ایک دو بار کئی ہفتے اُن کے یہاں قیام فرمایا۔ شاعروں سے انہیں

---

[1] یعنی وقت خوب مزے اور لطف میں گزرا ــــ یہ لفظ (گمّت) دکن میں بولا جاتا ہے "اللغات کشوری" کی لغت میں موجود ہے۔

دلی لگاؤ تھا۔ حافظ صاحب کے سیاسی موقف میں مدوجزر پیدا ہوتا رہا مگر دین سے جو شغف تھا اس میں کمی نہیں آئی۔ اسلام سے انہیں محبت اور عقیدت تھی۔ شروع شروع میں کئی سال تو اپنے بھائی بھتیجوں اور رشتہ داروں کے پورے ٹبر کے وہی کفیل رہے۔ لاکھوں کے وارے نیارے! حافظ مبارک علی شاہ نے اپنی فراست، حکمت و تدبیر اور ذہانت کی بدولت اتنا عروج پایا۔

تین مہینے ہوئے ہوں گے جب اُن سے آخری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی، پاکستان کے موجودہ صدر جناب بھٹو نے اُنہیں بعض مسائل پر مذاکرے کے لیے بلایا تھا، مشہور شاعر و افسانہ نگار جناب فضل کریم فضلی جناح اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں داخل تھے، جناب محمد صالح اور غلام محی الدین صاحب اشرفی کی معیت میں راقم الحروف اُن کو دیکھنے کے لیے گیا ہوا تھا، اتنے میں حافظ مبارک علی شاہ عیادت کی غرض سے تشریف لائے اور صدرِ پاکستان سے مذاکرے کی کچھ تفصیل بھی محتاط انداز میں بتائی۔ اس ملاقات کے کوئی مہینہ سوا مہینہ بعد اخبارات میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی اور تعلقات و روابط اور زمانے کے اتار چڑھاؤ کی ایک فلم ذرا سی دیر میں آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔ اللہ تعالیٰ کی مغفرت مرنے والے کو نصیب ہو۔

(ماہنامہ "فاران"، دسمبر ۱۹۷۲ء)

مولوی مجید حسن

۱۹۳۰ء سے سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) میں راقم الحروف کی غزلیں اور نظمیں جو شائع ہونی شروع ہوئی ہیں، تو کئی سال تک مسلسل یہ سلسلہ چلتا رہا، میں ان دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا۔ اس دَور میں "مدینہ" کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب مجھ سے اخبار مانگ کر لے جاتے اور اوراد و وظائف کی کتاب کی طرح اس اخبار کا ایک ایک لفظ یہاں تک کہ اشتہارات تک کو پوری توجہ اور شوق و عقیدت کے ساتھ پڑھتے اور دوسرا شمارہ آنے تک "مدینہ" مسلسل ان کے مطالعہ میں رہتا۔

۱۹۳۲ء کے وسط میں سہ روزہ "مدینہ" ہی میں یہ اطلاع میں نے پڑھی کہ بجنور سے روزنامہ "مدینہ" شائع ہونے والا ہے اور اس کے لیے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ اس اطلاع کے پڑھتے ہی مولوی مجید حسن صاحب مالک سہ روزہ "مدینہ" کی خدمت میں، راقم الحروف نے درخواست بھیج دی۔ دو تین مہینے کی خط و کتابت کے بعد بات طے ہو گئی، اور ریاست حیدرآباد دکن میں لگے لگائے روزگار کو چھوڑ کر میں وہاں سے چل پڑا۔

اس واقعہ کا میں نے اپنے کسی دوست اور جاننے والے سے اس لیے ذکر نہیں کیا کہ وہ مجھے میرے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے، اُدھر سے اصرار اور میری طرف سے ضد، اس کشمکش کی نوبت ہی کیوں آنے دی جائے! یہ پوری کارروائی راز میں رہی! دکن کی سرزمین میں، شک نہیں بڑی کشش تھی اور ہر طرح کی دلچسپی کے اسباب موجود تھے۔ خاص طور سے حکومتِ آصفیہ کے صدرِ اعظم سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کی نوازشیں ہمیشہ زنجیرِ پا بنی رہیں، مگر دنیائے صحافت میں آنے کا شوق، وطن کی قربت کا جذبہ اور کچھ یہ بھی کہ آدمی ایک ہی ماحول اور فضا میں رہتے رہتے اُکتا سا جاتا ہے۔

اب سے ۳۲ سال پہلے کی بات ہے طے یہ پایا تھا کہ روزنامہ "مدینہ" کے آغاز اشاعت سے چند دن قبل بجنور پہنچ جانا چاہیے۔ میں حیدرآباد سے رمضان کی ۲۸ تاریخ کو

گرانڈ ایکسپریس سے چل پڑا ۲۹ رمضان کو شب میں آگرہ اترنا ہوا تو عید کا چاند ہو چکا تھا۔ ایک سرائے میں سامان رکھا اور صبح سویرے نہا دھوکر شاہی مسجد میں عید الفطر کی نماز ادا کی، زندگی میں پہلا تجربہ تھا کہ دوستوں اور عزیزوں سے دُور، اس طرح مسافرت میں عید ہوئی۔ پھر میں کچھ دن کے بعد بجنور پہنچا۔ مولوی مجید حسن مرحوم سے ملاقات ہوئی، وہ بڑے تپاک سے ملے اور بغل گیر ہوئے۔ سخت سردی پڑ رہی تھی، اس عالم میں انڈے کا گرم گرم حلوہ اور چائے مزہ دے گئی۔ مولوی صاحب مرحوم کی محبت اور تواضع کی یہ رسم ہمیشہ جاری رہی۔ کم و بیش تین ہفتہ دفتر "مدینہ" میں مولوی صاحب کا مہمان رہا۔ ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا اُنہی کے ساتھ رہتا۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز سہ روزہ "مدینہ" کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور کئی سال سے ادارت کے فرائض بڑی نیک نامی اور اچھی شہرت کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ آزادیٔ تحریر اور حق گوئی کے جرم میں قیدِ فرنگ کی عزت بھی حاصل کر چکے تھے۔ مولانا حامد الانصاری[1] اور مولوی مجید حسن کے داماد حمید حسن صاحب "مدینہ" کے رکنِ ادارہ تھے! اخبار کا اداریہ اور فکاہی کالم مولانا نصر اللہ خاں عزیز سے متعلق تھا۔ شذرات (Notes) اور عربی ڈاک کے ترجمہ کا کالم مولانا انصاری کے ذمہ تھا اور باقی کام حمید حسن انجام دیتے تھے۔

روزنامہ مدینہ میں جس جگہ میرا تقرر ہوا تھا اس کے لیے شوکت تھانوی مرحوم نے بھی لکھنؤ سے درخواست بھیجی تھی، میں اس دنیا میں نووارد، وہ مشاق و تجربہ کار، مگر تنخواہ کی کمی کے سبب اُن سے معاملہ طے نہ ہوسکا ورنہ یہ قرعۂ فال اس دیوانہ کے نام کاہے کو نکلتا۔

میں اس خیال و تصور کے ساتھ بجنور گیا تھا کہ اداریہ، شذرات اور اسی قسم کے دوسرے

---

[1] صاحبِ موصوف حضرت شیخ الہندؒ کے تربیت یافتہ مولانا محمد میاں منصور انصاری مرحوم مہاجر کابل کے صاحبزادے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خویش ہیں کم و بیش بیس بائیس سال سے بمبئی میں قیام فرما ہیں اور وہاں کی جمعیۃ علماء کے ناظم ہیں، اسلامی حکومت کے آئین و دستور پر اُن کی معرکہ آرا تصنیف منظرِ عام پر آچکی ہے! افسوس ہے بمبئی میں اُن کے صحافتی مشاغل جاری نہ رہ سکے! تقسیم ہند کے بعد جب بھی بمبئی میرا جانا ہوا ان کی محبت کی بدولت قدیم رابطہ کی تجدید ہوگئی

مضامین کا کام مجھ سے متعلق ہوگا، مگر پہلے ہی دن مولانا نصراللہ خاں عزیز نے انگریزی دور کے وزیر ہند سر سیموئل ہور کی ایک تقریر ترجمہ کرنے کے لیے میرے سامنے رکھ دی۔ تقریر پڑھ کر ترجمہ کے لیے جو قلم اٹھایا تو اپنی بے مائگی کا احساس ہوا، ایک ایک سطر میں کاٹ چھانٹ اور رد و بدل! بعض جملوں کی ترکیب اور مفہوم ہی پوری طرح پلے نہیں پڑا۔ فیلن کی ڈکشنری بھی آخر کہاں تک مدد کرتی، ایک ایک جملہ پر دشواری کا سامنا، اپنی انشاء پردازی اور خواہ مخواہ کی ہمہ دانی کا غرہ اس دن پانی کے بلبلہ کی مانند ٹوٹ کر رہ گیا۔ یا اللہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ——— کیا کروں کیا نہ کروں، چہرے پر شرم کے مارے ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں! کئی گھنٹے کی محنت کے بعد مشکل سے دو تین سلپ ترجمہ کر کے مولانا نصراللہ خاں عزیز کے سامنے رکھیں وہ ترجمہ کو پڑھ کر قدرے مسکرائے عبارت کو جگہ جگہ سے درست کیا، ہمدردی کے لہجہ میں بتایا کہ انگریزی کے جملوں کو اردو میں اس طرح منتقل کرنا چاہیے! لفظوں کی دروبست کی یہ صورت ہونی چاہیے۔

رات کو پلنگ پر لیٹا تو دل و دماغ عجیب کشمکش اور پریشانی میں مبتلا تھے عقل کہتی کہ یہاں سے بھاگ چلو، یہ روگ تمہارے بس کا نہیں ہے مگر دل مشورہ دیتا کہ اس منزل میں ناکام ہوگئے تو یہ احساس کمتری تمہاری زندگی میں ادب و انشاء کے باب پر ہمیشہ کے لیے سیاہی پھیر دے گا، اور تمہارا ادبی مستقبل ختم ہو جائے گا اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو، ہمت سے کام لو، یہ منزلِ دشوار رفتہ رفتہ آسان ہو جائے گی۔

دوسرے دن مولانا نصراللہ خاں عزیز نے ایک اور مضمون ترجمہ کے لیے دیا جس کے ترجمہ میں پہلے دن کے مقابلہ میں کم دشواری پیش آئی۔ اس طرح رفتہ رفتہ ترجمہ کی مشق بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک مشاق اور تجربہ کار مترجم کی طرح اردو اخبار کے چار چار کالموں کے لیے انگریزی سے اردو ترجمہ کرنا روزانہ کا مشغلہ ہوگیا! اس کامیابی بلکہ فتح مندی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ——— "السعی منی والاتمام من اللہ" کا یہ مشاہدہ بھی تھا اور تجربہ بھی!

ترجمہ کے علاوہ روزنامہ مدینہ کے ادبی کالموں کی ترتیب بھی مجھ سے متعلق تھی اور کتابوں پر تبصرہ بھی! سیاست کے وقتی مسائل اور ہنگامی موضوعات پر کبھی کبھار نظمیں بھی میرے نام سے چھپتی تھیں، روزنامہ "مدینہ" بڑی شان اور اہتمام سے نکلا، مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اپنے شہرہ آفاق اخبار "زمیندار" میں مدینہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک نظم شائع فرمائی

جس کا ایک شعر یہ تھا

رمضاں نے ترے آنے کی سنائی ہے نوید
اس مہینہ کو مدینہ کا مہینہ کہیے !

بجنور کے "مدینہ" اور لاہور کے روزنامہ "انقلاب" سے ان دنوں کسی سیاسی مسئلہ پر نوک جھونک ہوگئی تھی، مولانا ظفر علی خاں نے اپنی نظم کے اس شعر میں :-

بد زبانی نہیں ہرگز شرفا کا شیوہ   گالیاں جو تجھے دے اس کو کمینہ کہیے

اخبار مدینہ کی حمایت اور روزنامہ انقلاب پر چوٹ کی اس سلسلہ میں یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سالک[۱] مہر نے روزنامہ "زمیندار" سے روٹھ کر اخبار زمیندار کے توڑ پر اپنا روزنامہ "انقلاب" لاہور سے نکالا تھا۔

روزنامہ "مدینہ" بجنور کی خاصی پذیرائی ہوئی، مگر اس زمانہ میں روزنامہ ایک ایسے مقام سے نکلنا چاہیے تھا جہاں ایسوشی ایٹڈ پریس سے ربط قائم ہو سکتا اور وہاں ریل کی برانچ لائن نہیں امیل لائن ہوتی، بجنور کہنے کو تو ضلع کا صدر مقام تھا مگر اس کی آبادی قصبہ کی حیثیت رکھتی تھی، برانچ لائن کا ریلوے اسٹیشن مگر پلیٹ فارم ندارد، یہی حال میونسپلٹی کے گھنٹہ گھر کا تھا کہ گھر موجود لیکن گھنٹہ غائب! ایسوشی ایٹڈ پریس کی خبر کا بنڈل ریل کے ذریعہ دلی سے آتا تھا اور دوسرے اخباروں کے مقابلہ میں ایک دن تاخیر سے خبریں چھپتی تھیں، بجنور کی بجائے مراد آباد سے روزنامہ نکلتا، تو ضرور کامیاب ہوتا، مولوی مجید حسن صاحب اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، گھر بار چھوڑ کر نئے شہر میں جا کر روزانہ اخبار نکالنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔

روزنامہ مدینہ کی ادارت میں ہم دو آدمی نئے لیے گئے تھے، سید صلاح الدین[۲] بہاری اور

---

[۱] عبدالمجید سالک وفات پا چکے ہیں، مولانا غلام رسول مہر اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں۔

[۲] یہ صاحب صحافت و سیاست کے معاملات میں بڑی معلومات رکھتے تھے۔ خاصی دلچسپ شخصیت! روزنامہ "مدینہ" بند ہو جانے کے بعد کچھ دنوں کان پور میں قیام کیا۔ مولانا حسرت موہانی سے ان کے خاصے تعلقات تھے۔ پھر حیدرآباد دکن چلے گئے، وہاں قاضی عبدالغفار مرحوم کے روزنامہ "پیام" کے شعبۂ انتظامیہ سے متعلق رہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

راقم الحروف! باقی عملہ سہ روزہ اخبار میں بدستور کام کرتا رہا، انتظامی شعبہ میں ایک کلرک کا اضافہ ہوا تھا۔ نذیر حسین نام کے ایک صاحب چند دنوں اس پوسٹ پر کارگزار رہے، آج کل وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمدرد دواخانہ میں منیجر ہیں اور دو ہزار روپے کے قریب تنخواہ پاتے ہیں۔۔

روزنامہ "مدینہ" کی ادارت سے وابستگی ہونے کے علاوہ بچوں کے پندرہ روزہ رسالہ "غنچہ" کا بھی میں ایڈیٹر تھا۔ اصل پوسٹ ہی جب نہ رہی تو یہ ضمنی خدمت کس طرح برقرار رہ سکتی تھی۔ روزنامہ بند ہو جانے کے بعد میں بدایوں چلا گیا، وہاں سے مولانا عبدالقدیر بدایونی کی معیت میں حیدرآباد دکن پہنچا اور پھر براہِ بمبئی بحری جہاز سے عراق کا سفر کیا۔

اُس زمانے کی دو چار باتوں کا ذکر کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ایک خبر تھی، جس کی سرخی میں نے ان لفظوں میں قائم کی تھی:

"بنگال میں گورنر نے ریڈیو کا انتظام کر دیا۔"

کاتب صاحب نے اس سرخی کو اس طرح لکھا:۔

"بنگال میں گورنر نے رنڈیوں کا انتظام کر دیا۔"

وہ تو خیر ہوئی کہ کتابت کی اس غلطی پر میری نگاہ پڑ گئی ورنہ اس طرح خبر چھپ جاتی تو۔۔۔۔؟!

ان دنوں حکومت کی طرف سے اخبارات کی بڑی سخت نگرانی ہو رہی تھی، اہم خبروں پر عنوانات بھی خاصی احتیاط کے ساتھ قائم کرتے! ایک خبر تھی کہ وائسرائے بہادر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ اس کے بعد ناگپور میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کے انتظامات کو سنبھالا اور نواب صدیق علی خاں کی رفاقت میں کام کیا پھر دلّی میں مرکزی انجمن اردو سے اُن کا تعلق رہا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا اعتماد اُن کو حاصل تھا۔ اچھے کھانوں کے شوقین خرچ کے معاملہ میں کشادہ دست اور اُس کے عواقب سے بے پروا! تقسیمِ ہند سے کچھ دنوں قبل شادی ہوئی، پاکستان بن جانے کے بعد بیوی بچوں میں ایسے گھرے کہ سیاست و صحافت کی زندگی کو بالکل خیرباد کہہ دیا اور دفتر کے سپرنٹنڈنٹ بن کر رہ گئے! زندگیوں میں ایسا تغیر بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

نے کان پور کا دورہ کیا اور وہاں ان کا استقبال ہوا۔ میری طبیعت میں چہل پیدا ہوئی، میں سوچنے لگا، تھوڑی دیر میں نظیری کا ایک شعر یاد آگیا، جسے میں نے اس خبر کا عنوان بنایا، شعر یہ تھا:

ہیبتِ حسنش کسے را رخصتِ آہے نہ داد
گرچہ ہر سو دادخواہے بود او تنہا گزشت

اس شعر میں وائسرائے بہادر پر جو لطیف طنز تھی اس کا اظہار لمبے چوڑے اداریے سے بھی ہونا ممکن نہ تھا، سنسر والے بے چارے اس لطافت طنز کو کہاں سمجھ سکتے تھے۔

بجنور میں عبدالسمیع نام کے ایک مختار تھے، گورنمنٹ سے خان صاحب کا خطاب پائے ہوئے اُن کے بیٹے سعید اللطیف اپنے والد کی بالکل ضد تھے، وہ سرکاری آدمی اور صاحبزادے کٹر کانگرسی۔ ایک دو بار جیل بھی کاٹ چکے تھے۔ دفتر "مدینہ" میں اُن کا آنا جانا رہتا تھا۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے ایک بار فرمایا، ان صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر گھمانا مولانا آزاد سے سیکھا ہے، چادر اوڑھنا جواہر لال نہرو سے۔ اپنی علالت کا تذکرہ مولانا محمد علی جوہر کے انداز میں کرتے ہیں اور سنجیدہ بننے کی کوشش میں حکیم اجمل خاں کی نقل اتارتے ہیں۔

اردو زبان کے مشہور مورخ مولوی اکبر شاہ نجیب آبادی سے بھی مدینہ منزل ہی میں نیاز حاصل ہوا۔ لانبا قد، سیاہ رنگت، کھدر کا انگرکھا، اسی کی ٹوپی اور پاجامہ اور ہاتھ میں کان سے اونچا لٹھ! مولوی مجید حسن صاحب سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ اکبر شاہ خاں مرحوم کی زندگی میں ایک ایسا تاریک دور بھی آیا کہ وہ قادیانی ہو گئے اور عقیدت کے جوش میں مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ حکیم نورالدین (علیہ ما علیہ) کی بیوگرافی تک مرتب کر ڈالی مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا فرمائی اور وہ کفر و ضلالت کے اُس دائرے سے نکل کر مسلمان ہو گئے۔

حضرت جگر مراد آبادی سے پہلی بار ملاقات "مدینہ" کے دفتر میں ہوئی۔ مولوی مجید حسن مرحوم نے اُن کے اعزاز میں شعر و سخن کی ایک نشست کا انتظام کیا۔ مولوی صاحب کو شعر و شاعری سے خاصی دلچسپی تھی۔

مولوی مجید حسن مرحوم کی زندگی کا آغاز ایک خوشنویس اور کاتب سے ہوا۔ پھر انہوں

نے اپنے وطن بجنور سے سہ روزہ اخبار "مدینہ" نکالنا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بڑی برکت عطا فرمائی۔ "مدینہ" کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ متحدہ ہندوستان کے علاوہ افریقہ، زنجبار، مارشس، عدن اور حجاز وغیرہ ممالک میں بھی "مدینہ" کے خریداروں کی خاصی تعداد تھی۔ اخبار کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا کام بھی بہت نفع بخش رہا خاص طور سے حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ قرآن جس پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی ہیں۔ اس کی اشاعت نے اُنہیں مالا مال کر دیا۔ بلاک سازی کے لیے، متن، ترجمہ اور حواشی کی پروف ریڈنگ میں مولوی صاحب کو بڑی دیدہ ریزی اور محنت و مشقت کرنی پڑی!

پریس، اخبار اور مکتبہ سے مولوی صاحب مرحوم کو ہزاروں کی آمدنی تھی، اور اب سے ۳۰ - ۳۵ سال قبل اُن کا شمار ضلع بجنور کے خوش حال بلکہ دولت مند اور نامور لوگوں میں ہوتا تھا، مگر اس عزت، ناموری اور خوش حالی کے باوجود منکسر المزاج تھے۔ سیدھی سادی متوازن زندگی جو نام و نمود اور تکلفات سے ناآشنا تھی۔ خوش چلن اور معاشی معاملات میں محتاط، دو بیویاں تھیں، اور دونوں کے اولاد تھی۔ ضرورت مند عزیزوں کی خاموشی کے ساتھ امداد کرتے۔ مولوی صاحب کی شریفانہ روش کی بدولت شہر کے ہر طبقہ میں اُن کی عزت کی جاتی۔ حافظ محمد ابراہیم جو برسوں یو۔پی کے وزیر رہے ہیں اس کے بعد ہندوستانی حکومت میں مرکز کے وزیر ہوئے اور پھر ڈیڑھ دو سال مشرقی پنجاب کی گورنری کا لطف بھی اُٹھایا۔ اُن کو اخبار "مدینہ" (بجنور) کے دفتر میں راقم الحروف نے بارہا دیکھا، ان دنوں وہ نگینہ میں وکالت کرتے تھے اور مولوی مجید حسن صاحب کو اپنا بڑا سمجھ کر نیازمندانہ انداز میں ملتے تھے۔

مولوی صاحب مرحوم چونکہ خوشنویسی اور کتابت کے فن سے واقف تھے اس لیے اُن کی نگرانی میں اخبار "مدینہ" کی کتابت معیاری ہوتی۔ کوئی کاتب عجلت اور بے پروائی سے کام لیتا تو اس کو ٹوکتے اور بتلاتے کہ کتابت میں حرفوں کے دائروں اور شوشوں کے نوک پلک اس طرح درست کیے جاتے ہیں۔ اخبار "مدینہ" کے اداریے چھپنے سے پہلے خود پڑھتے اور بعض اوقات ایڈیٹروں کو ٹوک بھی دیتے کہ فلاں خیال کے اظہار میں یہ

مولوی صاحب مرحوم سر سے پیر تک مذہبی آدمی تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے انتہائی پابند، پاک صاف زندگی، علماء دیوبند سے بے حد متاثر، اُن کے عقیدت مند اور قدر شناس! اخبار "مدینہ" کے عملہ نے "مدینہ کلب" قائم کیا تھا جس میں فٹ بال ہوتی تھی۔ شہر کے باہر کھیتوں کے درمیان کھیل کا میدان تھا۔ دو تین بار مولوی صاحب نے بھی فٹ بال میں حصہ لے کر ہم جوانوں اور اپنے خردوں کی ہمت افزائی کی اور اپنی جولانیٔ طبع کا ثبوت دیا۔

————— ۱۹۳۳ء کے بعد مولوی مجید حسن مرحوم سے پھر نہ تو ملاقات کا موقع ملا اور نہ اُن سے خط وکتابت کا معاملہ رہا، سولہ سال کی اس طویل فرقت کے بعد ۱۹۴۹ء میں جب میں نے "فاران" نکالا تو اس کا اشتہار "مدینہ" میں اشاعت کی غرض سے بھیجا اور مولوی صاحب نے اُسے کسی معاوضہ کے بغیر اپنے اخبار میں شائع فرمایا، اسی طرح "رسالت نمبر" اور "توحید نمبر" کے اشتہارات بھی "مدینہ" میں نمایاں طور پر اشاعت پذیر ہوئے اور اُن کے تبادلہ میں "فاران" میں چھپنے کے لیے مولوی صاحب مرحوم نے اپنے مکتبہ کی کسی کتاب کا اشتہار نہیں بھیجا۔

سُنا ہے کہ اب کچھ دنوں سے مولوی مجید حسن مرحوم کے مالی حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے، مگر انہوں نے استقلال وعزیمت اور صبر وشکر کے ساتھ یہ زمانہ گزارا، ڈیڑھ دو مہینے ہوئے سہ روزہ "مدینہ" میں ایک مضمون نگاہ سے گزرا جس میں جمال ناصر کی حمایت کی گئی تھی اور "اخوان المسلمون" پر چوٹیں تھیں مجھ سے نہ رہا گیا میں نے مولوی صاحب مرحوم کو شکوہ آمیز خط لکھا کہ "مدینہ" کا اب یہ کیا رنگ ہو گیا ہے۔ ظالم کی حمایت و مدافعت اور مظلوم پر طنز وملامت .... یہ کیا ہو رہا ہے؟

اس خط کے کچھ دن بعد "مدینہ" میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی — اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ فاران، جنوری ۱۹۶۷ء)

مجید لاہوری

سنہ تو ٹھیک طرح یاد نہیں ہے۔ غالباً ۱۹۴۱ء تھا جب سب سے پہلے مجید لاہوری مرحوم سے عربک کالج دلی کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ یہ زمانہ ان کی شہرت کے آغاز کا تھا۔ میں نے "ادبی دنیا"، "ہمایوں" اور "شاہکار" میں ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھی تھیں اور ان کی ذات سے یہ توقع قائم کی تھی کہ نام نہاد "ترقی پسندوں" کے مقابلے میں "تعمیر پسند شاعروں اور ادیبوں" کا جو گروپ ہے مجید کی ذات اس گروپ کو تقویت پہنچائے گی۔ اس زمانہ تک انھوں نے مزاحیہ شاعری شروع ہی نہیں کی تھی سنجیدہ غزلیں اور نظمیں کہتے تھے۔ دلی میں وہ غالباً جناب حفیظ جالندھری کے یہاں ٹھہرے تھے۔ پھر حفیظ صاحب ہی کے ساتھ انہیں میرٹھ نوچندی کے مشاعرے میں دیکھا۔

اس واقعہ کے تیسرے سال مجھے دلی سے کراچی ایک مشاعرے میں آنا پڑا۔ رائے ونڈ جنکشن سے جو گاڑی بدلی تو اتفاق سے اس ڈبہ میں جگہ ملی جس میں مجید لاہوری بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ حاجی لق لق بھی تھے! کراچی تک کا یہ سفر بڑی ہنسی خوشی میں کٹا چوبیس گھنٹہ باتوں باتوں میں گزر گئے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور قہقہہ و مزاح کا ڈبہ میں ایک طوفان سا اٹھتا رہا، کراچی پہنچ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شاعروں کو مشاعرے والوں نے مختلف مقامات پر ٹھہرایا تھا۔ پھر شب کو مشاعرے میں یکجائی ہوئی!

زمانہ گزرتا اور دن بیتتے چلے گئے، یہاں تک کہ اللہ کا کرنا ایسا ہوا ہندوستان تقسیم ہوا پاکستان بنا اور اس کے بعد جو کچھ ظہور میں آیا کس کے قلم میں طاقت ہے جو ان المناکیوں کو بیان کر سکے۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں مجھے بھی کراچی آنا پڑا ان دنوں مجید لاہوری مرحوم روزنامہ "انصاف" میں کام کرتے تھے، پھر وہ روزنامہ "جنگ" میں "حرف و حکایت" لکھنے لگے۔ اور اس آٹھ نو سال کی مدت میں انھوں نے اس قدر شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی، جو بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو بیسیوں برس کی مشق و ریاضت کے بعد بھی میسر نہیں آتی۔

چراغ حسن حسرت مرحوم سے کراچی میں مجید کا بہت یارانہ تھا بلکہ یوں کہیے کہ گاڑھی چھنتی تھی، حسرت ——— اے بے خبر زلذت شرب دوام ما ——— کی تصویر بلکہ تفسیر بن کر رہ گئے تھے۔ حسرت مرنے کو مر گئے مگر اپنے بعض ہم مشرب دوستوں کی زندگیوں پر "سرخوشی" کا گہرا نقش چھوڑ گئے۔ اسی بے اعتدالی کی بدولت مجید لاہوری کی صحت رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگی پھر دل کے دورے پڑنے لگے اور آخر میں تو ان کے جسم کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اپنی انگلی سے اپنے جسم کو دباتے، دبانے سے جسم میں گڑھا پڑ جاتا اور بہت کافی دیر میں گڑھا ہموار ہوتا!

مجید لاہوری بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ جس جگہ بیٹھتے لوگوں کو ہنسا کر اٹھتے کس کس کے کیسے کیسے لطیفے یاد تھے، کچھ دوسروں سے سنے ہوئے، کچھ خود ان کے بنائے ہوئے پھر طرز ادا سے ان میں جان ڈال دیتے، زیادہ وقت ہنسنے اور ہنسانے ہی میں گزرتا محفلیں اور صحبتیں ان کے دم سے چہچہانے لگتیں! چراغ حسن حسرت مرحوم کا اکثر ذکر کرتے، کہتے تھے کہ حسرت دھوبی، حجام، تانگہ والے یہاں تک کہ طوائف کو بھی "مولینا" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بذلہ سنجی اور ٹھٹھول میں مجید مرحوم کسی حد کی پروا نہ کرتے، سب کچھ کہہ گزرتے۔ ان سے آخری بار ملاقات اسی سال مارچ میں لائل پور کے مشاعرے میں ہوئی، مشاعرے کے بعد لاہور جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر ہم آئے رات کافی بھیگ چکی تھی موسم خاصا خنک تھا پلیٹ فارم پر فراق گورکھپوری اور مجید لاہوری کے درمیان رنگین باتوں اور بے تکلفانہ مذاق کی تو "چھوٹ" چلی تو مولانا عبدالمجید سالک جی کڑا کر کے وہاں جمے رہے۔ مگر میں اپنی غیر سنجیدگی اور آزاد منشی کے باوجود وہاں سے دور جا کر کھڑا ہو گیا! بس پھر اس دن کے بعد ملنا نہ ہو سکا۔ اخبار میں ان کے مرنے کی خبر ہی پڑھی اور کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ مرحوم سے میری بہت زیادہ بے تکلفی تھی مگر ان کے گھر کبھی جانا نہیں ہوا اخبار میں پتا دیکھ کر لیاقت آباد پہنچا اور وہاں تھوڑی سی دیر کی تلاش کے بعد ان کا گھر مل گیا۔ فلیٹوں کے درمیان گلی میں فرش بچھا تھا اور اس پر دوسرے سوگواروں کے ساتھ میں بھی بیٹھ گیا۔ جنازہ اٹھا تو عورتوں کی چیخوں نے سب کے دل ہلا دیے۔ ملول سب تھے مگر میں نے روتا ہوا اس مرد قلندر کو دیکھا، جو کراچی کے ہر جلسہ میں بڑی جرأت کے ساتھ نعرہ لگایا کرتا ہے کہ:

"کچھ قادیانیوں کے بارے میں بھی تو کہو"

طنز و مزاح کا جو "طوطیِ ہزار داستان" تھا اس کے جنازے کو کندھا دیا! اب یہاں کیا رکھا تھا، ایک جسدِ بے روح ایک پیکرِ خاموش............ ہے نام اللہ کا۔

مجید لاہوری کے طنز و مزاح میں بڑی شگفتگی ہوتی تھی۔ عوامی مسائل کو ظرافت کے پیرایہ میں بڑی خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے۔ ان کا قلم بعض اوقات نشتر کا کام کرتا مگر دیکھنے والے سمجھتے کہ یہ تو ہنسی ہنسی میں چٹکی لی ہے۔ "عوامی بولیوں" کی ترجمانی میں انہیں یدِطولیٰ حاصل تھا، اور ان کی مزاحیہ شاعری تو پھلجھڑی ہوتی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کے "مزاح و ظرافت" کے سامنے ان کی سنجیدہ شاعری دب کر رہ گئی۔

ان کا قلم کبھی کبھی بہک بھی جاتا تھا۔ اسلامی دستور اور دینی رجحانات پر انھوں نے چوٹیں کیں تو میں نے کئی بار ان سے سخت الفاظ میں شکوہ کیا وہ شرما سے گئے اور چپ سادھ لی۔ اسی سال کے جاڑوں کی بات ہے کہ کاٹن ایکسچینج کی بلڈنگ میں مشاعرہ تھا، وہاں انھوں نے نظم سنائی جس میں "مولوی گلشیر خاں کی حکومت" پر طنز تھی کہ اس انداز کی مذہبی حکومت جب قائم ہوگی تو نگاہوں پر، فکر و خیال پر، رنگینیوں اور نظاروں پر پابندی ہوگی...... میں نے اس نظم پر ان کو ٹوکا۔

کئی سال کی بات ہے کہ لاہور کے ایک نقاب پوش صحافی "ابو رشید ہمدانی" کے نام سے حکومت کی تائید میں مضامین لکھا کرتے تھے، انہی حضرت (؟) نے مجید لاہوری کو ایک خط لکھا جس میں "بکارِ سرکار" حکومت کی طرف سے کسی "پیش کش" کی طرف اشارہ تھا۔ مجید لاہوری نے مجھے یہ خط دکھایا۔ میں نے کہا کیا ارادہ ہے؟ بولے کہ میں اس پیش کش کو ٹھکرا دوں گا۔

مجید لاہوری کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے مر گئے اور سبھی مرنا ہے۔ مرنے والے کے ساتھ نہ اس کی شہرت جاتی ہے اور نہ دولت و منزلت! ان میں سے کوئی چیز نہیں یہ سب اس دنیا میں رہ جاتی ہیں ساتھ جاتے ہیں اعمال! آؤ! اس دن کے لیے ہم "زادِ راہ" مہیا کر رکھیں جس دل نے دوسروں کی موت سے بھی عبرت حاصل نہ کی اس دلِ غافل سے اللہ کی پناہ!

(ماہنامہ "فاران" اگست ۱۹۵۷ء)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی

اب سے ساٹھ برس پہلے مولوی فیض الدین حیدرآباد دکن میں محکمہ مال گزاری کے نامی گرامی ایڈووکیٹ تھے، چاہے کتنا ہی بھاری محنتانہ کیوں نہ ملتا ہو غلط قسم کے مقدموں کی پیروی کرنے سے وہ انکار کر دیتے۔ اس احتیاط کے باوجود اُن کی بلغا دوں آمدنی تھی! اس حلال کمائی کا زیادہ تر حصہ کارِ خیر میں صرف ہوتا۔ چہرہ مہرہ اور وضع قطع مشرقی اور شریفانہ! دسترخوان وسیع! اُن کی میزبانی کی خاصی شہرت تھی۔ حضرموت، بحرین، شحر، مُکلا، عراق و حجاز سے عرب روزگار کی تلاش میں حیدرآباد دکن کے ریلوے اسٹیشن پر اُترتے تو جھٹکے اور تانگے والے انھیں مولوی فیض الدین کے یہاں پہنچا دیتے۔ اُن کی کوٹھی مہمانوں سے کبھی خالی نہ رہتی! علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ مولوی فیض الدین کے یہاں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تو دسترخوان پر چالیس پچاس آدمیوں کا ہجوم تھا، اور ان کو دعوت دیکر نہیں بلایا گیا تھا، یہ لوگ علامہ عثمانیؒ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ کھانے کا وقت ہوا تو سب کو روک لیا گیا۔

علماءِ دیوبند سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی؁ سے ملاقات کا شرف مولوی فیض الدین ہی کے دولت کدے پر حاصل ہوا۔ مولوی فیض الدین علماء دیوبند کی تربیت اور فیضِ صحبت کا قابلِ تحسین نمونہ تھے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ یہ غالباً ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ مولانا کاندھلوی مرحوم مولوی فیض الدین کے یہاں رہتے تھے اور انہیں عربی پڑھاتے تھے۔ علم اور دین سے شغف کی یہ مثال قابلِ ذکر ہے کہ مولوی فیض الدین نے کئی برس کی ریاضت و محنت میں میزان الصرف سے لے کر درسِ نظامی کی آخری کتابیں مولانا ادریس کاندھلوی سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ استاد اور شاگرد دونوں سراپا اخلاص — دین کے فدائی اور ملت کے خیر خواہ!

ایک بار گرانڈ ٹرنک ایکسپریس میں مولانا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ساتھ ہو گیا۔ اُن

کا وطن ضلع مظفر نگر کا مشہور قصبہ کاندھلہ اور میں موضع کسیر کلاں ضلع بلند شہر کا رہنے والا یکشنری ان دونوں ضلعوں کی ایک ہی (میرٹھ) تھی۔ ہم دونوں پردیس سے اپنے دیس کو جا رہے تھے۔ تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں کشادہ جگہ ملی۔ اُن کے صاحبزادے مولانا عبدالمالک جو برسوں سے دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں حدیث کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ماشاللہ بال بچوں والے ہیں، اپنے والدِ محترم کے ساتھ تھے۔ اس وقت اُن کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔

مولانا کاندھلوی مرحوم کے لبوں کو میں نے اکثر ہلتا ہوا پایا، راستہ بھر چپکے چپکے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اُن کی زبان حلاوت اور طراوت حاصل کرتی رہی۔ میں نے فقہ کا ایک مسئلہ پوچھا، وہ انھوں نے بتا دیا، تھوڑے سے وقفہ کے بعد جوبات دریافت کی تو اس کے جواب میں فرمایا یہ مجھے معلوم نہیں ہے ان کی اس عالی ظرفی اور انکسارِ علم و فضل کا بڑا اثر ہوا ورنہ آج کسی مسئلے میں بھی ایک طالب علم یہ نہیں کہے گا کہ "میں نہیں جانتا" غالباً یا شاید کہتے ہوئے کسی نہ کسی غلط سلط رائے کا اظہار ضرور کرے گا۔

پاکستان بننے کے بعد لاہور اور کراچی میں بارہا ان سے حصولِ نیاز کے موقعے میسر آئے۔ ایک بار لاہور کے دورانِ قیام میں راقم الحروف اُن کی خدمت میں حاضر بھی ہوا، مولانا کاندھلوی نے چائے سے تواضع کی۔ نیلے گنبد (لاہور) کی مسجد میں وہ جمعہ کے خطبہ سے پہلے تقریر کیا کرتے تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دورِ حکومت میں مولانا مرحوم نے تقریر کرتے ہوئے بڑے دردمندانہ لہجے میں فرمایا:

ہم علماء کا اس کے سوا کیا قصور ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کرتے ہیں ۔۔۔۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب رویتِ ہلال کے سلسلے میں بعض علماء قید و بند میں مبتلا تھے۔

مولانا کاندھلوی کا شمار علماء دیوبند کے اکابر میں ہوتا تھا، ساری عمر دینی علوم پڑھنے اور پڑھانے میں گزار دی علمِ حدیث اُن کا خاص موضوع تھا اور اس فن میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں برسوں سے شیخ الحدیث اور متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ علامہ شبلی نعمانی سے وہ خوش نہ تھے، سیرۃ النبی کی کوتاہیوں پر انھوں نے گرفت کی مگر شبلی کا قلم اور ذہانت ہر عالم کو کہاں میسر آتی ہے۔ چھ جلدوں میں مشکوٰۃ شریف کی شرح لکھی، یہ جلدیں مصر میں چھپ چکی ہیں علماء مصر نے اُن کی عربی انشاء کے قدیم طرز

کو پسند کیا۔

مجھے یاد پڑتا ہے اُن کے عربی اشعار میں نے بعض رسالوں میں پڑھے تھے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ دیوبند کے اسلاف و اکابر کی روش کے مقلد اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوش کے محافظ و امین ــ اور سیرت و کردار کے اعتبار سے صلحاء کا نمونہ تھے۔ اس قدر علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے باوجود طبیعت میں مزاح بھی تھا، خاصے خوش مزاج اور خوش طبع تھے۔

مزاج قناعت پسند تھا، انہوں نے اپنی دنیا بنانے کے لیے تگ و دو نہیں کی۔ مگر حیدرآباد دکن سے لے کر پاکستان تک تقریباً پچاس برس کی مدت میں روزگار کی طرف سے کبھی بے اطمینان نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی روزی میں وسعت عطا فرمائی۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے قوانین کی تسوید و نظرِ ثانی کے لیے حکومتِ پاکستان نے جس مشاورتی کونسل کی تشکیل کی ہے، اس میں رکن کی حیثیت سے مولانا کاندھلوی کا بھی تقرر کیا گیا۔ مولانا مرحوم کے بہی خواہوں اور عقیدت مندوں کو مولانا کی سادگیٔ طبیعت سے اندیشہ تھا ــ کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے مداحوں کے نقطۂ نگاہ اور ذہن و فکر کی شیشہ بازی انہیں متاثر نہ کردے اور مولانا کاندھلوی کو اپنی نیک نیتی اور سادگیٔ طبع کی وجہ سے پتا بھی نہ چلے کہ اُن سے کیا کام لے لیا گیا۔ اُن کی صحت بھی اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ شرعی قوانین کی تشکیل و تسوید کے لیے خاطر خواہ محنت برداشت کر سکتے۔ بڑھاپا اور امراض کی کثرت اس گراں بار ذمہ داری سے اُن کے لیے عہدہ برآ ہونا کارِ دشوار تھا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے دینی اخلاص کی قسم کھائی جا سکتی ہے، معمولی معمولی جزئیات میں بھی شریعت کے سختی سے پابند، دینی علوم میں صاحبِ تبحر، سُنّتِ رسولؐ کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھنے والے اہلِ ذکر بھی اور صاحبِ حال بھی، ان کی موت ــ "موت العالِم موت العالَم" کی مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں اُن کے درجات بلند فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۷۴ء)

نواب محمد اسمٰعیل خاں

میں نے جب ہوش سنبھالا تو ملک تحریکِ خلافت کے شور سے گونج رہا تھا۔ انھیں دنوں اخباروں میں نواب محمد اسماعیل خاں کا نام بھی نظر سے گزرتا تھا، ایک تو "نواب" کے لقب و خطاب ہی میں کافی مرعوبیت اور کشش تھی، پھر یہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب ہمارے ضلع کے قصبہ جہانگیر آباد کے زمیندار ہیں۔ سب سے بڑی بات ان کا لیڈر ہونا، مرحوم کی شخصیت کے ان نقوش سے لوحِ قلب و دماغ متاثر ہو کر رہی۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں میرا دہلی جانا ہوا، جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد جلسہ تھا۔ مفتی کفایت اللہ مرحوم جلسہ کے صدر تھے۔ اس جلسہ میں مولانا عبدالماجد بدایونی نے دھواں دھار تقریر کی۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں کو اسی جلسہ میں سب سے پہلے دیکھا۔ مولانا عبدالماجد نواب محمد اسمٰعیل خاں کے ساتھ آئے تھے اور انہی کے ساتھ موٹر کار میں (غالباً) میرٹھ چلے گئے۔

نواب صاحب مرحوم کو دور سے دیکھا مگر دل و دماغ کو ان سے قریب ہوتے محسوس کیا۔ سبب؟ ان کی خاموش سنجیدگی اور خلوص کی کشش! انھوں نے اس جلسہ میں کوئی تقریر نہیں کی لیکن میرے وجدان نے ان کی زبانِ سکوت ہی سے بہت کچھ سن لیا۔

نواب صاحب مرحوم سے ملاقات حیدر آباد دکن میں ہوئی، یہ کوئی سنہ ۱۹۲۸ء یا سنہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے، ایک کلب میں ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا۔ چلئے پانی کے بعد شعر و شاعری ہوئی۔ نواب صاحب نے فرمائش کر کے مجھ سے کئی غزلیں سنیں، ان کے داد دینے کا انداز بہت سنجیدہ تھا مگر سخن شناسی سے بھرپور۔

اس کے بعد کانپور میں بڑے دھوم کا مشاعرہ اور اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں حیدر آباد دکن سے کانپور گیا اور وہاں سے اپنے ایک عزیز سے ملنے کے لیے میرٹھ پہنچا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں میرٹھ جاؤں اور نواب صاحب سے نہ ملوں! ان کی عالی شان کوٹھی "مصطفےٰ کیسل" میں حاضر ہوا۔ بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے اور دوسرے یا تیسرے دن مجھ خاک نشین کی خاطر شام کو ایٹ ہوم میں میرٹھ کے عمائد کو بلایا۔ بڑی پرلطف دعوت

رہی۔ نواب جمشید علی خاں مرحوم رئیس باغپت بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ کم سے کم مسلسل دو گھنٹے میں نے اپنا کلام سنایا۔ مصطفےٰ کیسل کا کشادہ باغیچہ، سخن شناسوں کا مجمع، قرینہ کی صاف ستھری محفل، دوسروں پر کیا اثر ہوا یہ تو وہ جانیں، مگر خود میرا دل چاہتا تھا کہ غزل پر غزل سنائے ہی چلا جاؤں ع

کبھی کبھی تو یہ موقعے نصیب ہوتے ہیں

اس کے بعد یہ معمول ہوگیا کہ جب بھی میرٹھ جانا ہوتا، نواب صاحب کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ یہ زمانہ مسلم لیگ اور کانگریس کی معرکہ آرائی کا تھا۔ نواب صاحب مسلم لیگ کے صفِ اوّل کے لیڈر تھے اور اس وصف میں تو وہ شاید تمام مسلم لیگی لیڈروں میں ممتاز تھے ۔۔ کہ وہ قیادت کے ہر فرمان پر " YES " کہنے والوں میں نہ تھے، یہ دوسری بات بات ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے نیاز مندوں کے ہجوم میں ان کی بات چل نہ سکتی تھی مگر وہ اظہارِ رائے میں کسی کی خوشی ناخوشی کی پروا نہ کرتے وہ شخصیت کے نہیں حق کے ساتھی، ہم نوا اور پرستار تھے۔

ایک بار وہ مسلم لیگ کونسل کی کسی اہم میٹنگ میں شرکت کر کے میرٹھ آئے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو کسی مسئلے پر قائدِ اعظمؒ کے اصرار کو انھوں نے " ضد " سے تعبیر کیا، اس کا انھیں ملال بھی تھا مگر پارٹی ڈسپلن کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ کی ملی جلی حکومت (Interim Government) بنی تو اس میں نواب صاحب کے لیے جانے کی سو فیصد امید تھی اس منصب کے وہ مستحق ہی نہیں اہل بھی تھے۔ مگر وہ نہیں لیے گئے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ کئی بار یہاں آئے، اپنے بچوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کے لیے! وہ جب بھی یہاں آتے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا، سب ان کا دل سے احترام بلکہ محبت کرتے تھے۔ آخری بار ان سے کراچی میں میرا ملنا ہوا، اپنے صاحبزادے محمود اکرام حسن کے بنگلہ (باتھ آئی لینڈ) میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بالائی منزل میں قیام تھا۔ بخار میں مبتلا تھے مگر میری حاضری کی اطلاع ملی تو اوپر بُلا لیا۔ چند منٹ بات چیت رہی، چہرے سے نقاہت کے آثار نمایاں تھے، اور ان کی ربودگی اور اضمحلال کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ شمع تو بجھی سی جا رہی ہے " اب تب " کا معاملہ ہے!

ان کے انتقال کی خبر سب سے پہلے جناب فضل کریم فضلی نے سنائی، پھر دوسرے دن اخبارات میں تفصیل آگئی۔ غالب نے یہ مصرع ایسے ہی المناک حادثوں کے لیے کہا تھا؎

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

نواب محمد اسماعیل خاں نے شرافت اور امارت خاندانی ورثہ میں پائی تھی۔ وہ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے نامور دادا کے پوتے اور نواب محمد اسحاق خاں جیسے بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ خلافت کی تحریک سے ان کی قومی و سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی سیاسی شہرت اور قومی شخصیت سے ذرہ برابر فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ سیاسیات میں آکر انھوں نے مالی خسارہ ہی برداشت کیا اور روز بروز ان کی مالی مشکلات بڑھتی ہی چلی گئیں۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ وہ اپنے قصر (مصطفیٰ کیسل) کے وسیع و کشادہ باغ کی بھی پوری طرح نگہداشت نہ کر سکتے تھے۔ یہ زمانہ انھوں نے بڑے شکر و صبر کے ساتھ گزارا اور تیوری کو ملول نہ ہونے دیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ بھی دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کی طرح پاکستان چلے آتے تو یہاں انھیں بڑے سے بڑا عہدہ مل سکتا تھا، ان کی موجودگی میں غلام محمد کو کون پوچھتا؟ مگر انھوں نے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو بے سہارا چھوڑ کر پاکستان چلا آنا گوارا نہ کیا، اس ایثار کا، اخلاص و دردمندی اور مسلم دوستی کا اللہ کے یہاں انھیں بہت بڑا اجر ملے گا۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم کو دین سے خاص شغف تھا وہ نماز روزے کے پابند تھے اور ذاتِ رسالت مآب کی غلامی کو اپنے لیے سب سے بڑا شرف سمجھتے تھے، انھیں پاکیزہ عقائد و اعمال کے ساتھ وہ اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔ اللہ تعالیٰ اپنی شبنم رحمت سے ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے انھیں بہرہ وافر نصیب ہو۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اگست ۱۹۵۸ء)

حاجی محمد اصطفا خاں لکھنوی

میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا، اُن دنوں لکھنؤ کا ایک ماہنامہ نظر سے گزرا نام تھا "ترچھی نظر" اور اس پر حاجی محمد اصطفا لکھنوی کا نام ایڈیٹر یا "سرپرست و نگراں" کی حیثیت سے مرقوم تھا۔ یہ اُن سے پہلا تعارف تھا۔ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے اشتہارات کے ذریعہ اس کا پتا لگا کہ یہ صاحب عطر سازی کے اس کارخانہ کے مالک بھی ہیں —— اُن سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ہوئی۔ حضرت جگر مرادآبادی شروع شروع میں پاکستان تشریف لائے تو حاجی صاحب مرحوم ہی کی کوٹھی میں قیام فرمایا۔ پھر دوبارہ آئے تو کئی مہینے اُن کے یہاں ٹھہرے! اس طرح حاجی اصطفا خاں صاحب مرحوم سے ملنے کے موقعے بارہا آئے۔ جگر صاحب کے دورانِ قیام میں اُن کے اہتمام سے حاجی صاحب کے یہاں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوتا۔

حاجی اصطفا خاں مرحوم، حضرت جگر کا بڑا احترام بلکہ نازبرداری کرتے تھے مگر ایک رات "رمی" کھیلنے پر خاصے تند و تیز انداز میں جگر صاحب کو تنبیہ کی۔ اس نصیحت کا اتنا اثر ہوا کہ جگر صاحب کئی دن "رمی" کھیلنے سے رُکے رہے اور یہ چند دن اُن پر بڑے سخت گزرے۔

حاجی صاحب مرحوم نے متعدد شادیاں کی تھیں، کثیر الاولاد تھے، مگر اس کے باوجود اُن کی خانگی زندگی سکون و اطمینان کی زندگی تھی۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کے کرایہ کی ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی تھی لیکن خرچ آمدنی کے حدود ہی میں رہتا، امیرانہ زندگی تھی مگر تبذیر و اسراف سے دُور۔ اس احتیاط اور سلیقے کے ساتھ "بڑے آدمی" کم ہی رہتے ہیں۔

گوری رنگت، لوٹا سا قد، سر پر پٹے اور چہرے پر داڑھی کیا بہار دیتی تھی۔ وضع قطع، رہن سہن، پہناوا اور کھانا پینا خالص مشرقی بلکہ لکھنوی! جوانی کے زمانے میں "اسکیٹنگ" کا شوق تھا اور اس فن میں کمال حاصل کیا۔ تین چار فٹ قطر کی میز پر "اسکیٹنگ" کرتے۔ لندن کے کلب میں لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو حیران و ششدر رہ گئے۔ (اس واقعہ کا

حاجی صاحب مرحوم نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھ سے ذکر کیا۔)

شعر و ادب سے خاصی دلچسپی تھی۔ عاشقانہ غزلیں بھی کہتے اور نعت و منقبت بھی! ان کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں! تاریخ گوئی کی بڑی مشق تھی۔ میں زیارتِ حرمین شریفین سے واپس آیا تو مبارکباد کی نظم کہہ کر اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر دفتر "فاران" میں تشریف لائے۔ خط بڑا پاکیزہ تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھوں نے خطاطی کی مشق کی ہے۔ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے ایک بار اپنے یہاں مجھے اور مسٹر ذوالفقار علی بخاری (سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) کو کھانے پر بلایا۔ اس دعوت کی غرض یہ تھی کہ "شعر و ادب" کی ترویج و ترقی کے لیے ایک انجمن یا حلقہ بنایا جائے۔

صوم و صلوٰۃ کے پابند، تہجد گزار، مسجد میں جاکر با جماعت نماز پڑھنے کا اہتمام و التزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے عقیدت اور تعلق عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ مدینہ منورہ میں "اصطفا منزل" ان کے اس عشق و محبت کی یادگار ہے۔ دو چار نہیں بیسیوں حج اور عمرے کیے۔ حرمین شریفین کی سال کے سال زیارت۔ یہی ان کا شوق تھا، اور اسی مقدس سفر سے ان کی زندگی کی ساری دلچسپیاں وابستہ تھیں ——— اور اسی یاد، شوق اور ذکر و فکر میں دنیا سے سلامتیِ ایمان کے ساتھ رخصت ہو گئے ——— رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و برد اللہ مضجعہ! ———

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۶۲ء)

پروفیسر محمدؐ الیاس برنیؔ

چند مہینے ہوئے کہ نواب اچھن صاحب اشکؔ رامپوری اللہ کو پیارے ہو گئے! داغؔ کے ایک قابلِ فخر شاگرد تھے، محمود رامپوری، داغؔ کے رنگ میں کامیاب غزل گو، اشکؔ رامپوری انہی سے نسبتِ تلمذ رکھتے تھے۔ اشکؔ رامپوری کی ایک تو وہ زندگی تھی کہ کوٹ پتلون، کالر اور ٹائی سے لیس رہتے۔ سات سال انگلستان اور فرانس کی رنگین فضاؤں میں بسر کیے، اور اب آخر میں وہ بالکل بدل گئے تھے۔ سر پر شرعی بال، داڑھی صوفیانہ وضع قطع! گولڑہ شریف کی خانقاہ کے ایک حجرے میں لنگر کا کھانا کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر بھیجتے!

اشکؔ رامپوری کے ایسے شعر ؎

ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں اب وحشت میں ‏ ‏ ہائے دامن نہ ہوا، ہائے گریباں نہ ہوا

کاغذ پر نہیں، دلوں پر نقش رہیں گے۔

اشکؔ مرحوم کے بعد خیام الہند حیدرؔ دہلوی نے رختِ سفر باندھا، اور اپنے پیچھے ہزاروں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑا۔ حیدرؔ مرحوم شعر گوئی میں حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے، سینکڑوں شاگردوں کو اُن کی ذات سے فائدہ پہنچا اور نہ جانے کس کس کو صاحبِ دیوان بنا دیا، جو شاعر اتنے بلند پایہ شعر کہتا ہو:

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی ‏ ‏ بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی
ابھی ماحول معیارِ سخن میں پست ہے حیدرؔ ‏ ‏ یکایک ہر بلند آواز پہنچائی نہیں جاتی

اُس کے اٹھ جانے سے اردو زبان و ادب کو کتنا نقصان پہنچا ہو گا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی موت بھی علم و ادب کا ایک سانحہ ہے، مرحوم برسوں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں فلسفہ کے پروفیسر رہے ہیں، اب کئی سال سے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ رومیؔ اور اقبالؔ کے فلسفہ اور کلام پر اُن کے بڑے معرکے کے مضامین شائع ہوئے ہیں، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے انشاپرداز تھے

علامہ اقبال کی ہم نشینی بلکہ بے تکلفی کا انہیں فخر حاصل تھا، بعض دینی عقائد میں شدید اختلاف کے باوجود، اُن کی علمی منزلت کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں، جس دن اُن کا انتقال ہوا ہے، اُسی شب نیچ ملگزری ہوٹل میں انہیں دیکھا اور علیک سلیک بھی ہوئی، وہ ایک انگریز متشرق سے بات چیت کر رہے تھے۔ انہی متشرق کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا تھا!

یہ داغ ابھی تازہ ہی تھے کہ ایک دن شام کو جناب ظفر احمد انصاری کے یہاں مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی کی زبانی سب سے پہلے یہ غم انگیز خبر سُنی کہ پروفیسر الیاس برنی کا انتقال ہو گیا، میں نے کہا کہ اخباروں میں اس حادثہ کی کوئی اطلاع شائع نہیں ہوئی، یہ خبر اللہ نے چاہا تو غلط ثابت ہو گی! مگر ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، پھر موت ہر جان کے لیے مقدر کر دی گئی ہے، اس سے کسی کو مفر نہیں۔

اس خبر نے طبیعت کو ملول و مکدر کر دیا، دوسرے تیسرے دن روزنامہ" تسنیم" میں الیاس برنی مرحوم کی موت پر ایک" شذرہ " نظر سے گزرا، اور اس کے بعد مرحوم کے نواسے کا کارڈ مجھے ملا:-

> السلام علیکم! مولانا الیاس برنی صاحب میرے حقیقی نانا ہیں۔ آپ کا پتا وہ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکان پر رکھ گئے تھے۔ اپنی ہمشیرہ سے ملنے اپنے وطن بلند شہر تشریف لے گئے تھے، جہاں پر بحالت صحت اچانک ۲۶ جنوری کو اُن کا وصال ہو گیا ہے۔ میں آپ کو اطلاعاً لکھ رہا ہوں، میرا پتا یہ ہے:—— فاروق حسن برنی، بیت السلام، سیف آباد، حیدرآباد دکن

پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم بلند شہر (برن) کے رہنے والے تھے۔ میرا وطن بھی اسی ضلع (بلند شہر) کا ایک گاؤں —— کیسر کلاں —— ہے جو بلند شہر سے دور اور علی گڑھ سے قریب ہے، مرحوم نے شروع شروع میں ایم، اے، او کالج علی گڑھ میں لیکچراری کی خدمت انجام دی، پھر وہ حیدرآباد دکن چلے گئے، وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں برسوں پروفیسر رہے۔ اس کے بعد دارالترجمہ کے ناظم ہو گئے، پھر جامعہ عثمانیہ کے مُہتمم (REGISTRAR) کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

پروفیسر الیاس برنی مرحوم نے " علم المعیشت " کے نام سے ایک مفید کتاب لکھی،

اور "مناظرِ قدرت" کے عنوان سے اردو نظموں کا انتخاب چھپوایا، جو بہت مقبول ہوا اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی (غالباً) کئی برس شامل رہا!

مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ "قادیانی مذہب" کی تالیف ہے۔ یہ تالیف اُن کے نام کو زندہ رکھے گی اور آخرت میں اُن کے لیے۔ ان شاءاللہ ذریعۂ مغفرت اور وسیلۂ نجات بن جائے گی۔

قادیانیت کی تردید میں اس کتاب نے جو کارِ عظیم انجام دیا ہے، اُس کے موافق و مخالف سب معترف ہیں!

میں نے آج سے تقریباً چوبیس سال پہلے انہیں سب سے پہلے قاضی عبدالغفار (مرادآبادی) مرحوم (مصنف "لیلیٰ کے خطوط") کے یہاں حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا، اُس کے بعد دو چار مہینے کے فصل سے کہیں نہ کہیں آمنا سامنا ہو جاتا! مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور اور مولانا عبدالباری ندوی ایک بار مجھے میرے گھر سے صوفی محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں لے گئے تھے، تو اس محفل میں الیاس برنی مرحوم موجود تھے!

"فاران" کی اشاعت کے بعد پروفیسر الیاس برنی مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا، اور تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے، وہ اپنی ہر نئی کتاب "فاران" میں تبصرے کے لیے بھیجتے! اپنے ایک دو مکتوبوں میں اپنی محبت سے اس ہیچ مداں کا ذکر بھی کیا، انھوں نے ایک بار اپنی "نظموں" (؟) کا مجموعہ بھیجا تو میں نے مرحوم کو لکھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے "موزوں طبع" نہیں بنایا، اس لیے "نظموں" کی اشاعت ہمیشہ کے لیے روک دیجیے، یہ بات آپ کے منصب سے فروتر ہے۔ میری اس تنقید اور صاف گوئی کا انھوں نے بُرا نہیں مانا۔

چند مہینے پہلے الیاس برنی مرحوم نے "قادیانی قول و فعل" کا دوسرا حصہ تبصرے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے بعد "یا زدہم شریف" کا ایک مطبوعہ دعوتی کارڈ میرے نام آیا۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ اس قسم کے معمولات اور رسموں کا کتاب و سنت میں کہیں پتا نہیں چلتا لہٰذا ان کے کرنے سے کوئی دینی فائدہ نہیں ہو سکتا ـــــ اس کے بعد پھر ان کا کوئی خط نہیں آیا، اُن کے انتقال ہی کی ملال انگیز خبر ملی۔

پروفیسر الیاس برنی مرحوم کو ذاتِ رسالت مآبؐ سے والہانہ عقیدت تھی۔
تصوف کی طرف طبیعت کا خاص میلان تھا۔ صاحبِ ذکر و فکر بزرگ تھے۔ لانبا قد،
گوری رنگت، خوب صورت خد و خال، گورے چہرے پر ڈاڑھی کتنی بھلی لگتی تھی!
ظاہر و باطن دونوں حسین! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو اپنی رحمت کے پھولوں سے چھپا دے
اور ان کی روح کو ابدی سکون و مسرت عطا فرمائے (آمین)

یہ سطریں لکھتے ہوئے اپنے نفس کی دراز دستیوں کے احساس سے دل کتنی پچھاڑ
اور اذیت محسوس کرتا ہے ـــ موت و آخرت سے کتنی غفلت ہے، دنیا کے جھنجھٹوں
سے کس قدر دلچسپی ہے، ماحول اور معاشرے کے سر سارا الزام کیوں ڈالیے، خود اپنی
ذات ہی پر نفرین کرنی چاہیے۔ (اَللّٰھُمَّ قلّب قلبی اِلیٰ ذکرِکَ وطاعتِکَ)

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۵۹ء)

حضرت سید محمد امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین

اب سے بیالیس تینتالیس برس پہلے کی بات ہے غالباً ۱۹۳۲ء ہوگا حضرت مفتیٔ اعظم فلسطین کو آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ بلدہ حیدرآباد دکن میں باغ عامہ کے سامنے حکومت کے سب سے شاندار گیسٹ ہاؤس میں اُن کا قیام تھا اور وہ سرکاری مہمان تھے مفتیٔ اعظم کی عظیم شخصیت کے لحاظ سے میں اُن کی خدمت میں کسی تعارف و تقریب کے بغیر حاضر ہونے کی شاید جراُت بھی نہ کرتا، مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی مجھے اپنے ساتھ لے گئے، مصافحہ کرتے ہوئے اُن کے ہاتھ اور میرے ہاتھ میں بزرگی و خردی کا بہت بڑا تفاوت تھا مگر حضرت مفتیٔ اعظم کی شفقت نے اس خلا کو پُر کردیا۔ ہم سب ہال کمرے میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں نواب بہادر یار جنگ تشریف لے آئے۔ اُن سے مفتی صاحب نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ معانقہ فرمایا۔ وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے مجھے یہ غلط فہمی لاحق نہیں ہوئی کہ میں نے اُن کے دل و دماغ پر اپنی ملاقات کا ذرہ برابر کوئی نقش چھوڑا ہے اور آج کے بعد وہ مجھے یاد بھی رکھیں گے۔

پھر اگست ۱۹۳۴ء میں مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی کی ہمراہی میں عراق جاتے ہوئے بمبئی میں تین ہفتے کے قریب ٹھہرنا پڑا۔ بمبئی پہلے پہل آنا ہوا۔ سمندر دیکھنے کی بچپن سے تمنا تھی۔ تاج محل ہوٹل کے قریب باب الہند سے شام کے وقت سمندر کا پہلی بار نظارہ ——— بس یوں سمجھیے کہ آنکھیں ہی نہیں میرا پورا وجود غرقِ نظارہ تھا۔ حضرت مفتیٔ اعظم فلسطین بھی ان دنوں بمبئی میں قیام فرما تھے، اُن سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں، بوہروں کے پیشوا "سیدنا" (طاہر سیف الدین) کی کوٹھی میں پرانی چوپاٹی کے قریب وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ تین بار حضرت مفتیٔ اعظم کے ساتھ ہم طعامی کا بھی شرف حاصل ہوا، کھانے انگریزی ہوتے تھے، میٹھے کے علاوہ پانچ چھ کورس۔ ایک دن لنچ میں پڈنگ جو آئی تو زبان اس کی لذت اور حلاوت پر زبانِ حال سے مرحبا پڑھنے لگی، اتنی لذیذ پڈنگ اس سے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ انجیر اور کریم اس پڈنگ کے خاص اجزاء تھے۔

علوبہ پاشا جو حکومتِ مصر میں وزیر رہ چکے تھے اور شاہ فواد نے "پاشا" کا خطاب انہیں عطا کیا تھا جسے انگریزی دور کے "نواب" کے خطاب کے مساوی سمجھیے۔ مفتیٔ اعظم مرحوم کے ساتھ تھے۔ اُن سے راقم الحروف کی بہت دیر تک گفتگو رہتی۔ ایک دن وہ فرمانے لگے کہ بعض مؤرخین سکندرِ اعظم اور نپولین کے ساتھ حضرت علیؓ اور حضرت خالدؓ کا ذکر کرتے ہیں، یہ اُن کی بہت بڑی بھول ہے، بہادری، جرأت و فہمندی کے ساتھ اصل چیز جو دیکھنے کی ہے وہ سپاہیوں سپہ سالاروں اور فاتحوں کا اخلاقی کردار ہے۔

بیت المقدس پر قبضہ جمانے اور فلسطین اور اس کے نواح میں یہودی حکومت قائم کرنے کے لیے انگریز اور امریکہ کے گٹھ جوڑ سے یہودیوں کی دراندازی اور سازشوں کا آغاز ہو چکا تھا، وہ دھڑا دھڑ فلسطین میں زمین خرید رہے تھے۔ مفتیٔ اعظم اس غرض سے ہندوستان آئے تھے کہ یہاں کے مسلمانوں اور مسلم ریاستوں سے خاطر خواہ مالی امداد مل جائے تو عربوں کے لیے بھی فلسطین میں جائداد اور اراضی مول لے کر یہودیوں کے مالکانہ تسلط کا توڑ کیا جائے۔ حیدر آباد دکن کے سوا انہوں نے ریاست جونا گڑھ کا بھی سفر کیا، بمبئی میں جلسے بھی ہوئے مگر میرے خیال میں تین چار لاکھ روپے سے زیادہ رقم فراہم نہ ہو سکی اتنے عظیم الشان منصوبے اور بین الاقوامی مسئلے کے لیے اتنی رقم ایسی ہی تھی جیسے "اونٹ کے منہ میں زیرہ"! مقابلہ یہودیوں کے سرمائے سے تھا جس کی پیشبندی اور مقاومت کے لیے کروڑوں روپے درکار تھے۔

لیڈروں، شاعروں، مولویوں اور پیروں کا یہ معاملہ ہے کہ شاندار سے شاندار کوٹھیوں، بنگلوں، ڈیوڑھیوں بلکہ محل سراؤں میں بھی ٹھہرنا ہوتا ہے۔ شاہانہ میزبانی اور امیرانہ آؤ بھگت! اور بعض اوقات بہت ہی معمولی قسم کے مکانوں اور فلیٹوں میں بھی قیام کرنا پڑتا ہے۔ بیچارے کم حیثیت لوگ اپنی حیثیت کے مطابق ہی مہمانداری کرتے ہیں۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی بھی کولسہ محلہ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے ایک عقیدت مند کے یہاں قیام پزیر تھے۔ راقم الحروف اور اُن کے خادمِ خاص مولوی عبدالرحیم اُن کے ساتھ تھے۔ مفتیٔ اعظم فلسطین عام طور پر شب میں دس بجے کے قریب مولانا بدایونی سے ملنے کے لیے تشریف لاتے۔ اور اسی کہنہ و تنگ فلیٹ میں چٹائی پر دیر تک بیٹھے رہتے۔ پانی کے جہاز سے روانگی ہوئی۔ ہم تینوں ڈیک کے مسافر تھے۔ حضرت مفتیٔ اعظم، مولانا عبدالقادر بدایونی کو رخصت کرنے

کے لیے بندرگاہ تشریف لائے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عام مسافروں کے ساتھ بنچ پر بیٹھے رہے۔ مولانا مفتی عبدالقدیر بدایوانی سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔

پاکستان بننے کے بعد حضرت مفتی اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں تشریف لائے۔ پان اسلامک کمیٹی کے بانی اور چیئرمین جناب عبدالمجید مرحوم نے جن سے میری بمبئی کی خاصی شناسائی تھی۔ مفتی اعظم کے اعزاز میں لنچ دیا مگر اُسی دن شہیدِ ملت نے مفتی اعظم کو اپنے یہاں بُلا لیا اور اس گفتگو نے اتنا طول کھینچا کہ مفتی اعظم تین بجے کے قریب بیچ لگژری ہوٹل پہنچ سکے۔ تمام مہمان اُن کی آمد کے منتظر تھے۔ ایک بجے کا کھانا تین بجے کے بعد سہ پہر کے قریب شروع ہوا۔ کھانے کے بعد مفتی صاحب مرحوم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا جس کا انہوں نے مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ اس کے بعد وہ کئی بار پاکستان آئے اور کسی نہ کسی دعوت، پارٹی اور اجتماع میں اُن سے شرفِ ملاقات کا مجھے موقع ملتا رہا۔ ایک بار مسجد باب الاسلام آرام باغ کے بالائی حجرے میں حضرت مفتی مولانا محمد شفیعؒ نے مفتی اعظم کو ناشتے پر مدعو فرمایا، میں بھی اُس مخصوص دعوت میں حاضر تھا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک طالب علم کی آٹوگراف بک میں عربی عبارت لکھی، حضرت مفتی اعظم نے اُسے پڑھا اور تحسین فرمائی۔

افریقہ اور یورپ کے سفر (۱۹۶۹ء) میں راقم الحروف بیروت بھی گیا اور سمندر کے کنارے ایک صاف ستھرے آرام دہ ہوٹل میں قیام کیا۔ پہلے دن ہی سے حضرت مفتی اعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا بے چین کیے ہوئے تھی۔ سیاحوں کی بس میں شہر کے خاص مقامات کی سیر کرنے کے بعد قالینوں کے ایک ڈپو میں ہمیں لے جایا گیا۔ ایک ایرانی کروڑوں روپے کی مالیت کے اس قالین محل کا تنہا مالک تھا۔ میں نے اس سے مفتی اعظم فلسطین کے مکان کا پتا پوچھا مگر وہ شخص انجان بن کر طرح دے گیا۔ ہوٹل کے کارپردازوں نے بھی ٹھکانے کی بات نہیں بتائی۔ پھر میں ایک دن کے لیے بعلبک اور دمشق چلا گیا، صبح کو روانگی ہوئی اور سرِ مغرب واپسی! شام میں البعث والوں کی جگہ اسلام پسندوں کی حکومت ہوتی تو میں دمشق میں دو تین دن ضرور ٹھہرتا۔ دمشق میں چند گھنٹے سیر ہی میں گزرے مگر دل اندر ہی اندر فشار سا محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے دن ایک ڈرائیور نے میری مشکل آسان کر دی۔ وہ حضرت مفتی اعظم کی

قیام گاہ تک سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے دونوں طرف کا جتنا بھی کرایہ مانگا، میں نے اس میں حیل حجت نہیں کی۔ راستے میں وہ مجھ سے بولا کہ مفتی کو پاکستان سے تنخواہ ملتی ہے یا امریکہ سے؟ میں نے جواب دیا کہ مفتیٔ اعظم اللہ کے فضل سے دولت مند شخص ہیں، انہیں کسی حکومت کی مدد کی کیا ضرورت ہے —— اس سے اندازہ ہوا کہ یہودی پروپیگنڈے میں کتنے مشاق ہیں اور بیروت میں رہ کر بھی فلسطین کا یہ مجاہد عالم دین اور اسلامی دنیا کا عظیم مفکر خطروں میں گھرا ہوا ہے۔

ڈرائیور خاصا مشاق اور چابکدست تھا ہوٹل سے روانہ ہونے کے بعد شہر کی گلی کوچوں کے پیچ و خم آئے پھر پہاڑی چڑھائی! مگر اس نے کار کی رفتار کو مدھم نہیں ہونے دیا مفتیٔ اعظم کی قیام گاہ شہر سے کئی میل کے فاصلے پر تھی۔ دروازے پر پہرے دار تھے مجھ سے پوچھا گیا کیا نام ہے، کہاں سے آئے ہو، مفتیٔ اعظم سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ میرا جواب مفتیٔ اعظم تک پہنچا دیا گیا۔ چند منٹ کے بعد دروازے کی آہنی رکاوٹ کو پہرے داروں نے اٹھایا اور مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ صحن سے گزر کر ڈرائنگ روم میں پہنچا، خاصا وسیع و عریض اور پُرشکوہ مکان، فرنیچر بھی مکان کے شایان شان! تھوڑی دیر کے بعد ملازم آیا کہ اندر چلیے، یہ مکان کا زنانہ حصہ تھا، وہاں مفتیٔ اعظم کے داماد حیدر الحسینی نے چند قدم بڑھ کر مصافحہ کیا اور ہم دونوں کچھ دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ یہودیوں کے تسلط، سازشوں اور ناپاک ارادوں کا ذکر آیا تو وہ بولے:

"you are talking of Palestine, Makka and Madina are under threat".

(آپ فلسطین کی بات کرتے ہیں، اجی حضرت! مکہ اور مدینہ کو خطرہ لاحق ہے)

پھر حضرت مفتیٔ اعظم تشریف لائے۔ میں سروقد تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ انتہائی شفقت کے ساتھ معانقہ فرمایا۔ میں نے حیدرآباد دکن، بمبئی اور کراچی کی ملاقاتوں کا ذکر کیا، بولے "I know you" پھر پوچھا آپ کب تک بیروت میں رہیں گے، میں نے عرض کیا کل جدہ کے لیے روانگی ہے، اس پر افسوس کرنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ وقت ہوتا تو اپنے یہاں بلاتے! پندرہ بیس منٹ بات چیت رہی، اثنائے گفتگو میں مولانا محمد جمال میاں فرنگی محلی کا ذکر آ گیا، ان کی بہت تعریف کی۔ پھر دریافت کیا آپ

شہر کس طرح جائیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ ٹیکسی میرے ساتھ ہے! اُن کو بھی سعودی سفارت خانہ اُسی وقت جانا تھا، مصافحہ کے بعد میں اپنی ٹیکسی میں بیٹھ گیا، اور وہ اپنی کار میں! کچھ دیر چلنے کے بعد ڈرائیور نے اشارہ پاکر ٹیکسی روک لی۔ حضرت مفتیٔ اعظم اپنی کار سے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور فرمایا کہ سعودی سفارت خانہ آنے تک آپ کا ساتھ رہے گا ـــــ اس قدر اعزاز و تکریم اور شفقت و محبت ؎

کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

جمال ناصر کا ذکر آیا تو میرے کان کی طرف جھک کر قدرے رازدارانہ انداز میں فرمایا: ------ He is a Man of ـــــ پھر بولے آپ میرے مہمان ہیں! سعودی سفارت خانہ کی عمارت کے صحن میں وہ ٹیکسی سے اتر گئے۔ اُن کے داماد حیدر الحسینی میرے ساتھ ہوٹل تک گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرے پاس سفر خرچ کے لیے پیسہ کی تنگی نہیں ہے۔ حضرت مفتیٔ اعظم نے ملاقات و گفتگو میں جو شفقت فرمائی ہے میرے لیے یہی سب کچھ ہے ـــــ بولے نہیں! مفتی صاحب نے جو کچھ زبان سے کہہ دیا ہے اس پر عمل کیا جائے گا۔ ہوٹل پہنچ کر ٹیکسی کا کرایہ بھی انہوں نے مجھے نہیں دینے دیا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت ہوٹل کے کارپرداز نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ مفتیٔ اعظم کے سکریٹری آپ کے تمام واجبات ادا کر گئے، ہوٹل سے آپ کا حساب بیباق ہو گیا۔ اُسی شام کے جہاز سے میں جدہ پہنچا وہاں ایرپورٹ پر احباب موجود تھے۔ مدرسہ صولتیہ کے نائب مہتمم مولانا محمد شمیم اپنے صاحبزادوں سمیت کار لے کر مکہ معظمہ سے تشریف لائے تھے! جماعتِ اسلامی کے رہنما چودھری غلام محمد مرحوم ان دنوں جدہ میں مقیم تھے۔ انہوں نے بھی میری عزت افزائی کی۔

اس بات کو ڈیڑھ سال ہوا، حضرت مفتیٔ اعظم کراچی تشریف لائے، انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں اُن کا قیام تھا، مولانا ظفر احمد انصاری کی معیت میں راقم الحروف ہوٹل پہنچا اور وہاں اُن سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ یہ حضرت مرحوم سے آخری ملاقات تھی۔ میں نے اُن کے داماد حیدر الحسینی صاحب سے کہا کہ حضرت مفتیٔ اعظم کا ملازم "برنادی" کہاں ہے۔ میں نے اُسے ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا، اتنے میں حضرت مفتی صاحب کا یہ قدیم وفادار بلکہ جاں نثار حبشی ملازم کمرے میں آگیا، اس سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ ہوا!

سید امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین کی صورت اتنی پاکیزہ اور جاذب و پرکشش تھی کہ بس دیکھتے ہی رہیے۔ اُن کی سیادت اور شرافت کی قسم کھائی جا سکتی تھی، صورت کی طرح سیرت بھی حسین، ظاہر و باطن میں اتنی یک رنگی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ اب سے پچاس برس پہلے انہوں نے فتنۂ یہودیت سے عالمِ اسلام کو آگاہ کر دیا تھا۔ مفتیٔ اعظم نے اس فتنہ کی روک تھام کے لیے برسوں جدوجہد کی، مگر وہ تنہا کیا کرتے۔ شروع شروع میں تو ان کے انتباہ کو شاید وہم ہی سمجھا گیا۔ پھر بیت المقدس کے سقوط اور یہودی حکومت کے قیام کا جو المیہ ظہور میں آیا اُس سے نہ صرف عربوں کو بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ کے عزت و وقار کو دھچکا لگا! مفتیٔ اعظم بھی گھر سے ——— بے گھر ہو گئے کئی برس قاہرہ میں اُن کا قیام رہا مگر جمال ناصر کا دورِ حکومت اُن کو ساز گار نہ آسکا، وہاں سے بیروت چلے آئے!

حضرت مفتیٔ اعظم بین الاقوامی شخصیت اور عالمی شہرت کے مالک تھے، یورپین طاقتیں اُن کی فراست کا لوہا مانتی تھیں بلکہ اُن سے چوکنا اور خوفزدہ رہتی تھیں کہ فلسطین سے متعلق مسائل کو نہ جانے وہ کب کس رُخ پر موڑ دیں۔

مفتیٔ اعظم کا جب بھی لاہور آنا ہوتا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ضرور ملتے، مولانا مودودی کی دینی و علمی خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کے وہ معترف و مداح تھے۔

حضرت مفتیٔ اعظم کی وفات نے تاریخ اسلام کے ایک روشن باب پر "تمت بالخیر" کی مہر ثبت کر دی۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں اُن کو اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۷۴ء)

مولانا محمد ایوب دہلوی

میں کئی سال دلی میں مقیم رہا، اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو دلی میرا وطن ثانی بن جاتا، مگر چار سال کی اس مدت میں مولانا محمد ایوب صاحب سے نہ تو کسی محفل میں ملاقات ہوئی اور نہ کہیں دور و قریب سے میں نے اُنھیں دیکھا۔ اُن کی زندگی توکل و قناعت کی زندگی تھی، اُن کا شمار دلی کے اکابر میں تو ہوتا تھا مگر مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالسلام اور خواجہ حسن نظامی کی طرح وہ مشہور نہ تھے۔

کراچی میں پہلی بار اُن کا نام سُنا اور یہ بھی کہ وہ کلامی انداز میں بڑی اچھی تقریر کرتے ہیں۔ اُن کی تقریر سُننے اور انہیں دیکھنے کا شوق مجھے بزرٹا لائن لے گیا۔ یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے، ایک کوارٹر میں لوگ جمع تھے، مُلا واحدی صاحب بھی تشریف فرما تھے، حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی سے پہلی بار وہیں نیاز حاصل ہوا اور ان کی تقریر سُنی۔ مولانا مرحوم کی تقریر نہ صرف دلپذیر بلکہ ایمان افروز تھی۔ پھر متعدد بار وہاں جانا ہوتا رہا۔ مولانا کی زیادہ تر تقریریں "حجیت حدیث" کے موضوع پر ہوتی تھیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ جن صاحب کے کوارٹر میں یہ اجتماع ہوتا تھا وہ خود منکرینِ حدیث کے سرغنہ مسٹر پرویز سے متاثر تھے۔ اس لحاظ سے مولانا کی تقریر بتکدے کی اذان تھی۔

ڈیڑھ دو سال کے بعد جگہ بدل گئی۔ یہ اجتماع پھر مشہور قومی شاعر جناب اسد ملتانی کے یہاں ہونے لگا۔ وہ مرکزی حکومت میں اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ جمشید روڈ پر ان کی کوٹھی تھی۔ یہاں حاضرین کی تعداد کسی کسی صحبت میں سو کے قریب ہو جاتی —— ایوب خاں جب پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اٹھا کر پنڈی لے گئے تو اسد ملتانی مرحوم کو بھی بادلِ ناخواستہ کراچی چھوڑ دینا پڑا۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات! نہ جاتے تو ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑتے، مگر راولپنڈی جاتے ہی بیمار پڑ گئے اور یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی —— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

پھر اس کے بعد اسد ملتانی مرحوم کے چھوٹے بھائی کے بنگلہ میں مولانا محمد ایوب دہلوی

کا وعظ ہونے لگا۔ ہفتہ میں ایک نشست حکیم محمد سعید صاحب چیئرمین ہمدرد ٹرسٹ کے یہاں بھی ہوتی تھی۔ مولانا مرحوم علم کلام، فلسفہ اور منطق میں خاص درک و بصیرت رکھتے تھے۔ اُن کے وعظ و تقریر میں کلامی رنگ غالب ہوتا تھا۔ نقل کے مقابلہ میں عقل اور روایت کے مقابلہ میں درایت کی زیادہ سے زیادہ جھلک! مولانا روم کا مقولہ ہے:

پائے استدلالیاں چوبیں بود

مگر مولانا محمد ایوب دہلوی کا پائے استدلال چوبیں نہیں فولادی تھا اور "بے تمکین" نہیں قوی و مستحکم تھا۔ میں نے اپنے بعض مضامین میں مولانا مرحوم کے دینی اور فلسفیانہ افکار سے استفادہ کیا ہے۔

مولانا محمد ایوب دہلوی کے وعظ و تقریر میں فلسفہ و منطق اور کلامی استدلال کے ساتھ ساتھ یقین و ایمان کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ دین و شریعت کی حقانیت و صداقت پر اُنہیں پورا پورا یقین تھا، اور دین کے کسی ادنیٰ جزیے یا فروعی مسئلے کے بارے میں بھی وہ مذبذب نہ تھے۔ وعظ کے درمیان جب وہ اپنے خاص انداز میں:

"اپنے اللہ کی تکبیر کرو اور اس کی بڑائی بیان کرو۔"

کہتے تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

اسلاف و اکابر سے وہ عقیدت رکھتے تھے مگر لکیر کے فقیر نہ تھے۔ بعض اوقات مشاہیر مسلم فلسفیوں اور اہلِ کلام کے دلائل کا رد کرتے ہوئے فرماتے کہ اس مسئلے میں میری یہ تحقیق ہے۔ کبھی اُن کی خود شناسی اور خود اعتمادی یہ رنگ بھی اختیار کر لیتی:

"میں جو یہ مسئلہ بیان کر رہا ہوں، آج تک کسی عالم اور فلسفی نے اس طرح بیان نہیں کیا ......"

لٹھے کا شرعی پاجامہ، ململ کا کُرتا، جس کا گریبان اکثر کھلا رہتا۔ وعظ کے دوران تھوڑے تھوڑے وقفے سے پان کھاتے، آواز خاصی پاٹ دار تھی اور لہجہ پُر وقار تھا۔

اپنی روزی قوتِ بازو سے خود کماتے۔ بندر روڈ پر اُن کی کپڑے کی دکان تھی۔ یہ کاروبار مندا پڑا تو تجارت کی لائن کو بدل دیا کپڑے کی بجائے سوٹ کیسوں کی دکان کر لی۔ کئی کئی گھنٹے جم کر دکان پر بیٹھتے، تین چار سال ہوئے لڑکی کی شادی کی تو دعوتِ طعام کا اہتمام شاندار پیمانے پر کیا۔

" حدیث دین میں حجت ہے "۔۔۔۔۔۔ اس موضوع پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی کتاب چھپ کر آئی تو دو تین مقامات پر مجھے کھٹک محسوس ہوئی۔ میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ ان عبارتوں کو بدل دینے کی ضرورت ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی بات کی تاویل نہیں فرمائی، چھوٹتے ہی بولے کہ آپ عبارت کو بدل دیجیے اور میری طرف سے اجازت ہے کہ میری تحریر میں جہاں کہیں بھی آپ ترمیم و اضافہ کی ضرورت محسوس کریں مناسب ہو تو بدل کر سکتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ یہ اُن کی عالی ظرفی، خُرد نوازی، بے نفسی، اخلاص اور حقیقت پسندی کی دلیل تھی۔

ذاتِ رسالت مآبؐ سے والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ " اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ " کی شرح و تفسیر میں حضورؐ کی سیرت و مناقب جب بیان کرتے تو اُن پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔

وعظ و تقریر میں ریاضی، فلکیات اور منطق کے علمی نکات بیان کرتے جاتے اور نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کی تشریح خاصے دل نشیں اور عام فہم انداز میں فرماتے یوں سمجھیے کہ اپنے نطق و طلاقت کے زور سے لوہے کو پانی کرنے کا فن اُن کو آتا تھا، پھر بھی مولانا مرحوم کے وعظ و تقریر سے وہی لوگ پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے تھے جو فلسفہ اور کلام سے مناسبت رکھتے تھے اور جن کا مطالعہ وسیع تھا۔ فکر و درایت اور برہان و استدلال کی ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ میلاد، قیام اور فاتحہ کے بارے میں حیرت ہے وہ نرم گوشے رکھتے تھے۔

حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی مرحوم کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی۔ گھر پر کسی صاحب نے ٹیلی فون کیا میں اس وقت موجود نہ تھا، ورنہ جنازے میں شرکت کی سعادت حاصل کرتا، غفر اللہ تعالیٰ و نور قبرہٗ!

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۷۰ء)

محمد باقر خاں

سنہ ۴۸ ۱۹ء کے آغاز میں جب چند مہینے ملتان میں میرا قیام رہا۔ ان دنوں محمد باقر خاں مرحوم سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آتے رہتے اور ان سے پہلا تعارف ملتان ہی میں ہوا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی، طبیعت میں انشراح پیدا ہوتا۔ وہ خوش خلق، ملنسار اور ہنس مکھ تھے! ملتان کے بعد بھی مرحوم سے سال میں ایک دو بار کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی۔ یہ ان کی محبت تھی کہ دفتر "فاران" اور غریب خانہ پر بھی راقم الحروف سے ملنے کے لیے کئی بار تشریف لائے اور اتنی سے کچھ اوپر سیڑھیاں چڑھنے کی زحمت گوارا کی۔

چار سال پہلے کی بات ہے ملتان میں "یوم حسینؓ" تھا۔ کراچی سے میں اور لاہور سے مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی اور جناب کوثر نیازی اس میں تقریر کرنے کے لیے بلائے گئے انہی کے نو تعمیر مکان میں ہم نے قیام کیا۔ مکان کی ساخت ہیئت اور اس کے رکھ رکھاؤ، غرض ہر چیز سے سلیقہ اور خوش ذوقی ظاہر ہوتی تھی۔

پارسال کراچی تشریف لائے تو مجھ سے جامع العلوم ملتان کے جلسہ میں شرکت کے لیے اصرار کیا۔ میں نے کہا مجھے بلانا ہے تو آموں کی فصل میں جلسہ کیجیے۔ اس پر وہ بے ساختہ مسکرا کر بولے، اچھا! ایسا ہی انتظام کیا جائے گا۔ یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔

تین مہینے پہلے یہ خبر سننے میں آئی کہ محمد باقر خاں پر فالج گرا ہے حالت نازک ہے۔ پھر اطلاع ملی کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ دماغ کا آپریشن ہوگا۔ انہیں ملتان سے لاہور لے جایا گیا۔ وہاں آپریشن ہوا اور اس آپریشن کو کامیاب بتایا گیا ——— مگر یہ ڈاکٹروں کی خوش اندیشیاں اور دوستوں اور عزیزوں کی دل خوش کن توقعات تھیں، مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس دنیا سے اِن کا دانہ پانی اٹھ چکا تھا، موت جو ہر جان کے لیے مقدر کی گئی، اس سے ان کو بھی دوچار ہونا پڑا، اور کل جن کے نام کے ساتھ سلمہٗ، مدظلہٗ اور زید مجدہ لکھا جاتا تھا، آج "مرحوم"، "مغفور" لکھا جا رہا ہے ——— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

محمد باقر خاں مرحوم جماعت اسلامی میں آنے سے پہلے کوآپریٹو سوسائٹی میں انسپکٹر تھے۔ فیض اسلام گریجویٹ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی سے قریب ہوئے، اپنے آبائی شیعی مذہب کو چھوڑا۔ یہاں تک کہ جماعت کے رکن بن گئے۔ انہوں نے ملازمت کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ تجارت کے لیے دیانت اور اعتماد کے ساتھ سرمایہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے انہیں ایسے لوگوں کا سرمایہ آسانی سے مل گیا جو مرحوم پر اعتماد کرتے تھے۔ تجارت اور لین دین میں ان کی دیانت اور خوش معاملگی نے ایک اچھی مثال قائم کر دی۔ سرمایہ لگانے والے نہ صرف ان سے خوش اور مطمئن رہتے بلکہ ان کا احسان مانتے۔

عائلی قوانین کی تشکیل و تنفیذ سے پہلے ہی وہ "تعددِ ازدواج" کے مسئلے میں اس (دفعہ) کی قانون شکنی کر چکے تھے۔ تین بیویاں تھیں، کثیر الاولاد تھے مگر مطمئن زندگی! حوصلہ کے آدمی تھے، کوئی پریشانی ہوتی تو اسے خاطر میں نہ لاتے اور مضطرب نہ ہوتے۔

جماعت اسلامی کے وہ نہایت پُرجوش اور مخلص کارکن تھے۔ ملتان کے حلقے کے تو وہ روحِ رواں تھے! چند سال پہلے جب بعض ارکان جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے لگے، تو محمد باقر خاں مرحوم بھی اس اضطراب اور ہل چل سے ہل گئے، مگر ان کی طبیعت میں ضد نہ تھی اور دین کے معاملے میں وہ شخصی آن بان کے بھی قائل نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں ثبات اور استقامت عطا فرمائی یہاں تک کہ دمِ واپسیں تک وہ جماعت سے وابستہ رہے۔

محمد باقر خاں مرحوم حق کے معاملے میں جری اور بے باک تھے، ایک بار ایسا ہوا کہ ملتان میں جماعت اسلامی کا جلسہ منعقد کرنے کے لیے جماعت کے کارکن نے متعلقہ مجسٹریٹ سے اجازت چاہی، ان صاحب نے تاؤ میں آکر اس قسم کی تلخ باتیں کہیں کہ یہ حلوے مانڈے کھانے والے یوں ہی وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔.... مرحوم کو جب اس واقعے کا پتا چلا تو وہ ضلع کے مقتدر حاکم سے جا کر ملے اور ان سے دو دو دو کہا کہ اگر ہم ایسی باتوں کے جواب میں یہ کہیں کہ یہ شراب پینے والے اور ناچنے گانے والے حکومت کو کیا چلائیں گے —— تو کیا آپ کو ناگوار نہ ہوگا! —— سچ کہا اقبالؒ نے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی | اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

محمد باقر خاں مرحوم کی موت سے جماعت اسلامی کو بڑا دھچکا لگا۔ جماعت کے لیے یہ نقصان ناقابلِ تلافی ہے، مگر دین کا کام رکے گا نہیں جسے ہم "ناقابلِ تلافی" سمجھ رہے ہیں، اس کی تلافی اللہ تعالیٰ فرمائے گا، یہاں تک کہ پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ و سربلندی نصیب ہوگی! حق کے قافلے کے اے مخلص مسافر، تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، تیرے بعد تیرے نقشِ قدم کو لوگ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں :-

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے | کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

(ماہنامہ "فاران" مارچ ۱۹۶۳ء)

علامہ محمد بشیر الابراہیمیؒ

الجزائر جن دنوں فرانسیسی استعمار کی گرفت میں تھا، اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے ان دنوں درسگاہیں ملک کے شہروں، قصبوں بلکہ دیہات تک میں قائم کر دی گئیں، اس تحریک کی زمامِ قیادت عبدالحمید بن بادیس کے دستِ حق پرست میں تھی۔ ان درسگاہوں نے الجزائر میں ایک طرف دینی روایات کی حفاظت کی، نئی نسل میں اسلامی جوش پیدا کیا اور دوسری طرف نوجوانوں میں آزادی کے جذبے کو بیدار کر دیا۔ عبدالحمید بن بادیس رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم محقق اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ استعمار دین و حریت کے اس داعی کو بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا، انہیں زہر دیا گیا اور اس شہادت نے ان کی آخرت کو فوز و فلاح سے ہمکنار کر دیا۔ محمد بشیر الابراہیمی انہی شیخ عبدالحمید کے دست راست تھے، اور ان کی شہادت کے بعد اس عظیم تحریک کی قیادت کا بارِ گراں انہی نے سنبھالا، وہ جمعیۃ العلماء (الجزائر) کے صدر بھی تھے، اور ہفت روزہ "البصائر" کے مدیر اعلیٰ بھی! علم و فضل، عزیمت و استقامت، جذبۂ جہاد اور تقویٰ نے ان کو نہ صرف الجزائر بلکہ اسلامی دنیا میں مشہور و محبوب بنا دیا تھا۔

حکومت فرانس کے جور و استبداد نے انہیں وطن سے باہر جانے پر مجبور کیا۔ الجزائر سے وہ قاہرہ آئے۔ انہیں توقع تھی کہ یہاں کی فضا میں ان کی حریتِ فکر کو کام کرنے کا موقع ملے گا، مگر مصر کی آمریت نے اس توقع کا گلا گھونٹ دیا اور وہ قاہرہ میں زیادہ دن تک نہ رہ سکے۔

علامہ مرحوم ۱۹۵۲ء میں پہلی بار پاکستان تشریف لائے اور دوسری بار ۱۹۵۴ء میں، کراچی کے مشہور ہوٹل میٹروپول میں قیام فرمایا۔ "فاران" کا "توحید نمبر" ان دنوں زیر ترتیب تھا، مولانا سعید اشرف جیلانی بہاری کی معیت میں راقم الحروف علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، علیک سلیک کے بعد تعارف ہوا، مولانا محمد عادل ندوی جو پاکستان

میں سعودی سفارت خانہ کے افسر رابطہ ہیں۔ وہاں موجود تھے، مولانا سعید اشرف پورے مجذوب، میں نیم مجذوب، قدوسی صاحب کی ترجمانی نے اس "جذب" میں سلوک پیدا کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجلہ شہریہ "فاران" کا "توحید نمبر" شائع ہونے والا ہے آپ اس کے لیے کوئی مقالہ عنایت فرمائیں۔ علامہ کی طرف سے متوقع جواب نہ ملنے پر میں نے ٹوٹی پھوٹی بلکہ غلط سلط عربی میں شدید اور طویل اصرار کیا، وہ مسکرانے لگے اور پھر مضمون لکھنے کی ہامی بھر لی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر علامہ نے اپنا مقالہ املا" (Dictate) کرانے کے بعد عادل قدوسی صاحب کو ترجمہ کے لیے دے دیا۔ جو بعد میں فاران کے "توحید نمبر" کی زینت بنا۔

علامہ کے قیام کراچی کے زمانے میں اُن کی خدمت میں بارہا حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس بڑھاپے میں وہ جوانوں سے زیادہ پرجوش اور فعال تھے، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کی فکر! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی حج سے واپس ہوئے تو ان کو لینے کے لیے ایئرپورٹ تشریف لے گئے، میں بھی اُن کے ساتھ تھا، عرب وداع و رخصت اور مصافحہ و معانقہ میں بڑے جوش بلکہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مولانا مودودی اس معاملے میں خاصے محتاط اور سنجیدہ ہیں۔ علامہ مرحوم نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "کیا مولانا مودودی اپنے بچوں کو دیکھ کر بھی نہیں مسکراتے۔" سفارت خانہ شام کے پریس آتاشی بھی اُن کے ہمراہ تھے

علامہ البشیر الابراہیمیؒ نے مولانا مودودیؒ کی بعض کتابیں جو عربی میں منتقل ہو چکی ہیں پڑھی تھیں۔ اس لیے وہ اُن کی دینی فکر، اسلامی بصیرت اور علم و فضل کے بے حد مداح و معترف تھے، جماعت اسلامی دین کے جس ہمہ گیر پروگرام کو لے کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں گامزن ہے، اس کے بھی وہ بہت بڑے قدر دان اور جوہر شناس تھے۔ علامہ کی ذات فکر و عمل کے اعتبار سے حسن البنا شہیدؒ اور مولانا مودودیؒ کی شخصیتوں کا سنگم تھی —— الجزائر آزاد ہو جانے کے بعد وہ اپنے وطن پہنچے، مگر وہاں ارباب اقتدار کا کچھ اور ہی رنگ پایا، ان سے ضبط نہ ہو سکا وہ بے اختیار پکار اٹھے:- "آزادی اس لیے حاصل نہیں کی گئی تھی کہ مغربی تہذیب اور اشتراکیت کے آزمائے ہوئے شیطانوں کو یہاں مسلط کیا جائے۔ آزادی اس لیے بھی حاصل نہیں کی گئی تھی کہ شخصی آمریت کا راج قائم ہو جائے آزادی تو اسلام کی خاطر حاصل کی گئی تھی اور اسلام یہاں (بالآخر) سربلند ہو کر رہے گا۔"

آمریت کلمہ حق کو گوارا نہ کر سکی، جور و استبداد کے راج میں حق گوئی سے بڑا کوئی جرم نہیں، اس جرم میں اس بوڑھے مجاہد کو نظر بند کر دیا گیا اور اسی عالم میں ان کو "رفیق اعلیٰ" کا بلاوا آگیا۔

سید محمد جعفری

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھا۔ وہاں سے اپنے وطن (کسیر کلاں ضلع بلند شہر) عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کے لیے آیا اور اس کے بعد دلی پہنچا، وہاں رام لیلا گراؤنڈ میں بڑے دھوم کا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں راقم الحروف کو بھی مدعو کیا گیا۔ اسی مشاعرے میں پہلی بار سید محمد جعفری کو دیکھا اور ان کا کلام سنا۔ میرے لیے یہ بالکل نیا چہرہ تھا۔ مشاعرے میں ان کی پہلی نظم (کلرک) پر داد وتحسین کا وہ شور برپا ہوا جیسے پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔ سامعین کے اصرار پر انہوں نے دو نظمیں اور سنائیں۔ ہر نظم کی طوفانی انداز میں پذیرائی ہوئی۔ سید محمد جعفری مشاعرے کے "فاتح شاعر" تھے۔ اس دن کے بعد ان سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو وہ کسی وقفہ کے بغیر ۳۴ برس تک جاری رہا۔ رفتہ رفتہ یہ میل جول بے تکلف یارانے میں تبدیل ہو گیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے بیسیوں شہروں میں مشاعرے ساتھ ساتھ پڑھے، ہوائی جہاز، ریل، موٹر کاروں اور بسوں میں سفر اور ایک ہی جگہ قیام! وہ باتیں کیا کرتے تھے پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے ان واقعات اور لطائف و ظرائف کو لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

سید محمد جعفری کی ظرافت نگاری خالص تعمیری اور اصلاحی تھی، وہ گدگدیاں کم کرتے تھے اور چٹکیاں زیادہ لیتے تھے۔ ان کی بعض نظمیں سن کر سننے والے یہ سوچتے تھے کہ یہ آئینہ کہیں ہمیں کو تو نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ "کلرک" اور "پرانا کوٹ" سید محمد جعفری کے دورِ شباب کی نظمیں ہیں مگر کامیاب ترین ہیں جن کا شاید ایک شعر بھی ناہموار اور بھرتی کا نہیں ہے ؎

شیطان راستے میں ملا کچھ سکھا دیا
اترا فلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا (کلرک)

اس شعر میں کتنی لطیف تلمیحات ہیں!

جگہ جگہ یہ پھیرا مثل مارکو پولو !
یہ کوٹ کو ووٹس کا لیڈر ہے اس کی جے بولو!

ان کی اس نظم (کوٹ) کا ایک مصرع ہے ؎
کہ آفتاب چرا لے گیا ہے رنگت کو

کس قدر نازک صناعی ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں مصوّر کے ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑتا ہے۔
مرحوم نے اپنی ایک نظم میں عجیب و غریب تشبیہ استعمال کی ہے جو اردو شاعری کی صنعت تشبیہ و تمثیل میں حسین اضافہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

ایبسٹریکٹ آرٹ (Abstract Art) سید محمد جعفری کی مشہور و مقبول نظم ہے جو "تجریدی آرٹ" پر بھرپور طنز ہے۔ کسی آرٹسٹ نے ایک عورت کی تصویر بنائی تھی جس کے تجریدی خطوط اور زاویے کچھ اس طرح کے تھے ؎
میں یہ سمجھا تھا انناس ہے عورت نکلی

علامہ اقبالؒ کی نظموں کی جعفری نے پیروڈی کی ہے مگر اس چابکدستی کے ساتھ:
لاہور میں نہیں ہے رہنے کا بھی سہارا
چین و عرب ہمارے ہندوستاں ہمارا
ایسا مکاں ملا ہے چھت جس کی آسماں ہے
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

"گوشت کی ہڑتال" کا ایک شعر ہے ؎
شب کو چڑیوں کے بسیرے بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

"فری ورس" کا سید محمد جعفری نے خوب خاکہ اڑایا اور اس کی کمزوریوں کو گنایا۔ یہ نظم "آہ! اونٹ" پر ختم ہوتی ہے۔ یہ نظم نئی نسل کے نومشق شاعروں کو روشنی دیتی ہے کہ قافیہ و ردیف اور وزن سے بے نیاز تک بندی اردو شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیسے کیسے نازک فلسفیانہ مسائل وزن، بحر اور ردیف و قافیہ کے حدود میں رہ کر نظم کیے ہیں۔ "آزاد نظمیں" اردو شاعری کے ساتھ مذاق ہیں۔

"وزیروں کی نماز" نوابزادہ لیاقت خاں مرحوم کے دور کی نظم ہے جس میں وزیروں کے غرض پرست ہوا خواہوں کی نیازمندی پر لطیف طنز کی ہے، ایوب خاں کے دورِ حکومت کی بلیک ڈیماکریسی، کو بھی اچھوتا نہیں رہنے دیا۔ اس دوشیزہ کو بھی جعفری نے بے نقاب کر دیا۔ پھر انہوں نے دو برس پہلے جو نظم کہی اس میں اس مشہور مصرع ؎

یارب مجھے معاف کرو میں نشے میں تھا

کی اس قدر حسین انداز میں تضمین کی کہ سننے والے تڑپ اٹھے جیسے ان کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

سید محمد جعفری نے مسکراہٹوں کے ہجوم میں تعمیر و اصلاح کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ سید محمد جعفری صحتِ زبان کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی شاعری ان اجزا سے عبارت ہے جو اجزا شاعری کے ضروری اور حسین لوازم ہیں۔

تسامحات سے کوئی شاعر و ادیب محفوظ نہیں ہے۔ سید محمد جعفری کی شاعری میں بھی تسامحات ملتے ہیں مثلاً یہ کہ کئی جگہ "زیادہ" (بروزن لبادہ فعولن) کو انہوں نے "زادہ" (بروزن سادہ فعلن) نظم کیا ہے۔ میں نے کئی بار ٹوکا بھی مگر انہوں نے میری گزارش کو ناقابلِ التفات سمجھا۔ ان کے یہاں متعدد مصرعوں میں "الف" اور "ی" دبتے ہوئے ہیں اس حد تک کہ ذوقِ صحیح کھٹک محسوس کرتا ہے! ان کی ایک نظم "بھنگیوں کی ہڑتال" ہے! جس کا ایک مصرع ہے:

آج کل دلی میں بھنگی تال ہے

اس نظم میں جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں، اس شعر میں بڑے سلیقے سے کہہ دی ہے۔

ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی — سانس کھینچے ہیں مگر منہ لال ہے

لیکن اطناب و تفصیل میں یہاں تک پہنچ گئے۔

آ گیا ہے اب تو رُک سکتا نہیں — اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے
......سیٹھ جی! — جیسے دھوتی میں بہت کچھ مال ہے

اور اس پر یہ مصرع:۔

رفع حاجت بھی بڑا جنجال ہے

میں نے جعفری صاحب سے کہا کہ اس نظم کے یہ دو تین شعر آپ نہ پڑھا کریں، انہیں سن کر

ذہن اچھا اثر قبول نہیں کرتا غلاظت کی طرف خیال جاتا ہے مگر شاید ٹوکنے سے ان کی طبیعت میں ضد پیدا ہوگئی تھی، ان مصرعوں کو انہوں نے حذف نہیں کیا، پوری نظم خوب جھک کر سناتے، اس نظم کا یہ شعر:

ایک بھنگن سے پولس والا پٹا   واہ! کیا انگریز کا اقبال ہے

انگریز کی بداقبالی کا عکاس و ترجمان ہے!

ان کے ایک مصرع کا قافیہ "دن وے ــــ (One way) ساقی تھا میں نے کہا دوسرا مصرع پھس پھسا ہے "رن وے ــــ (Run way) قافیہ لائیے تو پھر شعر لطف انگیز اور جاندار ہو جائے گا۔

تہران سے پاکستان آنے کے بعد انہوں نے چند نظمیں کہیں لیکن وہ اُن کے معیارِ شاعری سے فروتر تھیں مگر پھر وہ سنبھل گئے۔ گزشتہ سال دو تین نظمیں سنائیں وہ خوب تھیں۔

سید محمد جعفری ریاست بھرت پور میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام سید محمد علی جعفری تھا۔ ۱۹۵ء میں انہوں نے ایم۔ اے کیا۔ وہ ڈبل نہیں ٹریپل ایم۔ اے تھے۔ فلسفہ، تاریخ اور اکنامکس میں، لاہور کالج کے برسوں پرنسپل رہے۔ اس کالج کا سنگ بنیاد امیر حبیب اللہ خاں والی کابل نے رکھا تھا۔ بڑے وسیع الخیال شیعہ بزرگ تھے۔ سنجیدگی اور متانت کی جیتی جاگتی تصویر! مجھے ان سے شرف نیاز ۱۹۵۲ء میں حاصل ہوا جب سید محمد جعفری اول میں ڈھاکہ کے مشاعرے سے لاہور پہنچے۔ اُن کے والد مولانا مودودی کے مداح تھے۔ فرماتے تھے میں مولانا مودودی سے ملنے کے لیے کبھی کبھار اچھرہ جاتا ہوں۔

وہ جو عربی کی مشہور ضرب المثل ہے "الولد سر لابیہ" تو سید محمد جعفری بھی فارسی اور انگریزی کے ایم۔ اے تھے۔ کچھ دنوں لائل پور کے کالج میں لیکچرار بھی رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جرنلسٹ کی حیثیت سے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ان کا تقرر ہوا، پھر ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد دہلی سے منتقل ہو کر کراچی آگئے۔ مسٹر تاج الدین عباسی مرحوم اس محکمہ کے جوائنٹ سیکرٹری تھے ان سے کسی مسئلے میں تند و تیز گفتگو ہوگئی۔ آغا سرخوش قزلباش نے اس واقعے کا مجھ سے ذکر کیا اور کہا سید محمد جعفری بڑے خوددار ہیں وہ تم سے اس معاملے میں مدد نہیں چاہیں گے۔ میں نے سنا ہے عباسی صاحب سے تمہاری جان پہچان ہے تم کچھ تگ و دو کرو۔ دتاج الدین عباسی جب یوپی میں محکمہ زراعت کے ڈائرکٹر تھے تو میں ان دنوں حیدرآباد دکن

یہ ایک مشاعرے میں کان پور آیا تھا۔ عباسی صاحب نے مجھے جلسے پر مدعو کیا۔ ان سے بس اتنی سی شناسائی تھی مگر میں ان کے دفتر میں جا کر ملا تو بڑے تپاک کا مظاہرہ کیا۔ سید محمد جعفری کے واقعے کا میں نے باتوں باتوں میں ذکر نکالا، اسی کام کے لیے تو میں ان کے دفتر میں گیا تھا اس کے بعد بات وہیں ٹھپ ہو کر رہ گئی اور وہ تلخی اور خلش جاتی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ــــــ اس ملاقات کا یہی مقصود تھا۔

جعفری مرحوم فرض شناس، ذہین اور محنتی عہدے دار تھے۔ ان ہی صفات کی بدولت اپنے محکمے میں ترقی کر کے ڈپٹی پرنسپل آفیسر ہو گئے۔ پھر کلچرل اٹیچی کی حیثیت سے حکومت پاکستان نے انہیں ایران بھیجا کئی برس وہاں کے سفارت خانہ میں کارگزار رہے۔ تہران سے انہوں نے مجھے شہرۂ آفاق خطاط عماد الحسینی کے مخطوطے کا عکس بھیجا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو شعر بھی!! سید محمد جعفری کا خط نہایت دیدہ زیب اور پاکیزہ تھا۔ انہوں نے اپنی بہت سی نظمیں خوشخط لکھی تھیں جن کے بلاک بنوا کر کلیات کی صورت میں چھپوانا چاہتے تھے مگر یہ کام ادھورا رہ گیا اور ان کی شاعری کی کتاب چھپنے سے پہلے خود ان کی کتابِ زندگی پر قدرت نے "تمت بالخیر" کی مہر لگا دی، رہے نام اللہ کا!

جعفری باغ و بہار آدمی تھے۔ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ میں نے انہیں کبھی غمگین اور فکرمند نہیں دیکھا۔ کسی دوست اور عزیز کی پریشانی کی خبر ملتی تو بے چین ہو جاتے۔ سوسائٹی میں قرض لے کر کوٹھی بنائی جب مکان بن چکا تو بولے اس کا نام "بیت المقروض" موزوں رہے گا۔

۱۹۴۵ء کا ذکر ہے۔ سید محمد جعفری بمبئی کے "کل ہند مشاعرے" میں شریک ہوئے۔ میں ان دنوں فلمی گانوں کے سلسلے میں بمبئی میں مقیم تھا وہ اور میں ایک دن میرن ڈرائیو سیر کرنے کے لیے گئے، وہیں جدن بائی کا مکان تھا، جعفری صاحب محفلوں میں اس لطیفہ کو بیان کیا کرتے تھے کہ اس ماہر نے جدن بائی کے مکان میں مجھے تو نرگس کی نانی کے پاس بٹھا دیا اور خود نرگس سے گفتگو میں محو ہو گیا۔

ایک مرتبہ سید محمد جعفری دفتر میں کھانا کھا رہے تھے اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے چپراسی سے کہا کہ دیکھو کس کا فون ہے؟ چپراسی نے ریسیور اٹھا لیا مگر کچھ بولا نہیں؟ جعفری صاحب بولے خاموش کیوں ہو بتاتے کیوں نہیں کس نے فون کیا ہے۔ یہ

فون سید محمد جعفری کے گھر سے آیا تھا۔ چپراسی احترام کے لہجے میں بولا :

" سرکار! زنانی سواری "

سید محمد جعفری ناظم آباد کی چورنگی سے متصل رضویہ کالونی میں دو ڈیڑھ برس رہے اُن کے مکان کے قریب ہی امام بارگاہ تھا جہاں اکثر مجلسیں ہوتی رہتی تھیں۔ جعفری نے اس پر ایک شعر کہا۔

رفتہ رفتہ واقفِ علمِ لدُنی ہو گیا   مجلسیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ سنی ہو گیا

وہ اُمتِ مسلمہ کی وحدت و اتحاد کے قائل تھے اُن کی دلی تمنا تھی کہ مسلمانوں کے فرقے ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں۔ نماز کا وقت آتا تو وہ ہمارے ساتھ باجماعت نماز میں بھی شریک ہو جاتے ——— شاعروں میں ان سے زیادہ وقت کا پابند میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اس اچھی عادت کی بدولت انہیں پریشانی بھی اٹھانی پڑتی۔ کسی دعوت یا بزمِ شعر و سخن میں انہیں بلایا گیا، شب میں سات بجے کا وقت مقرر ہوا جعفری صاحب ٹھیک سات بجے وہاں پہنچ گئے مگر دعوت یا مشاعرے کا آغاز دس بجے ہوا۔ تین گھنٹے جعفری صاحب کو انتظار کرنا پڑا۔

سید محمد جعفری کئی برس سے دل کے مریض تھے تین ماہ قبل دل کا شدید دورہ پڑا اور امراضِ قلب کے ہسپتال میں داخل ہو گئے، وہاں خاصا معقول علاج ہوا ان کے انتقال سے دس بارہ دن پہلے اسمٰعیل احمد صاحب تسنیم مینائی، سید احمد میرٹھی اور میں بیمار پرسی کے لیے ان کے یہاں پہنچے۔ جعفری صاحب دھوپ میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے اب میں اللہ کے فضل سے اچھا ہوں۔ ڈاکٹر شفقت صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ نہاری پائے، کباب خوب کھاؤ۔ مرغوب کھانوں سے تمہاری کمزوری دور ہو گی مگر دوا اور غذا کیا کرتی اُن کا وقت آ چکا تھا۔ چند دن کا افاقہ یا سنبھالا " افاقۃ الموت " ثابت ہوا۔ ایک دن نماز پڑھنے کے بعد تنفس تیز ہو گیا یہاں تک کہ وہ بول بھی نہ سکے پھر ذرا سی دیر میں نبضیں ساقط ہو گئیں سانس رک گیا اور یہ چہکتا ہوا بلبل ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(ماہنامہ فاران، فروری ۱۹۷۶ء)

منشی محمد خلیلؔ

علم و ادب اور صحافت کی دنیا کے لیے بالکل نیا اور اجنبی نام! اور وہ اس لیے کہ مرحوم نہ مصنّف تھے۔ نہ عالمِ دین تھے اور نہ "سیاست" کی اصطلاح و زبان میں "قومی ورکر" تھے۔ دین کی خدمت ان کی زندگی بن کر رہ گئی تھی ——— مگر نام و نمود سے ہمیشہ بے نیاز بلکہ متنفر رہے، اس کی کبھی تمنا ہی نہیں کی کہ کوئی انہیں جانے اور ان کی دینی خدمت کا چرچا اور ذکر کیا جائے۔ بے نفسی اور للٰہیت میں آپ اپنی مثال ہیں ——— چھیانوے سال کی عمر پائی مگر اس پیرانہ سالی کے باوجود میلوں پیدل چل کر اشاعتِ قرآن اور قیامِ صلوٰۃ کے لیے جدوجہد کرتے ——— دن رات مِلّت اور مسلمانوں کی اصلاح کی لگن، کیسی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو، ادائے صلوٰۃ کے لیے مسجد اور جماعت کا اہتمام کرتے۔ چہرہ پرنور! انہیں دیکھ کر ان کی صحبت میں رہ کر اللہ تعالیٰ کی یاد دل کو حرکت دیتی تھی۔ یہ ان کی پاکیزہ نفسی کی دلیل تھی کہ مجھ جیسے گنہگار شخص سے انتہائی شوق و محبت کے ساتھ ملتے۔ ایک بار بڑی دردمندی کے ساتھ فرمایا:

"ماہرؔ صاحب! اس "اپوا" (A. P. W. A) کا کوئی توڑ بتائیے۔"

پاکستان میں مغرب زدگی، عورتوں کے فتنۂ بے حجابی اور تبرّجِ جاہلیۃ کو جو فروغ ہو رہا ہے اس کا انہیں بہت دُکھ تھا۔

انگریزی دَور میں محکمہ ڈاک میں (غالباً) آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۲۵ سال تک پنشن پاتے رہے۔ اب سے تقریباً ستر سال پہلے اُس دَور کے سب سے بڑے شیخ حضرت فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا شاہ عین القضاۃ صاحب اور دوسرے اکابر کی صحبتوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے ساتھ دنیا کی نعمتوں سے بھی نوازا، ان کے صاحبزادے مولوی محمد جمیل صاحب پاکستان میں ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہ چکے ہیں اور وہ بھی کئی سال سے پنشن پا رہے ہیں۔ کوٹھی، بنگلہ، موٹر، نوکر، ہر طرح

کا آرام و راحت اللہ تعالیٰ نے دے رکھا تھا مگر وہ اس امیرانہ ماحول میں بھی درویش صفت رہے۔ گھر میں ایک چھوڑ دو دو موٹریں لیکن وہ ہیں کہ مسجدوں اور دینی مدرسوں تک پیدل چل کر پہنچ رہے ہیں۔ اسی دینی شغف کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان تینوں[1] بزرگوں کے لیے ہم دعائے مغفرت کرتے ہیں کہ نیک سے نیک مسلمان کے لیے بھی دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ انبیائے کرام بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، مگر ساتھ ہی دل کہتا ہے کہ ان جیسے نیک لوگوں اور اہل اللہ کی مغفرت اگر مشتبہ اور مشکوک ہو تو پھر ہم جیسے گناہگاروں کو تو نجات و مغفرت سے مایوس ہو جانا چاہیے!

لیکن

بڑے بڑے گناہ کے بعد بھی مسلمان اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے مایوس نہیں ہوتا۔ ہم بھی اُسی کی رحمت کی آس لگائے ہوئے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ اُس غافر الذنوب کی رحمت ہمارے گناہوں کو ڈھانپ لے گی! (اِن شاء اللہ العزیز)

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۶۵ء)

---

[1] اسی پرچے میں مولانا ماہر القادریؒ نے علامہ محمد بشیر الابراہیمیؒ اور مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کے ارتحال پر بھی اپنے تاثرات قلمبند کیے تھے۔ تینوں بزرگوں سے مولانا ماہر القادریؒ کی مراد منشی محمد خلیلؒ کے علاوہ یہی دونوں بزرگ ہیں۔ ان کے حالات حروفِ تہجی کے اعتبار سے اپنی اپنی جگہ پر جلد اوّل اور دوم میں شامل ہیں۔ (طالب ہاشمی)

علاّمہ محمّد خلیل عرب

علامہ محمد خلیل عرب کا نام تو سنا تھا مگر انہیں دیکھنے کا اتفاق سیرت النبیؐ کے ایک جلسہ میں ہوا، یہ اب سے کوئی تیرہ چودہ سال پہلے کی بات ہے، اس جلسہ میں علامہ کی تقریر بھی سُنی، مگر گفتگو کا موقع نہ مل سکا، میں اپنی نعتیہ نظم پڑھنے کے بعد چلا آیا۔ اس کے بعد دو تین بار اُن سے تعارف و ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک ملاقات میں درس نظامی سے ہٹ کر نئے انداز پر عربی پڑھنے پڑھانے کا ذکر آیا اور اس کے بعد علامہ خود غریب خانہ پر تشریف لے آئے، عربی نصاب کی کتاب بھی اُن کے ساتھ تھی، ہاتھ کے ہاتھ پڑھائی شروع ہو گئی! چند دن کے بعد جناب ظفر احمد انصاری صاحب کے مکان پر صاحب موصوف، سید حسن ریاض صاحب اور راقم الحروف کا جماؤ ہونے لگا، بلکہ یوں سمجھیے چھوٹا سا "مکتب" قائم ہو گیا۔ علامہ بڑی شفقت کے ساتھ درس دیتے، اس دھن میں اُن کی پوری عمر گزری تھی، طلباء میں عربی زبان وادب کی استعداد پیدا کرنے کا انہیں بڑا ملکہ اور تجربہ تھا۔ طلباء کی کمزوریوں سے بھی وہ باخبر تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سال یہ سلسلہ جاری رہا، جو آخر زمانے میں کلیلہ دمنہ، مقدمہ ابنِ خلدون؛ اور ریاض الصالحین تک پہنچ گیا، پھر وہ اپنی پیرانہ سالی کے باعث آنے جانے میں بڑی زحمت محسوس کرنے لگے، بڑھاپا اور اُس کے ساتھ بہت سے امراض، اس حالت میں کراچی کی لبسوں میں سفر، یہ مرحلہ بڑا سخت تھا، ہر ہفتہ ناغہ کی نوبت آنے لگی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ بند ہو گیا، ان کے سجادہ کو مولانا سعید اشرف صاحب ندوی نے سنبھالا، مگر علامہ مرحوم کا وہ عالم صحو اور مولانا کا یہ سُکر اور نیم مجذوبیت! تقریباً ایک سال اُن سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ اُور مقاماتِ بدیع الزماں ہمدانی اور عربی کے قصائد درس میں رہے۔

کراچی کی زندگی مشینی زندگی بنتی جارہی ہے اور بقول علامہ اقبالؒ:۔

؎ احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

ہر شخص اپنے معاملات میں الجھا ہوا ہے، اور دور دراز کے فاصلے، کام زیادہ، فرصت کم ---! راقم الحروف ہی کی بدتوفیقی ہے کہ علامہ کی خدمت میں بہت دنوں سے حاضر نہ ہو سکا، اُن کی علالت کی خبریں ملتی رہیں، اور ساتھ ہی یہ مژدہ بھی کہ وہ اب اچھے ہیں۔

ایک دن جمعہ کی نماز کے بعد گھر آیا، تو ٹیلی فون پر آیا ہوا یہ پیام ملا کہ علامہ خلیل عرب کا انتقال ہو گیا، پیر الٰہی بخش کالونی کی فلاں مسجد میں ایک بجے نمازِ جنازہ ہو گی، میں جب گھر پہنچا ہوں تو تین بج چکے تھے، اور اُس وقت علامہ آسودۂ لحد ہو چکے تھے!

علامہ مرحوم یمن کے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، متحدہ ہندوستان میں ریاست بھوپال علامہ کے بزرگوں کا دارالافادہ رہا ہے، علامہ خلیل عرب نے ندوہ (لکھنؤ) کی مشہور درسگاہ میں بھی معلمی کے فرائض انجام دیے ہیں، مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ کا اسمِ گرامی بھی اُن کے شاگردوں کی فہرست میں آتا ہے! لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی علامہ شعبۂ عربی کے صدر رہے ہیں۔

علامہ خلیل عرب عربی زبان و ادب کے مستند عالم تھے، جن کی زبان دانی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اُن کی بڑی صاحبزادی رقیہ بیگم نہ صرف عالمِ دین ہیں بلکہ فنِ حدیث میں "اختصاص" کا درجہ رکھتی ہیں، چھوٹی لڑکی عطیہ بیگم بھی عربی داں ہیں اور اُردو کی اچھی مضمون نگار ہیں۔ علامہ سلفی المذہب تھے۔ توحید کے معاملے میں بڑے غیرت مند! افسوس ہے کہ پاکستان میں ان کی قدر نہیں ہوئی۔ معاشی حالات ایسے تھے کہ تنگی ترشی سے گزر ہوتی تھی، مگر اس کشمکش کے باوجود مزاج میں خشونت پیدا نہیں ہوئی، ان کی زندہ دلی کو دیکھ کر راقم الحروف "مزاح" کی جرأت بھی کر بیٹھتا، اور وہ اس میں لطف لیتے۔ ان کے ساتھ مشرقی وضعداری، عربی شرافت اور علمی و دینی وجاہت کا ایک دَور ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۶ء)

مولانا محمد سلیم کیرانوی ثم مکیؒ

افسوس ہے کہ چالیس پچاس برس پہلے کے جن واقعات، تجربات اور مشاہدات سے میری زندگی گزری ہے، اُن کے سنہ اور سال حافظہ میں محفوظ نہیں رہے۔ اس وقت اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی "وفیات"، کو یادِ رفتگاں کے عنوان سے رقم کرنے کا حسرتناک فرض مجھے مستقبل میں انجام دینا پڑے گا! ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں مولانا محمد سلیم کیرانوی سے دِلّی میں سب سے پہلے ملاقات ہوئی۔ قرول باغ میں ماہنامہ "ندائے حرم" کا دفتر تھا، اُسی میں مولانا مرحوم نے احباب کی دعوت کی۔ کھانوں میں لذت کے ساتھ تنوع اور مزہ دے گیا! مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی، پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی اور غالباً مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی شریکِ طعام تھے۔ دوسرے شرکاءِ دعوت کے نام تو کیا، اُن کے چہرے بھی لوحِ یادداشت سے محو ہوگئے۔ دعوت میں شعراء کو شعرخوانی ہی کے لیے بلایا جاتا ہے ــــ کھانے کے بعد راقم الحروف نے اپنا کلام سنایا، ہر غزل کے بعد "ایک اور" کی فرمائش! مولانا محمد سلیم کا داد دینے کا انداز بتا رہا تھا کہ اونچے درجہ کے صاحبِ ذوق اور شعر فہم ہیں: میرے سطحی اور معمولی شعروں پر وہ خاموش رہتے اور جو اشعار انہیں پسند آتے، اُن کی خوب جھوم کر پاٹ دار آوازمیں داد دیتے۔ داد وستائش کے ساتھ لطف انگیز فقرے بھی چست فرما دیتے کسی کسی شعر کی معنویت کی طرف عالمانہ انداز میں اشارہ بھی۔ اس کے بعد اُن سے کئی بار ملاقات کی مسرت بلکہ یوں کہیے سعادت حاصل ہوئی! پھر زمانہ گزرتا گیا یہاں تک کہ ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آگیا۔

دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

مگر "طربیہ" بے خلش نہیں رہا، احباب اور عزیز متفرق ہوگئے۔ بھرے پُرے گھر بار، چلتے ہوئے کارخانے اور دکانیں، لگے ہوئے روزگار، سرسبز کھیتیاں اور لہلہاتے باغ چھوڑنا پڑے۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا ہے
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

مگر یادِ وطن کو ہم "ہجرت نصیبوں" نے دھتکار دیا۔ لاکھوں مسلمانوں کو آگ اور لہو کے دریا سے گزرنا پڑا اُس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ پاکستان کے لیے عزت و عصمت اور جان و مال کی اتنی جاں گداز قربانیاں دینی پڑیں گی۔ یہی وہ نازک مقامات ہیں جہاں تدبیر کو تقدیر کے سامنے سپر انداختہ ہونا پڑتا ہے۔

ہندوستان کے قریب قریب ہر صوبہ میں میرے جاننے والے اور شناسا تھے پاکستان آنے کے بعد برسوں کسی کی خیر خبر نہیں ملی۔ راقم الحروف کے ہلاک ہونے کی خبر بھارت کے کسی اخبار میں چھپ گئی! میری ادارت میں "فاران" کی اشاعت اس خبر کی تردید تھی!

سنہ ۱۹۵۴ء میں اللہ تعالیٰ نے حج بیت اللہ کا بندوبست فرما دیا۔ مکہ مکرمہ میں پہنچنے کے بعد شب میں عمرہ کی سعادت حاصل کی اور صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر مدرسہ صولتیہ پہنچا۔ مولانا محمد سلیم مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے، مصافحہ اور معانقہ کے بعد شستہ اردو میں اُن کے محبت آمیز فقرے سامعہ نواز تھے، جب تک مکہ مکرمہ میں اس گنہگار کا قیام رہا، عصر کی نماز حرم شریف میں پڑھنے کے بعد اُن کی ——— خدمت میں حاضر ہوتا، چائے کے بعد مولانا مرحوم انڈونیشیا کے پان کا بیڑا عطا فرماتے۔ اُن کے صاحبزادے محمد شمیم اپنے محترم والد کی طرح متواضع اور "الولد سرٌ لابیہ" کا صحیح مصداق! وہ اپنی کار میں جنت المعلیٰ لے گئے! میری ڈاک مدرسہ صولتیہ کی معرفت آتی تھی، شمیم صاحب حاجیوں کے خطوط بڑی حفاظت سے رکھتے! ابھی تک حرم شریف کی توسیع و تعمیر کا آغاز نہیں ہوا تھا، مدرسہ صولتیہ کا دفتر حرم شریف سے ملحق و متصل تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد ——— اس دفتر میں بڑا آرام ملتا۔ مولانا محمد یامین صاحب اس کے انچارج تھے۔

سنہ ۱۹۶۹ء میں پھر قسمت نے یاوری کی۔ راقم الحروف جنوبی اور مشرقی افریقہ اور یورپ کے سفر کے بعد پھر اس ارضِ مقدس میں حاضر ہوا۔ حضرت مولانا محمد سلیم مرحوم کو جدہ پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی، اُن کے صاحبزادے مولانا محمد شمیم مکہ مکرمہ سے کار لے کر جدہ آئے۔ مطار جدہ پر دوسرے احباب بھی موجود تھے۔ جماعت اسلامی کے قیم چوہدری غلام محمد مرحوم اُن دنوں جدہ میں مقیم تھے انہوں نے بھی جدہ ایرپورٹ آنے کی زحمت گوارا فرمائی اور میری عزت افزائی کی! اب کی بار مدرسہ صولتیہ ہی میں راقم الحروف کا قیام رہا۔ مولانا محمد سلیم مرحوم کی میزبانی میں اخلاص و محبت کے ساتھ کشادہ دلی

اور سیرچشمی بھی شامل تھی۔

تیسری بار ۱۹۷۶ء میں زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت میسر آئی اور مدرسہ صولتیہ میں مولانا مرحوم کا مہمان رہا۔ رمضان کا مہینہ تھا رات کے کھانے اور سحری میں لذیذ کھانے ہوتے۔ وہ میرے لیے دودھ جلیبی خاص طور سے سحری میں بھجواتے! دن کی گرمی میں پیاس نہ لگنے کے لیے یہ اہتمام تھا۔ حضرت مولانا محمد سلیم اب بڑھاپے کے اس دور میں تھے جب قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں! مدرسہ صولتیہ کا تمام کام مولانا محمد شمیم کو سونپ دیا۔ اُن کی حیثیت اب ایک سرپرست اور بزرگ مُشیر کی تھی! مگر ضعف پیری کے باوجود ان کی بذلہ سنجی، تبسم و قہقہہ اور شعر و ادب میں نکتہ آفرینی کا وہی عالم تھا۔ آواز پہلے کی طرح پاٹ دار تھی۔

ایک مہینہ ہوا تیسرا یا چوتھا رمضان تھا، ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور پانیر آرمس کے مالک حاجی فریدالدین الوجیہہ نے یہ غم انگیز خبر سنائی کہ مکہ معظمہ میں مولانا محمد سلیم کا انتقال ہوگیا۔ اس خبر نے دماغ کو متوحش اور دل کو مضطرب کر دیا۔ عقل نے کہا بڑھاپے کے بعد کی منزل موت ہی ہے۔ یہ کوئی نئی اور انہونی بات نہیں ہے مگر عقل کی یہ توجیہہ دل کے اضطراب کو دُور نہ کرسکی۔

مولانا محمد سلیم عالم دین تھے، اردو کے ادیب و انشا پرداز اور شعر و ادب کے دیدہ ور ناقد تھے۔ ۱۳۲۹ھ میں دلی سے ماہنامہ "ندائے حرم" جاری کیا تو عربی مدرسوں اور دینی حلقوں میں اُس کے مضامین کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے جو خطوط راقم الحروف کے نام آتے تھے، وہ زبان و ادب کے شہ پارے ہوتے تھے۔ اُن کا خط بڑا پاکیزہ تھا عربی بولنے میں لب و لہجہ خالص حجازی! گفتگو میں بڑی دلکشی اور شگفتگی تھی۔ مکتب و مدرسہ کے مولویوں ملاؤں اور منتظمین میں ایسی باغ و بہار شخصیت دیکھنے میں نہیں آئی۔

راقم الحروف اور "فاران" سے مرحوم کو کس قدر تعلقِ خاطر تھا اس کی جھلکیاں اُن کے صاحبزادے عزیز مکرم مولانا محمد شمیم کے خط میں دیکھیے یہ ۲ رمضان ۱۳۹۷ھ (۱۲ جولائی ۱۹۷۷ء) کا لکھا ہوا خط ہے:۔

"کن الفاظ میں آپ کو حضرت والد ماجد قبلہ مولانا محمد سلیم کی وفات کی خبر تحریر کروں کہ اس حادثہ کو نقل کرنے کے لیے قلم الفاظ نہیں پا رہا۔ فی الحال اس قدر جلد خط لکھنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ مگر ابھی جولائی کا "فاران" جو موصول

ہوا تو بے اختیار والد مرحوم کی ایک خاص ادا نے بے چین کر دیا کہ جب بھی ڈاک میں "فاران" آتا تو سب سے پہلے اس کو لے کر آپ کا نقشِ اوّل تبصرہ اور اس کے بعد شعریہ کلام پڑھتے، جب تک بینائی ساتھ دیتی رہی، یہی معمول رہا، مگر دو سال قبل آپریشن کے بعد لکھنے پڑھنے میں دقت ہوئی تو حکم ہوا کہ پڑھ کر سناؤ ۔۔۔۔۔!

۔۔۔۔۔ ماہر صاحب! شاید آپ مبالغہ سمجھیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اُن کے احباب کی فہرست میں آپ کا ایک خاص مقام تھا، اُن کا ایک خاص جملہ نقل کرتا ہوں، اکثر فرمایا کرتے :۔

"ماہر صاحب کا اور میرا فکر اور محورِ تفکر ایک ہی ہے۔" زیادہ کیا لکھوں، میرے لیے اور مدرسہ صولتیہ کے لیے دعا فرمائیں ۔۔

غم زدہ : "محمد شمیم عثمانی"

حضرت مولانا محمد سلیم متواضع، شگفتہ طبع وضعدار اور خوش ذوق انسان تھے اُن کے لب و لہجہ میں شائستگی اور اُن کی مسکراہٹ میں بڑی دلکشی اور معنویت تھی۔ مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ بلد الامین (مکہ مکرمہ) کی تاریخ کے مستند حافظ تھے۔ محلوں کا نام لے کر بتاتے کہ ان کی وجہ تسمیہ کیا تھی[1]؟ عرب دنیا کے حالات و معاملات کے وہ مبصر تھے۔

یو۔ پی کے مسلمانوں کی تہذیب، بولی ٹھولی، رہن سہن، آدابِ معاشرت اور شرافت کی حجاز میں آخری یادگار تھے، اُن کی وفات حسرت آیات نے تاریخ کے ایک باب کو ختم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں اُن کے مراتب بلند فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۷۷ء)

---

[1] مجھے یاد پڑتا ہے محلہ "خندلیسہ" کے بارے میں فرمایا کہ دورِ جاہلیت میں یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ دیوبندی

راقم الحروف نے دیوبندی علماء میں سب سے پہلے مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کو دیکھا، یہ وہ زمانہ تھا جب آل انڈیا کانگریس کی تحریک ترکِ موالات کا زور تھا۔ میں کیبرہائی اسکول ڈبائی میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مولانا چاندپوری نے انگریزی حکومت کے خلاف خاصی شعلہ فشاں تقریر کی۔ وہ اپنے نام کے ساتھ "ابن شیر خدا" لکھا کرتے تھے! ہمارے نواح کے لوگ بریلوی عقائد سے متاثر تھے۔ میں نے اسی بدعت زدہ ماحول میں آنکھیں کھولیں اور نشو و نما پائی، اس لیے دیوبندی علماء سے دل میں نفرت بیٹھی ہوئی تھی! مگر تحقیق و مطالعہ کے بعد یہ گرد و غبار چھٹ گیا اور علماء دیوبند سے نفرت و اجنبیت تعلق خاطر اور عزت و احترام میں تبدیل ہو گئی۔ جہاں تک "افتا" کا تعلق ہے اس میں سب سے زیادہ شہرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی تھی، تقسیم ہند سے قبل اور اس کے بعد اپنے سنہ وفات تک وہ برصغیر کے "مفتی اعظم" تھے۔ عام طور پر مشہور تھا کہ مفتی کفایت اللہ کو فقہ میں اتنی مزاولت ہے کہ وہ کتاب دیکھے بغیر استفتا کا جواب دے سکتے ہیں۔

دیوبندی علماء میں مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کی سب سے زیادہ شہرت تھی۔ مولانا مفتی محمد شفیع کا نام میں نے سنا تھا اور ان کی جستہ جستہ تحریریں بھی نظر سے گزری تھیں! ان کے علم و فضل کا انکشاف تو پاکستان بننے کے بعد ہوا۔

حیدرآباد دکن سے ترک اقامت کے بعد میں دلی چلا آیا اور وہاں ڈھائی تین برس رہا، مفتی کفایت اللہ مرحوم کے داماد مولوی سمیع اللہ کی کتابوں کی دکان جامع مسجد کے سامنے اردو بازار میں تھی، جو "کتب خانہ عزیزیہ" کے نام سے مشہور تھی۔ کتب خانہ عزیزیہ میں اہل علم، ارباب قلم اور شاعروں کا جماؤ سا در بیٹھک رہتی۔ ایک گیا دوسرا آ گیا، شام کے وقت شاعروں کا خاصا مجمع ہو جاتا۔ مولوی سمیع اللہ مسلم لیگ اور قائد اعظم کے

ے کے سخت مخالف تھے۔ مگر مسلم لیگ کے لیڈروں سے بھی اُن کا یارانہ تھا۔ ہر قماش اور مسلک کا آدمی اُن کے یہاں آتا تھا۔

ایک دن ظہر کی نماز کے بعد میں وہاں آیا تو مولانا مفتی محمد شفیع کتب خانہ عزیزیہ میں تشریف فرما تھے، اُن سے علیک سلیک ہوئی۔ بڑی محبت سے ملے اور باتوں باتوں میں کفو اور غیر کفو میں شادی کی بحث چھڑ گئی۔ کوئی شک نہیں شادی بیاہ کے معاملے میں "کفو" کی خاصی اہمیت ہے مگر شاید اتنی شدت نہیں ہے کہ غیر کفو میں شادی ہو جائے تو یہ رشتہ منقطع بھی ہو سکتا ہے۔ اس گفتگو کی تفصیل ذہن میں محفوظ نہیں رہی مگر صورتِ حال نفی و اثبات کی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ذکر چل نکلا۔ میں نے عرض کیا کہ تازہ ترین ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں کسی صاحب کا سوال چھپا ہے۔ جس میں انہوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ چاندی اور سونے کی قیمتوں میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے اس لیے زکوٰۃ کی شرح بھی بڑھنی چاہیے ——— مولانا مودودی نے اس کے جواب میں لکھا کہ زکوٰۃ کی شرح جو شریعت میں مقرر کر دی گئی ہے اُس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس پر مفتی محمد شفیعؒ نے مسرت کا اظہار فرمایا۔ مولانا مودودی کے لیے دعائیہ کلمے کہے! حضرت مفتی صاحب سے یہ میری سب سے پہلی ملاقات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ علم و فضل نے اُن میں کبر و نخوت کی جگہ اخبات و انکسار پیدا کر دیا ہے، ہر عالم میں یہ صفت نہیں ہوتی۔

سب سے پہلی بار مولانا ظفر احمد انصاری کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ وہ ان دنوں عبداللہ ہارون روڈ کے فلیٹ میں تیسری یا چوتھی منزل پر اقامت گزیں تھے، اُن کے صاحبزادے محمد تقی ان دنوں بہت سے بہت نو دس برس کے ہوں گے، وہ میرا نام سُن کر اور مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے جیسے وہ مجھے پہلے سے جانتے ہیں! اس کے بعد حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کے بے شمار موقعے ملے، دعوتوں میں، جلسوں میں، تقریبوں میں خود اُن کے بدولت کدے پر۔ یہ اُن کی عالی ظرفی اور بزرگانہ شفقت تھی کہ مجھ جیسے کم سواد سے عزت و احترام کا برتاؤ فرماتے! حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادگان جانتے ہیں کہ مفتی صاحب مرحوم مجھ ہیچ مداں کے ساتھ کس محبت و عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔

اُن کے خویش مولانا نوراحمد صاحب دارالعلوم کے مہتمم تھے تو دارالعلوم میں سال میں کئی بار خاصی پرتکلف دعوتیں رہتیں۔ حضرت مفتی صاحب بھی ان دعوتوں میں شرکت فرماتے، میں کھانوں کی تعریف کرتا تو کہتے ماہر صاحب کی تعریف کھانوں کے لیے سند ہے۔ پھر شعروشاعری کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ میں نے دو دو گھنٹے حضرت مفتی صاحب کی مجلس میں اپنا کلام سنایا ہے۔ جو شعر پسند آتا، اس کی باوقار انداز میں داد دیتے۔ میری فرمائش اور اصرار پر مفتی صاحب نے خود اپنا کلام کئی محفلوں میں سُنایا!

محمد زکی کیفی مرحوم حضرت مفتی صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اُن سے میرے انتہائی مخلصانہ روابط تھے، لاہور جب بھی جانا ہوتا زکی صاحب کے یہاں ٹھہرتا۔ ملتان روڈ پر اُن کی کوٹھی ہے اُس کا ایک کمرہ میرے نام سے موسوم ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ حضرت مفتی صاحب اپنے صاحبزادے (زکی مرحوم) کے نیلے گنبد والے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور میں بھی اُن کا مہمان ہوں! اس طرح مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دَور کا واقعہ ہے، عارف والا کے قریب رانا محمد ظفراللہ خاں صاحب نے سیرت النبیؐ کے جلسوں کا اہتمام کیا تھا حضرت مفتی صاحب، چودھری محمد علی (سابق وزیراعظم پاکستان) اور دوسرے علمار نے سیرت کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ راقم الحروف نے نعتیہ نظموں کے علاوہ سیرت کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا! جلسہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ڈپٹی کمشنر کا حکم آیا کہ لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کیا جاسکتا، اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تو مقررین اور منتظمین جلسہ دھر لیے جاتے! چودھری محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ دفعہ ۱۴۴ تو ہر جگہ میرا تعاقب کرتی ہے۔ منٹگمری میں بھی یہی سانحہ پیش آیا مگر لاؤڈ اسپیکر کے بغیر بھی جلسہ کامیاب رہا۔ پھر ہم کار کے ذریعہ لاہور آئے۔ مولانا زکی کیفی کے یہاں میں نے ایک دن قیام کیا اور دوسرے دن خضدار (بلوچستان) کے لیے روانہ ہو گیا، وہاں مشاعرہ تھا۔

سیدامین الحسینی مفتی اعظم فلسطین جب دوسری بار پاکستان میں تشریف لائے

تھے تو حضرت مفتی محمد شفیع نے مسجد باب الاسلام (آرام باغ) کے ملحق کاشانہ (دارالافتا) میں صبح کے ناشتے پر انہیں مدعو کیا، مہمانوں کی تعداد بہت مخصوص تھی، علامہ سید سلیمان ندوی رحؒ نے بھی شرکت فرمائی، راقم الحروف بھی حاضر تھا! دارالعلوم کی تقاریب میں مجھے ضرور مدعو کیا جاتا، مگر پانچ چھ برس سے ایسا ہوا کہ دارالعلوم کی تقاریب کے دعوت نامے مجھ تک نہیں پہنچے۔

حضرت مفتی صاحب سے بعض مسائل پر خاصی طویل گفتگو بھی رہتی۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ میرے پاس فتاویٰ رشیدیہ نام کی ایک کتاب تبصرے کے لیے آئی ہے اس میں منی آرڈر کو سود لکھا ہے۔ حضرت مفتی صاحب پندرہ بیس منٹ تک امانت، تامین، موتمن وغیرہ فقہی اصطلاحات پر گفتگو فرماتے رہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی تحقیق اور فتوے کو غلط نہیں بتایا۔ میں نے آخر میں عرض کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں کم و بیش نوّے برس سے لکھو کھا منی آرڈر آتے رہے ہیں اور کسی کراہت کے بغیر وصول کیے گئے ہیں۔ اس طرح دارالعلوم نے اس فتوے کی صحت کی عملاً نفی و تردید کر دی ہے۔

ہندوستان ہی میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت کا آغاز دارالعلوم دیوبند سے ہو چکا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد یہ لے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ہندوستان میں مولانا عامر عثمانی مرحوم نے اپنے ماہنامہ "تجلّی" میں ایک ایک اعتراض اور الزام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ تنہا اس شخص نے مولانا مودودی کے مخالفین کی پلٹن کا مقابلہ کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں برسوں سکوت اختیار کیا۔ کسی نے دریافت کیا تو کلماتِ خیر ہی ان کی زبان و قلم سے نکلے۔ اس کے ثبوت میں مفتی صاحب کا ایک مکتوب بلفظہٖ درج ذیل ہے:

یہ خط ۱۲ جون ۱۹۶۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ مکتوب الیہ نیر دہلی کے عبدالرحمٰن صاحب بزمی ہیں۔ مفتی صاحب نے سابق جماعتِ اسلامی اس لیے لکھا ہے کہ اُس زمانے میں جماعتِ اسلامی ایوب خانی مارشل لا کے تحت کالعدم قرار پا چکی تھی:

دارالعلوم کراچی (Darul-uloom Karachi)

کرم فرمائے محترم جناب عبدالرحمٰن صاحب بزمی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! عنایت نامہ مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۶۱ء موصول ہوا، اس کا افسوس ہے کہ میرا پہلا خط آپ تک نہیں پہنچا اور اوسی کی وجہ سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اب سوالاتِ مرقومہ کا جواب لکھتا ہوں۔

(۱-۲) مولانا سید محمد رفیع صاحب[1] سے میرا تعارف تو پرانا ہے اور اُن کے عادات و اخلاق کو میں پسند کرتا رہا ہوں۔ البتہ اون کے ساتھ کبھی تفصیلی ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لیے اون کی علمی اور تعلیمی حیثیت کے متعلق مجھے معلومات نہ تھی۔ اب آپ کے مرسلہ فوٹو کاپی سند فراغ اور تحصیل علوم دینیہ مدرسہ معینیہ اجمیر شریف نظر سے گزری۔ میں اس مدرسہ اور اوس کے ذمہ دار علماء سے واقف ہوں اور اون پر اعتماد کرتا ہوں۔ ان کی سند کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ موصوف باقاعدہ درسِ نظامی کے سند یافتہ عالم ہیں، اس لیے میرے نزدیک اون کا انتخاب جامع مسجد نیروبی کی خطابت کے لیے بالکل موزوں و مناسب ہے میں نے اُن کی سند کی پشت پر بھی آپ کی فرمائش کے مطابق اپنے اعتماد کے الفاظ لکھ دیئے ہیں۔

(۳) سابق جماعتِ اسلامی پاکستان کو مرزائیت[2] کا مثیل کہنا میرے نزدیک بڑا ظلم اور سخت غلطی ہے۔ میں نے اس جماعت کا لٹریچر تو زیادہ نہیں پڑھا مگر اس کے رجال کو کافی برتا ہے اون کو پکا مسلمان پایا ہے۔ ایک مرتد جماعت کا مثیل ان کو قرار دینا یہ کبھی میری زبان و قلم سے نہیں نکلا۔ اس جماعت کا من حیث الجماعۃ کوئی خاص فقہی مسلک نہیں،

---

[1] رکنِ جماعتِ اسلامی، عالمِ دین، معلّم اور مقرر (م۔ق)

[2] مولانا محمد متین خطیب دیوبندی نے نیروبی کے ایک استفسار کے جواب میں جماعت اسلامی کو فرقہ ضالّہ قادیانی سے تشبیہ دی تھی۔ مولانا خطیب صاحب تقریباً شروع ہی سے مفتی صاحب کے دارالعلوم سے وابستہ رہے ہیں۔ (م۔ق)

جس سے فقہی حیثیت میں اختلاف یا اتفاق کا سوال پیدا ہو، الحاد اور لادینیت کے طوفان کے مقابلہ میں اس جماعت کی موثر خدمات بھی کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہوئیں، اسی وجہ سے دینی مقاصد میں ان کے ساتھ تعاون واشتراک کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔

میں صرف اس بنیاد پر کہ کسی شخص کا تعلق جماعت اسلامی سے رہا ہے اس کو دینی خدمت سے نااہل قرار دینے کو ہرگز صحیح نہیں سمجھتا جب تک خود اس سے کوئی وجہ اختلاف سامنے نہ آئے۔ یہ ہے میرا نظریہ اور عمل جماعت اسلامی کے ساتھ! جو محض آپ کے فرمانے کی بنا پر ظاہر کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ میں بھی جماعت کے مویدین و مخالفین کی کشمکش ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کشمکش کو ختم کرکے سب کے سب بے دینی اور الحاد کے فتنہ کے مقابلہ میں لگ جائیں۔ فروعی مسائل کے اختلاف کو نظرانداز کریں۔ تحریر و تقریر میں اصلاح خلق کے لیے ہمدردی اور دلسوزی کا اظہار ہو، اور یہ حکمت بالغہ پیش نظر رہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَة

وَاللّٰہ الموفق والمعین

بندہ محمد شفیع، دارالعلوم کراچی ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ م ۲۱ جون

اس خط میں حضرت مفتی صاحب کا لب ولہجہ جماعت اسلامی کے بارے میں کس قدر ہمدردانہ بلکہ تعریف آمیز ہے مگر پھر چند برس کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "خلافت و ملوکیت" پر دارالعلوم کے آرگن "البلاغ" میں مفتی صاحب کے لائق فرزند مولانا محمد تقی عثمانی کی جرح وتنقید شائع ہوئی جو بڑھتے بڑھتے کتاب بن گئی۔ ملک غلام علی صاحب نے اس پر مفصل ومبسوط کتاب لکھی، جواب اور جواب الجواب کا یہ سلسلہ ترجمان القرآن (لاہور) اور "البلاغ" میں دو ڈھائی برس چلتا رہا۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب کی تصنیف "مقام صحابہ" منظر عام پر آئی اور پھر "جواہر الفقہ"۔ فاران میں ان کتابوں پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان مسائل کو ہم یہاں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ دیوبند کے عثمانی خانوادے میں پیدا ہوئے مگر انہوں نے اپنے نام کے ساتھ "عثمانی" نہیں لکھا! اُن کے والد دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے مدرس تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے مدرسہ دیوبند میں اپنے زمانے کے بلند پایہ اور صاحبِ علم وفضل اساتذہ سے استفادہ کیا اور تقریباً اٹھارہ اُنیس برس کی عمر میں درسِ نظامی سے فراغت حاصل کرلی۔ مفتی صاحب کا شمار دارالعلوم دیوبند کے انتہائی ذہین طلبا میں ہوتا تھا، پھر وہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے درس دینے لگے۔ اُس زمانے میں عربی مدارس کے معلمین کی تنخواہیں پچیس تیس روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ حضرت مفتی صاحب تمام دینی علوم میں درک وبصیرت رکھتے تھے مگر فقہ سے بہت زیادہ شغف تھا اور اُن کے ذہن و فکر کو فقہی مسائل سے خاص مناسبت تھی اس لیے دیوبند میں "افتاء" کا منصب انہیں تفویض کیا گیا، یہاں تک کہ "مفتی" اُن کے نام کا جزوِ لاینفک بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فقہ میں انہیں غیر معمولی بصیرت عطا فرمائی تھی۔ عمر کا بڑا حصہ اسی میں صرف ہوا، مفتی صاحب کے فتاویٰ کی تعداد کیا عجب ہے ڈیڑھ لاکھ سے بھی زائد ہو۔ پاکستان میں "مفتیِ اعظم" کا لقب صرف اُنہی کو زیب دیتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے قرآنِ کریم کی تفسیر آٹھ ضخیم جلدوں میں لکھی۔ یہ اُن کی آخری عمر کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد سو کے لگ بھگ ہوگی۔ دین واخلاق کے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔ عربی کی مشہور ومقبول لغت "المنجد" کا اردو ترجمہ اُن کے صاحبزادے نے دارالاشاعت کراچی سے شائع کیا تو اُس پر حضرت مفتی صاحب نے فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ وہ عربی زبان ولغت میں بھی خاصا درک رکھتے تھے اور مشہور عربی لغات کی خصوصیات اور اُن کے مدارج سے واقف تھے۔ مفتی صاحب کی اردو اپنے بعض اکابر اور اساتذہ کی اردو کی طرح نری "مولویانہ" نہیں ہے، اس میں زبان وادب کا بھی لطف ملتا ہے! مفتی صاحب کی تحریروں میں ژولیدگی، ابہام اور اغلاق کی جگہ سلجھاؤ پایا جاتا ہے۔ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی! حضرت مفتی صاحب کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپ کر مقبول

---

[1] حضرت مفتی [illegible]

ہوئے ہیں۔

فارسی شعر وادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں انہوں نے شعر کہے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کے اشعار کا انتخاب اگر کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو اہلِ نظر اور شائقینِ شعر وادب اس کا اچھا اثر قبول کریں گے۔ حضرت مفتی صاحب نے خطاطی بھی سیکھی تھی اور دیوبند میں کچھ دنوں کتابت کا بھی شغل رہا تھا۔

کوئی شک نہیں علماء دیوبند کا علمی پایہ بہت بلند ہے اُن کے اکابر کا شمار صلحاءِ اُمّت میں ہوتا ہے۔" دیوبند" نے دین کی بڑی خدمت انجام دی ہے اس کے وجود سے خیر پھیلا ہے اور برکات کا ظہور ہوا ہے مگر وابستگانِ دیوبند کا اکابر و اسلاف اور روایات کے بارے میں خاص مزاج ہے ـــــ روایات اور اسلاف کے وہ اقوال و ملفوظات جہاں تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہاں یہ حضرات عام طور پر " طابق النعل بالنعل" تقلید و نیازمندی اور عقیدت و اعتماد سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح علماء دیوبند کی کتابوں میں ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جو محلِ نظر ہیں بلکہ کہیں کہیں تو کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ سے اُن کی تائید نہیں ہوتی! اور یہ تسامحات زیادہ تر اُن کی تصوّف کی کتابوں میں ملتے ہیں!

ابھی حال ہی میں مجلہ" البلاغ" میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مضمون " قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب پر" شائع ہوا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی نے بیشک روایتیں بھی نقل کی ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ دیوبند میں مُردوں کے لیے جس طرح اجتماعی طور پر قرآن خوانی کی جاتی ہے اُس کی کوئی نظیر کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ میں نہیں ملتی! دیوبند کے پیرانِ پیر اور شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے " فیصلہ ہفت مسئلہ" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اُسے اہلِ بدعت اپنے مسلک کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اسی سال رمضان میں راقم الحروف کو زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک صاحب کو جن کو میں ثقہ سمجھتا ہوں انہوں نے مسجدِ نبوی میں بیان کیا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے جنت المعلاۃ میں اپنے معتقدین کے ساتھ حاجی امداد اللہ صاحب کی قبر پر رات کا کچھ حصہ گزارا، لالٹین یا پیٹرومکس اُن کے ساتھ تھے۔ قرآن خوانی، دُعا

اور ذکر اذکار ہوتا رہا۔ دینی اعتبار سے کون سا عمل اور مقام زیادہ باعث ثواب تھا، حرم کعبہ میں عبادت اور تسبیح و تہلیل یا حاجی امداد اللہ صاحب کی قبر پر قرآن خوانی!

حضرت مفتی محمد شفیع ہوں یا مولانا قاری محمد طیب ان حضرات کی تحریروں اور کتابوں پر "فاران" میں تبصرہ ہوا ہے۔ ان حضرات نے امام فورک اور عبدالغنی نابلسی کے اقوال نقل کیے ہیں مگر اس پر غور نہیں فرمایا کہ یہ اقوال درایتاً کتنے پوچ اور ناقابلِ استناد ہیں[1]۔ اکابر و اسلاف کا احترام و اعتماد تحقیق و تفکر کے تقاضوں کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔

حضرت مفتی محمد شفیع طریقت میں حکیم الامت مولانا تھانوی رح سے بیعت تھے بلکہ خلیفۂ مجاز تھے اور اُن کا شمار اجل خلفاء میں ہوتا تھا مگر پیری مریدی کو انہوں نے کاروبار نہیں بنایا، کوئی شخص بہت اصرار کرتا اور اس کے دینی حالات کے بارے میں مفتی صاحب کو اطمینان ہو جاتا تو اُسے اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کر لیتے۔ یہ بیعت خاموشی کے ساتھ ہوتی۔ عام طور پر لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مفتی صاحب نے کس کو کب مرید کیا۔ خانقاہی تصوف کا ذوق رکھنے کے باوجود محی الدین ابن عربی شیخ اکبر کی کتابوں کے بارے میں اُن کی زبان سے میں نے سُنا کہ ان میں سانپ بچھو بھی بھرے ہوئے ہیں۔

میں نے ان کی امامت و اقتداء میں بارہا نماز پڑھی ہے، نماز میں سراپا خضوع و خشوع نظر آتے، قرأت میں آواز اس قدر مدھم ہو جاتی کہ پہلی صف کے وسط کے مقتدی بھی قرأت مشکل ہی سے سُن سکتے تھے۔

دیوبند میں علماء کے دو گروپ تھے ایک کانگریسی، دوسرا مسلم لیگی! حضرت مفتی صاحب کا تعلق دوسرے گروپ سے تھا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مفتی صاحب

---

[1] "یادِ رفتگاں" میں ان باتوں کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے کہ مسلکِ "دیوبند" کے بارے میں ہمارے پاس استفسارات آتے رہتے ہیں، ان کا جواب اس تحریر میں مل جائے گا۔ ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ علماءِ دیوبند ان تسامحات کے باوجود لائقِ احترام ہیں اور دیوبند نے دینی علوم کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ (م۔ق)

نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا، ان دونوں حضرات کو مسلم لیگ میں لانے کا کریڈٹ مولانا ظفر احمد انصاری کو ملنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں جن سروں پر اس فخر کے سہرے بندھے ہوئے ہیں وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ اس مقدس تحریک کے کیا نتائج برآمد ہوئے! اللہ تعالیٰ اب بچے کھچے پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے مفتی صاحب نے بھرپور استفادہ اور کسبِ فیض کیا تھا، اپنے پیر و مرشد کے وہ فدائی اور دل و جان سے والہ و شیدا تھے۔ مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے ملفوظات کو انہوں نے مرتب فرما کر چھپوایا "البلاغ" میں کسی نہ کسی عنوان سے مولانا تھانوی کا ذکر ضرور آتا۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنے پوتوں کے ناموں میں "اشرف" کی رعایت رکھی۔ اپنے مکان کو بھی اسی نام سے موسوم کیا۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کی شخصیت اور عقیدت مفتی صاحب کے ذہن و فکر دل و دماغ بلکہ ریشہ ریشہ میں نفوذ کیے ہوئے تھی! جگر مرادآبادی نے کہا ہے: ۔

میں اتنا جذب کر لوں کاش! تیرے حسنِ کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر

تو مفتی صاحب کو اپنے شیخ سے اسی قسم کا تعلق تھا۔

جہاں اب دارالعلوم کی شاندار عمارت نظر آتی ہے وہ جنگل بیابان تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے اخلاص اور جدوجہد نے اسے آباد کیا اور سچ مچ جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا۔ کراچی کے اہلِ خیر سرمایہ داروں کو مفتی صاحب پر اعتماد تھا کہ اُن کا دیا ہوا پیسہ پیسہ صحیح طور پر خرچ ہوگا۔ اُن کا یہ حسنِ ظن صحیح ثابت ہوا، دارالعلوم نے دینی علوم کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ سینکڑوں طلباء نے اس درسگاہ سے درسِ نظامی کی تکمیل کی ہے۔ درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کے علاوہ دارالعلوم کا نظم و ضبط قابلِ تعریف ہے۔ کراچی کے شاید کسی انگریزی کالج بلکہ یونیورسٹی تک میں وہ سلیقہ اور صفائی ستھرائی نہیں ہے جو دارالعلوم میں پائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دین ظاہر و باطن کے حسن کا جامع ہے اور دین دنیا کو برتنا بھی سکھاتا ہے ـــــ اس دارالعلوم کا بہت بڑا کارنامہ دینی کتابوں کی تالیف و تصنیف اور

اشاعت ہے، اس ذخیرہ میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔

اس دورِ انحطاط میں دیندار لوگ اپنی اولاد کی تربیت پر توجہ نہیں دیتے۔ بڑے بڑے دینی مفکرین اور اہلِ علم و تقویٰ کے گھر والے دین سے بیگانہ ہیں اور نماز تک سے غافل ہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے اولاد کی تربیت پر اپنا وقت صرف کیا اور اُن میں دینی ذوق پیدا کرنے کی جد و جہد کی، اُن کے لڑکے اور لڑکیاں صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور دو صاحبزادے (مولانا محمد رفیع اور مولانا محمد تقی) علم و عمل میں عظیم باپ کے قدم بہ قدم صحیح جانشین ہیں، اور ان شاء اللہ مفتی صاحب کا "نعم البدل" ثابت ہوں گے۔

حضرت مفتی صاحب کی رنگت سانولی، قد میانہ، جسم ہلکا پھلکا اور ناک نقشہ باریک تھا۔ لباس، غذا اور رہن سہن اوسط درجہ کا شریفانہ! ایک دن اُن کے ساتھ میں صبح کا ناشتہ کر رہا تھا، فرمایا بھائی! صبح کو یہ بد وانڈے میری غذا اور دوا ہے۔

قاری محمد طیب صاحب کی طرح مفتی صاحب کے وعظ کی شہرت نہ تھی مگر وعظ میں اُن کا سیدھا سادہ انداز دل نشین ہوتا۔ میں ۱۹۶۹ء میں جنوبی افریقہ گیا تھا، اس سے پہلے حضرت مفتی صاحب ساؤتھ افریقہ کا دورہ کر چکے تھے وہاں کے مسلمان مفتی صاحب کے مداح تھے۔

مفتی صاحب مرحوم برسوں سے دل کے مریض تھے، دل کا دورہ پڑنے سے قبل یہ سانحہ پیش آیا کہ مچھلی کھاتے میں اس کا کانٹا حلق کی نالی میں پھنس گیا۔ اُن کو ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اگر تھوڑی دیر اور یہی حالت رہتی تو کام تمام ہو گیا تھا، جیسے تیسے کانٹا نکالا گیا! پھر وہ کئی بار ہسپتال میں داخل ہوئے اور اچھے ہو ہو گئے۔ اُن کے انتقال سے کئی مہینے پہلے میں دارالعلوم بعض کتابوں کی تلاش میں گیا تھا۔ دوپہر تک کتابیں دیکھتا رہا اس کے بعد مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ پلنگ پر تکیہ کے سہارے بیٹھے تھے بڑی محبت کے ساتھ اس گنہگار سے مصافحہ کیا، فرمایا، مجھے آپ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی میں اُسی وقت سے دُعا کر رہا ہوں، پھر مولانا محمد تقی عثمانی نے دوپہر کے کھانے کے لیے اصرار کیا مگر مجھے مکان واپس جانا تھا اس لیے وہاں نہ ٹھہر سکا۔

مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے زکی کیفی مرحوم جن کی سعادت مندی کے مفتی صاحب بےحد مداح تھے، اُن کے انتقال نے مفتی صاحب کو نڈھال کر دیا۔ بڑھاپے میں چہیتے اور فرمانبردار بیٹے کی موت کا داغ اٹھانا پڑا۔ دو سال کے اندر اندر وہ خود بھی چل بسے۔

مولانا ظفر احمد انصاری کی معیت میں راقم الحروف دن کے ساڑھے دس بجے دارالعلوم پہنچا۔ مرحوم کے آخری دیدار کے لیے کئی فرلانگ کی لائن لگی ہوئی تھی اور خلقت اُمڈی چلی آرہی تھی۔ ہم اس بھیڑ سے گزرتے ہوئے اُس کمرے میں پہنچے جہاں مفتی صاحب کا جنازہ رکھا تھا، اِدھر اُدھر برف کی سلیں تھیں اور پنکھے چل رہے تھے۔ مفتی صاحب کا چہرہ قدرے زردی مائل تھا مگر نور کی سپیدی دیدنی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پاکستان کا سب سے بڑا مفتی فتویٰ لکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو گیا ہے۔ اُن کے چہرے پر مردنی سے زیادہ زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔

ظہر کی نماز سے پہلے مولانا احتشام الحق تھانوی نے اثر انگیز تقریر کی۔ دو چار برس کے حالات سے تو راقم الحروف بے خبر ہے مگر علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد مفتی صاحب ان کی روش سے برسوں مکدر رہے۔

جس میدان میں جنازے کی نماز کا اہتمام تھا وہ حضرت مفتی صاحب کی اقامت گاہ سے بہت قریب تھا مگر عقیدت مندوں کا ہجوم طوفان انگیز تھا ہر شخص کاندھا دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم کی وصیت کے مطابق ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ میدان میں دُور دُور تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، لیڈروں کے جنازوں میں بڑے بڑے ہجوم دیکھے گئے ہیں مگر حضرت مفتی صاحب کے جنازے میں غالب تعداد دینداروں کی تھی۔ اسّی فیصد سوگواروں کے چہروں پر ڈاڑھیاں! یہ مرحوم کی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی دلیل تھی! نمازِ جنازہ کے بعد دارالعلوم کے قبرستان میں علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے!

نور اللہ مرقدہٗ وبرد اللہ مضجعہٗ

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۷۶ء)

میاں محمد شفیع

مجھے پاکستان آئے ہوئے تین ساڑھے تین مہینے ہوئے تھے کہ ۱۹۴۸ء کے دوسرے مہینے ملتان سے ایک مشاعرے کا دعوت نامہ آیا۔ ملتان جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مشاعر کی صدارت مسٹر ہادی حسن (سی۔ایس۔پی) نے فرمائی، جو اُن دنوں وہاں کے کمشنر تھے۔ سر عبدالحمید سابق وزیر اعظم کپور تھلہ کے صاحب زادے میاں ظہور الحق صاحب فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے وہاں افسر تھے، انہی کی کوٹھی میں ٹھہرنا ہوا اور وہیں میاں محمد شفیع مرحوم سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ اُن کی پہلی مسکراہٹ ہی نے دل موہ لیا۔ میاں صاحب اُن دنوں ملتان میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ انہی عہدے داروں کی توجہ اور محبت و قدر شناسی کی بدولت راقم الحروف کئی مہینے ایک فلور مل کے سلسلہ میں ملتان مقیم رہا، صابر دہلوی مرحوم کی رفاقت نے اس قیام اور عجیب مشغلہ کو گوارا بنا دیا۔

دفتری کام کے سلسلہ میں پہلی بار عدالت میں پہنچا، تو لوگوں کا خاصا ہجوم تھا، میاں محمد شفیع صاحب نے مجھے دیکھتے ہی عدالت کے ڈائس پر اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا، میاں صاحب کی نوازش اور محبت اپنی جگہ مسلّم مگر تمام دوسرے لوگوں کو عدالت کے کمرے میں کھڑا دیکھ کر، میں دل میں عجیب سی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ اسی ہجوم میں قابل گلاؤٹھوی بھی درخواست لیے کھڑے ہوئے تھے، میں قصداً اُن سے نگاہیں بچاتا رہا!

میاں صاحب مرحوم سے ملتان میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں، ایک دو بار ملنے کے لیے خود تشریف لے آئے اور سرِ راہ فلور مل کے پھاٹک کے سامنے بچھی ہوئی کھری چارپائی پر بیٹھ گئے اور محبت کے لہجہ میں مجھے "ماہرم" کہہ کر گفتگو کا آغاز فرمایا۔ میں چند ماہ کے بعد مستقل طور پر کراچی چلا آیا، پھر ملتان، لاہور، حیدرآباد اور لائل پور میں میاں صاحب مرحوم سے مشاعروں کی بدولت نیاز حاصل ہوتا رہا۔ شعر شاعری سے انہیں دلچسپی نہیں غیر معمولی شغف تھا۔ کسی مقام پر بڑے پیمانہ پر مشاعرہ ہوتا تو سرکاری دورے کی وہی تاریخیں مقرر کراتے! بہ یک کرشمہ دو کار! سرکاری فرائض بھی انجام دیے اور مشاعرہ بھی سُن لیا!

غلافِ کعبہ کی تیاری اور اس کی نمائش کے سلسلہ میں جماعتِ اسلامی کے مرکزی دفتر میں میٹنگ ہو رہی تھی، میاں صاحب ان دنوں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ میں کسی مشاعرے سے واپسی میں لاہور اتر پڑا، اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے یہاں پہنچا، مولانا موصوف نے اس میٹنگ میں مجھے بُلالیا، اس اجلاس کی کارروائی میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد ختم ہو گئی۔ چائے نوشی ہوئی اس کے بعد میں نے حاضرین کے اصرار پر دو تین نعتیہ غزلیں سنائیں، پھر میاں محمد شفیع صاحب اپنی کار میں مجھے لے کر ادارہ اسلامیات تشریف لے آئے اور بہت دیر تک وہاں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ سے تبادلۂ خیالات فرماتے رہے۔ ڈپٹی کمشنر اور اسی درجہ کے دوسرے عہدیدار اس طرح بے تکلفی کے ساتھ دکانوں پر کہاں جاکر بیٹھا کرتے ہیں۔ راقم الحروف کے علاوہ ادارۂ اسلامیات کے مالک مولوی محمد زکی صاحب کیفی سے میاں صاحب کے مخلصانہ روابط و مراسم تھے، یہی تعلق انہیں وہاں لے آیا! علماء دین سے ربط ضبط اور اُن کے خیر مقدم اور رخصت الوداع کہنے کے لیے موٹر تک جانا، سنا ہے ان کی یہی ادا اور روش پسندیدہ نہیں سمجھی گئی اور مشکل ہی سے ایک سال ہوا ہو گا کہ اس عہدے سے اُن کا تبادلہ ہو گیا۔

میاں محمد شفیع مرحوم سے میری آخری ملاقات گزشتہ سال اپریل کے مہینے میں ہوئی، میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) سے واپس ہوا اور حسبِ معمول اپنے میزبان اور عزیز دوست مولانا کیفی کی معیت میں میاں صاحب کے بنگلہ پر پہنچا۔ شفقت کاظمی صاحب بھی اتفاق سے ادارۂ اسلامیات تشریف لے آئے۔ وہ بھی ہمراہ تھے، چائے سے لوازمات کے ساتھ تواضع کی گئی، پھر ہم تینوں نے اُن کی فرمائش پر غزلیں سنائیں۔ رانا محمد ظفر اللہ خاں صاحب وہاں پہلے سے تشریف فرما تھے، اتنے میں بوندا باندی ہونے لگی، اس منظر نے شعر و سخن کے اس ماحول کو اور زیادہ کیف انگیز بنا دیا۔

میاں صاحب نے فرمایا کہ میں پیدل چلتا ہوں تو سر میں درد ہو جاتا ہے اور رگ پٹھوں میں گرفت سی محسوس کرتا ہوں، ماہر آپ! کراچی کو ٹیلی فون کریں، ڈاکٹر ولاور عباس صاحب اس قسم کے درد کا علاج معالجہ کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے یہاں ٹیلیفون ملایا گیا، مگر اُس دن شاید موسم کی خرابی کی وجہ سے لائن صاف نہ تھی، کئی بار کوشش کے باوجود، بات نہ ہو سکی! میاں صاحب نے فرمایا کہ آپ ڈاکٹر صاحب سے اس معاملے میں بات چیت کر کے

مفصل جواب دیں، کیا وہ لاہور تشریف لا سکتے ہیں یا مجھے کراچی آنا پڑے گا، میں نے آتے ہی ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کی، انہوں نے فرمایا کہ دونوں صورتیں ممکن ہیں، جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا میں نے مجی زکی کیفی صاحب کو لکھ کر بھیج دیا اس کے بعد ان کا خط ملا کہ میاں صاحب فلاں تاریخ تک کراچی پہنچ رہے ہیں میں ان کی آمد کا بڑی بے چینی کے ساتھ منتظر رہا مگر وہ تشریف نہیں لائے، ڈاکٹر صاحب بھی بار بار پوچھتے رہے، مگر پھر وہ چند ماہ کے بعد علاج کی غرض سے لندن چلے گئے اور وہاں ہسپتال میں اُن کے انتقال کی خبر اخباروں میں پڑھی! مرض بظاہر نہ کوئی ایسا تکلیف دہ تھا اور نہ اندیشناک ، خود میرے پیروں کے رگ پٹھوں میں کئی کئی مہینے گرفت رہی ہے چلنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن وہ پھر خود بخود جاتی رہی! مگر موت کو ایک بہانہ چاہیے! جو وقت جس جان کے لیے لکھ دیا گیا ہے وہ ایک لحظہ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔

میاں محمد شفیع فطرتاً خیر پسند اور انسانیت دوست واقع ہوئے تھے، وضعدار، ملنسار، ہنس مکھ، شگفتہ طبع اور خوش مزاج! صورت کی طرح سیرت بھی حسین تھی، دفتری کارروائی اور انتظامِ حکومت کے مسائل میں معاملہ فہم اور انصاف پسند! مطالعہ خاصا وسیع تھا، ایک کتاب بھی تصنیف کی، اردو خط بڑا دیدہ زیب تھا، نوجوانی میں انہوں نے خوشخطی باقاعدہ سیکھی تھی اُن کا آخری عہدہ صوبائی حکومت میں جوائنٹ سیکریٹری کا تھا، مگر اُن کی قابلیت اور ذہانت اس درجہ کی تھی کہ صوبہ کا نظم و نسق ان کے سپرد کر دیا جاتا تو اسے اس خوش اسلوبی سے چلاتے کہ لوگ محسوس کرتے یہ آصف برخیا اور محمود گاواں پاکستان میں کہاں سے آ گئے! معاہدۂ تاشقند ہو یا صدارتی انتخاب، ضبطِ ولادت ہو یا کوئی دوسرا مسئلہ اُن سے جب بھی تبادلۂ خیال ہوا، انتہائی آزادی اور بے باکی کے ساتھ اظہارِ خیال فرمایا۔ اُن کی یہ باتیں قصرِ ایوان میں بھی پہنچتی ہوں گی، کوئی لالچ، دباؤ اور خوف ان کے کردار میں لچک پیدا نہیں کر سکتا تھا، ایسے باضمیر اور حق شناس عہدیدار روز روز تھوڑی پیدا ہوتے ہیں۔

شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی، شاعروں کے انتہائی قدرداں تھے اور اس معاملے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے اُن کا مزاج بہت کچھ ملتا جلتا تھا اُن کے اٹھ جانے سے لاہور کی ادبی اور ثقافتی محفلیں سونی ہو گئیں اخبارات نے کس شدید جذبہ کے ساتھ ان کا ماتم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبر و برزخ سے لے کر روزِ حساب تک ہر منزل اُن کے لیے آسان فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۶۷ء)

مولانا سید محمد طلحہ

بلدہ حیدرآباد (دکن) میں ادارۂ شرقیہ مشہور تعلیمی درسگاہ تھی، جس میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے لیے طلبا کو تیار کیا جاتا تھا۔ مولانا حمید الدین قمر فریدی فاروقی اس ادارے کے بانی، مالک اور پرنسپل تھے۔ پتھر گٹی کے نبی خانہ سے جب ادارۂ شرقیہ نواب صادق جنگ کی ڈیوڑھی میں منتقل ہو کر آیا تو اس کو اور زیادہ ترقی ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں جسے ادارۂ شرقیہ کا دورِ شباب کہنا چاہیے، مولانا سید محمد طلحہ سے وہیں نیاز حاصل ہوا۔ وہ لاہور سے تشریف لائے تھے اور مولانا حمید الدین قمر فریدی کے مہمان تھے۔ چائے نوشی کے بعد قمر صاحب کے ایماء پر اپنی فارسی غزل سنائی۔ مولانا سید محمد طلحہ نے ایک ایک شعر پر داد دی۔

غزل کے مطلع : غریبِ عشق سامانے نہ دارد
جنوں دارد بیابانے نہ دارد

پر تو داد و ستائش اور حوصلہ افزائی کی حد ہی کر دی۔ فرمایا :

"اگر آپ نہ سناتے تو میں سمجھتا کہ یہ امیر خسروؒ کا کہا ہوا شعر ہے۔"

پھر سید محمد طلحہ صاحب سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں راقم الحروف کو زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت میسر آئی۔ تو سید صاحب مرحوم بھی اس سال حج کے لیے گئے تھے۔ مسجدِ نبوی میں اُن سے ملنا جلنا ہوتا رہتا۔ کراچی میں ہماری ملاقات کا مرکز نظامی دواخانہ تھا۔

مولانا سید محمد طلحہ، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ برسوں اورینٹل کالج لاہور میں علومِ مشرقی کے پروفیسر رہے۔ فارسی اور عربی کے متبحر عالم اور عربی کے انشاء پرداز! مولانا مرحوم مکہ اور مدینہ کے تمدن پر جو رسالت اور صحابہ کے دور سے متعلق تھا، عربی میں ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں معلومات اور مواد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے دمشق[1] اور قاہرہ کا سفر بھی کیا تھا اور ان شہروں کے کتب خانوں سے استفادے کے علاوہ وہاں کے تاریخ دانوں اور دانشوروں سے ملاقاتیں بھی کی تھیں اور پروفیسر مٹی

۱؎ غالباً سفرِ حجاز کے بعد

سے بھی اس سلسلے میں خط و کتابت کی تھی۔ فرماتے تھے عرب بچے کو کھیل کھیلتے تھے، اس پر بھی میں نے ریسرچ کی ہے۔ کاش یہ نادر کتاب[1] اُن کی زندگی میں شائع ہو جاتی۔ اسی حسرت کو لے کر وہ دنیا سے رخصت ہوئے (رحمۃ اللہ علیہ)

مولانا سید محمد طلحہ کی زندگی زہد و پاکبازی کی زندگی تھی، اُن کا چہرہ دیکھ کر دل گواہی دیتا تھا کہ یہ ایک نیک اور خوش اوقات آدمی کا چہرہ ہے۔ اُن کا کھانا پہننا اور رہن سہن بہت سادہ تھا۔ ساری عمر درس و تدریس، تعلیم و تعلّم اور مطالعہ و تحقیق میں گزاری۔ جماعت اسلامی کے مداح اور مولانا مودودی کے قدرداں تھے۔ اُمّتِ مسلمہ کی ابتری اور پراگندہ حالی کا انہیں دلی ملال تھا۔ "فاران" کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے اور جب بھی ملنا ہوتا تعریفی کلمات سے میری حوصلہ افزائی فرماتے۔

عمر نوے سال سے بھی کچھ اوپر ہی تھی، اس عمر کو حدیث شریف میں ارذل العمر کہا گیا ہے، جس کے آثار اُن کی عام زندگی میں نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مالی طور پر بھی وہ پریشان حال ہی تھے، اس بڑھاپے میں بسوں میں سفر کرنا کتنا تکلیف دہ ہے اور یہ تکلیف انہیں مجبوراً برداشت کرنی پڑتی۔

غالباً ڈیڑھ دو سال سے وہ "دارالتصنیف" سے متعلق ہو گئے تھے، اور رہبہ ندی کے قریب مولوی محمد طفیل صاحب کی خانقاہ مجاہد آباد میں رہتے تھے۔ شہرت اور نام و نمود سے بے نیاز! علم و تحقیق کی جو خدمت بھی انجام دی خاموشی کے ساتھ گمنام رہ کر انجام دی۔ اورینٹل کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد اگر انہیں معاشی فراغت میسّر آتی یا کسی علمی ادارے سے وابستہ ہو جاتے اور ان کی علمی صلاحیتوں کو منظر عام پر آنے کا موقع ملتا تو وہ دوسرے عبدالسلام ندوی ثابت ہوتے۔ بہرحال جو مقدر میں لکھا تھا وہ پورا ہو کر رہا اور جو وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا تھا ٹھیک اسی وقت وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یہ دن ہر کسی کو دیکھنا ہے کسی جان کو موت سے مفر نہیں، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ دنیا کی زندگی تو تنگی ترشی سے بھی بسر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت کی زندگی کو "فی الآخرہ حسنہ" کا مصداق بنائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۷۰ء)

---

[1] الحیات فی قرن الاول

حضرت پیر محمد ہاشم جان مجددی

اس واقعہ کو چھبیس برس ہو رہے ہیں، میری پہلی ملاقات پیر ہاشم جان صاحب سے کراچی کے نظامی دواخانہ میں ہوئی۔ وہاں وہ دو تین مہینے کے بعد آتے رہتے۔ نظامی دواخانہ کے مالک حکیم نصیرالدین ندوی اور پیر صاحب نے حکیم صاحب کے عم محترم علامہ معین الدین اجمیری سے موجز القانون کی شرح نفیسی سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔ جب بھی وہ کراچی تشریف لاتے تو نظامی دواخانہ میں گھنٹوں ان کے ساتھ گفتگو اور لطائف و ظرائف میں گزرتے۔

کراچی میں ہر مکتب فکر کے بائیس علماء کا دستور سازی کے سلسلے میں جو تاریخی اجتماع ہوا تھا اس میں حضرت پیر ہاشم جان بھی شریک تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ علماء کی اس بزم مشورت کا کیا رنگ ہے۔ جواب میں فرمایا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جب کسی مسئلے پر بولتے ہیں تو شور مچ جاتا ہے۔ ہر طرف سے ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہے مگر بحث و گفتگو کے بعد آخر مولانا مودودیؒ کی رائے ہی پر سب کا اتفاق ہوتا ہے۔

پیر صاحب مرحوم ایک چھوٹے سے قریہ سائیں داد کے رہنے والے تھے۔ راقم الحروف ٹنڈو محمد خاں کے سیرت النبیؐ کے جلسہ میں شریک ہونے کے لیے گیا تھا، تو جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے پیر صاحب کی خدمت میں بھی حاضری دی تھی ان کے یہاں دولت و زمینداری، شریعت و طریقت اور علم و فضل کا ملا جلا رنگ دیکھنے میں آیا۔

حضرت پیر ہاشم جان "مجددی" تھے یعنی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے سے نسبی تعلق رکھتے تھے، ان کے والد بھی عالم تھے مگر انہوں نے اجمیر شریف میں درس نظامی کی ابتدائی کتابوں سے لے کر آخری کتابیں تک علامہ معین الدین اجمیری سے پڑھیں اور کم و بیش بارہ تیرہ برس اجمیر میں قیام کیا۔ اردو، سندھی، عربی اور فارسی زبان کے وہ عالم تھے۔ یہ بات سب سے پہلے انہی نے مجھے بتائی کہ شاہ عبداللطیف صاحب

بھٹائیؒ کی شاعری میں (Metre) نہیں ہے۔ وہ زمیندار بھی تھے، عالمِ دین اور شیخ طریقت بھی تھے۔ اونچے درجہ کے طبیب اور خوش بیان واعظ بھی۔ میں نے کراچی میں اُن کے مریدوں کی نیازمندی اور عقیدت کا عالم دیکھا ہے کہ پیر صاحب کے سامنے ادب کے ساتھ دوزانو بیٹھتے اور اُن کے پیچھے خدام کی طرح چلتے۔

اس بات کو چھ سات برس ہوئے ہونگے کہ پیر صاحب کے مکانات اور جائداد پر اُن کے عزیزوں (بھتیجوں ......) نے قبضہ کرلیا اور انہیں مجبوراً ترکِ وطن کرنا پڑا۔ یہ بہت بڑا سانحہ تھا جو اُن کی زندگی میں پیش آیا۔ پھر وہ بال بچوں کو لے کر کراچی آگئے، ناظم آباد میں بنگلہ تعمیر کرایا، اسی میں رہتے تھے جہاں اُن کا مطب بھی خوب چلتا تھا، کوئٹہ میں بھی اُن کا مکان تھا ہر سال گرمیوں میں تین چار مہینے کوئٹہ میں جاکر رہتے! دو تین برس سے وہ اپنے وطن سائیں داد بھی جانے لگے۔ زمینداری اور جائداد کے معاملات بھی سلجھ گئے مگر مستقل سکونت کراچی ہی میں اختیار کرلی تھی۔

گزشتہ دنوں میرپور خاص اور نواب شاہ میں سیرت النبیؐ کے جلسوں میں اُن کا ساتھ رہا۔ پیر صاحب کی صدارتی تقریریں بہت مقبول ہوئیں۔ راقم الحروف نے بھی نعتیہ کلام سنانے کے علاوہ تقریریں کیں۔ پیر ہاشم جان مرحوم و مغفور کا رنگ خوب کھلتا ہوا تھا۔ ناک نقشہ متناسب، گورے چہرے پر سفید ڈاڑھی اور زیادہ خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ وہ جامہ زیب بھی تھے۔ گفتگو میں بذلہ سنجی حلاوت اور دلکشی تھی۔ "فاران" کے برسوں خریدار رہے، میرے ہر مضمون کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور جب کبھی ملاقات ہوتی تو تعریف کرتے، کئی برس ہوئے اُن کے نام کا وی۔پی واپس آگیا، اُس کے بعد "فاران" کی خریداری کا سلسلہ بند ہوگیا۔

"فاران" میں راقم الحروف کے مضامین توحید و سنت کی تائید و تبلیغ اور شرک و بدعت کی تردید میں جو آتے رہے، تو پیر صاحب مزاحاً چھڑی ہاتھ میں لیتے ہوئے مجھ سے کہتے — "اس میں بدعت تو نہیں ہے" پان کھاتے ہوئے فرماتے۔ "کیا یہ بدعت ہے۔" وہ شروع ہی سے عرس و فاتحہ اور نذر و نیاز سے شغف رکھتے تھے۔ مرنے سے ڈیڑھ برس پہلے بڑی جدوجہد کے بعد ویزا لے کر سرہند شریف گئے اور حضرت مجدد صاحبؒ کے عرس میں شرکت کی۔ آخری عمر میں یہ رنگ اور تیز ہوگیا۔ "بدعات" کی طرف اُن کا میلان بڑھ گیا اسی لیے جاپانی

والوں کی تنظیم جمعیۃ علماء پاکستان سے قریبی روابط پیدا ہو گئے اور اپنی تقریروں میں اسلام کی بجائے "نظامِ مصطفیٰ" کا نام لینے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے انتہائی عقیدت تھی، حضورؐ کا نام اور ذکر سن کر اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ جناب جتوئی صاحب اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے مگر پیر ہاشم جان مرحوم نے اس ارادت سے ذرہ برابر فائدہ نہیں اٹھایا۔ روپیہ پیسہ اور خرچ اخراجات کے معاملے میں بہت زیادہ جزرس تھے۔ اس لیے خاصے دولت مند تھے۔

اسی سال گرمیوں میں حسبِ معمول کوئٹہ تشریف لے گئے۔ جاتے وقت اچھے بھلے تھے مگر دنیا سے اُن کا دانہ پانی اٹھ چکا تھا، ایک دن صبح کو یہ غم انگیز خبر اخباروں میں آئی کہ حضرت پیر ہاشم جان مجددی کا کوئٹہ میں انتقال ہو گیا ان کی میت سائیں داد میں دفن ہوگی۔ اُن کی وفاتِ حسرت آیات کو دینی حلقوں میں بہت زیادہ محسوس کیا گیا۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۷۵ء)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری

تقسیم ہند سے قبل دیوبند کے علماء میں سب سے پہلے مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری کی تقریر قصبہ ڈبائی میں سننے کا اتفاق ہوا تھا، میں ان دنوں کبیر ہائی سکول (ڈبائی) کی ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا، مولانا مرحوم اپنے نام کے ساتھ " ابن شیر خدا " لکھا کرتے تھے۔ اس واقعہ کو اب چھپن برس ہو رہے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک موالات کا زور تھا اور ہمارے نواح میں "گاندھی کیپ" کا رواج تو تھا مگر مسلمانوں میں "محمود کیپ" کا بھی رواج ہو چلا تھا، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ خاص وضع کی ٹوپی پہنتے تھے، "محمود کیپ"، "گاندھی کیپ" کی بالکل ضد تھی۔ گاندھی کیپ کشتی نما تھی اور محمود کیپ گول تھی۔ ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد میرا جانا ہوا تو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریریں سنیں۔ اور ان سے خاصا ربط ضبط ہو گیا۔ مالگزاری کے سب سے بڑے وکیل اور صاحب تقویٰ بزرگ مولوی فیض الدین صاحب کی کوٹھی پر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنے، مصافحہ کرنے اور ان کی گفتگو سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی حضرت شاہ صاحب کے ہمراہ حیدر آباد دکن تشریف لائے تھے مگر اُس وقت تک اُن کی شہرت نہیں ہوئی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم و مغفور سے ۱۹۴۶ء میں دلی کے کتب خانہ عزیزیہ میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سے دسیوں بار ملاقاتیں رہیں اور ان کی معرکہ آرا تقریریں سنیں، مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی سے بھی دہلی میں بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ پاکستان بننے سے سال ڈیڑھ سال پہلے قاری زاہر قاسمی دلی سے مجھے دیوبند لے گئے، وہاں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، دوسرے دن شام کے وقت دیوبند ریلوے اسٹیشن پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ملاقات ہو گئی، مولانا مرحوم کانگریس کے کسی جلسہ میں شرکت کے لیے باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ قاری صاحب نے

میرا تعارف کرایا، اس پر حضرت مولانا مدنی نے فرمایا:

"ماہر القادری بدایونی"

میں نے عرض کیا میں "بدایونی" نہیں ہوں۔ ضلع بلند شہر کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اس تمہید و تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اکابر دیوبند میں حضرت مولانا یوسف بنوری سے ملاقات کا شرف پاکستان بننے کے بعد حاصل ہوا۔ ہاں! ان کا نام بارہا سنا تھا، اُن دنوں مولانا مرحوم مدرسہ عربیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے۔

حضرت مولانا کی خدمت میں جب بھی حاضر ہوتا بڑی محبت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے! اُن کا موزوں اور متناسب قد، خوب کھلتی ہوئی رنگت، خوش نما ڈاڑھی ــــ اُن کے چہرے مہرے اور صورت میں جاذبیت اور دلکشی تھی۔

ایک بار میں حاضر ہوا تو مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کے اساتذہ بھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اس آیت کے حاشیہ میں کس قدر شدید قابلِ اعتراض عبارت لکھ دی ہے، مولانا مرحوم نے وہ پوری عبارت توجہ کے ساتھ پڑھی، اس کے بعد اس تفسیر کی تاویل کی میں نے تیز لہجہ میں عرض کیا آپ کی تاویل صحیح نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں، حضرت شیخ الہند اور علماء دیوبند کا یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا مگر اُن کے قلم سے حیرت ہے ایسے جملے کیسے نکل گئے، اس پر مولانا نے فرمایا ــــــ "حضرت شیخ الہند سے غلطی ہوئی ہے" ــــــ اُن کا یہ اعتراف حق پسندی کی دلیل تھا ورنہ اپنے اکابر کی غلطیاں کون تسلیم کرتا ہے۔

ایک بار اُن کے یہاں گیا تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کی بالائی منزل کے کمرے میں تشریف فرما ہیں، اس کمرے میں بڑے سلیقے کے ساتھ کتابوں کی دیدہ زیب الماریاں رکھی تھیں، قالین نما فرش جس کی آب و تاب دیدنی تھی۔ حضرت مولانا بنوریؒ نے فرمایا کہ اس کمرے میں جو سامانِ آرائش آپ دیکھ رہے ہیں اس کا مدرسہ کی آمدنی سے کوئی تعلق نہیں ہے ایک صاحبِ خیر نے "دار الحدیث" کے لیے فرش فروش اور الماریاں خرید کر دی ہیں۔ پھر مولانا نے راقم الحروف کے لیے خنک مشروب منگوایا، میں کوکا کولا کی بوتل پی رہا تھا اور گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، فرمایا کہ یہاں مہمانوں کی تواضع مدرسہ کی آمدنی سے

نہیں کی جاتی یہ بوتل میں ڈالے اپنے گھروں لے گئے، پھر انہوں نے ہمیں اپنے مدرسہ کا مطبخ دکھایا جس میں خمیری روٹیاں پک رہی تھیں اس سلسلے میں پوری تفصیل بتائی کہ اس مدرسہ میں طلبار کو کھانا تقسیم نہیں کیا جاتا، دستر خوان پر کھلایا جاتا ہے۔ ایک خمیری روٹی اتنے وزن کی ہے! مدرسہ کا مطبخ بڑا صاف ستھرا تھا اور روٹیوں کی شکل صورت بتا رہی تھی کہ آٹا اچھا نہیں بہت اچھا ہے! اس مدرسہ کا حسنِ انتظام مولانا مرحوم کی توجہ کا رہینِ منت تھا۔

مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم، علامہ انور شاہؒ صاحب کے خاص الخاص تلامذہ میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، مدرسہ دیوبند کے اکابر اساتذہ میں جب اختلاف ہوا اور ڈابھیل میں بعض چوٹی کے دیوبندی علمار نے نیا دارالعلوم آباد کیا تو مولانا بنوری بھی ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں کئی برس مسندِ درس و تدریس پر فائز رہے، مولانا مرحوم فنِ حدیث میں قابلِ ذکر بصیرت اور تبحر رکھتے تھے، عربی ادب سے بھی غیر معمولی شغف تھا، عربی میں بے تکلف گفتگو اور شستہ تقریر و تحریر پر قدرت تھی، ترمذی شریف کی شرح عربی زبان میں کئی جلدوں میں لکھی۔

نیشنل بنک کے چیئرمین ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم جو کئی زبانیں جانتے تھے اور سبعہ معلقات کے اشعار داغ کے شعروں کی طرح روانی کے ساتھ سناتے۔ ایک دعوتِ ولیمہ میں وہ راقم الحروف سے کہنے لگے کہ "ولیمہ" کے اصل معنی کیا ہیں، اس کا کیا مادہ ہے؟ اس کی مجھے تلاش تھی، مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ ہمارے پاکستان میں ایک ایسا عربی داں موجود ہے جس نے "ولیمہ" کے معنی پوری تفصیل سے اس کے مادہ، مصدر اور اشتقاق کے ساتھ بتائے! اس ضمیر کا مرجع مولانا یوسف بنوریؒ کی شخصیت تھی!

مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم و مغفور کے اسلاف میں حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے شیخ طریقت گزرے ہیں، مولانا مرحوم کے والدِ ماجد بھی صاحبِ علم و فضل اور دوسری عجیب و غریب خصوصیات کے حامل تھے، طب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور بڑے تجربہ کار اور جہاندیدہ تھے، اُن کی وفات کو تین چار برس گزرے ہوں گے۔

مولانا بنوری مرحوم کی پوری زندگی علمِ دین سیکھنے اور سکھانے میں گزری ہے

اُن کا شمار پاکستان اور ہندوستان کے اہلِ علماء میں ہوتا تھا، مزاج میں حدّت تھی جو بعض اوقات دین کی مدافعت میں شعلہ انگیز بن جاتی، اُن کا علم تدبیر و رائے کے مقابلہ میں زیادہ وزنی تھا۔ قادیانیوں کو اُمّتِ مسلمہ سے علیحدہ فرقہ اور غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی جدوجہد کے وہ قائد و سربراہ تھے جس میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی، مگر اس مسئلے کے دوسرے متعلقات پر عملدرآمد نہ ہوسکا، یہاں تدبیر و حکمت کی ضرورت تھی۔

مولانا مرحوم نیوٹاؤن کی جس دیدہ زیب مسجد کے متولّی اور مدرسہ عربیہ کے مہتمم تھے۔ وہ مدرسہ اور مسجد دونوں عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، میں نے ایک بار دیکھا کہ امریکہ کے سیاح مسجد کے فوٹو اتار رہے ہیں مگر پھر فوٹو کی ممانعت کر دی گئی! نیوٹاؤن کا دارالعلوم مولانا یوسف بنوری کی جدوجہد اور اخلاص کے سہارے پروان چڑھا۔ مولانا کی دیانت تقویٰ اور علم و فضل کے سب معترف اور مداح تھے۔

کئی برس سے مولانا کا یہ معمول تھا کہ رمضان حرمین شریفین میں گزارتے اور مسجدِ نبوی میں اعتکاف کی سعادت انہیں میسّر آتی۔ اُن کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا —— درد کی شدّت ہوتی تو دوسرے آدمی کے سہارے چل کر مسجد میں آکر جماعت میں شریک ہوتے۔ کشتہ سازی اور طرح طرح کی معجون اور خمیرے بنانے کا فن انہیں اپنے والدِ محترم سے ورثہ میں ملا تھا، اُن کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تو تقریباً ۶۷ برس کی عمر میں دوسری شادی کی اور سال ڈیڑھ سال کا بچہ آخری یادگار چھوڑا۔

ختمِ نبوّت کے نام سے ٹرسٹ قائم کرنے کے سلسلہ میں بعض مسلمان حکومتوں میں اُن کا آنا جانا رہتا تھا، سُنا ہے کہ اس سلسلہ میں اُنہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

اپنے والدِ محترم کے بارے میں اُن کی وفات پر ماہنامہ بیّنات میں جو مضمون مولانا بنوریؒ نے لکھا تھا اُس پر تنقیدیں ہوئیں۔ اس مضمون میں کہیں کہیں الف لیلہ کا سا انداز پیدا ہوگیا تھا! جمال ناصر نے قاہرہ میں خاصے بڑے پیمانہ پر جو دینی کانفرنس کی تھی اس میں شرکت کے بعد مولانا پاکستان واپس آئے تو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے اُن سے دریافت کیا کہ قاہرہ میں فرعون کا مجسمہ تو آپ نے

دیکھا ہوگا۔ انہوں نے فرمایا میں نے ایسا کوئی مجسمہ نہیں دیکھا۔ دنیائے اسلام کے عظیم مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بارے میں انہوں نے مجلّہ بینات میں جو کچھ لکھا اور عربی میں ایک کتاب بھی مرتب فرمائی، اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے! "فاران" میں اس کی جھلکیاں آچکی ہیں۔

ڈھائی تین مہینے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے انہیں اسلامی کونسل کا رکن مقرر کیا تھا۔ اسی سلسلے میں مولانا مرحوم اسلام آباد گئے ہوئے تھے، وہیں حرکتِ قلب بند ہونے سے موت واقع ہوگئی۔ ان کی وفات پر دینی حلقوں میں کہرام برپا ہو گیا، اخبارات نے تعزیت کے ساتھ زبردست خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ اس قحط الرجال میں مولانا محمد یوسف بنوری کی وفات علم و اخلاق کا بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کے مدارج بلند فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۷۷ء)

شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف

یہ اب سے تقریباً ۲۰-۲۸ سال پہلے کی بات ہے ، "مجلہ ترجمان القرآن" اُن دنوں حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جدوجہد کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا جو تبلیغی جماعت کا غالباً سب سے پہلا عمومی تعارف تھا۔ یہ سعادت مولانا مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" کے حصہ میں آئی۔ مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف نے تبلیغی جماعت کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ، میں نے ان کا نام سب سے پہلے (غالباً) ۱۹۴۹ء میں اس عنوان سے سنا کہ سکھر میں تبلیغی جماعت کے جلسے ہو رہے تھے وہاں جماعت اسلامی کی کتابوں کی دکان بھی قائم تھی۔ مولانا مرحوم نے جماعت کی بک اسٹال کو جلسہ گاہ سے اٹھوا دیا اس خبر کو سن ——— یہ حقیقت معاً سامنے آئی کہ اونچے درجہ کے لوگوں کو بھی بعض معاملات میں غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔

کراچی میں مکی مسجد تبلیغی جماعت کا مرکز ہے۔ میں جس فلیٹ میں رہتا ہوں ، وہاں سے یہ مسجد بہت سے بہت دو فرلانگ کے فاصلے پر ہوگی جمعہ کی نماز زیادہ تر اسی مسجد میں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف کی تقریر کئی بار اسی مسجد میں سُنی۔ ایک بار اُن کی قیام گاہ پر خاص طور سے تعارف بھی ہوا ، بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور خاکسار کو قدرے غور سے دیکھا۔ اُن کی آخری بار زیارت کو بھی دو سال ہو رہے ہیں۔ اپنی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ ہارون الرشید کے کئی بیٹے تھے ایک بیٹے نے تخت و تاج کو چھوڑ کر مصلیٰ سنبھالا۔ حضرت مولانا مرحوم نے اپنے وعظ میں ایثار کا درس دیتے ہوئے یہ بھی کہا ——— کہ ——— "مزدلے دلوے ، لیوے نہیں" ——— ان کے وعظ و ارشادات کا خلاصہ اور لب لباب یہ تھا کہ لوگ ایثار سے کام لیں اور لینے کے بجائے دینے کا جذبہ رکھیں تو ایسا کرنے سے ایک طرف نفس کا تزکیہ ہوگا اور دوسری طرف نفسا نفسی اور معیشت و مسابقت کی رسہ کشی سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اُن کے وعظ کے دوران یہ خیال ابھرا کہ ہارون الرشید کا کیا کوئی ایسا لڑکا بھی تھا جس نے تخت و تاج چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی اور مزدور کا کام کر کے اپنی مزدوری وصول نہ کرے گا

تو بے چارہ کھلئے گا کیا! مگر معاً ذہن اس طرف گیا کہ وعظ و نصیحت میں نیکی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ایسی باتوں کو گوارا کر لیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغی جماعت کے کام کو جس مقام پر چھوڑا تھا اُن کے لائق جانشین اور سعادت مند فرزند مولانا محمد یوسف نے اُسے منزلوں آگے پہنچا دیا۔ مولانا الیاس صاحبؒ اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ تبلیغی وفود کو یورپ، امریکہ اور جاپان تک میں گشت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ مولانا مرحوم کی پیش گوئی صحیح اور مطابق واقعہ ثابت ہو کر رہی۔ اہل اللہ کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ بعض اوقات آنے والے واقعات اُن کے آئینۂ ادراک میں منعکس ہو جاتے ہیں۔

کراچی کی کئی مسجد میں ہر طرف سے تبلیغی جماعتیں آتی رہتی ہیں۔ اُن کے خلوص و ایثار، تواضع فروتنی، ذکر و شغل اور نماز سے شغف کو دیکھ کر طبیعت اثر قبول کرتی ہے۔ ایک بار راقم الحروف بھی تبلیغی جماعت کے وفد کے ہمراہ شہر سے باہر ملیر کی بستی میں گیا تھا اور ان نیک لوگوں کے ساتھ ایک رات گزاری تھی۔

کوئی شک نہیں تبلیغی جماعت کی جد و جہد سے لاکھوں مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت ہوئی ہے۔ دنیا کے گوشوں میں ان کے وفود جاتے ہیں اور اچھے اثرات چھوڑ کر آتے ہیں۔ ان کے دینی عقائد بھی صحیح ہیں۔ مشرکانہ رسوم و بدعات جن کا مسلمانوں میں خاصا چلن ہے، اُن سے کوسوں دور! بے نمازیوں کو نمازی بنا دینا اور جو نمازی ہیں اُن کی نماز درست کر دینا اس معصیت زدہ دور میں یہ عظیم الشان کارنامہ تبلیغی جماعت کی کوششوں سے انجام دیا جا رہا ہے۔ اسلام کا جامع تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے جس میں سیاست و حکومت بھی شامل ہے۔ تبلیغی جماعت سیاست و حکومت کے مسائل سے عملاً کوئی سروکار نہیں رکھتی، اس معاملے میں ان حضرات سے اُلجھنا نہیں چاہیے۔ دنیا کے پردے پر جہاں کہیں اور جب بھی اسلامی نظام برپا ہوگا، اس کی مشین کے لیے اچھے پرزے بے نمازیوں اور فاسقوں اور فاجروں کی ٹولیوں سے نہیں، انہیں مبلغین صلوٰۃ و تقویٰ سے لیے جائیں گے۔

خانقاہی اصطلاح میں جسے "شیخِ وقت" کہا جاتا ہے، یہ لقب حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو ہر طرح زیب دیتا ہے۔ اس زمانہ میں ذکر و شغل کے وہ سب سے بڑے

مبلّغ تھے۔ کوئی شک نہیں اُن کی ذات سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا۔ پاکستان تقریباً ہر سال آتے، رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت کا اجتماع قابلِ دید ہوتا، مولانا مرحوم جہاں جاتے، وعظ سے نماز کے چرچے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ماحول منوّر اور معطّر ہو جاتا۔ اُن کے وعظ کا خاص انداز تھا، سادہ لب و لہجہ مگر پُر سوز اور اثر انگیز! لاہور میں تبلیغی دورے پر آئے ہوئے تھے کہ پچاس سال کی عمر میں عالمِ قدس سے بلاوا آپہنچا۔ موت ہر جان کے لیے مقدر کر دی گئی ہے، اس عالم گیر قانون سے اخیار تک کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت برزخ و آخرت کی ہر منزل میں ان کی رفاقت فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۶۵ء)

محمد یوسف صدیقی

حیدرآباد دکن کے زمانۂ قیام میں راقم الحروف سال ڈیڑھ سال کے بعد وطن ضرور آتا تھا۔ اس سفر سے بڑا سکون اور نشاطِ خاطر حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے میں حیدرآباد دکن سے وطن آیا ہوا تھا، وہیں کے پتے پر ریاست ٹونک کی بزمِ ادب کے مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ دعوت نامہ ایسے تنگ وقت میں ملا کہ منتظمینِ مشاعرہ سے شرائط وغیرہ طے کرنے کے لیے مراسلت کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ میں آرہا ہوں۔

بہت دنوں کی بات ہے یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ میں جےپور کے راستے سے یا سوائی مادھوپور ہوکر نوائی پہنچا۔ نوائی جے پور اسٹیٹ ریلوے لائن پر چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ یہاں اتر کر لاری یا موٹر کار سے شہر ٹونک پہنچتے تھے۔ ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں مرحوم ریاست ٹونک کے فرمانروا تھے۔ انہی کی سالگرہ کی تقریب پر طرحی مشاعرہ[1] منعقد ہوا تھا۔ ٹونک میں کئی دن قیام رہا، شاعروں کو سرکاری طور پر ریسٹ ہاؤس یا گیسٹ ہاؤس میں ٹھیرایا گیا! اس مشاعرے کے علاوہ شہر کے رؤسا کے یہاں ادبی نشستیں اور دعوتیں بھی رہیں! نواب سعادت علی خاں کے ساتھ ایک دن شکار کے لیے بھی سفر کیا۔ ملک مجید ان دنوں ٹونک میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔ ان کے پاس پرانی اور خستہ موٹر کار تھی مگر ٹونک میں جہاں بیلوں کے تانگے سواری کے لیے استعمال ہوتے تھے، یہ موٹر بڑی چیز تھی۔

شاہی محل (نذری باغ) میں آتے جاتے ایک خوش شکل صاحب سے ضرور ملاقات

---

[1] میری طرحی غزل کے تین شعر:

بیمارِ ہجر نیند قیامت کی سو گیا — آنکھوں میں انتظار کی دنیا لیے ہوئے
اے دستِ چاک دامنِ یوسف کا واسطہ — آجا کبھی تو دستِ زلیخا لیے ہوئے
ساقی کی چشمِ مست نے پھر لڑکھڑا دیا — اٹھا تھا لغزشوں کا سہارا لیے ہوئے

ہوئی، یوسف صدیقی اُن کا نام بتایا گیا تھا۔ ہز ہائی نس کے امورِ خانگی کے وہ سکریٹری تھے سننے میں آیا کہ نواب صاحب کے معتمد علیہ ہیں۔ دیانت دار اور فرض شناس ہیں۔ نوابوں اور راجوں مہاراجوں کے یہاں جو تفریحات ہوا کرتی ہیں، اُن میں یوسف صاحب شریک نہیں ہوتے، سوائے اس کے کہ ریاست کے کسی ضروری کام سے ان محفلوں میں جانا پڑ جائے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جماعت اسلامی ہند کے رسالے آنے لگے تو ان سے پتا چلا کہ وہی محمد یوسف صدیقی جن سے ٹونک میں ملاقات ہوئی تھی، جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے ہیں اور ہمہ وقتی کارکن اور شہر دلی میں اُن کا قیام رہتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں دلی کلاتھ مل کے "پاک و ہند مشاعرے" میں راقم الحروف کا جانا نکل آیا، مولانا ابواللیث اُن دنوں جماعت اسلامی ہند کے امیر تھے۔ محلہ سوئی والان میں ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ اس میں جماعت اسلامی کا دفتر اور دارالاشاعت تھا، امیرِ جماعت بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ دو تین بار وہاں جانا ہوا، چلئے نوشی اور شعری نشست بھی رہی، وہیں یوسف صدیقی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے، اب وہ بالکل بدلے ہوئے تھے چہرے پر داڑھی تھی، وضع قطع سادہ! دینی انقلاب اُن کے بشرے سے نمایاں تھا، باطنی پاکیزگی کا وہ مظاہرہ نہیں کرتے تھے مگر وہ چھپ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر میں دلی کے مشاعرے کے بعد وطن گیا اور وہاں سے ٹونک، مولوی حبیب الدین صاحب وکیل نے بڑی فراخدلی اور سیر چشمی کے ساتھ پذیرائی اور میزبانی فرمائی۔ ٹونک کے نامور شاعر حضرت کیف ٹونکی کے پوتے جناب عمر سیفی نے "ٹونک میں ماہر القادری کے ڈھائی دن" کے عنوان سے دلچسپ مضمون لکھ کر چھپوایا۔ محمد یوسف صدیقی بھی اُن دنوں ٹونک میں آئے ہوئے تھے، مرحوم نے راقم الحروف کی پرتکلف دعوت کی جس میں سوائی مادھوپور کے رفقائے جماعت بھی شریک تھے۔ جب میں ۱۹۶۱ء میں مدراس گیا تھا وہاں بھی ایک دعوت میں کیرالہ کے ارکانِ جماعت مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ دین ہی کی نسبت سے یہ حضرات مجھ بے عمل سے محبت کرتے ہیں اور میں دل میں ندامت محسوس کرتا ہوں۔

اُن سے آخری بار ملاقات کراچی ایرپورٹ پر ہوئی۔ تین برس پہلے کی بات ہے وہ زیارتِ روضۂ رسولؐ اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد دلی جانے کے لیے کراچی آئے۔ شہر

میں جانے کی انہیں اجازت نہیں ملی۔ ایئرپورٹ پر ایئرلائن کے ریسٹ ہاؤس میں لمبی گھنٹے قیام کیا۔ حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کی معیت میں راقم الحروف اُن سے جاکر ملا۔ یون گھنٹہ کے قریب بات چیت رہی، زیادہ دیر اس لیے نہیں بیٹھا کہ اُن کے اعزا ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے، مجھ سے زیادہ وہ لوگ یوسف صاحب کی معیت وقربت کے مستحق تھے ـــــــ مرحوم کے چہرے سے پیرانہ سالی کے آثار نمایاں تھے اگرچہ دین کی خدمت کے لیے ہمت جوان تھی شاید چوٹ لگنے کے سبب وہ تکلف کے ساتھ چلتے تھے۔ پھر یہ حادثہ بھی پیش آیا کہ ہندوستان میں جماعت اسلامی کالعدم قرار دے دی گئی اگرچہ کروڑوں مسلمانوں کے دلوں میں وہ گھر کیے ہوئے ہے۔ سنا ہے یوسف صدیقی اندرا گاندھی سے ملے۔ شریمتی نے فرمایا کہ جماعت اسلامی تو ہماری (Good Book) میں ہے مگر جن سنگھ، ہندو مہاسبھا جیسی ہندو تنظیموں پر جو پابندی لگائی گئی ہے اس توازن کے لیے جماعت اسلامی پر ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اس توازن کا کیا جواب ہے۔

محمد یوسف صدیقی مرحوم خوشحال اور معزز گھرانے کے فرد تھے۔ ملازمت کا تعلق ہز ہائی نس نواب صاحب ٹونک کے خانگی امور سے تھا، اور یہ خاصا باعزت عہدہ تھا، وہ زمیندار بھی تھے، ٹونک میں اُن کا مکان دومنزلہ اور شاندار تھا، جماعت اسلامی میں آنے کے بعد اُن کی سیرت وکردار میں نکھار پیدا ہوگیا۔ جماعت کے اکابر میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ جماعت اسلامی ہند کے انگریزی آرگن (Radiance) کے وہ ایڈیٹر تھے۔ انگریزی کے بلند پایہ صحافی اور انشاپرداز تھے (Radiance) ہر طبقہ میں مقبول تھا۔ سفارت خانوں میں خاص طور سے یہ اخبار پڑھا جاتا۔ اس اخبار کی رائے کا لوگ وزن محسوس کرسکتے تھے اور اس کی اطلاعات کو قابل اعتماد سمجھتے تھے۔

کاتب تقدیر نے اُن کی جتنی عمر اور دانہ پانی لکھ دیا تھا ٹھیک اُسی کے مطابق وہ دنیا سے رخصت ہوئے، اللہ تعالیٰ برزخ وآخرت میں اُن کے درجات بلند فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۷۶ء)

ڈاکٹر محمود حسین خاں

اس بات کو کم و بیش پچیس برس ہوئے ہوں گے، ڈاکٹر محمود حسین خاں حکومت پاکستان میں نائب وزیر تھے اور صدر سے کینٹ اسٹیشن کو جو سڑک جاتی ہے اس کے ایک بنگلہ میں فروکش تھے۔ مشہور شاعر فضل کریم فضلی ان دنوں مشرقی بنگال میں محکمہ تعلیمات کے سکریٹری تھے وہ کراچی آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے یہاں اُن کا قیام تھا۔ میں فضلی صاحب سے ملنے کے لیے صبح سویرے گیا، ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم سے پہلی بار ملاقات ہوئی محبت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ مصافحہ اور ناشتے میں اپنے ساتھ شریک ہونے کے لیے اصرار کیا۔

ابھی تک ریاستیں پاکستان میں ضم نہیں ہوئی تھیں، ریاست خیرپور میں مسٹر ممتاز حسن قزلباش وزیر اعظم اور اسٹیٹ کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ریاست کے فرماں روا کم سن تھے اور لندن میں تعلیم پا رہے تھے۔ قزلباش مرحوم کی حیثیت وزیر اعظم اور نائب السلطنت (ریجنٹ) کی تھی۔ خیرپور میں اردو کانفرنس اور بڑے دھوم دھام کا کل پاکستان مشاعرہ ہوا۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں اور بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ قزلباش صاحب نے تمام شاعروں اور مندوبین کو پر تکلف ظہرانہ دیا، خیرپور کی دعوتوں میں ڈاکٹر صاحب مرحوم سے بات چیت اور تبادلۂ خیال کا تھوڑا بہت موقع ملا۔

ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم جب تعلیمات کے وزیر تھے اور کلفٹن کے پل کے قریب کوٹھی میں رہتے تھے تو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اُن سے ملاقات کے لیے ایک وفد ترتیب دیا، جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے ارکان وفد کی گفتگو اردو کے مسائل پر بڑے دوستانہ ماحول میں ہوئی مگر اُن کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اردو زبان کے وہ انتہائی ہمدرد تھے لیکن مرکز کی پالیسی اور ہدایت اور عہدے کی ذمہ داریاں زنجیرِ پا ثابت ہوئیں۔

اس چوبیس پچیس برس کی مدت میں ڈاکٹر صاحب سے کسی نہ کسی دعوت یا ادبی تقریب میں ملنا جلنا رہتا، سلام میں وہ خود تقدیم کرتے اور برابر کے دوستوں کی طرح

ملتے! جامعہ ملیہ میں بھی آئے دن جلسے اور مشاعرے ہوتے رہتے اور ہر تقریب میں ڈاکٹر صاحب ضرور ہوتے۔ اپنے یہاں شادی بیاہ کی ایک دو تقریبوں میں بھی راقم الحروف کو یاد فرمایا۔

جامعہ ملیہ تنہا انہی کی کوششوں کی زندہ یادگار ہے۔ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں بنیں، مختلف تعلیمی شعبے قائم ہوئے، سائنس کی عملی تعلیم کے لیے قیمتی آلات خریدے گئے مگر عین شباب کے عالم میں یہ ادارہ حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور ڈاکٹر صاحب کا عمل دخل ختم ہوگیا، اب یہ تو ماہرین تعلیم اور جامعہ ملیہ کے طلباء اور معلمین ہی بتائیں گے کہ ماضی حال سے بہتر تھا یا حال ماضی سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر صاحب بالطبع شریف تھے۔ مذہب سے وہ اجنبی اور بیگانے نہ تھے۔ جامعہ ملیہ سے ہزارہا لڑکیوں اور لڑکوں نے فیض حاصل کیا۔ اُن کی یہ تعلیمی کوششیں سراہنے کے قابل ہیں۔ مگر جامعہ ملیہ اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر نمونہ کی تربیت گاہ نہ بن سکی۔ جامعہ ملیہ میں بعض ایسے بھی اساتذہ شامل ہوگئے تھے جو مذہبی نہ تھے اور کمیونزم کی جانب اُن کا رجحان تھا۔ ڈاکٹر صاحب ان کو علیحدہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے والد مولوی فدا حسین حیدرآباد دکن میں وکیل تھے اور قانون کے جریدے کے ایڈیٹر تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم اُن کے سب سے بڑے بھائی تھے اُن کا انتقال جب ہوا تو وہ بھارت راج کے راشٹر پتی تھے۔ دوسرے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہ چکے ہیں اور متعدد ادبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا تھا، اُن کی ملازمت کا آغاز ڈھاکہ یونیورسٹی میں تاریخ کے لیکچرار کی حیثیت سے ہوا، پھر وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ دو برس پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم رہے۔ ڈھاکہ اور کراچی کی یونیورسٹیوں کی وائس چانسلری بھی اُن کی رہین منت ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے حالات اس قدر پیچیدہ اور عجیب ہوگئے کہ ڈاکٹر صاحب نے کئی بار اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کی کوشش کی مگر اُن جیسے مخلص، مرنجاں مرنج اور ماہرین تعلیم کا ملنا بہت دشوار نظر آیا۔ اس افسوسناک واقعہ کو ایک برس ہو رہا ہے کہ کراچی یونیورسٹی میں اشتراکی اور لادینی رجحان رکھنے والے طلباء نے بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا جس کے صدمے سے ڈاکٹر صاحب کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی اور وہ دل کے دورے سے بیہوش ہوگئے۔

اسلامی جمعیتِ طلبہ کی شرافت، تعلیمی شغف اور اخلاقی موقف کے ڈاکٹر صاحب مرحوم مداح تھے مگر جمعیتِ طلبہ کا مخالف گروہ جو غنڈہ گردی میں پیش پیش تھا، اس کے خلاف خاطر خواہ سخت اور جراٴت مندانہ قدم وہ نہ اٹھا سکے۔ جہاں تک علمی قابلیت کا تعلق ہے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا پلّہ بھاری تھا مگر انتظامی معاملات میں ڈاکٹر محمود حسین خاں ڈاکٹر قریشی سے بڑھ کر تھے۔

ڈاکٹر محمود حسین خاں اپنی کوٹھی کے ایک مختصر حصے (Out House) میں رہتے تھے ان کے لباس، غذا اور رہن سہن کا انداز بہت سادہ تھا اور اس کا سبب کوئی مالی دشواری نہ تھی بلکہ وہ مصارف اور خرچ اخراجات کے معاملے میں خاصے محتاط اور جزرس واقع ہوئے تھے۔

جلسوں اور دعوتوں میں اُن سے ملاقات ہوتی تو سیاست اور زبان وادب کے مسائل پر تھوڑا بہت تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ اُن کے مرنے سے چند ماہ پہلے حمایت علی شاعر کے مجموعۂ کلام (مٹی کا قرض) کی رونمائی ہوئی، ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم اس تقریب کے صدر تھے۔ انہوں نے خاصی متوازن تقریر کی اور آخر میں فرمایا کہ عقل ہی مسائل کا فیصلہ کرنے میں حَکَم اور آخری معیار ہے۔ اس پر ترقی پسند گروپ نے خوب تالیاں بجائیں۔ جلسے کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ عقل کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے ہے مگر انسانی عقول غلطیاں بھی کر جاتی ہیں اس لیے وہ حَکَم نہیں بن سکتیں، ہاں! وحیِ الٰہی میں غلطی نہیں ہوتی اور عقل کو وحیِ الٰہی کے تابع ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات کی تائید میں کچھ کہا میں نے عرض کیا کہ انگلستان کے عقلاء اور دانشوروں نے "(Sodomy)" جیسے فعلِ شنیع کو قانونی طور پر جائز قرار دیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی عقل کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتی ہے —— اس تقریب میں اس سے زیادہ گفتگو کا محل نہ تھا۔

ڈاکٹر محمود حسین خاں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ روسو کی مشہور تصنیف (معاہدۂ عمرانی) (Social Contract) کا انھوں نے ترجمہ کیا جس پر "فاران" میں تبصرہ آ چکا ہے۔ وہ صلح کل انسان تھے ان کی شرافت کا سب کو اعتراف تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات کو ہر طبقے میں ملک و ملت کے نقصان کی حیثیت سے محسوس کیا گیا۔ غفرلہ اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۷۵ء)

مرزا محمود سرحدی

"یادِ رفتگاں" کے یہ اوراق لکھ کر ختم ہی کیے تھے کہ روزنامہ "جنگ" میں محمود سرحدی کے انتقال کی خبر پڑھی، ہائے! سوگواری اور تعزیت کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ! مگر کیا کیا جائے، موت سے تو کسی کو بھی مفر نہیں، یہ دن تو ہر کسی کو دیکھنا ہے۔

محمود سرحدی مرحوم سے پاکستان پہنچنے کے بعد تعارف ہوا، مشاعروں میں اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، دو سال ہوئے آخری بار اُن سے ملاقات کسٹم کے کل پاکستان مشاعرے میں ہوئی۔ بیماری کی حالت میں انہوں نے پشاور سے کراچی کا طویل سفر برداشت کیا اور کلیجہ تھام تھام کر مشاعرے میں اپنا کلام سنایا!

حکومتِ پاکستان سے انہیں وظیفہ ملتا تھا، مگر شاعری میں حکومت اور معاشرے پر طنز کرنے سے نہ چوکتے۔ "رویتِ ہلال" کے سلسلے میں انہوں نے ایک قطعہ کہا تھا جس کا چوتھا مصرع یاد رہ گیا ہے —— ہمارے ڈپٹی کمشنر نے چاند دیکھا ہے

طنز و مزاح میں ان کے قطعے زبان و بیان اور خیال و اظہار کی خوبیوں کے اعتبار سے اپنی آپ مثال ہیں، یہ اردو زبان کا کمال بلکہ اُس کی کرامت ہے کہ سرحد میں ایک شخص نشو و نما پاتا ہے اور اس کی زبان پر میرؔ، انیسؔ اور داغؔ کی زبان اور روزمرہ کا گمان ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

پکارنے کا قرینہ میں سوچتا ہی رہا حسین ہے کہ حسینہ میں سوچتا ہی رہا
دمِ وداع نمی تھی جو اُس کے دامن پر یہ اشک ہیں کہ پسینہ میں سوچتا ہی رہا

اخبار میں اُن کی عمر ۶۵ سال کی بتائی گئی ہے، مگر چہرے مہرے سے اس عمر سے آٹھ دس برس کم کے لگتے تھے، مشاعروں میں خواتین کلام سنائیں تو آنکھوں آنکھوں ہی میں بہت کچھ کہہ جاتے، لباس اور وضع قطع سادہ، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے کمالِ فن کا کوئی احساس نہیں۔ موت نے اس چہکتے ہوئے بلبل کو بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا —— اللہ تعالیٰ ان اہلِ کمال کی مغفرت فرمائے۔ آمین

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۶۸ء)

علامہ محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی

علامہ محوی صدیقی لکھنوی کا کلام اور مضامین تو نظر سے گزرے تھے مگر اُن سے تعارف کا شرف مدراس میں حاصل ہوا، جب ظفر الملت مولانا ظفر علی خاں اور راقم الحروف آل انڈیا اردو کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کے لیے مدراس گئے تھے سن غالباً ۱۹۴۱ء ہو گا۔ علامہ مرحوم بڑی محبت و شفقت سے ملے اور مصافحہ و معانقہ میں خاصی گرمجوشی کا اظہار کیا! مجھے یاد پڑتا ہے اس کے بعد وانمباڑی (صوبہ مدراس) کے ایک مشاعرے میں اُن سے نیاز حاصل ہوا تھا۔

مولانا مرحوم ۱۸۹۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے[۱] اُن کی ابتدائی تعلیم گھر کے علاوہ فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسے میں ہوئی! اپنے والد ماجد کے ساتھ اُن کا بھوپال آنا ہوا، یہ اُن کی جوانی کا زمانہ تھا، بھوپال کے سرکاری مدارس سے فارسی اور عربی کی باضابطہ سندِ فضیلت حاصل کی، شوقِ قدردانی سے علامہ محوی لکھنوی کو شرفِ تلمذ حاصل تھا! ۱۹۱۱ء میں ماہنامہ "الناظر" کے نائب مدیر ہو گئے، مولانا ظفر الملک علوی اُن کو بہت چاہتے تھے اور مرحوم کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی قدر کرتے تھے۔

علامہ محوی کے والد جب بیمار پڑے تو اُن کی عیادت کے لیے مولانا محوی کو بھوپال آنا پڑا۔ اُن کے آنے کی سرکاری حلقوں میں خبر ہوئی تو دفتر تاریخ میں عربی کے مترجم کی پوسٹ پر اُن کا تقرر کیا گیا، مولانا آزاد سبحانی کے مدرسہ الٰہیات میں بھی انھوں نے عربی ادب کی تعلیم دی ہے! بابائے اردو مولوی عبدالحق کے اصرار پر مرحوم مدراس تشریف لے گئے اور بائیس برس کا زمانہ وہاں گزارا۔ وہاں مدراس یونیورسٹی کی نگرانی میں اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ قائم تھا، اُس میں اُردو، عربی اور فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے علامہ محوی کا تقرر عمل میں آیا۔ تقسیم ہند کے پانچ برس بعد ۱۹۵۲ء میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے! ملازمت سے سبکدوشی کے بعد میل وشارم (ضلع ارکاٹ، صوبہ مدراس)

---

[۱] سالِ پیدائش غالباً ۱۸۸۱ء ہے۔

سے "الارشاد" اور "معیار ادب" دو رسالے جاری کیے اگرچہ وہ صوبہ مدراس سے لکھنؤ منتقل ہو گئے، یہ دونوں رسالے لکھنؤ سے چند مہینے نکل کر بند ہو گئے ۱۸، نومبر ۱۹۷۵ء کو بمبئی میں ان کا انتقال ہوا۔ تصنیف و تالیف کا کام آخر دم تک جاری رہا۔ بھوپال کے دارالعلوم الہٰیہ کے وہ منتظم و نگراں بھی رہے۔

راقم الحروف سے آخری ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں ماہنامہ شاعر کا جشن سیمیں منایا گیا، اس سلسلہ میں پاک و ہند مشاعرہ بھی ہوا، علامہ محوی بھی بھوپال سے تشریف لائے مگر پیرانہ سالی اور ضعف کا یہ عالم تھا کہ بولنے اور پڑھنے میں آواز کپکپاتی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

مولانا محوی مرحوم کی تیرہ کتابیں چھپ چکی ہیں اُن سے تقریباً دگنی کتابوں کے مسودے منیر کی درازوں اور الماریوں میں منتقل رہے اُن کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ صوبہ مدراس میں اردو کی شمع مولینا محوی ہی کے دم سے فروزاں رہی، میں مدراس کے جن شاعروں سے ملا، سب کو علامہ محوی کا شاگرد پایا! ملا رموزی، جلیل قدوائی، ثاقب کانپوری، فہمی ترمذی بھوپالی، حفیظ مالیگانوی، سرشار کسمنڈوی، محمود ایاز بنگلوری جیسے مشہور شعراء، شاعری میں علامہ محوی کے شاگرد تھے۔

اُن کی وفات کی اطلاع اُن کے صاحبزادے کے بھیجے ہوئے مطبوعہ کارڈ سے ملی:

آستانۂ محوی

از گوجر پورہ بھوپال

آپ حضرات کو یہ معلوم کر کے یقیناً دکھ ہوگا کہ قبلہ محترم والد بزرگوار حضرت علامہ جناب محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی نے بعمر ۹۵ سال ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو بروز بدھ بوقت سوا آٹھ بجے صبح داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُمید ہے کہ آں محترم یہ خبر پا کر حضرت قبلہ کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں گے ——— غمگین ——— منیر المحوی صدیقی

اس کے بعد جناب ممتاز مدراسی (ایڈووکیٹ) نے راولپنڈی سے مرحوم کے مختصر سوانح لکھ کر بھیجے، علامہ محوی صدیقی اپنی ذات سے علم و فن کی انجمن تھے۔ غفر اللہ تعالیٰ

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۶ء)

مخدوم محی الدین

مجھے یاد پڑتا ہے، جب عثمانیہ یونیورسٹی کے مشاعرے میں پہلی بار مخدوم محی الدین کو سُنا ہے تو وہ غالباً بی۔ اے میں پڑھتے تھے، سنہ یاد نہیں رہا، یہ اب سے تقریباً ۳۴-۳۵ سال پہلے کی بات ہے، پھر مشاعروں اور ادبی نشستوں میں اُن سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کمیونسٹ پارٹی سے اُن کا ابھی تک کوئی تعلق نہیں تھا مگر اُن کے سر کے لمبے لمبے بے ترتیب بال اور چہرے پر خاص قسم کی ژولیدگی اور خشونت پیش گوئی کر رہی تھی کہ یہ نوجوان "کامریڈ" بن کر رہے گا۔

مخدوم محی الدین، صاحبزادہ محمد علی خاں میکشؔ، سکندر علی وجدؔ اور نظرؔ حیدرآبادی۔ یہ چاروں نوجوان دکن کے ہم عصر شعرا تھے۔ نظرؔ ان سب میں کم سن تھے میکشؔ حیدرآبادی کی غزلوں کا مجموعہ اُن کے دَورِ شباب ہی میں شائع ہوا، اُن کے تغزل کا یہ رنگ تھا:

شراب ناب کو دوآتشہ بنا کے پلا — پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
گرتے گرتے اُن کا دامن تھام لے — گرنے والے لغزشوں سے کام لے

افسوس ہے عرفیؔ شیرازی کی طرح میکشؔ نے بہت ہی کم عمر پائی۔ زندہ رہتے تو شاعری میں اور زیادہ نام پیدا کرتے۔

نظرؔ حیدرآبادی دیارِ غربت (پاکستان) میں نذرِ اجل ہو گئے۔ مخدوم محی الدین اپنی شاعرانہ شہرت اور لیڈری کی بہاریں دیکھ کر رخصت ہوئے۔ سکندر علی وجدؔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندہ ہیں اور جنوبی ہند کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔

دکن میں دو بار مخدوم محی الدین کے ساتھ باہر کے مشاعروں میں بھی جانا ہوا۔ نلگنڈہ ضلع کا صدر مقام تھا، وہاں ہائی اسکول میں مشاعرہ تھا، تمام شعرا ایک ہی عمارت میں ٹھہرائے گئے۔ مخدومؔ کا ایک رات اور ایک دن ساتھ رہا، لباس کے معاملے میں وہ کچھ بے پروا سے تھے۔ نفاست اور تکلف سے اُن کے مزاج کو شاید مناسبت ہی نہ تھی۔

ایک بار نظام آباد کے مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے ایک ہی ٹرین سے سفر کیا، کاچی گوڑہ ریلوے اسٹیشن سے جب ٹرین روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا دوسرے شعراء تھرڈ میں ہیں۔ صرف میرے لیے منتظمین مشاعرہ نے سیکنڈ کلاس کا اہتمام کیا ہے۔ مجھ پر تفاخر کی بجائے کچھ ندامت جیسا عالم طاری تھا، اس خیال سے کہ دوسرے شعراء کچھ محسوس نہ کریں۔ میں کئی اسٹیشنوں تک تھرڈ میں دوسرے شاعروں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ مخدوم محی الدین اور نظر حیدر آبادی بھی اسی ڈبے میں تھے۔

پاکستان بننے کے بعد بمبئی اور دلی کے مشاعروں میں مخدوم محی الدین کا ساتھ رہا۔ بمبئی میں وہ کرافٹ مارکیٹ کے سامنے مل گئے۔ شاہد صدیقی بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ میں نے کہا کہ بمبئی کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہے۔ بولے جھانسی جا رہا ہوں۔ وہاں پارٹی کی ایک میٹنگ ہے۔ میں اُن کی بات ختم ہوتے ہی بول پڑا، تمہارا نام "محی الدین" ہے تمہیں تو دینِ اسلام کے لیے کام کرنا تھا، جواب میں فرمایا کہ ہم اسلام ہی کا کام کر رہے ہیں، اس پر میں اور شاہد صدیقی مرحوم مسکرانے لگے۔

مخدوم محی الدین سے آخری بار ملاقات سنہ ۱۹۶۴ء میں دلی کلاتھ ملز کے سالانہ مشاعرے میں ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اس کے بعد پھر ملنا نہ ہو سکا، یہاں تک کہ تین مہینے پہلے اُن کی رحلت کی خبر اخباروں میں پڑھی۔ اس سانحے نے نہ جانے اور کتنی چوٹوں کو ابھار دیا، اور حیدر آباد دکن کے عروج و زوال اور بہار و خزاں کا مرقع نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

مخدوم محی الدین ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہی نہیں صفِ اوّل کے لیڈر تھے۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری اور کنور اشرف سے بھی زیادہ فعال کارکن اور ان سے بڑھ کر اوِ نچے قائد! سنہ ۱۹۴۸ء میں وہ روپوش ہو گئے تھے۔ کئی سال خفیہ طور پر (Under Ground) دکن کی وادیوں، جنگلوں اور بستیوں میں کام کرتے رہے۔ ریاست کی پولیس پوری دوڑ دھوپ کے باوجود اُن کو پکڑنے میں ناکام رہی۔ پھر سنہ ۱۹۵۱ء میں جب وہ بلدہ حیدر آباد میں آئے ہیں تو اُن کا شاہانہ استقبال ہوا۔

مخدوم محی الدین جب اس قسم کے اشعار کہتے ہیں:

؎ فلک کے پیٹھ کے پیچھے سے آ رہا ہے قمر

اور اپنی نظموں میں قبر کے تختوں کی داب، جذام اور زخموں سے نکلتی ہوئی پیپ کا ذکر کرتے ہیں تو نام نہاد "ترقی پسندانہ شاعری" کی کمزوریوں کی نمائندگی کرتے ہیں، مگر جب اُن کی شاعری کا یہ رنگ ہوتا ہے :

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز!
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

تو وہ "بڑے شاعر" نظر آتے ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے بعد یہ دوسرے حیدر آبادی شخص ہیں، جن کو دکن سے باہر اتنی شہرت حاصل ہوئی۔

علی اختر مرحوم، مخدوم سے بڑے شاعر تھے مگر اُن کی موت پر خاموشی رہی۔ اخباروں میں بس ایک دو مضمون آ کر رہ گئے۔ مخدوم محی الدین کمیونسٹ تھے، اس نسبت اور تعلق کی بنا پر اُن کے ہم عقیدہ اور ہم مشرب شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے دھوم مچا دی!

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۹ء)

نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج

زندگی چاہے یقینی نہ ہو مگر موت یقینی چیز ہے، اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ضرور ہے۔ جب اللہ کے نبی اور رسول نہ رہے تو اور کون رہ سکتا ہے۔ زندگی کا قافلہ منزلِ فنا کی طرف چل رہا ہے بس آگے پیچھے کی بات ہے، کوئی منزل پر پہنچ چکا اور کوئی ابھی راہ میں ہے، میرا ہی شعر ہے ۔۔۔

جُز ذاتِ خداوند کہ ہے دائم و باقی
دُنیا میں سَدا کوئی رہا ہے نہ رہے گا

یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم کے مرنے کا یقین نہیں آتا۔ دفتر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے شاید وہ ملنے کے لیے آجائیں۔ میں نئے رسالے اور اخبار اُن کے سامنے پیش کروں، پھر سیاست و ادب پر گفتگو چھڑ جائے، "زبان" کے کسی مسئلے یا "لفظ" کی کسی تحقیق کے سلسلہ میں میری طرف سے جب یہ کہا جائے "ہمارے یہاں تو اس طرح بولتے ہیں" تو اس پر نواب صاحب طنز آمیز انداز میں فرمائیں "تم نے اپنے کور دیہہ وطن ــــ "کیسر" کو کیا کوئی اقلیم سمجھ رکھا ہے"! پھر ہم مل کر چائے پئیں ــــ ستمبر کا شمارہ شائع ہوا تو حسبِ معمول خیال آیا کہ نواب صاحب کے پاس نیا پرچہ لے کر جاؤں گا اور چند دن کے بعد جب ۔۔۔۔ پھر ملاقات ہو گی تو وہ ایک ایک مضمون پر تنقید کریں گے ۔۔۔۔ تمہارے نقشِ اوّل کا وہ حصہ کمزور ہے، فلاں بات تم نے خوب لکھی ہے ۔۔۔۔ افسانہ کا اٹھان اچھا ہے مگر آخر میں تم دھم سے زمین پر گر پڑے۔ اُن صاحب کا مقالہ بہت جاندار ہے میں نے اُسے بار بار پڑھا ــــ نظمیں اور غزلیں اوسط درجہ کی ہیں اور ماہر حیدر آباد سے چلے آنے کے بعد تمہاری شاعری میں وہ شوخی نہیں رہی ۔۔۔۔۔۔

کیا خبر بابِ حریمِ ناز وا ہو یا نہ ہو
بس یہی اک وہم تھا سنگِ گرانِ کوئے دوست

تمھارے یہ شعر کتنے دل نشین ہیں" ـــــ اس خیال سے چونکتا ہوں تو عقل دل کی اس انجمن آرائی پر مسکراتی ہے کہ نواب صاحب کہاں ؟ وہ تو اللہ کو پیارے ہو چکے، اور اے سخت جاں ماہرؔ تو نے تو اُن کے جنازے کو کاندھا دیا تھا اُن کے جنازے کی نماز پڑھی تھی اُن کی قبر پر مٹی ڈالی تھی، وہ چلے گئے ہمیشہ کے لیے چلے گئے اور ساری دنیا کی نوحہ گری بھی انھیں واپس نہیں لاسکتی۔

نواب نثار یار جنگ کا نام "نثار احمد" تھا، ساداتِ سبزواری کے معزز اور مستند خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے آباؤ اجداد شاہانِ مغلیہ کے دور میں ہندوستان آئے، دربارِ شاہی میں قدر و منزلت ہوئی، کئی گاؤں جاگیر کے طور پر عطا ہوئے مگر انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں امارت اور فراغ و آسودہ حالی کی یہ بساط ہی الٹ گئی۔

زانقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ

ازیں فسانہ ہزاراں ہزار دارد یاد

کہ آگہست کہ کاؤس و کے کجا رفتند

کہ واقف است کہ چوں رفت تختِ جم برباد

نواب صاحب مرحوم علی گڑھ (یو-پی) میں پیدا ہوئے، جامع مسجد کے نواحی محلہ اوپر کوٹ میں اُن کا آبائی مکان تھا، بہت ہی کم سنی میں وہ یتیم ہو گئے۔ بیوہ ماں نے بڑے حوصلے کے ساتھ اُن کی پرورش کی۔ نواب صاحب کہا کرتے تھے کہ " میری ماں نے مجھے خودداری کا سبق دیا اور مجھے گھٹی میں غیرت پلائی۔" غیرت مند ماں کے دودھ اور تربیت کا اثر اُن کی جبلت اور فطرت بن گیا، طبیعت کی اس خودداری اور غیرت کی بدولت انھیں بہت سے مالی نقصانات اٹھانا پڑے، دوستوں، ہم چشموں اور ہم جیسے خاک نشینوں کے وہ بے تکلف یار تھے، جاہ و منزلت کا فرق ہی محسوس نہ ہونے دیتے مگر متکبروں کو دیکھ کر " التکبر مع المتکبر صدقۃ " کی تصویر بن جاتے اور ان کا سرِ افتخار بلند تر ہو جاتا۔

آغازِ جوانی ہی میں نواب نثار یار جنگ مرحوم کو تلاشِ معاش کے لیے دیس چھوڑ کر پردیس جانا پڑا، بمبئی جب وہ پہنچے ہیں تو اُن کی مسیں بھیگ رہی تھیں، بمبئی میں انھوں نے ڈیڑھ دو سال رہ کر ایک اسکول میں ٹیچری کے فرائض انجام دیے، وہاں سے پھر

حیدرآباد چلے آئے ـــــ دکن میں انھوں نے تحصیلداری بھی کی ہے، دفترِ دیوانی میں اہلکار (کلرک) بھی رہے ہیں۔ منتظمی (آفس سپرنٹنڈنٹ) کی ذمہ داریوں کو بھی نباہا ہے۔ بابِ حکومت سرکارِ عالی (ایگزیکٹو کونسل حیدرآباد دکن) کے پہلے صدرِ اعظم سر علی امام مرحوم کی پیشی میں معتمد علیہ پیشکار کی حیثیت سے کام بھی کیا ہے۔

نواب صاحب مرحوم سر علی امام کے بڑے مدّاح تھے، اُن کی قابلیت، بیدار مغزی، مردم شناسی اور شرافت کی بہت تعریف کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ سر علی امام حیدرآباد کی سازشوں کا شکار ہو گئے۔ چاہ کن را چاہ در پیش" یہی سازشیں خود حیدرآباد دکن کے زوال کا باعث ہوئیں، نواب صاحب کہتے تھے کہ سر علی امام نے صدارتِ عظمیٰ سے استعفا جس وقت بارگاہِ خسروی[1] میں گزرانا تو اُس وقت سے کھانا پینا چھوڑ دیا، سر علی امام فرماتے تھے ریاست حیدرآباد دکن کی سرحد سے نکل کر کھاؤں گا پیوں گا! چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انھوں نے حیدرآباد چھوڑ دیا۔

سر علی امام کے جانے کے بعد نواب صاحب مرحوم محکمہ سیاسیات میں انڈر سیکرٹری ہو گئے، پھر دوم تعلقہ دار ہوئے اور پھر ضلع کے با اختیار حاکم (کلکٹر) بنا دیے گئے۔ دکن کی تعلقداری (کلکٹری) چھوٹی موٹی بادشاہت تھی، یوں سمجھیے کہ وہ چاندی سونے کے چبوترے پر بیٹھے تھے " دستِ غیب" کے قدم قدم پر موقعے حاصل تھے، مگر نواب صاحب مرحوم کی بلند فطرت، اسلامی حمیت اور مذہبی غیرت ان آلودگیوں کی پرچھائیں کو بھی گوارا نہ کر سکی، وہ لوگوں کے تحفے اور ڈالیاں تک قبول نہ کرتے تھے ـــــ اسی زمانہ میں بارگاہِ نظامی سے اُن کو "نثار یار جنگ" کا خطاب عنایت ہوا۔

ایسے خوددار، غیرت مند، بلند حوصلہ انسان بلکہ یوں کہیے مردِ مومن کو انگریز حکام کس طرح برداشت کر سکتے تھے، چنانچہ ان فرنگیوں کی بدولت جن کے چہرے گورے اور دل سیاہ ہوتے ہیں۔ نواب صاحب کو قبل از وقت وظیفہ (پنشن) پر ہٹ جانا پڑا، کوئی ڈیڑھ دو سال خانہ نشین رہے کہ پھر اِس وقت کے " راج پرمکھ" اور اُس زمانہ

---

[1] مگر اس انقلاب نے اس بساط ہی کو اُلٹ دیا، کہاں کی بارگاہ! اور کیسی خسروی؟ تاریخوں میں عروج و زوال کے جو افسانے پڑھے تھے، اُن کو ہم نے خود واقعات کی دنیا میں دیکھ لیا!

کے " اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ " نے انھیں اطرافِ بلدہ کا تعلقدار (کلکٹر) بنا دیا اور کئی سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے، پھر وہ اس خدمت سے بھی سبک دوش ہو گئے! یہاں تک کہ زوالِ حیدرآباد کے بعد اپنی شریکِ زندگی اور اپنے داماد قمر مقصود صاحب کے اہل و عیال اپنے برادرِ نسبتی اشرف میاں کے بال بچوں اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ کراچی آ گئے اور اسی خاک کا پیوند ہو کر رہ گئے۔

تعارف کے بعد

نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج سے غائبانہ تعارف اُن کے اس شعر کے ذریعہ ہوا:

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اس نے کہا تھا
کیا اس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں ہے

پھر ایک دن مہاراجہ سرکشن بہادر یمین السلطنۃ کے دربار میں اُن سے ملاقات بھی ہو گئی!

مرزا یاس یگانہ لکھنوی کی رباعیوں کے مجموعہ (ترانہ) پر میں نے ایک طویل تنقید لکھی تھی، فانیؔ بدایونی کو یہ تنقید بہت پسند آئی، وہ کہتے تھے کہ اس مقالہ کو کتابی صورت میں چھپنا چاہیے، مگر چھپتا کہاں سے! فانیؔ اور میں دونوں مل کر بھی ستر اسی روپیوں کا انتظام نہ کر سکے —— پھر یہ تنقید رسالہ " ساقی " میں شائع ہوئی اور اُس کے جواب میں مرزا یگانہ نے مجھے خوب خوب ملاحیاں سنائیں۔

تاریخ اور دن تو کیا مہینہ بھی یاد نہیں ہے، ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ یہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے میں ایک دن شام کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے یہاں گیا، وہاں فانیؔ بدایونی اور نواب نثار یار جنگ بہادر بھی تھے، فانیؔ مرحوم کے ایماء سے میں نے اس تنقید کا ایک حصہ مہاراجہ بہادر کو پڑھ کر سنایا، مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی سے میں لوٹا تو خوب رات ہو گئی تھی، میں شیروانی اُتار کر بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں دروازے پر موٹر رکنے کی آواز آئی پھر کسی نے دستک دی، میں باہر گیا تو حضرت فانیؔ اپنے ساتھ نواب نثار یار جنگ بہادر کو لیے کھڑے تھے، فانیؔ مسکراتے ہوئے بولے:

" بھئی! ماہر یہ نواب صاحب تمہاری تنقید سننے کے لیے آئے ہیں —— "

بس اُس ملاقات کے بعد تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے۔ ہر طلوع ہونے والی صبح نے

اس تعلقِ خاطر کو اور قریب تر کر دیا، نغمہ و رباب کی محفلوں سے لے کر خانقاہوں کے در و بام اور مسجدوں کے منبر و محراب تک ہمارے اخلاص کے شاہد ہیں، اس دُنیا میں دستوں کی کمی نہیں مگر بے غرض دوستی بہت کم یاب ہے، لوگ ذاتی منفعت کے پیمانہ سے تعلقات کو ناپتے ہیں، میرے اور نواب صاحب کے روابط میں کوئی غرض، طمع یا منفعت شریک نہ تھی، دوستی صرف دوستی! ایک دوسرے کی طبیعتیں بہت کچھ مل گئی تھیں۔

میں حیدرآباد دکن میں جب تک تھا قریب قریب روزانہ ملاقات ہوتی رہتی اور یہ ملاقات گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی نہیں، بعض اوقات سارے سارے دن اور پوری پوری رات تک کی ہوتی تھی، کھانا پینا، شعر شاعری، اور سیاست، مذہب، تصوّف اور ادب کے مسائل پر بحث مباحثہ، گفتگو، جرح و تنقید! نواب صاحب مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا، ذہن رسا اور فکر نکتہ سنج پائی تھی۔ طبیعت میں جودت اور شوخی بھی تھی، اس لیے ہماری علمی اور ادبی صحبتوں میں دوسرے لوگ بھی شامل ہو جاتے تو اکتانے نہ پاتے ـــــ گفتگو کے یہ موضوعات رنگا رنگ ـــــ ہوتے تھے۔ کسی دن خوشخطی کا ذکر چھڑ گیا تو ابن مُقلہ، میر عماد اور دہلی کے میر پنجہ کش سے لے کر دکن کے زمرد رقم اور دوسرے خطاطوں تک کے حالات اور اُن کے "آرٹ" پر گفتگو ہو جاتی ـــــ تصوّف کا ذکر نکلتا تو شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی عوارف المعارف اور مولانا رومؒ کی فیہ ما فیہ سے لے کر غوث علی شاہؒ پانی پتی کے تذکرہ غوثیہ تک پر گرما گرم بحث مباحثہ ہوتا، نواب صاحب وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس مسئلہ پر ہم دونوں میں خوب نوک جھونک رہتی، اس اٹھارہ سال کی دوستی میں بس ایک بار بہت تلخ گفتگو ہو گئی، کئی مہینے تک ایک دوسرے سے کھنچے رہے، لیکن پھر جو ملے تو اس طرح ٹوٹ کر ملے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا کھٹ پٹ کے بعد میل ملاپ میں بڑا لطف آتا ہے۔

ان صحبتوں میں علم و ادب اور شعر و شاعری ہی کا ذکر نہ ہوتا تھا، ان میں ہر کوئی اپنی زندگی کے اگلے پچھلے واقعات بھی بیان کرتا تھا، جہاں بے تکلفی اور یگانگت ہوتی ہے وہاں کیا کیا نہیں کہا جاتا، یعنی وہ باتیں بھی زبان پر آ جاتی ہیں جو سب کے سامنے نہیں کہی جاتیں، زندگی کی کتنی سیاہیاں اور رنگینیاں بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں جھلکنے لگتی ہیں ـــــ نواب دستگیر نواز جنگ خاطر مرحوم بھی اس محفل کی رُوحِ رواں

تھے۔ خاطر فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ تصوف اُن کی فطرت میں درج کیا تھا، خوش سلیقہ اور نفاست پسند تھے اور دوستوں کی دل دہی، خاطر داری بلکہ ناز برداری میں اپنی آپ نظیر! دو سال کے اندر اندر خاطر اور مزاج دونوں چل بسے، ماہر سخت جان رہ گیا ہے مگر کب تک!

؎ آیا آیا یاران رفتہ آیا

نواب نثار یار جنگ طبیعت کے سادہ تھے۔ خاک نشینوں کے ساتھ جھک کر اور بڑے آدمیوں سے تن کر ملنے والے! خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش طبع اور خوبصورت بھی! نازک ناک نقشہ تھا، گوری رنگت، جو کپڑا بھی پہن لیتے، جسم پر خوب پھبتا۔ جامہ زیبی کے ساتھ طبیعت میں نفاست بھی تھی، کھانے کے بہت شوقین تھے۔ مہمان نواز، سیر چشم، بامروت! اُن کا گھر مہمان خانہ ہی بنا رہتا، آئے دن دعوتیں اور جلسے[1]! ہاتھ کے سخی اور دل کے غنی، اپنی ضرورت روک کر دوسروں کی مالی امداد کرتے، اُن کی زندگی گوناگوں تجربوں اور طرح طرح کے انقلابوں سے گزری تھی مگر اس معاملہ میں بڑے بھولے تھے، ہر کوئی اپنی پریشانی کا ذکر کر کے اُن کو متاثر کر سکتا تھا —— اس طبیعت کے آدمی کے پاس روپیہ پیسہ جمع کہاں ہو سکتا ہے۔ ادھر تنخواہ ملی اور اُدھر خرچ ہو گئی یہاں تک کہ مہینے کے آخری دنوں میں بالکل قلاش ہو جاتے۔

نواب صاحب مرحوم کے یہاں دو ہی جذبے تھے محبت یا نفرت! جس سے محبت تھی اُس کے بندۂ بے دام اور جس سے نفرت و بیزاری اُس سے بات چیت کرنا بھی پسند نہ کرتے! اس معاملے میں انھوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کی بھی پروا نہیں کی، جب وہ صرف خاص کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے تو ایسا بھی ہوا کہ فوجداری کے مقدمہ میں ملزم پر اپنے اجلاس سے جرمانہ کیا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ ملزم جرمانہ ادا نہیں کر سکتا تو انھوں نے چپراسی یا اپنے پیش کار کی معرفت خود اپنے پاس سے جرمانہ کی رقم عدالت کے خزانہ میں جمع کرا دی اور ملزم چھوٹ گیا۔

مہاراجہ سرکشن بہادر کے یہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے، میں طرحی غزل کہہ کر اُن

---

[1] یہ لفظ "پارٹی" کے مفہوم میں اہلِ دکن بولتے ہیں اور یہی بولتے ہیں۔

کو سناتا تو کہتے تم مجھے غزل لکھ کر دو، پھر اس غزل پر بڑی دیر تک گفتگو رہتی، "اس لفظ کو بدلو ——— یہ مصرع چسپت نہیں ہے ——— یہاں یہ خامی رہ گئی" پھر وہ شعروں کو ترتیب وار لکھتے، یعنی مشاعرے میں جس ترتیب کے ساتھ پڑھنے چاہئیں، وہ کہتے تھے کہ غزل کے شعروں کو ترتیب کے ساتھ لکھنا بھی ایک فن ہے۔ حضرت داغ جب طرحی مشاعرہ کے لیے غزل کہتے تھے تو اُن کی غزل کی ترتیب دی جاتی تھی۔

میری غزل کا ایک شعر تھا:

اللہ اللہ! ترے جلووں کی بہار ہر جگہ انجمن آرائی ہے

نواب صاحب نے فرمایا "جگہ" کو بدلو یہاں "طرف" اچھا معلوم ہوتا ہے میں اس قسم کے مشوروں کو فوراً قبول کر لیتا، مگر بعض باتوں پر بڑی رد و کد رہتی اور خوب خوب بحثیں ہوتیں!

مشاہیر کے ساتھ

نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج مرحوم نے نامور اہل علم اور مشاہیر روزگار کی آنکھیں دیکھی تھیں، کہتے تھے سر سید خاں مرحوم نے بچپن میں بہ نظر شفقت آہستہ سے کان پکڑ کر ہلکی سی ایک چپت میرے لگائی تھی، فصیح الملک داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ مولانا حالی سے بھی وہ ملے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کی زبان سے ترنم کے ساتھ قومی نظمیں سنی ہیں۔ نواب محسن الملک اور جسٹس محمود کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ سر سید کے نامور پوتے سر راس مسعود مرحوم (نواب مسعود جنگ بہادر) اُن کے گہرے دوست تھے۔ سر راس مسعود اُن کو "پیارے نثار" لکھا کرتے تھے۔

میں حیدر آباد دکن سے کانپور کے مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے جا رہا تھا، بولے "ماہر! تم راستہ میں ایک دو دن کے لیے بھوپال اتر جاؤ، سر راس مسعود سے ملو، شعر و ادب کے وہ بہت بڑے قدر داں ہیں ———" پھر کہا "اچھا میری طرف سے اُن کو ایک تعارفی خط کا مسودہ لکھو" میں نے مسودہ لکھا، مسودہ پڑھا، اور مسکرا کر چاک کر دیا، فرمایا "بھئی! تم نے تو اس انداز میں اپنا تعارف کرایا ہے جیسے تم ماہر القادری نہیں شبلی نعمانی ہو۔" پھر خود تعارف نامہ لکھ کر مجھے دیا مگر میں بھوپال سے گزر گیا وہاں اترا نہیں۔

سر سید احمد خاں سے نواب صاحب مرحوم کافی متاثر تھے ان کی دردمندی اور اخلاص کے قائل تھے مگر ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف تھا کہ سر سید مرحوم سے قرآن کی تفسیر اور اسلام کی ترجمانی میں غلطیاں ہو گئی ہیں۔

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم سے حضرت ماہر کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے، قائدِ ملت مرحوم کی ڈیوڑھی (بیت الامت) میں ایک بار مجلسِ اتحاد المسلمین کے ایک مشورتی اجلاس کی صدارت بھی کی تھی ——— میں ۱۹۴۶ء میں آخری بار حیدر آباد دکن گیا تو میری خاطر اپنے یہاں ایک دعوت کا انتظام کیا، مجاہدِ دکن سید قاسم رضوی کو بھی بلایا اور قاسم رضوی نے اس مجلس میں اپنا کلام بھی سنایا ——— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعتِ اسلامی سے دلی تعلق اور گہرا ربط تھا اور اُن کے بڑے مداح تھے۔

دمِ آخر — نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم کی صحت پہلے ہی سے خراب تھی۔ کراچی میں آکر خراب تر ہو گئی، حیدر آباد دکن کے جس مکان کو انھوں نے چھوڑا ہے وہ اچھی خاصی وسیع اور آرام دہ کوٹھی تھی، یہاں کراچی میں آکر تنگ اور تکلیف دہ مکانوں میں رہنا پڑا، چند مہینے تو ایک خیمہ میں گزارے، اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی، اس خیمہ میں آگ لگ گئی، کئی سو روپیہ خیمہ والے کو دینے پڑے، حیدر آباد کی پنشن بھی بند ہو گئی تھی ——— سچ مچ "عالمِ غربت"! وہ کبھی تنہا نشین نہیں رہے، حیدر آباد میں دوستوں اور ملنے والوں کا جمگھٹا رہتا تھا، مگر یہاں یہ تنہائی اُن کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، ہم اُن کے دوست اور جاننے والے گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے اُن کے پاس ہو آتے، ایک دن مجھ سے بولے ..... ماہر! دماغ جواب دیتا جا رہا ہے، اب کتاب بھی مجھ سے نہیں پڑھی جاتی، میں تمہاری وجہ سے خدا کی قسم تمہاری وجہ سے کراچی آیا تھا، سو تمھیں اپنے کام سے فرصت نہیں ہے، میں شکایت نہیں کرتا تم بھی مجبور ہو .....''

نواب صاحب کی زندگی میں اس بات کا احساس نہ ہوتا تھا مگر اب اپنی کوتاہیوں پر غور کرتا ہوں تو دل کٹ کٹ جاتا ہے، مجھ سے پوری طرح اُن کی دل دہی نہ ہو سکی، میرا دل کہتا ہے کہ نواب صاحب نے میری اس کوتاہی کو معاف کر دیا ہوگا، اور نہ معاف کیا ہو تو اے خدا کے فرشتو! اُن تک میرا یہ پیام پہنچا دو کہ " ماہر کم بخت اور نالائق ماہر، تمہاری مدح سے معافی چاہتا ہے، ایک دوست کو معاف کر دو جبکہ تم اپنے دشمن کو بھی

معاف کر دیا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔!

دل کا دورہ پڑا تو احسن صاحب کی موٹر کار مجھے بلانے کے لیے بھیجی مگر میں مکان اور دفتر میں نہ تھا، دوسرے دن صبح سویرے پیر الٰہی بخش کالونی پہنچا، اب طبیعت سنبھل چکی تھی، بولے "ماہر! میں نے تمھیں ایک ضروری کام کے لیے بلایا تھا، کل حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی، میں وصیت کرتا ہوں، دیکھو! میرے مرنے کے بعد رسم و رواج کی خرافات نہ ہونے پائیں۔۔۔۔۔!"

دل کے دورے پڑتے تھے اور حالت سنبھل سنبھل کر بگڑتی تھی، کمزوری بلا کی ہو گئی تھی، ایک دن مجھ سے کہا اپنی کوئی پرانی غزل سناؤ، اپنی کتابوں میں سے میرا مجموعۂ کلام "نغماتِ ماہر" نکلوایا اور اس شعر کو بار بار سنا:-

جانے کب ہو جائیں سازِ دل کے پردے نغمہ ریز
ہر نفس کو گوش بر آواز رہنا چاہیے!

بیماری کے زمانے میں دل و دماغ "رفیقِ اعلیٰ" کی طرف متوجہ تھے، ایک دن رونے لگے پھر خود ہی بولے "میں موت سے نہیں ڈرتا، اسی وقت۔۔۔۔۔ اسی وقت چاہے دم نکل جائے، مگر میرے گناہ میرے سامنے آتے ہیں تو خوف آتا ہے، لیکن اللہ کی رحمت کے آگے میری سیاہ کاریوں کی کیا حقیقت ہے۔"

ایک دن مغرب کے بعد زائرِ حرم حمید لکھنوی کے مجموعۂ کلام سے چند غزلیں اپنی نواسی (زہرہ نگاہ) سے پڑھوا کر سنیں، مدینہ اور صاحبِ مدینہ کا نام آتا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے، میں نے کہا ــــ نواب صاحب! بدنصیبی تو ہماری ہے آپ کو تو زیارتِ حرمین میسر آ چکی ہے، بولے ــــ "شکر، شکر! اس کا شکر! میں اس قابل کہاں تھا۔"

بڑے جوش اور عقیدت کے ساتھ ایک دن یہ شعر پڑھا:

یا رب تو کریمی و رسولے تو کریم
صد شکر کہ ہستند میان دو کریم

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے ــــ لیکن میں نے خدا اور بندے میں ہمیشہ فرق کیا، خدا خدا ہے، رسول رسولؐ ہیں، میں دیکھ رہا تھا کہ ان کا چہرہ جوشِ توحید سے تمتمایا جا رہا ہے ــــ ایک دن فرمایا "کیا کروں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیادتیوں کی خلش دل

سے نہیں جاتی مگر میں ان کو برا نہیں کہتا وہ کاتبِ وحی تھے اور رسول اللہ صلعم کے برادرِ نسبتی تھے"!

آخری حالات بہت اچھے تھے، آنسو، دعائیں، توبہ، استغفار، خدا اور رسول کا ذکر! سوز و گداز پہلے ہی سے طبیعت میں تھا، آخری دنوں میں یہ اور بڑھ گیا۔ میں دو دن مسلسل اُن کے مکان پر رہا، کہنے لگے ... "ماہر! تمھیں بہت تکلیف ہوئی، مگر آخری تکلیف ... بس آخری تکلیف ....." ایک دن اُن کی حالت سنبھل گئی، میں نے کہا اللہ کے فضل سے آپ اچھے ہو گئے، اس پر بولے ..."وہ کیا ہوتا ہے ... جب بیمار اچھا ہونے لگتا ہے ....." میں قصداً خاموش ہو گیا پھر خود ہی فرمایا ... "افاقۃ الموت ...." اور اُن کا کہنا ٹھیک ثابت ہوا ... ہائے! ان پھر آنکھوں سے آنسو بھی تو نہیں نکلتے!

منتخب اشعار نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ تھا، اُن کی تحریر سلیس سادہ اور اثر انگیز ہوتی تھی اگر انشا پردازی کی طرف توجہ ہوتی تو اس فن میں نام پیدا کرتے، ۱۹۴۶ء میں انجمن مسلمانانِ پنجاب بمبئی کی طرف سے بڑے شاندار پیمانہ پر "اقبال ڈے" منایا گیا تھا اُس کے مشاعرے کی صدارت نواب صاحب مرحوم نے کی تھی، کسی تیاری کے بغیر مختصر سی تقریر بھی کی جو پسند کی گئی۔

اپنے کلام کا مجموعہ "کیفیات" یادگار چھوڑا، حضرتِ جگر مرادآبادی نے اس پر رائے دی ہے:

"حضرت مزاج فطرتاً شاعر ہیں، اور بہ حیثیت انسان نہایت درجہ پاکیزہ نفس اور بیش از بیش اعلیٰ اخلاق و صفات کے حامل — اس مجموعۂ کلام میں اُس دور کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں — مجھے کامل توقع ہے کہ موصوف کا کلام زندہ رہے گا اور مستقبلِ قریب میں اُن کے ادبی مرتبہ کا اعتراف کیا جائے گا۔"

جنابِ جگر مرادآبادی نے نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے، یہ اشعار اُسی انتخاب سے ماخوذ ہیں!

کبھی دیکھا تھا اک جلوہ کسی کے رُوئے روشن کا ابھی تک حسرتِ دل لے رہی ہے انتقام اُس کا

ابھی تک نشۂ مے کی طرح ہے میری آنکھوں میں وہ طرزِ دلبری اس کا وہ اندازِ خرام اُس کا

اُس کی شانِ مغفرت، اس کی کریمی دیکھ کر
میرے منہ میں خاک میرا ذوقِ عصیاں بڑھ گیا

رہروِ راہِ محبت کے لیے منزل کہاں ہر قدم پر یوں تو منزل کا گماں ہوتا رہا

کر گئی کام تری سحر بیانی واعظ
خیر ہو دین کی، دُنیا سے مرا دل اٹھا

اُن کے آتے ہی منوّر ہو گئے دیوار و در آج خود بھی ہو گئے ہیں زینتِ کاشانہ ہم

سراغ مل ہی گیا اُن کے نقشِ پا کا ہمیں
یہیں نشانِ سرِ سجدہ پائے جاتے ہیں

جی نہ بہلے جب تو اُس دنیا کو لے کر کیا کریں آ خیالِ یار! اور آباد اک دُنیا کریں

شبِ فراق کی ایذا کو ہم نشیں مت پوچھ
خدا کسی کو اس آفت میں مبتلا نہ کرے

لذتِ دردِ محبت جو نمایاں ہو جائے ہر فرشتہ کو یہ حسرت ہو کہ انساں ہو جائے

دلِ شوریدہ کو پاسِ نگہِ ناز بھی تھا
ورنہ سینہ میں تو سامانِ جنوں ساز بھی تھا

فصلِ گل کے ساتھ ہی پہنچا یہ فرمانِ خزاں — پتیاں پھولوں کے کھلتے ہی بکھر جایا کریں

آپ کی خاطر سے میں خاموش ہوں
ورنہ سب کچھ ہے لبِ فریاد میں

ایماں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی — اب راہِ مغفرت رہِ میخانہ ہو گئی

اشکِ غم کی قدر بے دردوں کو کیوں ہونے لگی — یہ گہر ہیں ہم نشیں اپنے ہی داماں کے لیے

منتِ خلق سے لیا تو نے مزاج کو بچا
اے غمِ بیکسیٔ عشق عمر تری دراز ہو!

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۵۱ء)

مولانا مسعود عالم ندوی

مولانا مسعود عالم ندوی سے میری سب سے پہلی ملاقات حیدر آباد دکن میں ہوئی، اس واقعہ کو تقریباً سولہ سترہ سال ہو گئے! حکیم محمد شعیب صاحب نے ایک دوسرے کا تعارف کرایا اور مولانا مرحوم خود ہی بڑھ کر بغل گیر ہو گئے، پہلی ملاقات میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں!

اس ملاقات کے بعد ایک مدت گزر گئی، نہ پیام نہ سلام، نہ خط و کتابت! بس میں ان کے مضامین رسالوں میں پڑھتا رہا اور یہی وہ ذریعہ تھا جس نے تعلقِ خاطر کو باقی رکھا! مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے ملاقات نہیں ملاقاتیں اور طویل ملاقاتیں پاکستان میں آکر ہوئیں!

میں نے جب "فاران" نکالنے کا ارادہ کیا تو مولانا مرحوم کو خط لکھا اور انہوں نے قلمی معاونت کے سلسلے میں بڑا حوصلہ افزا جواب دیا، اور اس وعدے کو انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود نباہا، "دیارِ عرب میں چند دن" کا ایک باب انہوں نے "فاران" میں چھپنے کے لیے عنایت فرمایا، نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) اور علامہ سید سلیمان ندوی کے گراں قدر خطوط انہی کے توسط سے مجھے ملے اور "فاران" کی زینت بنے! اس پر مزید نوازش یہ کہ وہ اپنے شاگردوں سے "فاران" کے لیے عربی مضامین کے ترجمے بھجواتے رہتے!

میں نے گزشتہ سال "سیرت نمبر" نکالنے کا جب خیال ظاہر کیا تو مولانا مرحوم کی خدمت میں گزارش کی تھی کہ عربی زبان میں حضورؐ کی سیرت پر جو معرکہ کی کتابیں ہیں ان پر مفصل تبصرہ فرما دیں! مولانا نے میری اس گزارش کو منظور فرما لیا، مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جماعتِ اسلامی کے کمانڈو اساطین کو "سنتِ یوسفی" پر عمل کرنے کی توفیق ملی، اور یہ سعادت مولانا کے حصّہ میں بھی آئی!

مولانا مسعود عالم ندوی نوّراللہ مرقدہٗ جب راولپنڈی جیل میں تھے تو میں نے اُن کے تربیت یافتہ اور شاگردِ خاص جناب محمد عاصم صاحب کو خطوں میں لکھا کرتا تھا کہ مولانا سے جب بھی جیل میں ملنا ہو تو میرا اسلام پہنچا دیا کریں، ایک بار میں نے عاصم صاحب کو لکھا:-

" مولانا سے کہیے کہ یا تو وہ جیل سے باہر آجائیں یا پھر ہمیں اپنے پاس بُلا لیں ....،،

جناب عاصم صاحب نے چند دن کے بعد مجھے خط لکھا کہ مولانا فرماتے تھے " آپ یہاں آنے کی کوشش نہ کریں بس اپنا کام جمعیتِ خاطر کے ساتھ کرتے رہیں ....،، پھر وہ چند ماہ کے بعد جیل سے چھوٹ گئے، اور " فاران" کے لیے جیل کی ڈائری کے چند ورق بھیجے، جن کو ہر طبقے میں پسند کیا گیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا مرحوم جب کراچی تشریف لائے تو میں جناح ہسپتال میں تھا، یہ اُن کا کرم تھا کہ مجھ خاک نشین اور ہیچ مداں کی عیادت کے لیے وہ ہسپتال پہنچے اور آدھ گھنٹے تک میرے سرہانے بیٹھے رہے!

پچھلے دو مہینوں میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے بہت زیادہ خط وکتابت رہی! وہ ہفتہ میں دو دو بار خط لکھتے اور اُردو کے بعض لفظوں کی تذکیر و تانیث اور طریقِ استعمال کے بارے میں دریافت فرماتے! ایک لفظ کے بارے میں مجھے لکھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تو اُسے اس طرح لکھتے ہیں ——— میں نے عرض کیا کہ مولانا مودودی دِلّی کے شریف ترین اور قدیم ترین گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ جس طرح لکھتے اور بولتے ہیں اُس کو "سند" کا درجہ حاصل ہے اور معتبر ہے۔

فروری (۱۹۵۴ء) کے تیسرے ہفتے میں راولپنڈی سے مجھے ایک تار بھیجا کہ ایک خاص مضمون تیار ہے کیا مارچ کے شمارے میں اُس کے لیے جگہ نکل سکتی ہے، میں نے تار کے ذریعہ جواب دیا کہ مارچ کا " فاران،، تیار ہو چکا افسوس ہے کہ اُس میں گنجائش نہیں نکل سکتی! ——— پھر وہ چند دن کے بعد کراچی تشریف لے آئے اور نظامی دواخانہ میں اپنے دوست حکیم نصیر الدین صاحب ندوی کے یہاں قیام

فرمایا۔

جس دن مولانا مرحوم کراچی تشریف لائے ہیں اسی دن میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، بڑے تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ ملے، حسبِ معمول معانقہ فرمایا اور میں نے محسوس کیا کہ میں خلوص و محبت کے ایک مجسّمہ سے گلے مل رہا ہوں، پھر بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی ــــ علمی اور دینی مسائل کے سلسلہ میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ مولانا مودودیؒ نے "ظہورِ مہدی" کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دل و دماغ کی گرہ کھل گئی!

ترجمان القرآن میں سید مصطفےٰ اسباعی کا جو مضمون (ترجمہ) کئی قسطوں میں شائع ہوا ہے، اُسے مکتبہ چراغِ راہ کتابی صورت میں شائع کررہا ہے، اس پر مولانا مسعود عالم ندوی کا مقدمہ ہوگا، میں ایک دن حاضر ہوا تو مجھ سے فرمایا کہ تم اس مقدمہ پر ایک نظر ڈال لو، میں لے اُسے پڑھا اور دو تین لفظوں کے بارے میں کچھ عرض کیا تو میری رائے مان لی، ایک جگہ "انہوں" لکھا تھا میں نے کہا یہاں "حضورؐ" کردیجیے فوراً پینسل سے "حضورؐ" بنادیا اور بولے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت کے معاملے میں تو میں "بدعتی" واقع ہوا ہوں!

ایک دن حکیم نصیر میاں کے یہاں یہ طے پایا کہ ۱۵ر مارچ سے پہلے حضرت جگر مرادآبادی کو کھانے پر بلایا جائے کیونکہ ۱۵ر سے جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کا آغاز ہورہا ہے اُس کے بعد مولانا مسعود عالم صاحب کو فرصت نہ مل سکے گی، چنانچہ ایک دن دوپہر کو حکیم صاحب موصوف کے یہاں پُرتکلف دعوت ہوئی، جگر صاحب تشریف لائے اور شعر و شاعری کی محفل گرم رہی اور مولانا مرحوم بڑی دلچسپی کے ساتھ اشعار سُنتے رہے، انہی کی تفریح کے لیے تو یہ سب کچھ ہوا تھا!

۱۴ر مارچ کو میں دوپہر کا کھانا کھا کر ہاتھ دھو رہا تھا کہ حکیم نصیر میاں کار لے کر تشریف لائے اور بولے کہ ابھی میرے ساتھ چلو، پیر اسحٰق جان مجددی نے سو روپیہ دعوت کے لیے دیے ہیں، کھانا پک رہا ہے، میں نے کہا کہ حضرت! میں تو کھانا کھا چکا، آپ اس قدر تنگ وقت پر بلانے کے لیے آئے ہیں، کہنے لگے کہ تمھارے بغیر دعوت میں مزہ نہ آئے گا، تمھیں چلنا ہوگا، اور ابھی تو کھانے میں دو ڈھائی گھنٹے کی دیر ہے،

اُس وقت تک کھانے کی خواہش پیدا ہو جائے گی، میں ہاضم سرکہ آپ کو پلا دوں گا! میں ان کے ساتھ چلا گیا، وہاں جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مولانا مسعود عالم ندوی سے ملنا ہو جائے گا۔

اس دن تین چار گھنٹے مولانا مرحوم کی معیت کا شرف حاصل رہا، مولانا کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کے لیے پلنگ پر لیٹ گئے، میں نے ارتجالاً مزاحیہ اشعار سُنائے، مولانا مرحوم مُسکرا مُسکرا کر شعر سنتے رہے! پھر میں نے نعتیہ کلام سُنایا تو مولانا پلنگ سے اُتر کر قالین پر بیٹھ گئے، اور والہانہ انداز میں تحسین فرماتے رہے! اور اس سلسلے میں زائرِ حرم جناب حمید لکھنوی کے نعتیہ کلام کی بھی تعریف کی!

پیر الٰہی بخش کالونی میں جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان کے قیام وطعام کا انتظام تھا، وہاں جانے اور رہنے کے لیے محمد اسلم صاحب، مولانا مرحوم کا بستر اور سامان باندھنے لگے، تین بجے کے قریب وکٹوریہ گاڑی آئی، اور ہم اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے! مگر تھوڑی دُور جا کر معلوم ہوا کہ شاہِ عراق صنعتی علاقے کا معائنہ فرمانے کے لیے جا رہے ہیں اس لیے جب تک سواری بادِ بہاری گزر نہ لے گی، اُس وقت تک راستے بند رہیں گے، ہم نے کوشش کی کہ شاید گاندھی گارڈن کی سڑک کھلی ہو اور وہاں کسی چور راستے سے گزرنے کا موقع مل جائے مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی، پھر میں وکٹوریہ سے اُتر کر جیکب لائن چلا آیا، مولانا مسعود عالم ندوی سے میری یہ آخری ملاقات تھی!

۷ تاریخ کو صبح سویرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا "نقشِ اوّل" لکھنے کے لیے کچھ سوچ رہا تھا کہ میرے ہم زلف (عبدالکریم خاں صاحب) نے یہ المناک خبر سُنائی کہ مولانا مسعود عالم ندوی کا رات انتقال ہو گیا، دل کو سخت دھچکا لگا، یہ بالکل غیر متوقع خبر تھی، میں اسی وقت بس میں بیٹھ کر جناب سلطان احمد صاحب کے مکان پر پہنچا، وہاں برآمدے میں فرش پر بہت سے سوگوار بیٹھے تھے، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی بڑے صبر وضبط سے کام لے رہے تھے مگر چہرے پر حزن وملال کی پرچھائیاں نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں! مولانا موصوف نے بتایا کہ حکیم محمد عبدالرحیم صاحب اشرف (مالک اشرف میڈیکل ہال لائل پور) کو جب مولانا مسعود عالم ندوی کی اطلاع ملی تو وہ فرطِ غم سے اس قدر نڈھال ہو گئے کہ ہم سمجھے خدانخواستہ کوئی دوسرا حادثہ پیش نہ آ جائے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ۱۶ رمارچ کو شام تک جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں مولانا مرحوم نے نہ صرف یہ کہ شرکت کی بلکہ مباحث میں حصہ لیا، رات کو نو بجے کے قریب ایکا ایکی طبیعت خراب ہوگئی، شدید گھبراہٹ سی محسوس فرمانے لگے پینے کے لیے پانی مانگا، اتنی سی دیر میں دو ہچکیاں آئیں اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون ؎!

دس بجے کے قریب جنازہ اٹھا، پیر الٰہی بخش کالونی کی جامع مسجد تک جنازہ کاندھوں پر لے جایا گیا، مجھے بھی یہ سعادت نصیب ہوئی، میں محسوس کر رہا تھا کہ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں! میدان میں نمازِ جنازہ پڑھی گئی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے امامت کا فرض انجام دیا، حجاز و شام کی حکومتوں کے سفیر بھی تشریف لا چکے تھے، پھر سب لوگ ایک لائن میں کھڑے ہوگئے اور میت کے قریب سے گزرے، دھوپ بہت تیز تھی، جماعتِ اسلامی کے چند ارکان ہاتھوں اور رومالوں سے میت کے چہرے پر سایہ کیے ہوئے تھے، چہرہ کھلا ہوا تھا، کسی قسم کی ربودگی اور پژمردگی نام کو نہ تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ مردِ مجاہد کام کرتے کرتے سستانے کے لیے سو گیا ہے، مرنے کے بعد بھی تیوروں میں عزم و استقامت کی جھلک تھی۔

؎ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پھر سب لوگ جنازے کے ساتھ لاریوں اور موٹر کاروں میں بیٹھ کر گورستان روانہ ہوئے اور بارہ بجے کے قریب "جمعیت پنجابی سوداگران" کے قبرستان میں اس جسم کو سپردِ خاک کر دیا جس کا ہر بن مو علم کا منبع اور عمل کا سرچشمہ تھا! —— ہر شخص سوگوار تھا، مولانا عبدالجبار غازی قبر سے تھوڑی دور کھڑے رو رہے تھے کہ مولانا مرحوم ان کے رفیقِ جماعت تو تھے ہی مگر چند مہینے رفیقِ سجن بھی رہ چکے تھے، یہ تعلقِ خاطر اور رفاقت آنسو بن کر ٹپک رہی تھی، چوہدری غلام محمد صاحب بہت ضبط سے کام لے رہے تھے مگر شدتِ ضبط کے باوجود چیخ نکل ہی گئی!

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمایا سفیرِ حجاز ابھی کہہ رہے تھے کہ مولانا مسعود عالم ندوی کی عربی تحریر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اُن کی مادری زبان ہے، مولانا عادل قدوسی نے بیان کیا کہ سفیرِ شام مولانا کی وفات کی خبر سن کر بے چین ہوگئے اور بار بار

کہتے تھے کہ کاش! اُن کی جگہ میں دفن کیا جاتا۔

علم و عمل کے اتنے بڑے خزانے کو زمین کی نذر کر کے ہم خالی ہاتھ واپس ہوئے! مجھ سنگدل کی آنکھیں بھی بھیگے بغیر نہ رہ سکیں، ہائے! مجھ جیسا ناکارہ انسان تین مہینے کی بیماری کے بعد بھی بچ گیا اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم جیسے کام کے آدمی دو ہچکیوں میں ختم ہو گئے! مشیت کے فیصلوں پر کس کی مجال ہے جو حرف گیری کر سکے! اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہمارے اندازے اور ظن و تخمین سے بالاتر ہیں، یہی وہ مقام ہے جہاں بندے کا عجز اور بیچارگی ظاہر ہوتی ہے اور اس کے اختیار کی قلعی کھل جاتی ہے!

مولانا مسعود عالم ندوی بہار شریف کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ندوہ میں تعلیم پائی اور تقریباً بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے، کئی سال تک خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں کیٹلاگر کی حیثیت سے کام کیا، زندگی کا زیادہ حصہ علم و ادب کی طلب و تحقیق میں گزرا، عربی ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا، پورے ہندوستان اور پاکستان میں بس دو تین شخصیتیں ہی مشکل سے ایسی نکلیں گی، جو عربی زباندانی اور انشا پردازی میں اُن کی برابری کر سکتی ہیں، مصر، شام، عراق اور حجاز کے جرائد اور رسالوں میں اُن کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے اور وہاں کے مشاہیر ادبا اور مفکر اہلِ قلم مولانا مرحوم کی عربی انشا پردازی کے مدّاح اور معترف تھے! عرب ممالک کا طویل سفر کیا اور وہاں کے علما، زعما اور اربابِ صحافت سے خاص تعلقات اور روابط قائم کر لیے! عرب ممالک کی سیاست کو وہ خوب جانتے تھے اور وہاں کے لیڈروں کو اچھی طرح پہچانتے تھے کہ کون کیا ہے؟ مصر کی سیاسیات سے اُن کو خاص دلچسپی تھی اور معلومات کا یہ عالم تھا کہ وہ محمد علی پاشا، زاغلول، فواد، نحاس اور عزام پاشا وغیرہ زعماء مصر اور اکابرِ نیل کے کردار کا تجزیہ کر کے بتا سکتے تھے! اُن کی رائے ان معاملات میں بہت وزن رکھتی تھی، سطحی قسم کی باتیں کرنے کے وہ عادی نہ تھے، اُونچی اور وزن دار بات کہتے تھے!

اخوان المسلمون سے دلی ربط اور خاص تعلق تھا حسن البنا شہیدؒ سے خاص طور پر محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ ایک محفل میں کسی نے اخوان المسلمین پر طنز کی تو خفا ہو گئے —— کراچی اُن کے آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں سے مصر جائیں اور وہاں کے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں، وہ مصر جا کر آتے تو سیاسیاتِ مصر

کا آہنی پردہ ہم دُور افتادگان کی آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جاتا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ اسکیم بس دل و دماغ ہی کی زینت بن کر رہ گئی! پاسپورٹ کے مراحل طے ہو رہے تھے کہ رفیقِ اعلیٰ کی طرف سے طلبی کا حکم آن پہنچا!

مولانا مرحوم جہاں علم و فضل اور شہرت و ناموری کی دوسری نسبتیں رکھتے تھے، وہاں اُن کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ وہ جماعتِ اسلامی (پاکستان) کی مجلسِ شوریٰ کے ممتاز رُکن تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و فضل کی تجارت اور سوداگری سے بچا لیا، اور اُن کی زندگی کے آخری سال "اقامتِ دین" کی جدوجہد میں صَرف ہوئے، سچ پوچھیے تو اُن کی زندگی کی یہی مدت حاصلِ زیست تھی! حق کی خاطر اُنہیں قید و بند کے مصائب بھی جھیلنے پڑے اور اس طرح ان کا اعمال نامہ نیکیوں کے اعتبار سے اور وزنی ہو گیا ـــــ کیونکہ

ؔ این سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

جماعت اسلامی کے "دارالعروبہ" کے موسّس منتظم اور نگران کار وہی تھے، عرب ممالک سے جماعتِ اسلامی کا تعارف انہیں کے مضامین کتابوں اور سفر و سیاحت کے ذریعہ ہوا، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے لاہور جیل میں جب مسعود عالم ندوی کے انتقال کی خبر سُنی ہوگی تو اُن کے دل پر نہ جانے کیا گزری ہوگی! ایک وہ رفیقِ کار جو سچ مچ دست و بازو ہو، اس کا اُٹھ جانا کوئی کم سانحہ نہیں ہے۔

مولانا مرحوم تنفس کے مریض تھے، جب دَورہ پڑتا تو نڈھال ہو جاتے، مگر عزم و ہمت کا یہ عالم تھا کہ اس آئے دن کی بیماری کے باوجود کام کرتے رہتے، زبان میں لکنت بھی تھی لیکن اس کمی کو اللہ تعالےٰ نے قلم کی روانی کے ذریعہ پورا کر دیا تھا، اوقات کے بہت پابند تھے، اُٹھنے، بیٹھنے، بولنے چالنے، کھانے پہننے میں سلیقہ پایا جاتا تھا!

عربی کے علاوہ اُردو کی متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں، اُردو تحریر بہت نپی تلی اور باوقار ہوتی تھی، طرزِ نگارش پر افسانوی انداز کی پرچھائیں بھی نہ پڑی تھی اس لیے اُن کی تحریر میں شرح و اطناب کی جگہ ایجاز پایا جاتا تھا، مگر کوئی بات مبہم نہ رہتی، چند لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرنے پر قدرت تھی۔

اس قدر علم وفضل کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار تھا، میں اُن کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتا اور جب کوئی بات پوچھتا تو وہ جواب اس انداز سے دیتے جیسے ابتدائی جماعت کا کوئی طالب علم جواب دے رہا ہے، تمکنت نام کو نہ تھی اور نمود و نمائش کا احساس اُن کے پاس بھی نہ پھٹکا تھا!

مولانا مسعود عالم علم وفضل اور بصیرت و تفقہ کے اس مقام پر تھے، جہاں وہ اس بات کا فیصلہ کر سکتے تھے کہ کسی فقہی مسئلہ میں ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ بن حنبل (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے اجتہادات میں کس امام کا اجتہاد قابلِ ترجیح ہے! ائمہ فقہ کی تقلید میں جو غلو کیا جاتا ہے اُس سے وہ کوسوں دُور تھے۔

میں نے ایک بار ہندوستان کے بعض علماء کا نام لے کر دریافت کیا کہ وہ کیسی عربی لکھتے ہیں؟ بولے "اُردو نما عربی!" علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور علامہ عبدالعزیز المیمن کے عربی ادب کے بہت زیادہ مداح تھے!

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذہانت اور فطانت کے وہ قائل تھے مگر یہ جو اُن کی "عربی دانی" کا چار دانگِ عالم میں شہرہ ہے اس کے بارے میں فرمایا کہ اُن کو "عربی" نہیں آتی! کہتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے اُس کو پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد عربی جانتے تھے مگر ابوالکلام آزاد کو عربی نہیں آتی! چنانچہ انہوں نے مولانا آزاد کے ترجمۂ قرآن کی غلطیوں پر نشان بھی لگا لیے تھے اور "المائدہ" تک یہ کام ہو چکا تھا!

میں نے اب کی بار مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے شدید اصرار کیا کہ آپ ان اغلاط پر ایک مضمون لکھ کر مجھے دیجیے "فاران" میں یہ مضمون شائع ہوگا، حکیم نصیر میاں نے بھی میری ہمنوائی کی، راضی ہو گئے اور غالباً راولپنڈی خط بھی لکھ دیا تھا کہ مولانا[1] آزاد کا ترجمہ کیا ہوا وہ نسخۂ قرآن بھیج دیا جائے جس پر اُن کے نشانات لگے ہوئے ہیں، افسوس کہ بہت سے عزائم کی طرح یہ ارادہ بھی ادھورا رہ گیا!

---

[1] میں نے عرض کیا کہ مولانا آزاد کے ترجمہ کی کوئی غلطی تو بتائیے، قرآن کی آیت پڑھ کر بولے کہ اُنہوں نے "یحکم" کا ترجمہ "فیصلہ" کے بجائے "حکم دینا" کیا ہے!

میں نے دریافت کیا کہ "فاران" میں ایک عربی مضمون کا جو ترجمہ چھپا ہے وہ بہت خوب ہے، کیا آپ کی نظر سے گزرا ہے! بولے کہ جب تک اصل مضمون سامنے نہ ہو، ترجمہ کا اعتبار نہیں! میں نے بہت سے ترجموں کو جب اصل سے مقابلہ کر کے دیکھا تو اصل سے مختلف پایا، یوں دیکھنے میں اُردو عبارت برجستہ اور رواں تھی۔

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی موت حقیقت میں علم و فضل کا بہت بڑا سانحہ ہے، اس بصیرت اور فکر و نظر کے لوگ جلد جلد پیدا نہیں ہوتے، قوم میں اچھے آدمیوں کا یوں ہی کال ہے، جو جاتا ہے پھر اُس کا بدل پیدا نہیں ہوتا، مولانا کی وفات سے سب سے زیادہ نقصان جماعتِ اسلامی پاکستان کا ہوا، جس کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی، مگر اللہ تعالیٰ اپنے دین کے کام کو رُکنے نہ دے گا:-

ہزار شمع بکشتند انجمن باقیست

صدمہ بہت شدید ہے مگر صبر کرنا ہی ہوگا، سانحہ انتہائی الم انگیز ہے لیکن فریاد و ماتم سے "ہوئی" بات "ان ہوئی" تو نہیں ہو سکتی، ساری دنیا کے آنسو بھی جانے والے کو اس دُنیا میں واپس نہیں لا سکتے، مرحوم کی رُوح کے لیے سب سے بڑا خراجِ تحسین اور پیامِ سکون و راحت صرف یہی ہے کہ "اقامتِ دین" کی جدّ و جہد کو وہ جس منزل پر چھوڑ گئے ہیں اُسے ہم آگے بڑھائیں!

مولانا مسعود عالم ندوی کی قبر پر نہ کوئی گنبد بنے گا اور نہ مجاور تیار ہوگا، مگر ہم اُمید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا شامیانہ اُن کی قبر پر سایہ فگن رہے گا اور وہ قیامت کے دن صالحین کے ساتھ اُٹھیں گے! (آمین یا رب العالمین)

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۵۴ء)

سید مسعود رضا

تقسیم ہند سے قبل تین بار کراچی آنا ہوا، تقریب آمد مشاعروں کی شرکت! بڑے دھوم کے مشاعرے ہوئے۔ دو مشاعروں کی صدارت سید ہاشم رضا صاحب نے فرمائی، وہ اُن دنوں گورنر سندھ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی آیا تو سید صاحب موصوف کراچی کے کلکٹر تھے اور پھر اس عہدے کو وسیع اختیارات کے ساتھ "ایڈمنسٹریٹر" کا لقب دیا گیا۔ سید ہاشم رضا صاحب سے مشاعروں اور دعوتوں میں ملاقات ہوتی رہتی۔ انہی کے توسط سے سید مسعود رضا صاحب سے جان پہچان ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ تعارف دوستی میں تبدیل ہو گیا۔

سید مسعود رضا مرحوم سے جب بھی ملنا ہوتا، اخلاص و محبت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا۔ ہنس مکھ، ملنسار، خود اچھے شاعر اور شاعروں کے قدر شناس بھی بفضل کریم صاحب فضلی کے یہاں "بزمِ جگر" کی جب نشستیں ہوا کرتی تھیں تو میں نے ایک صحبت میں دو شعر سنائے۔

دل کی شوخی صَرف کتنی بر محل ہوتی رہی — سامنے بیٹھے رہے وہ اور غزل ہوتی رہی

مجھ کو فن کاری کا دعویٰ ہے نہیں فن کار ہوں — شاعری شاید ترے غم کا بدل ہوتی رہی

سید مسعود رضا نے ان شعروں پر بہت داد دی۔ کئی ہفتے کے بعد پھر جو ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ تمہارے دونوں شعر میں نے مسٹر جی احمد خاں (امریکہ میں پاکستان کے سفیر) کو لکھ کر بھیجے تھے۔ وہاں سے جواب آ گیا، انہوں نے بھی ان شعروں کو پسند کیا۔

ہر شاعر اس کا شوق اور تمنا رکھتا ہے کہ اس کا کلام زیادہ سے زیادہ سنا جائے مگر سید مسعود رضا شعر سنانے کی فرمائش کو اکثر و بیشتر ٹال جاتے۔ دوستوں کا اصرار جب شدید ہو جاتا تو وہ اپنے چند اشعار سنا کر رک جاتے، ورنہ داد و تحسین شاعر کے لیے "دیوانہ را ہوئے بس است" ثابت ہوتی ہے!

سید مسعود رضا کے والد جسٹس سید محمد رضا چیف کورٹ لکھنؤ کے جج تھے، انہوں نے امارت و شرافت اور علم و سیادت کے آغوش میں پرورش پائی۔ محکمہ ریلوے میں اکاؤنٹ برانچ

اسے ملازمت کا آغاز ہوا اور اپنی ذہانت و فرض شناسی اور دیانت و محنت کی بدولت ترقی کرتے کرتے کمپٹرولر جنرل کے منصبِ جلیل پر فائز ہو گئے۔ اس عہدے کی اور گورنر کی تنخواہ غالباً برابر برابر تھی۔ اتنے بڑے عہدیدار مگر ہم جیسے خاک نشینوں سے جھک کر ملتے۔

ڈیڑھ سال کی بات ہے میں لاہور گیا ہوا تھا، انہیں میرے وہاں جانے کا پتا لگا تو اپنی کار بھیج کر بلوایا، چائے نوشی ہوئی اُن کی فرمائش پر میں نے دو غزلیں سنائیں اس کے بعد خاصی دیر تک مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ فرمانے لگے بھئی! لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے مشاعرہ نشر ہوا تھا، خمار بارہ بنکوی کی غزل خوب تھی، پھر انہوں نے خمار صاحب کی پوری غزل سُنا دی۔ راقم الحروف کو صرف ایک شعر کا مصرعِ ثانی یاد رہ گیا ہے۔ پہلے مصرع میں شاعر نے ناصح کو خطاب کیا ہے دوسرا مصرع یہ ہے:

آپ اب اور کوئی کام کریں

راولپنڈی میں اپنے داماد کے یہاں دعوت میں شریک تھے کہ اتنے میں ان کی طبیعت ایکا ایکی بگڑ گئی، لو سے اس قسم کا چکر مجھے آج تک نہیں آیا، بس پھر بے ہوش ہو گئے ہسپتال میں جا کر بھی ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹر نے بہت کچھ تدبیریں اور دوا دارو کی مگر اس دنیا سے ان کا دانہ پانی اٹھ چکا تھا، موت کا کوئی علاج نہیں! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

رضویہ کالونی کے امام باڑے میں نمازِ جنازہ ہوئی، سوگواروں کی بھیڑ لگی تھی، اُن کے بڑے بھائی سید ہاشم رضا صاحب کا بُرا حال تھا، مجھے دیکھتے ہی گلے ملے اور فرمانے لگے تین سال ہوئے میرے بھائی کاظم رضا اللہ کو پیارے ہوئے، پھر لکھنؤ میں دوسرے بھائی کا انتقال ہوا اس کے بعد میرے بھتیجے قمر رضا کو جوانی میں موت آئی۔ ابھی اس سانحہ کو پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ مسعود رضا چل بسے۔ ہم اتنے بڑے امتحان کے تو قابل نہیں تھے۔ دعا کیجیے اللہ تعالےٰ صبر و ثبات کی توفیق عطا فرمائے ورنہ اس وقت تو قدم ڈگمگا رہے ہیں۔

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۷۰ء)

مُسلم ضیائیؔ (ایم۔اے)

حیدر آباد دکن میں ایک صاحب سید اکبر حسن تھے، جو مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور محکمہ عدالت میں منصف تھے۔ ان کے بڑے بیٹے اختر حسن موہانی ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں ایم۔اے کے طالب علم تھے یا جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کر چکے تھے! اختر حسن، قاضی عبدالغفار مرادآبادی مرحوم کے ادارہ "روزنامہ پیام" سے بھی وابستہ رہے تھے، اُن کی بہنیں زبان و ادب اور شعر و افسانے سے غیر معمولی دلچسپی رکھتی تھیں، اُن کے یہاں ہر مہینے شعر و افسانہ کی نشستیں ہوتی رہتیں، ان نشستوں میں سب سے زیادہ اصرار میری شرکت پر ہوتا۔ ساغرؔ نظامی حیدر آباد تشریف لاتے تو وہ بھی شعر و ادب کے ان منتخب اجتماعات میں ضرور شریک ہوتے اور دو دو گھنٹے اپنا کلام خوب لہک لہک کر سناتے! اختر حسن کی بہنوں (رضیہ اور رابعہ) نے جامعہ عثمانیہ کی بیسیوں طالبات کو ساغر نظامی کے رسالہ "پیمانہ" کا خریدار بنایا۔ "میرے سو شعر" کتابی شکل میں شائع ہوئے تو اس کتابچہ کی فروخت میں بھی اس گھرانے نے انتہائی سرگرمی اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار غالبؔ کے اس قسم کے مصرعوں اور شعروں پر:

؎ آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

سرِ شکِ سرِ بصحرا دادہ نور العین دامن ہے — دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

؎ میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

رابعہ نے ایک نیم مزاحیہ مضمون سنایا، جو بہت پسند کیا گیا، یہ ایک ادبی تخیل طنزیہ مقالہ تھا۔ بڑا شگفتہ، دلچسپ اور جاندار ——————

ابھی تک خواتین پردے سے بات چیت کرتیں مگر کچھ دنوں کے بعد

پردہ رخصت ہوگیا! [1] اس کے بعد شعر خوانی اور ادبی مذاکروں میں اور زیادہ انہماک کے ساتھ باقاعدگی پیدا ہوگئی! اس گھرانے کی خواتین سے میری بیوی کا تعارف تھا مگر وہ کسی ادبی نشست میں شریک نہیں ہوئیں، اہلیہ مرحومہ کو عورتوں مردوں کی یہ ملی جلی ادبی نشستیں پسند نہ تھیں اور میرے وہاں جانے سے ناگواری سی محسوس کرتی تھیں۔

انہی محفلوں میں مسلم ضیائی سے جان پہچان ہوئی، وہ پابندی کے ساتھ ہر نشست میں حصہ لیتے۔ یہ زمانہ ان کی انشا پردازی کے آغاز کے کچھ بعد کا تھا۔ مگر یہ آغاز بتا رہا تھا کہ اُن کا ادبی مستقبل تابناک رہے گا! تنقید اور بحث و مناظرہ میں مسلم ضیائی کی رائے بھی تُلی ہوتی، اُن کے انشائیے اور مختصر افسانے سننے والوں کو متاثر کرتے ادبی نشستوں کے علاوہ بھی مسلم ضیائی کا اس گھرانے میں آنا جانا رہتا۔

سقوطِ حیدرآباد کے بعد مسلم ضیائی بھی پاکستان چلے آئے اور قلم ہی اُن کی گزربسر کا ذریعہ ٹھہرا! کراچی کے ادبی حلقوں میں وہ معروف تھے، ان کی تحریروں کی سنجیدگی، سلاست و سادگی اور صحتِ زبان سب کے نزدیک مسلم تھی! وہ مذہبی آدمی نہیں تھے مگر کمیونسٹ شاعروں اور ادیبوں کی طرح مذہب، اخلاق سے انہیں کد بھی نہیں تھی، ادب میں اُن کا رجحان نام نہاد "ترقی پسندی" کی جانب تھا! مگر شعر و ادب کی قدیم قدروں کے وہ مداح اور قدر شناس تھے!

مسلم ضیائی نے ساری عمر تجرد میں گزار دی۔ حیدرآباد دکن میں بہت ہی ہلکے قسم کے محتاط معاشقے کی طویل آنکھ مچولی کے بعد طرفین کنوارے ہی رہے۔ اپنی تمام دلچسپیاں انہوں نے قرطاس و قلم اور کتابوں کے مطالعہ سے وابستہ کر دی تھیں۔ حمایت علی شاعر نے اپنا مجموعۂ کلام (مٹی کا قرض) مسلم ضیائی کے نام معنون

---

[1] ۱۹۶۰ء میں "پاک و ہند مشاعرے" میں میرا بمبئی جانا ہوا تو سید اکبر حسن موہانی کی چھوٹی لڑکی زکیہ نے مشاعرے میں بڑے ادب سے مجھے سلام کیا اور اپنے شوہر دشوامتر عادل سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انہوں نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہی بات مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے بارے میں بھی سننے میں آئی۔

کیا تو اس کی رونمائی کی تقریب میٹروپول ہوٹل میں منعقد ہوئی، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا خاصا بڑا اجتماع تھا۔ مسلم ضیائی اسٹیج پر اپنا مقالہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ شدتِ گریہ سے آواز گلوگیر ہو گئی اور پھر بول ہی نہیں سکے! اس رقت و گریہ کی لم سمجھ میں نہیں آئی، یہ مسرت کے آنسو تھے یا کوئی اور جذبہ اس کے پس منظر میں کارفرما تھا!

اس بات کو تین برس ہوئے ایک صاحب کا فون آیا کہ مسلم ضیائی صاحب پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے، وہ ناظم آباد ہی میں اپنی بھانجی کے یہاں مقیم ہیں اور آپ سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ میں دوسرے دن اُن کی قیام گاہ پر گیا، بڑی محبت کے ساتھ ملے، چائے نوشی کے بعد شعر و ادب پر مختصر سی گفتگو رہی، بحث و مناظرہ انہیں پسند نہ تھا، کسی بھی ادبی مسئلے میں وہ اپنی رائے بیان کر کے خاموش ہو جاتے! میری اس رائے سے انہوں نے اتفاق کیا کہ نئی نسل شعر و افسانہ میں صحتِ زبان کی پروا نہیں کرتی۔

اس ملاقات کے تین چار مہینے کے بعد اُن کی طرف سے دعوت نامہ آیا، اُن کی کسی قریبی عزیزہ کی شادی تھی۔ اس تقریب میں ڈیڑھ دو گھنٹے ان کا ساتھ رہا۔

مسلم ضیائی (ایم۔اے) نے ملیر کالونی میں اپنا مکان بھی بنوا لیا تھا، تنہائی سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے مگر وہ تنہائی سے مانوس ہو گئے تھے! مفلوج ہو جانے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ——— چند ماہ قبل روزنامہ "جنگ" میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی اور ایک قدیم آشنا کے اٹھ جانے سے دل کو دھچکا لگا ———!

(ماہنامہ فاران، ستمبر ۱۹۷۰ء)

مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن مرحوم سے حیدرآباد دکن میں پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ اسے بھی سترہ اٹھارہ سال ہونے کو آئے۔ وہاں خاصے لکھے پڑھے اور صاحبِ حیثیت لوگ ان کے مرید تھے۔ اس کے بعد کنور محمد ظفر خاں صاحب رئیس داؤد پور کے یہاں (ان پور کمپاؤنڈ (علی گڑھ) میں ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا کنور صاحب موصوف کی کوٹھی میں مقیم تھے اور میں ان کے صاحبزادوں کا مہمان تھا۔ کئی بار کھانا بھی ساتھ کھایا۔ تصوف کے موضوع پر گفتگو بھی ہوئی۔ مولانا قدس سرہٗ نے میرے سوالات کے جوابات انتہائی وقار، سنجیدگی، متانت اور یقین و اعتماد کے ساتھ دیے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد جب مولانا کراچی میں آکر مستقل طور پر اقامت گزیں ہو گئے تو دسیوں بار ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں جاتا، بڑی شفقت سے ملتے۔ پان مرحمت فرماتے اور کبھی چائے سے بھی تواضع کرتے۔ میں مولانا کی خدمت میں بحث مباحثہ کے لیے نہیں بلکہ حصولِ سعادت کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ ایک دو بار تصوف پر بحث چھڑی تو میں اپنے اختلاف کو نہ چھپا سکا، مگر میں نے "ایاز قدرِ خود بشناس اور حدِ ادب" کو ملحوظ رکھا۔ بات کو بڑھنے نہ دیا کہ مناظرہ مقصود ہی نہیں تھا۔

مدیر ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) جناب عامر عثمانی مولانا مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ جن دنوں وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعتِ اسلامی کی پُرزور حمایت کر رہے تھے اور ان کا قلم کتنے محاذوں کو سنبھالے ہوئے تھا اور یہ بحث اپنے شباب پر تھی، ان دنوں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے یہ تاثرات تھے کہ جماعت اور مودودی صاحب کی اس حمایت و مدافعت میں خیر کا پہلو نظر آتا ہے کہ "خود عامر کے دینی حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔"

مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بڑے بھائی تھے (غالباً) درسِ نظامی کی متوسط کتابوں کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی اور پھر تامسن کالج رڑکی سے باقاعدہ انجینئرنگ کا ڈپلوما لے کر انجینئر بن گئے اور کئی سال تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ پھر ترکِ موالات کے زمانہ میں اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ

—— کے ایما پر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا [illegible] کا انقلاب
دراصل ان کی پوری زندگی کا انقلاب ثابت ہوا۔ کہاں وہ انجنیری اور کہاں ارشاد و تزکیۂ نفس کی یہ مسند! تحت و فوق کا بُعد اور فرق!

مولانا مرحوم و مغفور کے فیضِ صحبت، انذار و تبشیر، وعظ و تذکیر اور ہم نشینی نے بہت سی زندگیوں میں مذہبی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ذکر و شغل کا ذوق و شوق، عبادت کا اہتمام لہو و لعب اور لایعنی باتوں سے اجتناب! ان کی صحبت میں جتنے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے دینی حالات کو بہتر پایا۔ سیدھی سچی زندگی نہ کسی پر تنقید نہ کسی سے نزاع و مباحثہ، ذکرِ الٰہی سے شغف، خدا کا خوف اور اپنے حالات کی بہتری اور درستی کی لگن۔

اسے کرامت کہیے، ولایت سمجھیے یا کسی اور اچھے نام سے یاد کیجیے! اب سے تقریباً چار برس پہلے کی بات ہے بدنام سیاست بازوں کا دورِ حکومت تھا، مولانا مرحوم کے ایک صاحبِ منصب مرید کو پھانسنے کے لیے ایک جال بُنا گیا اور جال کے سمٹنے میں بس ایک رات باقی تھی۔ مولانا مرحوم نے رد بلا کے لیے وہ رات بڑے اضطراب کے عالم میں گزاری، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی دعاؤں نے صبح ہوتے ہوتے ساری بساط ہی کو الٹ دیا، وہ فضا ہی دگرگوں ہو گئی۔ حالات کا رُخ ہی بدل گیا! قبولیتِ دُعا کی یہ خاصیت اور تاثیر اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عرض و معروض کے قبول ہونے کا یہ اعتماد اس بارگاہِ بے نیاز کے نیازمندانِ خاص ہی کو حاصل ہوتا ہے —— میں نے ایک بار عرض کیا وساوسِ نفسانی کا غلبہ ہوتا رہتا ہے اور نماز پڑھتے میں خیالات منتشر رہتے ہیں کوئی ایسی دعا یا ترکیب بتایئے کہ یہ کمزوری دُور ہو جائے۔ اس پر قدرے مسکرا کر فرمایا: "اس کے لیے محنت کرنی ہوگی؟" پھر بولے: اچھا آپ استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ کا ورد رکھیے، اس سے انشاء اللہ فائدہ ہوگا —— حضرت مولانا کے انتقال سے تین دن قبل میں حاضر ہوا۔ مولانا عامر عثمانی کو دیوبند سے کراچی آئے ہوئے شاید ایک ہفتہ ہوا تھا اس دن اُن کی حالت غیر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور حقہ میں کش لگاتے ہوئے بولے، "اچھا ماہر صاحب ہیں!" بس پھر اس دن کے بعد ان کا دیدار نہ ہو سکا اور تین دن کے بعد یہ صاحبِ مسندِ ارشاد و تصوف "اہلِ قبر" بن گیا۔

اپنے لائق فرزند عامر عثمانی صاحب کو نصیحت کیا وصیت کی کہ "بیٹا! صرف قلم سے کچھ نہیں ہوتا اصل چیز تزکیۂ نفس ہے" اور یہ بھی کہا کہ اگر میں زندہ رہ گیا تو ایک نصیحت پھر کروں گا.... اور اس "اگر" کو اللہ تعالیٰ نے "اٹل اجل" سے بدل دیا جس میں ایک لمحہ بھی دیر ہوتی ہے نہ سویر۔ بس ہے نام اللہ کا! اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ عیشِ آخرت نصیب فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ١٩٦٠ء)

ممتاز الدولہ نواب مکرّم علی خاں

مغلیہ بادشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں لال سنگھ نام کے ایک سردار نے اسلام قبول کیا تھا، اُس کی اولاد "لال خانی" کہلاتی ہے۔ میرٹھ، مظفر نگر، متھرا، علی گڑھ اور بلند شہر کے اضلاع میں لال خانی رئیسوں کی زمینداریاں تھیں، جو تقسیمِ ہند کے تین چار سال بعد قانونی طور پر ختم کر دی گئیں۔ یہ رؤسا نومسلم راجپوت کہلاتے ہیں، چھتاری اور پہاسو یہ دو ریاستیں سب سے بڑی زمینداریاں تھیں اور ان کے درمیان نوک جھونک رہتی تھی۔

میں نے تیسری کلاس میں جب ضلع بلند شہر کا جغرافیہ پڑھا تو اس میں ضلع کی دو عمارتوں ـــــ خورجہ کے لالہ میوا رام کی حویلی اور پہاسو کے قلعہ کا ذکر تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ نواب ممتاز الدولہ سر فیاض علی خاں بہادر (K.C.S.I) کا قلعہ قصبہ پہاسو میں دیکھنے کے قابل ہے، میں سوچتا تھا جس قلعہ کی تعریف جغرافیہ کی کتاب میں کی گئی ہے وہ کتنی شاندار عمارت ہوگی؟

ریاست پہاسو کے والی نواب فیض علی خاں مرحوم برسوں ریاست جے پور کے وزیر اعظم رہے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحب زادے نواب فیاض علی خاں کو یہ منصب جلیل ملا۔ فیاض علی خاں مرحوم نے بڑی عمر پائی، انگریزی سرکار سے اُن کے بڑے اچھے تعلقات تھے، برطانوی حکومت کو اُن کی وفاداری پر پورا اعتماد تھا، نواب فیاض علی خاں کو "سر" کے خطاب سے نوازا گیا، جو اب سے ساٹھ ستر سال پہلے بہت بڑا اعزاز تھا۔ ریاست جے پور سے "ممتاز الدولہ" خطاب عطا ہوا، جس کو انگریزی سرکار نے بھی خاندانی خطاب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔

نواب ممتاز الدولہ سر فیاض علی خاں مرحوم کے اکلوتے فرزند نواب اکرام علی خاں جن کی عیش پسندی کا دُور دُور شہرہ تھا، باپ ہی کی زندگی میں فوت ہو گئے۔ انھوں نے دو بیٹے (مکرّم علی خاں اور معظم علی خاں) چھوڑے۔ ۱۹۲۰ء میں نواب سر فیاض علی خاں نے انتقال فرمایا اور لال خانی زمینداروں کے خاندانی قانون وراثت کے مطابق جائداد تقسیم نہیں ہوئی،

اُن کے بڑے پوتے کنور مکرم علی خاں جائز وارث اور جانشین قرار پائے۔ چھوٹے پوتے کنور معظم علی خاں کو گزارے کے طور پر ایک گاؤں (سوکھنا) ملا، جس کی سالانہ آمدنی بارہ چودہ ہزار روپیہ کے لگ بھگ ہوگی، دونوں بھائیوں کے تعلقات مرتے دم تک کشیدہ ہی رہے۔

دادا کی جانشینی اور وراثت میں کنور مکرم علی خاں کو ریاست جے پور کی جاگیر، شاندار حویلی اور کوٹھی (جس کا کئی ہزار گز رقبہ تھا) پہاسو کا قلعہ اور زمینداری علی گڑھ، بلند شہر، دلی اور آگرہ کی کوٹھیاں ملیں اور ساتھ ہی "ممتاز الدولہ" کا خاندانی خطاب بھی! اب وہ "کنور" سے نواب ہوگئے۔ اُن کے نامور دادا نے روپیہ پیسہ کے علاوہ لاکھوں روپیہ کا سامان چھوڑا، ہاتھی، گھوڑے، بگھیاں، رتھ، پالکیاں، موٹر، بندوقیں، چاندی اور سونے کا اسباب آرائش!

ہز ہائی نس مہاراجہ جے پور اپنی ریاست کے وزیر اعظم نواب فیاض علی خاں کا بڑا احترام کرتے تھے اور اُن کو "بھائی جی" کہتے تھے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد ہز ہائی نس نے نواب مکرم علی خاں سے کہا کہ آپ کے دادا مرحوم کا چالیسواں اُن کے شایانِ شان ہونا چاہیے۔ نواب فیاض علی خاں مرحوم کا چالیسواں ہوا اور اس شان کا ہوا کہ اس نواح میں اس سے پہلے اس اہتمام کے ساتھ کوئی تقریب شاید ہی ہوئی ہو، پورے شہر جے پور کے ہندو مسلمان کی دعوت عام، جو ٹرینیں جے پور اسٹیشن سے گزرتی تھیں، اُن کے مسافروں کی بھی انواع و اقسام کے کھانوں سے تواضع کی گئی۔ چالیسواں ہو چکا تو ہز ہائی نس نے اخراجات کی فرد طلب کی اور ڈھائی تین لاکھ روپیہ، جو اس تقریب میں صرف ہوا تھا، نواب مکرم علی خاں کے یہاں بھجوا دیا۔ ہز ہائی نس نے نواب صاحب کو تسلی دیتے ہوئے اور تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ "بھائی جی کا جو عہدہ تھا وہی آپ کو دیا جائے گا، مگر اس میں کچھ دیر لگے گی"۔ ریاست کی کونسل کا ممبر نواب صاحب کو مقرر کیا گیا، لیکن کونسل کے انگریز صدر سے نواب صاحب کی بہت جلد ان بن ہوگئی، انھوں نے خود مجھ سے فرمایا کہ میں نے کونسل کے انگریز صدر سے صاف طور پر کہہ دیا ہے "گویا کہ"[1] آپ کی کونسل میں بیٹھنا اور بیت الخلاء میں جانا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ وزارتِ عظمیٰ تک پہنچنے کا یہی پہلا زینہ تھا، نواب صاحب نے اسی کو لات مار دی۔

---

[1] یہ "گویا کہ" نواب صاحب کا تکیۂ کلام تھا۔

نواب مکرم علی خاں جوان تھے، خوبصورت تھے، اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے جائیداد اور دولت کسی محنت و مشقت کے بغیر ورثہ میں ملی، بس پھر کیا تھا، دن رنگ رلیوں اور راتیں عیش و عشرت میں گزرنے لگیں۔ پانی کی طرح دولت بہائی اور کنکری کی مانند پیسہ لٹایا۔ دو بار یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں رولس رائس کار خرید کر لائے۔ اس زمانے میں شاید پورے صوبہ میں رام پور اور بنارس کے والیانِ ملک کے یہاں اتنی قیمتی موٹر ہو تو ہو ورنہ زمیندار اور ساہوکار تو رولس رائس خریدنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں اُن دنوں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہم نوجوان دوستوں اور ساتھیوں کی صحبتوں میں نواب ممتاز الدولہ مکرم علی خاں کی شاہ خرچیوں اور رنگ رلیوں کے چرچے رہتے تھے۔ اُن کے مصاحبوں پر رشک بھی آتا تھا کہ وہ کیسے مزے کر رہے ہیں اور خوب گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ قصبہ ڈبائی کی مشتری طوائف کے حسن و جمال کی اُس نواح میں بڑی شہرت تھی۔ نواب صاحب کے تعلق سے علی گڑھ اور بلند شہر کے اطراف میں اس (Romance) کے تذکرے بیٹھکوں اور چوپالوں میں رہا کرتے تھے۔

فضول خرچی کے لیے قارون کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا۔ اس مسرفانہ زندگی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آگرہ اور دلی کی شاندار کوٹھیاں کوڑیوں کے مول بک گئیں۔ انگریزی راج میں ہندو بنیے اور ساہوکار ایک ہزار کا قرض دے کر دو ہزار اور بعض اوقات چار پانچ ہزار کی دستاویز یا رقعہ لکھواتے تھے، پھر اس رقم پر سود در سود، اس چکر سے نکلنا مشکل تھا قرض لینے والے کے مکان اور جائداد کی قرقی اور تعلیقہ کی نوبت آکر رہتی۔

جے پور میں بڑے دھوم کے مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء[1] کا مشاعرہ بھی یادگار مشاعرہ تھا۔ میں ان دنوں حیدرآباد دکن میں تھا۔ حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم کے صاحبزادے (اعجاز صدیقی مدیر شاعر) کو میں نے جے پور کے لیے آگرے سے سیٹ ریزرو کرانے کے لیے لکھ دیا تھا۔ جناب سیماب مرحوم اور راقم الحروف نے ایک ڈبہ میں سفر کیا۔ صبح سویرے ٹرین جے پور پہنچی تو مشاعرے کے منتظمین کی زبانی معلوم ہوا کہ شعراء مختلف مقامات پر ٹھہرائے گئے ہیں، مولانا سیماب اور ماہر القادری نواب ممتاز الدولہ بہادر کے مہمان رہیں گے۔ میں نے منتظمین مشاعرہ سے کہا کہ نواب صاحب ہمارے ضلع کے بہت بڑے رئیس ہیں، میں اسی ضلع کے ایک گاؤں

---

[1] سنہ کے بارے میرا حافظہ غلطی کر سکتا ہے۔ (م-ق)

(کیسر کلاں) کا رہنے والا ہوں۔ جس کے دس بسوے یعنی آدھا گاؤں نواب صاحب کی زمینداری میں شامل ہے، جو لال خانی رئیسوں کے اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر سے میرا پہلے کا تعارف بھی نہیں ہے اس لیے میں اُن کے یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ جناب سیماب مرحوم کو تو منتظمین نواب صاحب کے یہاں لے گئے اور مجھے سید حامد حسین کے مکان پر ٹھہرایا گیا۔ جو ان دنوں ریاست جے پور میں غالباً ہوم سکریٹری تھے۔ مشاعرے کے دوسرے دن نواب صاحب مرحوم نے اپنے سکریٹری کو میرے پاس بھیجا کہ آج میرے یہاں محفل میلاد شریف منعقد ہو رہی ہے اُس میں آپ شرکت کریں اور اپنا سلام سنائیں۔ وقتِ مقررہ پر اُن کی موٹر آگئی، میں نواب صاحب کے یہاں پہنچا، بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کیا۔ بس اُس دن کے بعد جو اُن سے روابط قائم ہوئے ہیں تو پھر ہر ملاقات میں بے تکلفی بڑھتی ہی چلی گئی۔

صابر دہلوی مرحوم اور راقم الحروف اُن کے یہاں دس دس بارہ بارہ دن مہمان رہے ہیں۔

نواب مکرم علی خاں ممتاز الدولہ کی سالگرہ پر خاصا جشن رہتا۔ شام میں پر تکلف عصرانہ کا اہتمام جس میں شہر کے عمائد شریک ہوتے، شب میں مخصوص احباب کی دعوتِ عیش و طرب کے تمام لوازم کے ساتھ! اطلس کی جو شیروانی نواب صاحب اس تقریب میں پہنتے وہ دلی کی رینکن کمپنی کی سلی ہوئی جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ یہ کمپنی امیروں اور رئیسوں سے وصول کرتی۔

نواب صاحب کے دسترخوان پر کم سے کم چھ سات طرح کے کھانے ہوتے، جاڑے کے زمانے میں گہری رکابیوں میں تیز گرم پانی بھرا ہوتا، جس میں کھانے کی پلیٹیں رکھی جاتیں تاکہ سالن گرم رہے، ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔

نواب صاحب مرحوم خوش پوشاک اور بڑے جامہ زیب تھے، سردی کے موسم میں کوٹھی کے صحن میں خیمہ نصب ہوتا اور جب وہ دھوپ سے گرم ہو جاتا تو نواب صاحب تنگانی کے کام کا خوب صورت نیلے کا چیسٹر پہن کر خیمہ میں فرد کش ہوتے۔

حیدر آباد دکن کے پرنس، النواب معظم جاہ بہادر کی طرح نواب مکرم علی خاں کو بھی شاعری کا بہت شوق تھا، ان کی غزلیں روزانہ نشستوں میں ترنم سے پڑھی جاتیں اور داد و تحسین سے اُن کے سُرخ و سپید چہرے کی رنگت اور زیادہ گلابی ہو جاتی، مگر موزوں طبع نہ معظم جاہ ہیں اور نہ نواب صاحب تھے۔

میں اور صابر دہلوی جے پور میں نواب صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان

دنوں سر مرزا محمد اسمٰعیل جے پور اسٹیٹ کے وزیر اعظم تھے۔ سر مرزا کو فنِ تعمیرات سے غیر معمولی شغف تھا۔ ریاست میسور کے جب وہ دیوان تھے تو ان کے حکم سے دریائے کاویری کے نشیب میں وہ باغ تعمیر ہوا تھا جس کے برقی فوارے آج بھی ہندوستان کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے ان فواروں پر نظم کہی تھی، جس کے تین شعر یہ تھے:

پھول کھلتے ہیں اُدھر، سبزہ ادھر لہرائے ہے
میں بھی تتلی بن کے اڑ جاؤں یہ جی میں آئے ہے

نور برساتے ہوئے فوارہ ہائے رنگ رنگ
دل کشی ایسی کہ چلتا آدمی رُک جائے ہے

ہر روش پر صنعتِ انساں کے زندہ معجزے
ہر قدم پر حیرتِ نظارہ ٹھوکر کھائے ہے

سر مرزا اسمٰعیل سے جے پور کے کسی شخص نے میری اس نظم کا تذکرہ کر دیا۔ انہوں نے میری زبان سے اس نظم کے سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ نواب صاحب تک یہ بات پہنچی تو فرمانے لگے ماہر صاحب میرے مہمان ہیں، سر مرزا کو مجھ سے کہنا چاہیے۔ بس پھر یہ بات وہیں ٹھپ ہو کر رہ گئی۔

نواب صاحب کو شاعری سے جو غیر معمولی شغف تھا، اُس کا تذکرہ اوپر کر چکا ہوں اسے میں اپنی کمزوری ہی کہوں گا کہ ان کے نام سے جو دیوان موسوم تھا اس پر میں نے مقدمہ لکھا مگر جہاں تک میرے علم واطلاع کا تعلق ہے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ مقدمہ کے معاوضے کے سلسلے میں کچھ غلط فہمی ہو گئی اور دو تین مہینے دونوں طرف سے خط وکتابت میں نوک جھونک ہوتی رہی مگر پھر صفائی ہو گئی۔

نواب صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی معظّم علی خاں دونوں شب کوری کے مریض تھے۔ جن دنوں نواب صاحب کے یہاں میرا آنا جانا ہوا ہے ان کی بینائی جاتی رہی تھی مگر وہ اس انداز میں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور چیزوں کو پکڑتے تھے جیسے انہیں دکھائی دیتا ہے۔

نواب صاحب کے یہاں ایک کتیا تھی جسے وہ "بیلا" کہہ کر پکارتے تھے۔ کتیا کیا تھی عین مین شیرنی تھی، میں اُسے کھلا ہوا دیکھ کر بہت ڈرتا تھا۔ رات کے وقت "بیلا" نواب صاحب کی کوٹھی کی رکھوالی کرتی۔ شب میں ناوقت کوئی اجنبی آدمی کوٹھی کے احاطہ میں پاؤں

رکھتا تو یہ کنیا اسے چبا ڈالتی۔ مگر نواب صاحب کے اشاروں پر ناچتی رہتی تھی۔

ایک بار نواب صاحب جے پور سے پہاسو تشریف لے گئے، مجھے خط بھیج کر بلایا۔ پہاسو کا قلعہ نام کا اور جھوٹ موٹ کا نہیں سچ مچ کا قلعہ تھا۔ آج کل تو ایسی عمارت شاید پچاس لاکھ روپیہ میں بھی نہیں بن سکتی۔ میری فرمائش پر ایک دن قلعے سے باہر انگریزی وضع کی کوٹھی میں بکرا ذبح ہوا۔ دیگ میں قورمہ پکا، مٹی کے سکوروں میں قورمہ اتارا گیا۔ تنور کے گرم گرم نان، میٹھے میں زردہ! بیاہ، برات کے کھانے کا لطف آگیا۔

علی گڑھ کی نمائش میں خورجہ کا اچار اور خان کے کباب پراٹھے بہت مشہور تھے۔ بلند شہر اور علی گڑھ ضلع کے رئیسوں کے خیمے نمائش میں لگتے، نواب صاحب کا خیمہ خان کی دکان سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلہ پر نصب ہوتا۔ نواب صاحب کے یہاں سے اصلی گھی اور پسا ہوا صاف آٹا دیا جاتا اس کے پراٹھے لگتے خان کی دکان سے نواب صاحب کے خیمہ تک تھوڑی تھوڑی دور پر ملازم کھڑے ہوتے اس طرح ہاتھوں ہاتھ گرم پراٹھے دسترخوان تک پہنچتے۔

۱۹۴۶ء میں قائد اعظمؒ کے ایماء سے جب بعض مسلمان خطاب یافتہ اکابر نے اپنے خطابات انگریزی سرکار کو واپس کیے ہیں تو نواب مکرم علی خاں نے بھی "ممتاز الدولہ" کا خطاب واپس کر دیا۔ سنا ہے کہ سات آٹھ سال سے ان کی زندگی میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پھر نواب صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کے سکریٹری قاضی عطاء اللہ صاحب کے لکھے ہوئے خط البتہ آتے رہے۔ عطاء اللہ نواب صاحب کے انتہائی وفادار ملازم تھے تقریباً پچاس سال کا ساتھ تھا۔ اپنے آقا کے انتہائی مزاج شناس اور ان کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے والے! میں چار مہینے کے طویل سفر سے کراچی واپس آیا تو منشی عطاء اللہ صاحب کے خط سے نواب صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین)

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر ممتاز حسن

ایک بزرگ حاضر صاحب ہیں، ان کی عمر نوے برس سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔ تقسیمِ ہند سے قبل اسٹیشنوں پر گرم و سرد مشروبات (چائے، سوڈا لیمونیڈ ......) اور کھانے کے وہ کنٹریکٹر تھے۔ دہرہ دون اُن کے کاروبار کا مرکز تھا۔ شعر و سخن سے اُنہیں بڑی دلچسپی ہے اور شاعروں اور ادیبوں کے قدرشناس ہیں! پاکستان بننے کے بعد حضرت جگر مراد آبادی کے اعزاز میں انہوں نے کئی مرتبہ پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام کیا۔ سامعین میں ڈاکٹر ممتاز حسن بھی شامل تھے۔ مگر میں نے اُن کا نام سُنا تھا، صورت آشنا نہ تھا، جب بہادر یار جنگ ہائی اسکول میں علامہ اقبالؒ پر ایک مذاکرہ ہوا اور میں نے اس میں اپنا مقالہ سنایا تو وہاں ممتاز حسن مرحوم سے پہلی بار تعارف ہوا اور اُن سے مل کر آنکھوں نے شہادت دی کہ یہ چہرہ تو کئی بار کا دیکھا ہوا ہے۔ راقم الحروف کا یہ مقالہ "اقبال ریویو" (کراچی) میں چھپ چکا تھا۔ اُس کا تراشا ممتاز حسن صاحب نے مجھ سے مانگا اور فرمایا کہ اس پر دستخط کر دیجیے۔ یہ آپ کی یادگار کے طور پر میرے کتب خانہ میں محفوظ رہے گا۔

جن دنوں ممتاز حسن مرحوم نیشنل بنک کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ میری مرحومہ بیوی کے ایک عزیز نے مجھ سے کہا سنا ہے، ممتاز صاحب سے آپ کے تعلقات ہیں اُن سے مل کر میری ملازمت کے لیے کوشش کیجیے۔ میں نے جواب دیا کہ اُن سے میری بس ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک ادبی اجتماع میں ـــــ اس ملاقات پر "تعلقات" کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا۔ عزیز موصوف کی ملازمت اور روزگار کا معاملہ تھا، انہوں نے اصرار کیا کہ آپ اُن سے مل کر تو دیکھیے، قسمت میں لکھا ہوگا تو کام ہو جائے گا اور نہ ہوا تو آپ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

نیشنل بنک ہیڈ آفس اُن دنوں بولٹن مارکیٹ کی عمارت میں تھا، میں وہاں پہنچا، حیدرآباد دکن کا ایک شخص ہیڈ چپراسی تھا، لانبا قد، گٹھیلا بدن، ناک نقشہ حضرموت اور مکلا کے شیدیوں جیسا، صاف ستھری وردی، عمامہ پر جھبا لگائے ہوئے اور شیروانی

کے سامنے کی جیبوں میں تمغے آویزاں، ڈاب میں خنجر، ہاتھ میں موٹا سا بید، اس ہیڈ چپراسی کی شخصیت خاصی پُرجلال تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پیشوائی کے لیے آگے بڑھا میں نے کہا ممتاز حسن صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، میرا وزیٹنگ کارڈ اُن تک پہنچا دو، وہ اس پر بولا آپ کے لیے کارڈ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے! اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے لے جا کر ممتاز حسن صاحب کی میز کے قریب کرسی پر بٹھا دیا! میں چپراسیوں اور اردلیوں کے اُس جمعدار کی اُس جرأت پر حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ اطلاع کے بغیر میرا اس طرح نیشنل بنک کے مینجنگ ڈائرکٹر کے ایوانِ خاص میں آ دھمکنا کہیں اُنہیں ناگوار نہ ہو! مرحوم، اسٹینوگرافر کو خط املا (Dictate) کرا رہے تھے۔ اُس سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

"کہیے کیا حکم ہے؟" [1]

ان کے اس محبت آمیز تخاطب پر دل نے کہا کہ کام ہو جائے گا۔ میں نے درخواست اُن کے ہاتھ میں تھما دی اور زبانی بھی کہا کہ پشاور کے قریب کسی کمپنی میں ایک سو اسی روپے کے ملازم ہیں۔ کمپنی کی نوکری کا کوئی ٹھیک نہیں .... ممتاز حسن مرحوم نے اپنے سیکرٹری کو بلایا اور حکم دیا کہ تقرر کر دیا جائے اور تنخواہ ایک سو پچاسی رہے گی! یہ جو کچھ ہوا راقم الحروف کی توقع سے زیادہ ہوا، کس محبت و تکریم کے ساتھ بات چیت کی اور عام عہدیداروں کی طرح معاملہ کو طول دینے اور بات کو ٹالنے کی بجائے ہاتھ کے ہاتھ تقرر کا حکم صادر فرما دیا۔ اُن کی اس نوازش، توجہ اور محبت کا نقش قائم ہو گیا، اس نقش کو اُن کا شفقت آمیز سلوک جلا دیتا رہا!

ایک صاحب تھے اکرام حسین، قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر کے رہنے والے، کبیر ہائی اسکول (ڈبائی) میں وہ اور میں سات آٹھ برس ساتھ ساتھ پڑھے ہیں میٹرک پاس کرنے کے بعد اکرام حسین کو محکمہ ڈاک میں کلرکی مل گئی اور ترقی کر کے علی گڑھ کے سٹی پوسٹ آفس میں سب پوسٹ ماسٹر ہو گئے، کراچی میں چالیس برس کے بعد اُن سے

---

[1] عربی زبان وادب سے وہ واقف تھے مگر گفتگو میں "حکم" کے کاف کو ساکن کی بجائے زبر کے ساتھ ادا کیا۔

ملاقات ہوئی، بولے میں بھارت سے پاکستان پنشن لینے کے بعد [illegible] نوکری کے فنڈ کی رقم ایک جاننے والے کے حوالے کر دی جو ابھی تک مجھے وصول نہیں ہوئی اور یہ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے، پنشن بند ہے، میرا لڑکا بیکار ہے۔ نیشنل بنک کا امتحان پاس کر چکا ہے مگر اُسے نوکری نہیں ملی! کیا کروں، مالی حالات خاصے پریشان کُن ہیں۔ آپ کو اپنا قدیم دوست اور ہمدرد سمجھ کر آیا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر ممتاز حسن کو خط لکھا کہ یہ نوجوان سفارش نہ ہونے کے سبب آپ کے بنک کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد بھی ملازمت سے محروم ہے آپ اپنے دفتر کی کوتاہی کی تلافی فرما دیجیے، میرا خط پڑھ کر انہوں نے دفتر سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد میرے قدیم دوست کے فرزند کا تقرر کر دیا۔ میری سفارش اور گزارش کو مرحوم نے کبھی نہیں ٹالا۔ ایک شاعر نے مجھ سے کہا کہ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کر رہا ہوں جس سے مجھ کو مالی منفعت بھی ہو جائے گی، ممتاز حسن صاحب میرے بھی کرم فرما ہیں مگر مشاعرے کی صدارت کے لیے وہ آمادہ نظر نہیں آتے، آپ کی بات وہ ضرور مان لیں گے آپ ان سے کہیے۔ میں نے فون پر گفتگو کی، انہوں نے اپنی مصروفیات کا عذر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ اسلام آباد بھی آنا جانا رہتا ہے۔ میں نے اصرار کیا تو میری بات مان لی۔ مشاعرے میں وقت مقررہ پر تشریف لائے اور خوب جم کر صدارت کی۔

ایک بار میں اُن سے ملنے کے لیے گیا اور جب میں نیشنل بنک کے ہیڈ آفس میں پہنچا ہوں تو ملاقات کے مقررہ وقت میں ابھی کئی منٹ باقی تھے۔ نہ جانے انہیں کیسے معلوم ہو گیا، وہ ملاقاتیوں کے کمرے میں آئے اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے اپنے آفس میں لے گئے، تھوڑی دیر گفتگو کے بعد میں نے اٹھتے ہوئے جانے کی اجازت مانگی تو بولے آپ کو جانے کی ایسی کیا جلدی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ بہت سے ملاقاتی جو بیٹھے ہیں؟ اس پر وہ بولے کہ اُن کی آپ کو کیا فکر ہے۔ اور اُن سے ملنا کون چاہتا ہے؟ جس سے میں ملنا چاہتا ہوں وہ صاحب بیٹھنا نہیں چاہتے! پھر چپراسی کو آواز دے کر کہا! مولانا کے لیے خوش ذائقہ چائے بنا کر لاؤ! اعلیٰ عہدیداروں اور بڑے آدمیوں میں ایسی پیار محبت کی باتیں کرنے والے کہاں ملتے ہیں۔

ایک ادبی نشست میں راقم الحروف کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۴۲ء ۱

میں نئی دلی کے ٹاؤن ہال میں ماہر القادری نے اپنی نظم "جمنا کا کنارا" پڑھی تھی اس وقت سے میری اُن سے نیاز مندی[1] ہے ۔ پھر میری نظم کے دو تین شعر سنائے۔

فارسی شاعری کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے فارسی شاعری دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری سے بلند و بالا ہے ۔ شعریت اس زبان کے خمیر اور مزاج میں شامل ہے ۔ ممتاز حسن مرحوم کا نقطۂ خیال یہ تھا کہ عربی شاعری کا مقابلہ دُنیا کی کسی زبان کی شاعری نہیں کر سکتی ، عربی شاعری میں تصنع نہیں سادگی اور فطرت کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے ۔ اس پر ہمارے درمیان بڑی خوشگوار قسم کی بحث و گفتگو ہوتی ، وہ عربی اشعار سناتے اور میں فارسی اشعار اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتا ۔ ایک بار میں نے یہ شعر :

ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد ۔۔۔ قربان لب یار گہے غنچہ گہے گل

پڑھتے ہوئے چیلنج کیا کہ کوئی عربی شعر اس کے مقابلے میں سنایئے ! اس پر وہ خاموش ہو گئے ۔ اُن کا یہ سکوت اس بحث کے خاتمے کا اعلان تھا ۔

ترقی اردو بورڈ جب جمشید روڈ کے متصل ایک عمارت میں تھا تو وہاں ممتاز حسن مرحوم ہی کے ایما سے علامہ عبدالعزیز میمن کے عربی شعر و ادب پر لیکچر ہوا کرتے تھے ۔ ایک نشست میں زبان و ادب کی گفتگو چلی تو ڈاکٹر ممتاز حسن نے فرمایا کہ اردو کو آسان بنانے کی ضرورت ہے ۔ بس اُن کا یہ کہنا تھا کہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے تن بدن میں کسی نے شتابہ لگا دیا ۔ میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر عرض کیا کہ جس اردو زبان کا برسوں سے چلن ہے ، وہ معیاری زبان ہے اُس کے مشکل و دشوار ہونے کی کوئی شخص شکایت نہیں کرتا ، اردو کو آسان بنانے کی کوشش میں زبان کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا ، احتیاط و ضبط کے باوجود میرے لہجہ میں تیزی آگئی ، ممتاز صاحب کی یہ عالی ظرفی تھی کہ میری باتوں کی تردید میں ایک حرف بھی نہیں کہا ۔ بحث و مباحثہ اُن کا مزاج ہی نہ تھا ! اپنی رائے کے منوانے پر وہ اصرار نہ کرتے اور کسی صحبت اور محفل کو دلیل و مباحثہ کا اکھاڑا نہ بننے دیتے !

شاعروں اور ادیبوں کے انتہائی قدر دان اور قدر شناس ! نہ جانے کتنے اہلِ قلم

---

[1] کوئی دوسرا شخص "ملاقات" یا "تعارف" کہتا (م۔ق)

کو اُن کی سعی و توجہ سے فائدہ پہنچا۔ ہر شخص کی دلدہی اُن کا شعار تھا۔ ایوانِ ادبِ اردو کے جلسہ میں ایک شاعر کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے، یہ تک کہہ دیا :-

" یہ شاعری نہیں شاعری سے ماورا کوئی چیز ہے۔"

اس مبالغہ میں ان کی شرافتِ نفس شامل تھی! علامہ اقبالؒ کے فدائی اور شیدائی مگر:-

زمانہ با تو نسازد تو بہ زمانہ ستیز

سے اپنے کو محفوظ رکھا، اس لیے ہر حکومت میں وہ کسی نہ کسی بڑے عہدے پر فائز رہے، وہ نہ زمانہ ساز تھے اور نہ "زمانہ ستیز"! اُن کا خیال یہ تھا کہ حکومت سے تعاون کرکے ملک و ملت کو فائدہ پہنچایا جائے اور اپنی توانائیاں تصادم کی بجائے تعاون و توافق میں صرف کی جائیں! اُن کے اس موقف پر گفتگو کی جا سکتی ہے! مگر اُن کی خیر پسندی اپنی جگہ بہرحال مسلّم ہے!

ان کی زبان سے میں نے کسی پر طنز و تعریض نہیں سُنی۔ ان کی زبان اور قلم سے کسی شخص کو دکھ نہیں پہنچا۔ ان کا شعار "فصل" نہیں "وصل" تھا۔ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کسی عقیدت مند نے قینچی ہدیہ کے طور پر پیش کی تو آپ نے فرمایا :-

" میں کاٹنے کے لیے نہیں جوڑنے کے لیے آیا ہوں مجھے قینچی نہیں سوئی چاہیے۔"

ممتاز حسن مرحوم کی پوری زندگی اور سیرت و کردار میں اسی قول کی جھلکیاں دکھتی ہیں۔

کتنے بڑے بڑے عہدوں پر وہ فائز رہے ہیں، مگر ہر کسی سے "تواضع" کے ساتھ پیش آتے۔ اپنے مناصب اور عہدوں کی شان اور تمکنت کو انھوں نے فراموش کر دیا تھا۔ آمدنی کا خاصا حصہ ضرورت مندوں کی امداد پر صرف کرتے، نادار طلباء کے وظائف اُن کے یہاں سے مقرر تھے۔ لباس سادہ اور معمولی کھانا لباس سے بھی زیادہ سادہ۔ جس جگہ رہے نیک نام اور ہر دلعزیز رہے، اُن کی دیانت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

شریف النفس، علم دوست، وسیع المطالعہ۔ اردو، فارسی، انگریزی، عربی اور پنجابی کے عالم، فرانسیسی اور جرمنی بھی جانتے تھے! اس لیے کسی مبالغہ کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہفت زبان تھے۔ علامہ عبدالعزیز میمن ہوں یا قاضی اختر جونا گڑھی

مرحوم اہل علم سے ربط ضبط رکھتے! مشہور محقق ادیب پیر حسام الدین راشدی صاحب سے بڑی گہری دوستی تھی، یہ دونوں بزرگ اتوار کی چھٹی میں ٹھٹھہ گئے ہیں اور وہاں کے مقبروں اور آثار قدیمہ کے کتبوں کو پڑھا ہے اور ان پر ریسرچ کی ہے۔

تصانیف و تالیفات اور ترجموں پر اُن کے مقدمے، دیباچے اور تعارف عالمانہ اور معلومات افزا ہیں۔ ان کو یکجا کر کے چھپوا دیا جائے تو یہ کتاب اردو زبان و ادب کا گرانقدر سرمایہ ہوگی! شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ شاعر کی حیثیت سے اُنہیں لوگ کم ہی جانتے ہیں مگر اس صنف میں بھی اُن کی ذہانت نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اس ہمہ گیر قابلیت کے باوجود طبیعت میں بڑا انکسار تھا! انہوں نے نہ کبھی اپنی بڑائی جتائی اور نہ اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کیا!

ممتاز حسن مرحوم شعر و ادب کے حلقوں میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ سینکڑوں ادبی مذاکروں، علمی جلسوں، سیمیناروں اور مشاعروں کو اپنی صدارت یا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے رونق بخشی! نہ جانے کتنی علمی اور ادبی انجمنوں اور اداروں کے وہ سرپرست تھے۔

اسی سال کے رمضان سے پہلے کی بات ہے، میں سواری کے انتظار میں شپ یارڈ کے قریب فٹ پاتھ پر کھڑا تھا مجھے دیکھ کر ممتاز حسن مرحوم نے اپنی کار روک لی پھر وہاں سے ایک کمپنی کے دفتر میں ساتھ لے گئے، کمپنی کے ڈائرکٹر سے میرا تعارف کرایا، خنک مشروب سے لطف اندوز ہونے کے بعد، کار میں بیٹھ کر اُن سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا "تخلص" عربی زبان کا لفظ ہے مگر عربی کے شعراء اپنا نام اور تخلص شاعری میں نہیں لاتے۔ یہ لفظ (تخلص) تو عجمیوں کی ایجاد ہے! فارسی زبان و ادب میں یہ لفظ کب آیا اور کس معنوی رعایت کے ساتھ آیا اس کی تحقیق مطلوب ہے! بولے کسی دن علامہ عبدالعزیز میمن کے یہاں چلیں گے، میں آپ کو فون کر دوں گا۔ مگر فون پر اطلاع کی جگہ اخبارات کے ذریعہ اُن کی موت کی اطلاع سننی پڑی۔ میں ان دنوں لاہور میں تھا۔ دل کو دھچکا لگا اور اُن سے تعلقات و روابط کی فلم آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

ممتاز حسن مرحوم کے سوگ میں ابھی تک تعزیتی جلسے ہو رہے ہیں، شعراء نے

قطعات تاریخ اور مرثیے کہے ہیں، ان کے انتقال سے ادبی دنیا میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے، اس کا سب کو ملال ہے! فرہنگ خانہ ایران میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا اس میں ایرانی دانشوروں نے بھی اپنے تاثراتِ ملال و عقیدت پیش کیے، پیر حسام الدین صاحب راشدی اختتامی کلمات کہتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے اور آواز گلوگیر ہوگئی۔

نیکی کن! اے فلان و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم کی زندگی سعدیؒ کے اسی شعر کی آئینہ دار تھی۔

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" جنوری ۱۹۷۵ء)

مولانا مناظر احسن گیلانی

حیدرآباد دکن نے چھوٹے پیمانے پر حقیقت میں قرطبہ اور بغداد کی علمی مجلسوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ارباب کمال کھنچ کھنچ کر سرزمین دکن میں پہنچ گئے تھے۔ ان آنکھوں نے دکن میں جو چہل پہل دیکھی ہے اور علم و کمال کے جن جگمگھٹوں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ باتیں آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حیدرآباد ہی میں سب سے پہلے نیاز حاصل ہوا۔ اُن کے مضامین کے ذریعہ غائبانہ تعارف تو تھوڑا بہت پہلے ہی سے تھا۔ حیدرآباد کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں اُن کی تقریریں سُن کر یہ غائبانہ تعارف تعلق خاطر سے بدل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدرآباد دکن میں سیاسی اور مذہبی جلسوں کا بڑا زور و شور تھا۔ بہت ہی کم ایسے جلسے ہوتے تھے جن کے پروگرام میں میری "نظم" نہ شامل ہوتی ہو۔ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی تقریر اور میری نظم جلسوں کے پروگرام میں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ انہی جلسوں کی بدولت مولانا گیلانی مرحوم سے تعارف ہوا اور یہ جان پہچان رسمی تعارف ہو کر ہی نہیں رہ گئی بلکہ ربط و اخلاص بڑھتا ہی چلا گیا۔

میں نے اپنی مشہور نظم "ظہورِ قدسیؐ"[1] کہی تو اُسے لے کر مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُن دنوں عثمانیہ یونیورسٹی کے قریب ایڈیکمیٹ میں رہتے تھے، میں نے نظم سُنائی، تو اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہو گئیں۔ کاش! عشقِ رسولؐ کے ان موتیوں کو میں چن سکتا! میری اس نظم پر مولانا گیلانی مرحوم نے مقدمہ لکھا اور نظم کی شہرت و مقبولیت کی جو پیشن گوئی انہوں نے اُس وقت کی تھی وہ بعد میں جاکر

---

[1] سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی۔

حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ میری سعادت اور خوش نصیبی کی انتہا ہے کہ دو سال پہلے جب میں نے روضۂ رسولؐ پر حاضری دی تو مسجدِ نبوی کے دروازوں پر یہ نظم (ظہورِ قدسی) کتابی صورت میں تقسیم ہو رہی تھی۔

حیدرآباد دکن میں ایک نیک نفس بزرگ مچھلی والے شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کی عقیدت کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ سر اکبر حیدری مرحوم تک اپنے تمام اعزاز و مرتبت کے باوجود اُن کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ انہی شاہ صاحب کے ایک خلیفہ مولوی محمد حسین صاحب تھے، جو دکن کی ایک جاگیر (ونپرتی) میں ناظم تھے۔ مولوی محمد حسین صاحب مرحوم کو توحید کے اسرار و معارف کی شرح و تفسیر کے لیے اللہ تعالےٰ نے "طولِ لسان" عطا فرمایا تھا۔ گھنٹوں "لا الٰہ الا اللہ" کی تفسیر فرماتے اور کئی کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ مگر مضامین کی تکرار اور اعادہ نہ ہونے پاتا۔ ہر لمحہ نئی تشریح اور تازہ سے تازہ تر مضامین! مولانا مناظر احسن گیلانی بھی اُن کے عقیدت مندوں میں تھے۔

ایک دن میں اپنے مکان[1] میں تھا کہ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی چوکھٹ کے قریب کھڑے ہیں۔ اُن کو شاید محسوس بھی نہ ہوا ہو۔ مگر میں نے دیدہ و دل اِن دونوں بزرگوں کے قدموں تلے بچھا دیے۔ فرمانے لگے: "ہم تمھیں مولوی محمد حسین صاحب قبلہ کے یہاں لے چلنے کے لیے آئے ہیں"۔ میں اُن کی آن میں شیروانی پہن کر تیار ہو گیا۔ مولوی صاحب مرحوم کے یہاں ہم پہنچے تو وہ مجھے دیکھتے ہی بولے:۔

"عہدہ بہت چھوٹا ہے۔ ابھی اور ترقی ہونا ..... اور ..... ترقی"۔

وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر میں چلا آیا۔ صوفی محمد حسین صاحب قدس سرہٗ کی ذات اور شخصیت میں بڑی جاذبیت بلکہ محبوبیت تھی۔ ساری عمر وعظ و تلقین ہی میں گزار دی۔ اور توحید کے وہ نکتے بیان کیے کہ بڑے بڑے کتابی علم رکھنے والوں کو حیران و ششدر کر دیا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم!

کسی نہ کسی عنوان اور تقریب سے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سے نیاز حاصل ہوتا رہتا اور ہر ملاقات میں میری نیازمندی اور اُن کی کرم فرمائی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو

۱؎ واقع ملک پیٹ (حیدرآباد دکن)

جاتا۔ جب ملتے بڑی کشادہ خاطری اور بے تکلفی کے ساتھ ملتے۔ اپنی علمی عظمت اور شہرت کا احساس تک نہ ہونے دیتے۔

حیدرآباد دکن سے قطع تعلق کے بعد ۱۹۴۹ء تک کوئی آٹھ نو سال کی مدت ہوتی ہے۔ اس مدت میں مولانا گیلانی سے نہ تو پھر ملنا ہوا اور نہ خط و کتابت کی نوبت آئی۔ جب میں نے "فاران" نکالنے کا ارادہ کیا تو ان کی خدمت میں مضمون کے لیے عریضہ بھیجا۔ جواب میں مضمون روانہ فرمایا اور ساتھ ہی محبت آمیز مکتوب بھی! مولانا مرحوم نے اس کے شاید تین چار مہینے کے بعد پھر ایک اور مقالہ روانہ فرمایا مگر وہ "فاران" میں نہ چھپ سکا۔ اسی شرمندگی کے سبب کئی سال تک میں اُن کی خدمت میں خط بھیجنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مگر رسالہ (فاران) مولانا کی خدمت میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا رہا۔

جب میں زیارتِ حرمین شریفین سے واپس ہوا تو اُس وقت علامہ گیلانی مرحوم کا گرامی نامہ آیا۔ جسے میں نے بارہا پڑھا اور اُن کو مجھ نابکار کی ذات سے جو غیر معمولی حسنِ ظن تھا، جس کا اظہار انہوں نے اپنے مکتوب میں فرمایا تھا۔ اُس نے مجھے خوب رُلایا۔ اُن کی تحسین و ستائش نے مجھے عرقِ ندامت کر دیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہٗ علم و فضل، اخلاق و کردار اور وضع قطع کے اعتبار سے علماءِ سلف کا نمونہ تھے۔ گداز بدن، متوسط قد و قامت، گندمی رنگت، چہرے پر ڈاڑھی کتنی بھلی لگتی تھی۔ مُسکراہٹ کا خاص انداز تھا۔ باتیں بڑی دلنشین کرتے اور ان میں جو ایک "جذب" کی سی کیفیت تھی، اُس نے اُن کی ذات میں بڑی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔

درسِ نظامی کی تکمیل امتیازی شان کے ساتھ کی۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں خود اُن کے اساتذہ اُن کی ذہانت اور فہم و دانش کے معترف تھے۔ سب کچھ پڑھ کر پھر ٹونک پہنچے اور حضرت مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ سے علومِ عقلی میں استفادہ کیا۔ علامہ برکات احمد جیسا کامل اُستاد اور مناظر احسن جیسا ذہین شاگرد، ہم جیسے بے علم

تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ اُستاد نے کیا سکھایا اور شاگرد نے کیا حاصل کیا؟

مولانا مرحوم کی زندگی کا زیادہ زمانہ دکن میں گزرا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں برسوں شعبۂ دینیات کے صدر رہے۔ ایک ہزار سے اُوپر تنخواہ ملتی تھی۔ ہر طرح کے فراغت کے اسباب میسر تھے، موٹر نشین تھے، بنگلہ میں رہتے تھے، بلدہ حیدرآباد کے ہر طبقے میں ان کا احترام کیا جاتا تھا، بلکہ لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے تھے، مگر مزاج میں انکسار اور طبیعت میں تواضع کا رنگ ہمیشہ باقی رہا۔

مولانا گیلانی اُونچے درجہ کے واعظ نہیں مقرر (اسپیکر) تھے۔ قایدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم جو تقریر میں اپنا آپ جواب تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ "میں نے تقریر کرنی مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھی ہے، میں اُن کے پیچھے موٹر لیے لیے پھرتا تھا، جہاں اُن کی تقریر ہوتی وہاں جا کر اُن کو ضرور سُنتا"۔ اُن کی تقریر میں خطابت کی تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ آخر میں بیماری کے سبب تقریر میں اُلجھنے لگے تھے۔ مگر اس دَورِ انحطاط میں بھی جب سنبھل کر بولتے تو خطابت کا حق ادا کر دیتے۔

تحریر میں قلم کی روانی کا یہ عالم کہ ذرا سی بات پھیل کر ایک اچھا خاصا دفتر بن جاتی۔ "اختصار و ایجاز" انہیں ناپسند اور شرح و اطناب سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ معلومات کے انبار کے انبار لگاتے چلے جاتے۔ اُن کا قلم طوفان کی طرح خس و خاشاک اور لالہ و گل سب کو اپنی رَو میں بہا لے جاتا۔ تحریر میں "انجیل" کا انداز جھلکتا تھا۔ "النبی الخاتم" میں مولانا گیلانی کی تحریر کے جوہر پوری طرح جھلکتے ہیں۔ دسیوں کتابیں اور درجنوں طویل مقالے یادگار چھوڑے!

شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی، خود بھی اچھے شعر کہتے تھے۔ مگر اُن کے دوسرے کمالات کے سامنے اُن کا یہ وصف دبا اور چھپا ہی رہا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی وفات پر جو فارسی نظم[1] کہی اُسے علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا!

ذاتِ رسالت مآبؐ سے مولانا گیلانی مرحوم کو جو محبت اور عشق تھا، وہی اُن کی سیرت و کردار کا سب سے زیادہ نمایاں باب ہے۔ عشقِ رسولؐ کی زادِ راہ لے کر

---

[1] بہ عشقِ مصطفےٰؐ دیوانہ بودی۔

جس نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہو اُس کی سعادت اور خوش نصیبی کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ دل بڑا دردمند پایا تھا۔ دُنیا کے کسی خطہ سے بھی مسلمانوں کی مظلومیت کی کوئی خبر سُنتے تو بے چین ہو جاتے۔ بہار اور دکن میں مسلمانوں کی تباہی اور قتل و غارت گری کے رُوح فرسا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور مظلوموں کی جگر خراش داستانیں اپنے کانوں سے سُنیں۔ اِس نے اُن کے دل میں اور زیادہ گداز پیدا کر دیا تھا۔ مولانا گیلانی "نالۂ نیم شب" اور آہِ سحر گاہی" کی لذّت سے بھی آشنا تھے اور وہ اُن لوگوں میں سے تھے کہ خشیتِ الٰہی کے سبب جن کے آنسوؤں سے سجادہ سچ مچ بھیگ جاتا ہے۔ صاحبِ حال و قال، اہلِ جذب و سوز۔ اللہ تعالےٰ اُن کی قبر کو معطّر فرمائے کہ اُن کے اُٹھ جانے سے خیر و فلاح اور علم و فضل کی مسند خالی ہو گئی۔ اُن کی موت کا اُن کے کس عزیز کو پُرسا دیجیے کہ مولانا گیلانی مرحوم کے ہم تمام مغموم عقیدت کیش اور نیاز مند خود تعزیت کے مستحق ہیں! (رحمہ اللہ تعالےٰ)

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۵۶ء)

منظرؔ صدیقی اکبرآبادی

حضرت سیمابؔ اکبرآبادی کے سب سے بڑے بیٹے تھے، سیمابؔ صاحب کی نسبت اور تعلق سے اُن کا نام تو سنا تھا مگر اُن سے خطوں کے ذریعہ تعارف ۱۹۲۶ء میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب انہوں نے آگرہ سے ماہنامہ "کنول" نکالا تھا ان کا خط آیا جس میں "کنول" کے لیے مضمون اور غزل کی فرمائش کی گئی، اُن دنوں میرا قیام حیدرآباد دکن میں تھا "کنول" میں میرے مضامین چھپتے رہے، منظرؔ مرحوم سے پہلی بار ملاقات ۱۹۳۸ء میں ریاست ٹونک کے مشاعرے میں ہوئی، کئی دن اُن کا ساتھ رہا، تمام شعراء ڈاک بنگلہ میں ریاست کے مہمان تھے، ہز ہائی نس نواب میر سعادت علی خاں مرحوم والیٔ ٹونک کے جلو اور معیت میں ابوالاثر حفیظؔ جالندھری، ساغرؔ نظامی، منظرؔ اکبرآبادی مرحوم اور راقم الحروف نے سیر وشکار اور جنگل کی دعوتِ شاہانہ کا لطف بھی اٹھایا۔

ماہنامہ "کنول" ڈھائی تین سال نکل کر بند ہو گیا، پھر منظرؔ اکبرآبادی مرحوم نے ایک ہفتہ وار اخبار کا آغاز کیا اور ۱۹۴۷ء تک یہی اخبار اُن کی گزربسر کا ذریعہ بنا رہا۔ اس اخبار کی سب سے بڑی مد عدالتوں اور کچہریوں کے سمن تھے، آگرہ کے تاجروں کے چھوٹے موٹے اشتہار بھی مل جاتے۔ ریاست ٹونک سے منظرؔ صاحب کو کئی سو روپے سالانہ کی امداد بھی ملتی تھی اور جب تک سر عزیز الدین ریاست دتیا کے وزیراعظم رہے وہاں سے بھی فتوحات ہوتی رہیں۔

حضرت سیمابؔ کے رسالہ "شاعر" کا انتظام اور قصرالادب کا کام منظرؔ مرحوم کے چھوٹے بھائی جناب اعجاز صدیقی نے سنبھالا۔ منظرؔ صاحب اپنے والد سے علیحدہ مکان میں رہتے تھے، میں دوبار حضرت سیمابؔ کے یہاں آگرہ میں اُن کا مہمان رہا۔ مگر میں نے منظرؔ صاحب کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا۔

کراچی میں منظرؔ مرحوم سے بارہا ملنا ہوا، جب وہ دلی کالونی میں کرایہ کے مکان میں

رہتے تھے تو کئی بار اُن کی مزاج پرسی کے لیے گیا۔ مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لاتے تو فلیٹ کے نیچے ہوٹل میں بیٹھ جاتے اوپر چڑھنا اُن کے لیے دشوار تھا، ہوٹل کے ملازم یا اپنے بچے کے ہاتھ پرچہ بھجواتے اس طرح ہوٹل میں اُن سے ملاقات ہو جاتی۔

منظر اکبرآبادی مرحوم نے کراچی میں "بزم سیماب" قائم کی تھی اس بزم کی ادبی نشستیں اور مشاعرے ہوتے رہتے۔ راقم الحروف کی شرکت کے لیے ان کا اصرار شدید تقاضے کی حد تک پہنچ جاتا! ایک بار خالقدینہ ہال میں "بزم سیماب" کا طرحی مشاعرہ تھا، ہال کے ایک گوشے سے "ہوٹنگ" کی آوازیں آنے لگیں۔ منظر صاحب نے اسٹیج پر مجھ سے فرمایا کہ آپ کچھ کیجیے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ خود مائک پر جا کر ان شریر لوگوں سے چپ ہونے کے لیے کہیے، وہ بار بار میرے پاس آکر اصرار کرنے لگے کہ ماہر! اس صورت حال کو سنبھالنے کے لیے تمہیں کو ہمت کرنی پڑے گی۔ ان کے اصرار اور میرے انکار کا منظر سامعین دیکھ رہے تھے اور میں خود تماشا بنا جارہا تھا بالآخر میں نے مائک پر ایک مختصر تقریر کی اور حاضرین جلسہ سے درخواست کی کہ آداب مشاعرہ کا لحاظ کریں۔ میری گزارش توجہ کے ساتھ سنی گئی، تھوڑی دیر کے لیے ہوٹنگ رُک گئی مگر تین چار شاعروں کے بعد پھر شور اٹھا، میں نے پھر مجمع سے خطاب کیا کہ آپ سب صاحبان تو شاعروں کو سننا چاہتے ہیں، گڑبڑ ایک دو آدمی پھیلا رہے ہیں۔ اگر آپ مشاعرے کو جاری رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ان شرارت پسندوں کو اُن کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ سنبھالیں ورنہ مشاعرہ ختم کر دیا جائے گا۔ میری تقریر کے بعد مشاعرہ گاہ کے ایک گوشے سے آوازیں آنے لگیں اور دُور سے ایسا دکھائی دیا کہ ہاتھا پائی ہو رہی ہے! ہوا یہ کہ جو دو آدمی ہوٹنگ کر رہے تھے انھیں ان کے پاس بیٹھے ہوئے اشخاص نے پکڑ کر اور ڈولا ڈنڈی کر کے ہال سے باہر نکالا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد مشاعرے میں پھر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔

منظر مرحوم نے اپنی مسلسل علالت کے باوجود بزم سیماب کی تقریبات کو کامیاب بنانے کے لیے بہت کچھ دوڑ دھوپ کرتے، اخبارات میں جلسوں کی اطلاعیں چھپتیں، خاص خاص لوگوں کو دعوت نامے بھی بھیجے جاتے مگر حاضرین کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہتی۔

منظر اکبرآبادی نہایت زود گو اور مشاق شاعر تھے۔ نہ جانے کتنی غزلیں

سہرے اور تہنیت نامے دوسروں کو لکھ کر دے دیے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُن کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ وہ نثر نویس بھی تھے، شعر ترنم سے پڑھتے مگر وہ مشاعروں کے شاعر نہیں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی سے باہر دو چار مشاعروں میں شریک ہوئے۔ رحیم یار خان کے آل پاکستان مشاعرے میں میرا اور اُن کا ساتھ رہا، ایک ہی مکان میں ٹھہرے۔

ایوب خاں صاحب کے دورِ حکومت میں منظر صاحب کو سو یا ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ ملنا شروع ہوا۔ سال کے سال منظوری لینی پڑتی تھی، ایک بار دشواری پیش آئی تو مرحوم اور راقم الحروف سید ہاشم رضا صاحب سے جا کر ملے ان کی سعی و توجہ کام آئی۔

منظر صاحب کثیر الاولاد تھے، اُن کی پہلی بیوی کے بڑے لڑکے یوسف اظہر صدیقی نے انتہائی سعادت مندی اور والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت و احترام کا ثبوت دیا۔ یوسف کی پوری تنخواہ گھر میں خرچ ہوتی، منظر صاحب دائم المریض تھے، خوش پوشاک اور خوش خوراک بھی، دواؤں کا اس پر خرچہ مستزاد! آمدنی ضروریات سے کم تھی۔ دو ڈھائی سال سے اپنے ذاتی مکان واقع فیڈرل ایریا میں منتقل ہو گئے، ان کے انتقال کی خبر روزنامہ "جنگ" میں شائع ہوئی۔ پھر اُن کے صاحبزادے کا خط آیا کہ والد صاحب آپ کو آخری دنوں میں بہت یاد کرتے تھے ....! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۷۱ء)

ابوالعلا ناطقؔ لکھنوی

مولانا حکیم ناطقؔ لکھنوی سے میری ملاقات سب سے پہلے حیدرآباد دکن میں ہوئی، یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے، ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنا ہوتا رہا، بلدۂ حیدرآباد میں وہ اپنے ایک عزیز کے یہاں سالار جنگ کی ڈیوڑھی کے قریب ٹھہرے تھے۔ مہاراجہ سرکشنؔ بہادر کا دربار اہل کمال کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فقرا، علما، شعرا، نجومی، جوتشی، پنڈت، خوش ذویس، مطرب، مُغنّی، آرٹسٹ غرض ہر صاحب فن کو مہاراجہ بہادر کے دربار میں دیکھا گیا، برامکہ[1] کی معارف نوازی، علم پروری اور داد و دہش کے کتابوں میں جو قصے پڑھے ہیں اس کی ایک جھلک مہاراجہ کشن پرشادؔ کے دربار میں نظر آتی تھی، حکیم ناطقؔ مرحوم کا بھی مہاراجہ بہادر کے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔

ایک بار جوبلی ہل پر مہاراجہ بہادر کے اہتمام سے بزم شعر و سخن منعقد ہوئی، یہ ایک طرحی مشاعرہ تھا، بلدۂ حیدرآباد کے تمام مشہور اور باکمال شاعروں کا جمگھٹا تھا، سب نے غزلیں پڑھیں اور خوب خوب پڑھیں مگر مشاعرہ ناطقؔ لکھنوی کے ہاتھ رہا مطلع تھا:

اس اہتمام سے مجھ کو فلک وقار کیا
جلا کے خاک کیا خاک کو غبار کیا

اور یہ شعر تو حاصلِ مشاعرہ تھا:

یہ دو سبب ہوئے اے دل تری تباہی کے
کہ اس نے وعدہ کیا تو نے اعتبار کیا[2]

سرزمینِ دکن میں بلا کی کشش تھی (مگر..... اب نہیں رہی، اس انقلاب نے وہاں کے زمین و آسمان ہی بدل دیے..... ع نہ سُنا جائے گا تم سے یہ فسانہ ہرگز) جو شخص

---

[1] حکومتِ عباسیہ کے مشہور وزرا، کا خاندان۔

[2] میں نے بھی اس طرح میں غزل کہی تھی مگر ناطقؔ کے شعروں کے بعد اپنی غزل کے اشعار پیش کر کے اسبابِ ذوق کو بے مزہ کرنا نہیں چاہتا۔

وہاں گیا، وہیں کا ہو کر رہ گیا، امیرؔ، داغؔ، جلیلؔ، فانیؔ، طباطبائی، مولانا عبدالله عمادی جیسے اہلِ کمال اُسی خاک میں سو رہے ہیں، مگر عجب اتفاق تھا کہ حکیم ناطقؔ لکھنوی دو تین مہینے ہی میں وہاں سے گھبرا کر وطن واپس چلے آئے۔

۱۹۳۳ء میں مولانا حسرتؔ موہانی نے ایک کانفرنس کی تھی اُسی سلسلے میں میرا کانپور جانا ہو گیا، مولانا حکیم ناطقؔ لکھنوی مرحوم اُن دنوں کانپورؔ ہی مطب کرتے تھے۔ انہوں نے ایک ادبی صحبت میں مجھے یاد فرمایا کئی گھنٹے تک شاعروں کا جماؤ رہا۔ کانپورؔ میں ناطقؔ صاحب مرحوم کی موجودگی نے شعر و سخن کی محفلوں میں اور گرمی پیدا کر دی، اُن کے شاگرد سلیمؔ ناطقی نے دائرہ ادبیہ قائم کیا، جس کے سال کے سال اچھے خاصے پیمانے پر جلسے ہوا کرتے تھے۔ دو تین بار دائرہ ادبیہ کے سالانہ مشاعرے ریڈیو سے بھی نشر ہوئے، سلیمؔ صاحب کے انتقال کے بعد پھر اُس کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔

حکیم ناطقؔ مرحوم سے آخری بار میری ملاقات ۱۹۴۱ء (غالباً) میں ہوئی، اُن کا قیام اپنے وطن لکھنؤ میں تھا، جناب احمقؔ پھپھوندوی میرے ہمراہ تھے، جاڑوں کا زمانہ تھا، ناطقؔ صاحب ریشمین لحاف میں لپیٹے لپٹائے پلنگ پر لیٹے تھے، بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملے، تھوڑی دیر تک حیدرآباد دکن کی پچھلی صحبتوں کا تذکرہ رہا، پھر مجھ سے کئی غزلیں سُنیں اور میرے اصرار پر اپنا کلام بھی سُنایا۔ حکیم صاحب کا ان دنوں نواب صاحب رامؔ پور کے دربار سے تعلق تھا بس وہ دن ہے اور آج کا دن ہے پھر اُن سے ملنا نہ ہو سکا، اخبار میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی اور میں تلملا کر رہ گیا۔

حکیم ناطقؔ مرحوم اِس انداز کے شعر کہتے تھے:

اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اِس طرح

میکشو! مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

مگر افسوس ہے کہ دنیا نے اُن کی قدر نہ پہچانی، مانا کہ وہ خود شہرت سے گریز کرتے تھے اور نام و نمود سے بھاگتے تھے مگر یہ تو اہلِ نظر اور اربابِ قلم کا کام تھا کہ ناطقؔ مرحوم کے کمال کو منظرِ عام پر لاتے۔ میرے پاس تین چار مہینے ہوئے چٹاگانگ سے ایک خط آیا تھا کہ کوئی صاحب

ناطق مرحوم کا دیوان چھپوا رہے ہیں۔ ان کے لکھنے پر میں نے ایک مختصر سا پیش لفظ بھی بھیج دیا تھا، پھر کوئی خیر خبر نہیں ملی کہ وہ ارادہ ابھی تک قلب و ذہن ہی کی زینت بنا ہوا ہے یا عملی مراحل سے گزر رہا ہے۔

حکیم ناطق لکھنوی مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے حکیم مومن خاں مومن دہلوی سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے، عشق و رنگینی مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، فنِ طب اور دوسرے علوم میں دست گاہ رکھتے تھے، اردو شاعروں میں اتنے پڑھے لکھے شاعر بہت ہی کم گزرے ہیں ـــــ وہ شاعر ہی نہیں ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے۔

اردو زبان کی "منظوم تاریخ" حکیم ناطق مرحوم کی غیر فانی یادگار ہے، اتنی شگفتہ اور مستند تاریخی نظم آج تک کسی نے نہیں کہی، جب یہ نظم شائع ہوئی تو اس کے حاشیہ پر حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی جائے پیدائش "پٹیالہ" لکھی ہوئی تھی، میں نے ناطق مرحوم کو توجہ دلائی کہ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے حضرت امیر خسرو پٹیالہ (مشرقی پنجاب) میں نہیں پٹیالی (یو۔پی) میں پیدا ہوئے تھے جو قائم گنج ضلع فرخ آباد کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔

حکیم ناطق مرحوم اپنے کلام کو حفاظت سے نہ رکھتے تھے، بے نیازانہ طبیعت پائی تھی، مجھے اندیشہ ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک یقین ہے کہ ان کی بعض غزلیں دوسروں نے ہتھیا لیں اور اب جبکہ خود شاعر دنیا میں نہیں رہا یہ چوری کھلے تو کس طرح کھلے! بہر حال یاروں کی دست برد سے جو کلام باقی رہ گیا ہے اسے تو جلد سے جلد منظر عام پر آجانا چاہیے۔

(ماہنامہ "فاران" اپریل ۱۹۵۱ء)

نواب ناظر یار جنگ بہادر

نواب ناظر یار جنگ بہادر، مولوی نظام الدین حسن کے فرزند تھے۔ مولوی صاحب مرحوم ریاست بھوپال میں مشیر المہام اور حیدر آباد دکن میں رکن عدالت العالیہ (ہائی کورٹ کے جج) رہ چکے تھے۔ فنِ تقویم میں ید طولیٰ حاصل تھا، اُن کی مرتب کی ہوئی صد سالہ تقویم حیدر آباد دکن میں راقم الحروف کی نگاہ سے گزری ہے۔ مولوی نظام الدین حسن بڑے وضعدار، بااصول اور وقت کے انتہائی پابند تھے۔ اُن کی پابندیٔ وقت، اصول پرستی اور وضعداری کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب وہ لکھنؤ میں آنریری مجسٹریٹ تھے اور تانگہ میں بیٹھ کر گھر آتے تھے تو تانگہ والے کو کرایہ کی منظوری کے لیے درخواست دینی پڑتی تھی! اس چکر میں تانگہ والے کا خاصا وقت صرف ہو جاتا، اس لیے تانگے والے انہیں پیدل آتے جاتے دیکھ کر کتراتے اور کنی کاٹنے کی کوشش کرتے۔ ایک بار لکھنؤ کی کسی انجمن کے کارکن مولوی صاحب کے پاس اس انجمن کے اشتہار لے کر آئے اور اشتہاروں کی گڈیاں رکھ کر جانے لگے کہ یہ دس ہزار اشتہارات ہیں، مولوی صاحب نے جو اس انجمن کے غالباً سکریٹری تھے فرمایا کہ یہ قوم کا معاملہ ہے، اشتہارات گنے بغیر آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ چنانچہ اُس غریب کو مولوی صاحب کے ساتھ دس ہزار اشتہارات گننے پڑے۔

یہ لطیفے خانہ ساز بھی ہو سکتے ہیں اور مبالغہ آمیز بھی، مگر یہ بھی واقعہ ہے:

؎ تا نہ باشد چیزکے، مردم نہ گویند چیزہا

مولوی صاحب کی اصول پرستی اور پابندیٔ وقت، ضرورت سے زیادہ ہی محسوس کی جاتی تھی، انہی کے صاحبزادے نواب ناظر یار جنگ بہادر تھے!

نواب صاحب مرحوم نے جوانی کے زمانہ میں قومی کاموں میں بھی حصہ لیا۔ چودھری خلیق الزماں کی طرح قومی تحریکوں میں ہی لگے رہتے، تو بلاشبہ اُن کا شمار بڑے لیڈروں میں ہوتا! متحدہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ولایت گئے اور وہاں سے قانون کی سب سے بڑی ڈگری حاصل کی۔ ریاست حیدر آباد دکن کے محکمۂ عدالت

میں ملازمت کا آغاز ہوا۔ برسوں سیشن جج رہے پھر ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ پچپن سالہ مدتِ ملازمت کے بعد کئی سال توسیع بھی ہوئی۔

مرحوم کی پوری ملازمت کا زمانہ نیک نامی میں گزرا۔ کسی کی رو رعایت نہیں، کوئی دباؤ اور سفارش اُن کو متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ اُن کے علم و فضل اور قانون دانی کی کوئی خاص شہرت نہ تھی مگر ان کی دیانتداری، فرض شناسی اور انصاف پسندی کا عام شہرہ تھا۔ انگلستان کے ایل۔ ایل۔ ڈی، لیکن چہرے پر داڑھی، صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند، محتاط اور پاکبازانہ زندگی کے سبب بڑھاپے میں بھی کمر تیر کی طرح سیدھی رہتی۔ بلدہ حیدرآباد میں دو آدمیوں کے "ٹہلنے" کی بڑی شہرت تھی۔ ایک سراج الحسن ترمذی وکیل اور دوسرے نواب ناظر جنگ مرحوم۔ کیسی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو، گرمی ہو، جاڑا ہو، آندھی چل رہی ہو، بوندا باندی ہو رہی ہو، یہ دونوں صاحبان روزانہ پابندی کے ساتھ پانچ چھ میل ٹہل کر دم لیتے۔

عدالتِ عالیہ میں مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کا مفتی کے عہدہ پر شاہی فرمان کے ذریعہ تقرر ہوا، تو دفترِ افتاء کا اہل کار کہیے، یا صیغہ دار اور پیشکار، راقم الحروف ہی تھا۔ نواب ناظر یار جنگ بہادر مرحوم کے حکم اور ایما سے عدالتِ عالیہ کے کتب خانہ کی تنظیم و تہذیب کا فریضہ بھی، ملا عبدالباسط صاحب مددگار معتمد عدالتِ عالیہ (اسسٹنٹ رجسٹرار ہائی کورٹ) کی نگرانی اور ماتحتی میں مجھے انجام دینا پڑا[1]۔ ملا عبدالباسط صاحب حیدرآباد دکن کے مشہور حریت پسند مفکر، ملا عبدالقیوم صاحب کے فرزند تھے۔ بطلِ حریت علامہ جمال الدین افغانی نے حیدرآباد میں انہی کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ سروجنی نائیڈو کے والد پروفیسر اگھور ناتھ مالی مشکلات میں مبتلا ہوئے تو ملا عبدالقیوم صاحب نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اُن کی مالی امداد کی۔

نواب ناظر یار جنگ سے ہائی کورٹ میں دعوتوں اور جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں، کہاں ہائی کورٹ کا جج اور کہاں دفتر کا ایک اہلکار، مگر ملاقات، گفتگو اور ملنے جلنے میں اتنی مساوات اور بے تکلفی کہ عہدے کی بلندی اور پستی کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا۔ میرے ایک عزیز میرٹھ میں وکالت کرتے تھے، اُسی زمانہ میں نواب صاحب مرحوم کے بہنوئی ——

---

[1] مگر یہ کام ادھورا رہ گیا۔

خان بہادر اکبر حسین وہاں کے سیشن جج تھے۔ خان بہادر صاحب کی انصاف پسندی اور اصول درستی ضرب المثل تھی۔ میرے اُن عزیز نے مجھے لکھا کہ عدالتوں میں صداقت ناموں کی تصدیق وغیرہ کا کام، سیشن جج صاحب کے حکم سے مل سکتا ہے۔ آپ ان کے برادرِ نسبتی نواب ناظر یار جنگ سے سفارشی خط بھجوا دیں۔

میں نے بعض احباب سے ذکر کیا تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے کہ ہم میں سے تو کوئی ایسی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ نواب صاحب بڑے بااصول آدمی ہیں اور اُن کے بہنوئی ان سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ایک دن میں ہمت کر کے نواب ناظر یار جنگ مرحوم کے چیمبر میں پہنچا، حسب عادت بڑے تپاک سے ملے، کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر میں نے اس تمہید کے ساتھ کہ کسی کا حق متاثر نہ ہوتا ہو، تو جائز سفارش کا رِ ثواب ہے۔ اپنی غرض کا اظہار کیا، نواب صاحب نے کچھ دیر سوچا اور اس کے بعد سفارشی خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا، احباب کو معلوم ہوا تو انہوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے نواب ناظر یار جنگ سے سفارشی خط حاصل کر لینا بس تمہارا ہی کام تھا۔

نواب صاحب مرحوم کے بات کرنے کا خاص انداز تھا۔ رک رک کر بلکہ چبا چبا کر الفاظ ادا کرتے اور ہاتھ کی حرکت سے طلاقتِ لسانی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش فرماتے۔ ہم اپنی بے تکلف صحبتوں میں کبھی کبھار ان کی گفتگو کی نقل کر کے لطف لیا کرتے تھے۔

زوالِ حیدرآباد کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو بڑے سخت دَور سے گزرنا پڑا۔ کتنے بہت سے کرسی نشین، خاک نشین ہو گئے، مسلمانوں کی اقبال مندی کی بساط ہی الٹ گئی۔۔۔ حیدرآباد آہ! مرحوم حیدرآباد ـــــ ہمیں است رسمِ سرائے فریب گہے بر فراز و گہے بر نشیب کی ہو بہو تصویر ـــــ حیدرآباد آنے جانے والوں کی زبانی سننے میں آیا کہ اس خونیں دردناک انقلاب کے بعد بھی نواب ناظر یار جنگ مرحوم کی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی اور اُن کی دینداری اور اسلام دوستی نے کسی دباؤ اور اثر کو قبول نہیں کیا۔ نئے حاکموں نے بھی اُن کے ساتھ احترام کا سلوک کیا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی مدیر "صدق جدید" جو نواب صاحب کے ہم زلف ہیں ان کے جریدہ میں نواب صاحب کے انتقال کی خبر پڑھی۔ بلدہ حیدرآباد کے اخبارات میں ضرور تعزیتی اداریے لکھے گئے ہوں گے، کراچی کے صحافی، ہندوستان کیا پاکستان کی بھی بعض قابلِ ذکر شخصیتوں کے بارے میں بے خبر اور انجان نکلے! مرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی مغفرت نصیب ہو (آمین)

(ماہنامہ فاران، اکتوبر ۱۹۶۶ء)

پروفیسر سیّد نجیب اشرف ندوی

سالہا سال پہلے کے سنہ اور تاریخیں کسے یاد رہتی ہیں، حافظہ پر زور ڈالنے کے بعد بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ سید نجیب اشرف ندوی صاحب سے پہلی ملاقات کس سنہ میں ہوئی، غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے، ایک مشاعرے کے سلسلہ میں میرا بمبئی جانا ہوا، وہیں ایک صاحب نے اُن کا پیغام پہنچایا کہ اسمٰعیلیہ کالج اندھیری میں فلاں تاریخ کو محفلِ شعر و سخن برپا ہو رہی ہے آپ کو تقریر بھی کرنی ہے اور کلام بھی سُنانا ہے۔ اُن کی دعوت میرے لیے مژدۂ فخر و مسرت تھی، دل نے اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا کہ اتنی معروف، نامور اور قابلِ احترام شخصیتیں اس ہیچ مداں سے تعلقِ خاطر رکھتی ہیں اور ملنے ملانے میں پہل اُدھر سے ہو رہی ہے۔

وقتِ مقررہ پر اسمٰعیلیہ کالج کے ایک طالب علم آ گئے، وکٹوریہ میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن پہنچے اور وہاں سے الیکٹرک ٹرین کے ذریعہ اندھیری تک سفر کیا۔ برقی ٹرین سے پہلا سفر، راستے کے مناظر بھی دلچسپ، ہر اسٹیشن پر مسافروں کی گہما گہمی مگر ہلڑ بازی نہیں، ریل گاڑی سچ مچ صبا رفتار اور برق خرام، ڈبے صاف ستھرے، ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق وقت کی سختی کے ساتھ پابندی، گھنٹہ پون گھنٹہ کا یہ سفر ہر اعتبار سے خوشگوار اور دلچسپ رہا۔ جس اسٹیشن پر ہم اترے وہاں پہلے سے موٹر کار موجود تھی، چند منٹوں میں کالج پہنچ گئے۔ سید نجیب اشرف ندوی مرحوم نے بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کیا، کالج کے اسٹاف سے ملایا، کالج کا ہال طلباء سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ میں نے اردو زبان و ادب پر پہلے تقریر کی، پھر اپنا کلام سنایا ہر غزل کے بعد دوسری غزل کی فرمائش نوجوانوں کی ہتھیلیاں جب پوری قوت کے ساتھ تالیاں بجا رہی ہوں تو اس کی گونج کا کیا پوچھنا! وہ جو کسی تجربہ کار شاعر نے کہا ہے کہ ؎

آدمی فربہ شود از راہِ گوش

تو میں بھی داد و تحسین کے اس ہنگامہ میں اپنے تبسم کو پھیلتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

بزمِ شعر و سخن کے بعد چائے نوشی ہوئی، سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کی دلچسپ باتوں نے چائے اور اس کے لوازم کو اور زیادہ لذیذ بنا دیا ―― پھر تو یہ رسم پڑ گئی کہ جب بھی میرا بمبئی جانا ہوتا اسمٰعیلیہ کالج میں مجھے ضرور بلایا جاتا۔ ایک بار ریلوے اسٹیشن سے کالج تک پیدل بھی جانا ہوا، راستے میں جگہ جگہ ناریل کے درخت، ہریالی، پیڑوں کے جھنڈ میں کالج کے دروازے تک چڑھائی! اس دن احساس ہوا کہ اس راستے کا لطف تو پیدل چلنے ہی میں ہے۔ اسمٰعیلیہ کالج کا محل وقوع اور زیادہ نظر افروز درختوں کا کنج، پہاڑی پر مسطح میدان، سبزہ، پھلواری اور اس کے جھرمٹ میں کالج کی عمارت، سید نجیب اشرف مرحوم کی محبت کے طفیل سیر کو ہسار کا یہ لطف سال میں ایک دو بار راقم الحروف کو ضرور میسر آجاتا۔

مرحوم سے زبان و ادب کے مسائل پر بھی بارہا گفتگو ہوئی، وہ خاصے محتاط انداز میں اظہارِ رائے فرماتے تھے، جذباتیت کم اور سنجیدگی زیادہ! علامہ سید سلیمان ندوی کی طرح وہ خوش رنگ اور خوبرو نہ تھے جو عام طور پر سادات کا طغرائے امتیاز ہے مگر ان کی تحریر کا حسن اس کمی کی پوری طرح تلافی کر دیتا۔

"رقعاتِ عالمگیری" کی تدوین و ترتیب اور تحقیق کا جو کام انہوں نے انجام دیا ہے وہ ان کا "عظیم کارنامہ" ہے جس کی بدولت ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا بمبئی میں اردو زبان و ادب کو ان کی ذات سے جو فروغ ہوا، اس کا ذکر تاریخ میں آنا چاہیے، سید نجیب اشرف ندوی مرحوم اپنی ذات سے خود ایک "درس گاہ" تھے، علم و تحقیق کے شیدائی، اردو کے سچے عاشق اور اسلام سے محبت کرنے والے! ساری عمر لکھنے پڑھنے سیکھنے سکھانے اور علمی تحقیق کے کاموں ہی میں گزری، معاش و روزگار کی بے فکری کے ساتھ کام کرنے کے انہیں موقعے بھی ملے اور ان موقعوں کو مرحوم نے ضائع نہیں ہونے دیا ―― اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

(ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۶۸ء)

نخشب جارچوی

سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے، میں حیدر آباد دکن سے کانپور آیا۔ وہاں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، کانپور سے لکھنؤ ٹھہرتا ہوا اپنے ایک عزیز سے ملنے کے لیے رام پور پہنچا۔ رام پور میں علی گڑھ نمائش کے مشاعرے کا دعوت نامہ ملا۔ مسلم یونیورسٹی کے نامور پروفیسر جناب عبدالمجید قریشی نے بڑے اصرار و تاکید سے راقم الحروف کو لکھا کہ اس مشاعرے میں تمہاری شرکت ضروری ہے! میں رام پور سے چل پڑا، راستے میں چند گھنٹے اپنے وطن کسیر کلاں میں قیام کیا۔ وہاں سے اپنے چھوٹے بھائی (مسرور حسین) اور اپنے ایک دوست اور لنگوٹیا یار کو ساتھ لے کر شب میں گیارہ بجے علی گڑھ پہنچا۔ مشہور و مقبول شاعر شکیل بدایونی اُن دنوں مسلم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور نئی بستی کے ایک کرایہ کے مکان میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے، اُن کے مکان کی بیٹھک میں سامان رکھ کر ہم تینوں پیدل نمائش کو روانہ ہوئے، دربار ہال میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ مسٹر اے، بی نقوی مرحوم جو اُن دنوں علی گڑھ کے کلکٹر تھے مشاعرے کے صدر تھے، اور پروفیسر عبدالعزیز پوری اناؤنسر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

یہ بات تو مشاعرے کے بعد معلوم ہوئی کہ یونیورسٹی کے طلبا شاعروں پر ہوٹنگ کر رہے تھے اور شاید کسی شاعر کو بھی انہوں نے نہیں بخشا۔ اس طوفانِ بدتمیزی سے تنگ آ کر عبدالعزیز پوری مرحوم مشاعرے کے برخاست ہونے کا اعلان کر ہی رہے تھے کہ مجھے دور سے آتا دیکھ کر ساغر نظامی نے اُن سے کہا:۔

"...... ماہر القادری ...... وہ ...... ماہر القادری ہیں"

اس پر عبدالعزیز پوری صاحب نے اس اعلان کو کٹ کر کے میرے نام کا اعلان کر دیا۔ مشاعرے کا یہ دوسرا دور تھا، آدھی رات گزر چکی تھی، میں نے ایک غزل پڑھی پھر سامعین کے اصرار پر دوسری غزل، اس کے بعد "جمنا کا کنارا"، "نوجوان بیوہ" پھر تابڑ توڑ کئی غزلیں اور نظمیں! ڈیڑھ گھنٹے کے قریب مسلسل شعر خوانی کے بعد لوگوں کے اصرار

ہے میرا بھیا چھوٹا، پھر مشاعرہ صبح کے چار بجے تک سی انداز پر چلتا رہا۔ ساغر نظامی اور روش صدیقی کے بعد نخشب جارچوی کا نام پکارا گیا۔ اسٹیج کے ایک کنارے سے ایک صاحب اٹھ کر آئے، چھریرا بدن، لانبا قد، کھڑا ناک نقشہ، کھدر کی قمیص اور کھدر کا چوڑی دار پاجامہ کرتے پر کشمیر سے کی جواہر کٹ صدری اور کھدر کی کشتی نما ٹوپی! ہاتھ میں امرود کی چھڑی اور بغل میں گرم لوئی۔ میں پہلی نظر میں یہ سمجھا کہ یہ کوئی کائستھ شاعر ہے! وطن کی نسبت "جارچوی" سن کر چونکا۔ جارچہ ہمارے ضلع بلند شہر کا مشہور قصبہ ہے جو قدیم زمانہ میں نقالوں کے لیے مشہور تھا۔ نخشب نے غزل اور سامعین کی تالیوں کی گونج میں ایک نظم سنائی، خاصی داد ملی۔

علی گڑھ کی نمائش میں شام کے وقت بڑی بہار ہوتی تھی۔

؎ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

سماں! مشاعرے کے دوسرے دن جب ہم نمائش میں ٹہل رہے تھے، تو پھلواری کی روش کے قریب نخشب کا آمنا سامنا ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر ایسا محسوس کیا۔

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

علی گڑھ ہی کے قیام میں اُن سے تعارف ہوا، پھر دعوتوں اور پارٹیوں میں بار بار ملاقات۔ اس کے بعد جو یارانہ شروع ہوا ہے، تو قربت و بے تکلفی کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں رہی۔ میری اہلیہ مرحومہ کے بھانج داماد میرٹھ میں وکیل تھے، اور محلہ خیر نگر میں نخشب کے مکان سے متصل ہی اُن کا مکان تھا، وہاں جب بھی جانا ہوا زیادہ وقت نخشب کے ساتھ ہی گزرتا، ہم تین دوست ——— نخشب، صابر دہلوی اور راقم الحروف —— یک جان سہ قالب تھے۔ ایک دو دن نہیں کئی کئی ہفتے مسلسل رامش و رنگ کی محفلوں اور نغمہ وطرب کے جگھٹوں میں گزرے ہیں۔ تینوں کو اپنی شاعری، آواز اور رنگ روپ کے بارے میں خوش فہمی، اور پھر اس کی آزمائش و امتحان کے لیے دلچسپ معرکے اور رنگین مقابلے۔

ناگ پور کے ایک رئیس تھے —— نواب محی الدین خاں —— جو اب مرحوم ہو چکے —— یاروں کے یار، سیر چشم، رنگین مزاج، عیش پسند، کشادہ دست بلکہ سچ مچ لکھ لُٹ! نواب صاحب سے ناگپور کے مشاعروں اور قومی جلسوں میں میری ملاقات ہوئی، ایک دو بار —— اُن کی کوٹھی پر ٹھہرنے کا بھی اتفاق ہوا، میرے ہی واسطہ سے صابر دہلوی اور

نخشب سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ وہ مہینوں دلی میں آکر رہتے، ہوٹلوں کے کئی کئی کمرے نوکروں، مصاحبوں اور یار دوستوں کے لیے ریزرو! روپیہ پیسہ اُن کی جیب اور ہاتھ میں ٹکتا ہی نہ تھا، کسی کسی مہینے ایسا بھی ہوا کہ ان کے کارندے اور گماشتے نے کسانوں اور نمبرداروں سے چالیس پچاس ہزار وصول کرکے نواب صاحب کو دیا اور انہوں نے مہینہ ختم ہونے سے پہلے پہلے، سعدی کے اس شعر کو

قرار در کفِ آزادگاں نہ گیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

عملاً سچ ثابت کر دیا۔ نواب صاحب کی محفلوں اور صحبتوں میں ہم تینوں دوستوں کا وقت قہقہوں، چہچہوں اور خوش فعلیوں میں گزرتا، ان سے ہمارا معاملہ نوابی کا نہیں بے تکلف یار دوستوں کا تھا! شاعری کا بھی اُنہیں ذوق تھا۔ میں اُس رنگین دور میں بھی نواب صاحب کو دھکیل کر اور اصرار کر کے جمعہ کی نماز کے لیے جامع مسجد لے جاتا —— پھر نخشب فلمی لائن سے وابستہ ہو کر بمبئی چلے گئے، میں بھی اس ہجوم رنگ و بو سے اکتا گیا، ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ پھیرا ادھر کا ہو جاتا، مگر صابر دہلوی نواب صاحب کے سفر و حضر کے ساتھی ہو گئے۔

نخشب کا فلمی دنیا میں جانا اس طرح ہوا کہ مشہور فلمی ہدایت کار مسٹر شانتا رام دہلی آئے، انہیں نغمہ نگاروں کی تلاش تھی، متعدد شاعروں کو انہوں نے بلایا، اُن کا کلام سنا۔ یہ ایک قسم کا انٹرویو سا تھا، مگر نگاہِ انتخاب نخشب پر جا کر ٹھیری! (غالباً ۱۹۴۳ء میں) وہ چار سو روپے ماہوار پر ملازم ہو کر بمبئی چلے گئے۔

مشاعروں کے سلسلہ میں میرا بمبئی آنا جانا رہتا تھا، میری کسی کوشش کے بغیر کئی فلموں میں گانے لکھنے کا کام مل گیا۔ حکیم مرزا حیدر بیگ دہلوی کی میزبانی نے قیام و طعام کی فکر سے آزاد کر دیا۔ حضرت جگر مراد آبادی بھی حکیم صاحب ہی کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے!

نخشب شاید ایک سال سے زیادہ شانتا رام کی فلم کمپنی (کلامندر) سے وابستہ نہ رہ سکے، کسی بات پر اختلاف ہو گیا، پھر وہ کم و بیش سال بھر بیکار رہے، یہ بیکاری کا زمانہ بھی انہوں نے ہنس کھیل کر گزارا، مگر آدمی کتنا ہی گھمبیر اور حوصلہ والا کیوں نہ ہو، حالات کی ناسازگاری کا مقابلہ کرتے کرتے پریشان ہو جاتا ہے، ایک دن نخشب نے اپنے حالات کا ذکر مجھ سے اس قدر دل گرفتگی کے ساتھ کیا کہ اُن کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو آگئے۔

میں اُن دنوں مشہور فلمی ہدایت کار شوکت حسین کی "زینت" کے گانے لکھ رہا تھا! یہ کام ختم ہوگیا تو میں بمبئی سے دلی آگیا۔ تقسیم ہند سے چار سال پہلے میں نے دلی کو اپنا مسکن بنالیا تھا! سبزی منڈی کے علاقہ (شورہ کوٹھی) میں اپنے ہم زلف کے ساتھ ایک معمولی درجہ کے چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا، فلم اور مشاعروں کی آمدنی کی ساری جمع پونجی تو تعمیر مکان میں لگا دی تھی، مگر مکان بن کر تیار ہو ہی رہا تھا کہ تقسیم ہند نے ایک قیامت برپا کردی، اس مکان میں رہنا اور اس سے فائدہ اٹھانا نصیب نہ ہوسکا۔

ہاں! جن دنوں فلم "زینت" کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو شوکت حسین کی ذہانت نے انہیں عورتوں کی قوالی کی تدبیر سجھائی، نخشب نے قوالی لکھی اور اصرار کرکے اپنا تخلص اس میں شامل کرایا۔ "زینت" جب منظر عام پر آئی تو نخشب کی قوالی:

آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا

کی دھوم مچ گئی، ہر طرف اس قوالی کا چرچا، لاکھوں کی تعداد میں ریکارڈ فروخت ہوئے، نخشب کی زندگی کا یہی وہ موڑ ہے کہ اُن کے نغمے چاندی سونے کی ندی میں ہاتھ دھونے لگے، فلم والے ان پر ٹوٹ پڑے، نخشب نے ہر گانے کے منہ مانگے دام لیے، سچ پوچھو تو نخشب نے فلمی نغمہ نگاروں کی قدر و قیمت بڑھا دی اور گانوں (SONGS) کی شرح کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ فلمی شاعروں کو اُن کا احسان ماننا چاہیے۔

تقسیم ہند نے دوستوں اور عزیزوں کی جمی جمائی محفلوں کو درہم برہم کردیا، سکون و دلجمعی کی ہر بساط تتر بتر ہوگئی، بہت دنوں تک تو ایک دوسرے کی خبر ہی نہیں ملی کہ کون جیا اور کون مرا! اور جو جی رہا ہے وہ کس حال میں ہے؟ پاکستان بننے کے دو ڈھائی سال بعد فلمی رسالوں اور اخباروں سے پتا چلا کہ نخشب اب فلمی نغمہ نگار ہی نہیں رہے، فلم ڈائرکٹر اور فلم پروڈیوسر ہوگئے ہیں! ۱۹۵۲ء میں وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے کراچی آئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو اب ٹھاٹ باٹ ہی اور تھے، شیروانی میں ہیرے کے بٹن، پرائیویٹ سیکرٹری ہر وقت اردلی میں! ہزاروں نہیں لاکھوں کی باتیں! مجھ سے کہا کہ میں تمہارے یہاں کی دعوت کھائے بغیر بمبئی نہیں جاؤں گا۔ وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے، کل صبح ناشتہ کی دعوت رہے گی، اور ہاں اس میں "WHITE MEAT" ضرور رکھنا، میں نے کہا وہائٹ میٹ کیا ہوتا ہے؟ بولے "پرندوں کا گوشت" یہ بھی بتا دیا کہ

اتنے آدمی میرے ساتھ ہوں گے، کراچی میں ہر دل، لیڈر اور چھپنے کہاں مل سکتے تھے۔ مرغیاں دستیاب ہوئیں، دو ڈھائی گھنٹے اس دعوت کے طفیل ہنسی خوشی میں گزر گئے۔

بمبئی جانے کے بعد کئی سال تک اُن سے کسی قسم کا کوئی ربط قائم نہ ہو سکا، میں نے ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ بمبئی کے کس محلہ میں رہتے ہو، پتا کیا ہے؟ میں اُن کی عادت سے واقف تھا کہ وہ شاذ و نادر ہی خط لکھنے میں پہل کرتے ہیں، اور خطوں کا جواب دینے سے جی چراتے ہیں۔ فلمی دُنیا سے مجھے کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔ اُن کے اور میرے مشاغل کی پٹڑی ہی بدل چکی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان سے متعدد مشاعروں کے دعوت نامے آئے مگر میں نے سب کو کورا جواب دے دیا۔ ایک آدھ خط میں یہ مصرع بھی لکھ دیا:۔

؎ از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

وہاں جانے کے لیے طبیعت میں کوئی امنگ ہی پیدا نہیں ہوتی تھی، میں نے اسی دور میں ایک قطعہ کہا تھا:

بدر و حنین آج بھی دیتے ہیں یہ پیام | مکّہ نہ ہو جو فتح تو ہجرت ہے ناتمام
یہ معرکہ عجیب قیامت سرشت تھا | زندوں پہ بھی درود، شہیدوں کو بھی سلام

اس زمانہ میں، اکثر میں یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ ہندوستان کے کسی شہر میں ہوں اور پاسپورٹ کے بغیر میرا آنا ہو گیا ہے کاش! کوئی ابن سیرین میرے ان خوابوں کی صحیح تعبیر بتا سکتا۔

۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے (بمبئی کی کسی ادبی یا تعلیمی سوسائٹی کی طرف سے پاک ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، شوکت تھانوی مرحوم نے کہا کہ تمہارے پاس بمبئی کے جس مشاعرے کا دعوت نامہ آیا ہے اُس میں شریک ہونے کے لیے نخشب نے ٹیلی فون پر بڑا اصرار کیا ہے! میں نے کہا کہ بھئی! ہندوستان جانے کے لیے طبیعت کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوتی! اسی زمانہ میں فضل کریم فضلی کی کوٹھی پر شام کے وقت شعر و شاعری کی نشست تھی! شوکت تھانوی نے وہاں سے ٹرنک کال کی، وقت کی بات کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں نخشب صاحب فون پر مل گئے، مجھ سے بات چیت ہوئی (بمبئی آنے کے لیے وہ اصرار اور اتنی شدید تاکید کہ مجھے ہامی بھرتے بنی۔ گیارہ سال کے بعد بمبئی جانا ہوا، ہر قدم پر مانوس منظر اجنبی سا لگا، بہت سے پچھلے نقش اُبھر آئے، نخشب نے میزبانی اور پزیرائی کی حد کر دی، بڑی دھوم کا مشاعرہ

ہوا، مسٹر حیا دن اُن دنوں صوبہ بمبئی کے وزیرِ اعظم تھے، اُن سے ہم پاکستانی شعراء کو ملایا گیا اور اصرار کر کے اسٹیج پر ان کے دوش بدوش بٹھایا گیا۔ اس مشاعرے اور سفر کا یہ لطیفہ یاد رہیگا کہ احسان دانش صاحب جن کپڑوں میں ہوائی جہاز سے بمبئی اترے تھے، وہی کپڑے وہاں زیبِ تن کیے رہے، ہاں! جس دن کراچی واپس ہونے لگے اس دن لباس تبدیل فرمایا۔

چند مہینے کے بعد پھر خود نخشب صاحب نے بڑے پیمانہ پر مشاعرے کا اہتمام کیا، ان دنوں بھارتی ہوائی جہاز کے گرنے کے واقعے نے پاک و ہند کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی تھی، ہندوستان جانے کے لیے ویزا ملنا بہت ہی دشوار تھا۔ قریب قریب روزانہ ٹیلیفون پر شوکت تھانوی سے نخشب کی گفتگو ہوتی تھی کہ آپ لوگ تیار رہیں۔ ویزا مل کر رہے گا۔ صابر دہلوی اس مشاعرے کے لیے ملتان سے کراچی دو تین ہفتے قبل ہی آچکے تھے، یہاں تک کہ عین مشاعرے کی تاریخ آگئی اور ہمیں ویزا دن کے دو بجے جیسے تیسے ملا، بھاگم بھاگ ہوائی جہاز کے ٹکٹ خریدے اور شام کے "اڑن کھٹولے" سے بمبئی روانہ ہو گئے! جیب جالب صاحب کو بھی انڈیا ہائی کمشنر کے ویزا آفس میں دیکھا گیا، وہ لاہور سے اسی توقع پر چل پڑے تھے، کہ کراچی میں ویزا مل جائے گا، مگر انہیں اُلٹے پاؤں لاہور واپس جانا پڑا۔

شوکت تھانوی، صابر دہلوی اور راقم الحروف —— ہم تینوں شب میں بمبئی ایرپورٹ پر اُترے، سامان کی جانچ پڑتال ذرا سی دیر میں ہو گئی۔ ہوائی اڈے سے ہمیں سیدھا مشاعرہ گاہ پہنچایا گیا، ہمارا وہاں پہنچنا، خاصے ڈرامائی انداز میں ہوا۔ سامعین نے ناموں کا اعلان سن کر اور ہمیں دیکھ کر پرجوش انداز میں تالیاں بجائیں! شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی پانی کے جہاز سے بمبئی پہنچ چکے تھے، انہوں نے مصرعِ طرح پر نظم کہی جس کا یہ مصرع بہت مشہور ہوا۔

کیا گلبدنی، گلبدنی، گلبدنی ہے

مسٹر وی شنکر (آئی سی، ایس، ڈائرکٹر جنرل محکمہ ڈاک حکومتِ ہند) مشاعرے کے صدر تھے، اسٹیج بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا، نقرئی تھالیاں شاعروں کے درمیان گردش کر رہی تھیں، جن میں سونے کے ورق لگے پان کے بیڑے رکھے تھے، نخشب نے مجھے اسٹیج پر شدید اصرار کر کے ایک ایسے مقام پر بٹھایا کہ اعلان کے مطابق اُس مشاعرے کی فلم تیار ہو جاتی، تو مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر نوجوان رشک کرتے اور اہلِ تقویٰ ملامت! حضرت جگر مرحوم نے طرح پر غزل پڑھی۔ غالباً یہ اُن کا آخری مشاعرہ تھا، اب اُن کی صحت کا یہ

حال ہو گیا تھا کہ بعض اوقات آٹو گراف بک پر شعر لکھنے یا دستخط کرنے کی بجائے لکیریں بنا دیتے۔

میر تقی میرؔ کی غزل کا مصرع اس مشاعرے کی طرح قرار پایا، پھر مشاعرے میں چند معروف و منتخب شعراء سے میرؔ کی شخصیت و فن پر مختصر تاثرات پڑھوائے گئے جن کی فلم والوں نے صدا بندی کی، جگرؔ صاحب کا تاثر اُن کے کہنے سے میں نے لکھا!

شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہو گا کہ نخشب کوئی کام شروع کریں اور اُس میں اختلاف و ہنگامہ کی صورت پیدا نہ ہو جائے، اس مشاعرے میں بھی آخر دنوں میں ترقی پسند شعراء سے شدید اختلاف ہو گیا، انہوں نے اخبارات میں نخشب کے خلاف مضامین چھپوائے، اس اختلاف و نزاع کا اثر مشاعرے پر بھی پڑا، مالی طور پر نخشب کو مشاعرے میں خاصا خسارہ رہا۔

اس انڈو پاک مشاعرے کے تیسرے دن ترقی پسند شعراء نے صابو صدیق ہال میں مشاعرے کا اعلان پاکستانی شعراء کے ناموں کے ساتھ کیا! نخشب مشاعرے کے دن شام کے ۵ بجے جگرؔ، شوکت تھانوی، صابرؔ دہلوی اور راقم الحروف کو شہر سے دُور جوہو لے گئے، اور وہاں کسی پارسی تاجر کے شاندار بنگلہ میں ٹھہرا دیا۔ سمندر کا کنارا، ناریل کے درختوں کی قطار، چاندنی رات، موجوں کا مد و جزر! بنگلہ میں ہر طرح کا سامان و آرام، کھانے کا پُر تکلف انتظام! یہ رات ہنسی خوشی کے پُر لطف ماحول میں گزری! مشاعرے کے منتظمین شاعروں کو اُن کی قیام گاہوں پر ڈھونڈتے پھرے مگر نخشب نے شاعروں کو ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں کا پتا لگنا ناممکن تھا۔ سُنا ہے کہ مشہور ترقی پسند شاعر سردار جعفری نے معذرت کرتے ہوئے مشاعرے میں اعلان کیا کہ بعض شعراء جن کے نام اشتہار میں دیئے گئے تھے وہ کسی وجہ سے مشاعرے میں شرکت نہ کر سکے جو سامعین اُن کو سُننے کے لیے آئے ہوں وہ اپنے ٹکٹوں کی رقم واپس لے سکتے ہیں۔

اس سفر میں شکیلؔ بدایونی کی زبانی معلوم ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان کے سب سے بڑے فلمی نغمہ گر نوشادؔ سے نخشب کا شدید اختلاف ہے۔ شکیلؔ نے مجھ سے کہا کہ نوشاد تم سے ملنا چاہتے ہیں، وہ خود یہاں آ کر تم سے ملتے مگر اُن کا نخشب کے یہاں آنا جانا نہیں ہے۔ پھر وہ بولے کہ آپ نوشاد کے یہاں کیوں نہ چلے چلیں۔ میں اس پر خاموش ہو گیا، اس واقعہ کے تیسرے چوتھے دن نوشاد خود آئے، نخشب کے فلیٹ میں آدمی بھیج کر مجھے نیچے بلایا،

کسی پارٹی سے وہ آرہے تھے، گوٹے کناری اور پھولوں کے ہار ان کی موٹر کی نشست پر رکھے تھے، میرے گلے میں ہار ڈال دیے اور تھوڑی دیر باتیں کر کے چلے گئے۔

اسی زمانہ میں محمد نیاز مرحوم (سی، ایس، پی) حیدرآباد میں کمشنر تھے، انہوں نے حیدرآباد میں مشاعروں کی طرح ڈالی۔ شوکت تھانوی کے کہنے پر محمد نیاز مرحوم نے نخشب کو بمبئی مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوایا، مشاعرے کے صدر سابق وزیر خزانہ جناب محمد شعیب تھے، شوکت تھانوی نے نخشب کو شعیب صاحب سے ملوایا۔ اس کے بعد نخشب نے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے آنے کا خیال ظاہر کیا ــــــ اور وہ پھر چند ماہ کے بعد کراچی آ بھی گئے۔

ہندوستان میں جو فلمیں انہوں نے بنائی تھیں اُن کے لانے کے سلسلے میں نخشب کے لیے مشکلیں اور خطرے پیدا ہو گئے، سب سے زیادہ نازک بات یہ تھی کہ وہ پاکستان کے نیشنل نہیں تھے۔ صورت ایسی پیچیدہ ہو گئی کچھ بعید نہ تھا کہ وہ گرفتار ہو جاتے ــــ مگر میرے شیر نے اپنے اثر و رسوخ، شہرت اور شخصیت سے کام لے کر شاید دو تین دن میں نیشنلٹی حاصل کر لی، ہفتوں کے مراحل گھنٹوں میں طے ہوئے اوپر والوں کو اس کا پتا چلا تو سب ہکا بکا رہ گئے۔ حکومت کا کوئی وزیر یا سکرٹری بھی چاہتا تو اس طرح آناً فاناً نیشنلٹی نہیں مل سکتی تھی مگر ـــ یہ نخشب تھا کہ جہاں کسی کی سوئی نہ جا سکے، وہاں یہ شخص بھالا داخل کر سکتا تھا۔ فلموں کی درآمد کا معاملہ خاصا اہم اور نازک و پیچیدہ تھا یہاں تک کہ بات عدالت تک پہنچی، مگر چند پیشیوں کے بعد مقدمہ اٹھا لیا گیا۔

نخشب نے ہندوستان میں کئی فلمیں تیار کی تھیں اِن میں سے سب سے زیادہ کامیاب فلم " زندگی اور طوفان " تھی۔ پاکستان میں بھی اس فلم نے آمدنی کے اعتبار سے اگلے پچھلے سب ریکارڈ توڑ دیے، لاکھوں کی آمدنی ہوئی ــــ مگر نخشب کے اخراجات بھی تو شاہانہ تھے، اور اُس پہ گھوڑ دوڑ میں شرط لگانے کی لت! ریس (RACE) کے جوئے کا مارا ہوا کہاں پنپتا ہے۔ پھر نخشب نے دو فلمیں بنائیں ایک کراچی میں اور دوسری لاہور میں! اتنی لاگت کی فلمیں پاکستان میں اب تک نہیں بنی تھیں، ان میں بھی کمایا نہیں گنوایا۔ اس کے بعد نخشب کی تمام دلچسپیاں " ریس کورس " کی نذر ہو کر رہ گئیں، کسی کسی دن تو کئی کئی لاکھ کی ہار جیت! گھوڑے جو رکھنے شروع کیے ہیں تو اُن کی تعداد چالیس تک

پہنچ گئی۔ ہزاروں روپے ماہوار کا خرچ! کیسے کیسے نامی گرامی سدھانے والے (TRAINER) بھاری تنخواہوں پر ملازم رکھے گئے، کروڑوں انسانوں کو ایسی غذا میسر نہیں آتی جیسی غذا ان گھوڑوں کو دی جاتی تھی بس—سچ مچ نوابی کارخانہ!

میں نے بارہا سمجھایا کہ فلم اور ریس ان دونوں دھندوں کو چھوڑ کر تم کوئی اور کام کرو، تمہارے پاس روپیہ ہے، تعلقات ہیں، خود تمہاری ذہانت ہے، اس سے زیادہ کماؤ گے! یہ ہیجڑے، بھنتری، نقال، ڈوم ڈھاڑی اور جواری بھنڈاری بھلا شرفا کی صحبت کے قابل ہیں! ایک دن بگڑ کر بولے:-

"ماہر! دیکھو، ہم تمہارے نماز روزے کے معاملے میں نہیں بولتے، تم ہمارے معاملات میں مت بولو"

اُن کی اس بات پر مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی آئی۔

نخشب کی زندگی عیش و راحت کی زندگی تھی، لطفِ زندگی کے بارے میں اُس نے جو زیادہ سے زیادہ سوچا، اُس سے بڑھ کر اسبابِ عیش مہیا ہوتے چلے گئے۔ مکان قالینوں، آئینوں اور جھاڑ فانوس سے "قیصر باغ" اور "دلکشا منزل" بنا ہوا ہزاروں روپیہ تو باورچی خانہ کی آرائش اور صنعت پر خرچ کر دیا، اچھے سے اچھا کھانا کھانا اور دوسروں کو کھلانا اس شخص کی (Hobby) تھی، دعوتوں کا کوئی حد و شمار نہیں، پھر اُن میں طرح طرح کے پرتکلف کھانے، ہر چیز کی فراوانی، مرغ کے سیخ کباب تو راقم الحروف نے حیدرآباد دکن کے نوابوں اور لکھنؤ کے تعلقداروں کے یہاں بھی نہیں کھائے، مگر نخشب کی دعوتوں میں ان کبابوں کا معمول تھا! کھانا پکانے میں وہ خود دلچسپی لیتے اور نئے نئے تجربے کرتے رہتے، مسلّم بکرا پہلے ہی دن خاصا اچھا پکایا پھر مسلسل مشق و تجربہ نے اسے خاصے کی چیز بنا دیا، مسلّم بکرے کے اندر چاول بھرے ہوئے! اس کے ساتھ دہی کی لسّی! کھانوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ جنس صرف ہوتی، بید مشک، کیوڑے اور عطر کے کنٹر اور زعفران کے ڈبے تحویل میں رہتے۔

نخشب کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، مگر اُن میں سب سے بے تکلف اور قریبی دوست تابش دہلوی اور راقم الحروف تھے! نخشب کی دعوتوں میں ہر طبقے کے لوگ ہوتے، ایک دو بار انڈیا ہائی کمشنر کے عہدیداروں کو بھی اُن کے دسترخوان پر دیکھا گیا۔

تابش صاحب اور میں نے نخشب سے دعوت کے بعد کہا کہ ان لوگوں کا آنا جانا کہیں تمہارے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی تعلقات میں سدا تناتنی رہتی ہے۔

نخشب سے بعض لوگوں نے ہزاروں کا فائدہ اٹھایا، کتنوں نے قرض کے نام پر روپیہ لیا اور پھر واپس نہیں کیا، کسی نے کسی معاملے میں جھکمہ دے کر رقم اینٹھ لی۔ اس کشادہ دستی کے ساتھ اُن کی یہ عادت تھی کہ بھکاریوں اور فقیروں کو بُری طرح دھتکار دیتے! میں نے ایک دو بار خیر کے کاموں میں مالی امداد کے لیے توجہ دلائی تو ٹال گئے۔

ایران کا دو بار سفر کیا، فلم کی پبلسٹی کے سلسلے میں دو دفعہ سیلون بھی گئے، جاپان اور ہانگ کانگ بھی ہو آئے، وہاں سے آکر کلبوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں کی تفصیل سناتے رہے! کسی کتب خانے، میوزیم اور تاریخی مقام کا کوئی ذکر نہیں۔

نخشب کے معمولات میں طہارت کا بہت اہتمام دیکھا گیا، کبھی کبھی نماز بھی پڑھ لیتے، وہ مذہباً شیعہ تھے، مگر مذہبی مباحث اور خاص طور سے اختلافی مسائل نہ خود چھیڑتے اور کوئی دوسرا ان باتوں کا ذکر کرتا تو سختی سے روک دیتے۔ ایک بار ایک شیعہ نوجوان شاعر محرم کی عزاداری کا ذکر کرتے ہوئے بولے کہ اتنے آدمی جھیرلیں سے ماتم کرتے ہوئے شہید ہو گئے، میرے منہ سے بیساختہ نکلا یہ شہادت نہیں خودکشی ہے! اس پر نخشب نے بہت بُرا مانا، کچھ دیر تک خاصی تلخ و تند قسم کی گفتگو بھی رہی۔

نخشب کے دل میں میرے لیے جتنی گنجائش تھی اور کسی دوست اور ملنے والے کے لیے نہ تھی۔ ہر بات میں میری دلہی کا خیال رکھتے، دعوتوں کے بعد لوگوں سے کہتے کہ ماہر کو کھانا پسند آگیا بس میری محنت وصول ہو گئی اور میرا جی خوش ہو گیا۔ ایران سے میرے لیے سردہ لے کر آئے اور مسلّم مرغ بھی! جاپان سے شیروانی کا گرم کپڑا مجھے اور تابش کو لاکر دیا۔ یہ اُن کا پہلا اور آخری تحفہ تھا۔ ایک بار میری کلائی سے گھڑی باندھ دی، میں نے کہا یہ تو میرے پاس دو دن میں خراب ہو جائے گی، مجھے گھڑی میں چابی دینی ہی نہیں آتی۔ میں نے ساری عمر جیبی یا دستی کسی قسم کی گھڑی نہیں رکھی، اس پر وہ مسکرانے لگے اور میرے اصرار پر گھڑی واپس لے لی ——— اپنے ریس (RACE) کے ایک گھوڑے کا نام ماہر (Mahir) رکھا، دوستوں سے کہا کرتے کہ اس گھوڑے

میں ماہر کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

جب وہ شروع شروع میں پاکستان آئے ہیں تو مجھ سے فلمی گیت لکھنے کے لیے بڑا اصرار کیا، میں نے انکار کیا تو جھنجلا کر بولے، تو نے مُلّا بن کر اپنی اوقات خراب کرلی، سواری کے لیے موٹر تک نہیں ہے، ٹراموں اور بسوں میں مارا مارا پھرتا ہے ——— پھر انھوں نے ہوائی جہاز سے لاہور بلوایا اور وہاں بالاہی بالا بارہ ہزار روپے پر ایک کمپنی سے گانوں اور مکالموں کا معاملہ بھی طے کر دیا، میں مسلسل انکار کرتا رہا، میں بڑی سخت مشکل میں پھنس گیا، ایک طرف اتنے ہمدرد اور بے تکلف دوست کی بے غرض ہمدردی، دوسری طرف بارہ ہزار کی رقم! طبیعت آمادہ ہوتے ہوتے پھر برگشتہ ہوگئی! حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد زکی کیفی جو نخشب صاحب کے بھی دوست تھے، اُن سے میں نے کہا کہ بھئی! اس مخمصے سے مجھے خدا کے لیے نکالو۔ اُن کے سامنے جب اس کا ذکر آیا تو انہوں نے میرے "انکار و گریز" کی تائید کی، میں نے نخشب سے کہا کہ میں اس کام کے لیے تیار بھی ہو جاؤں ——— تو اس کا اندیشہ ہے کہ چند دن کے بعد پھر کہیں طبیعت بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے، اس وقت کیا ہوگا؟

"تم تمام بُری باتوں سے توبہ کر چکے ہو؟" ——— نخشب نے کہا

"مجھے پارسائی کا دعویٰ کب ہے؟" ——— میں نے جواب دیا۔

"تم جیسے ملّاؤں کی عجیب ذہنیت ہے، ایسے گناہ تو کرتے ہو جس میں گرہ سے خرچ ہوتا ہے، مگر جس کام سے مالی نفع ہوتا ہے، زندگی خوش حال ہوتی ہے اس سے بھاگتے ہو......"

نخشب کے اس ریمارک کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ بات جہاں تھی وہیں ٹھپ ہو کر رہ گئی۔

اب سے سات سال پہلے کی بات ہے مدراس سے مشاعرے کا بلاوا آیا، اُس کے بعد ہی بمبئی میں "جشنِ شاعر" کا مشاعرہ تھا، بات طے ہوگئی مگر جس دن سفر کرنا تھا، اُس دن بین الاقوامی قانون کے تحت "کیمبرے ہوائی جہازوں" کی پرواز ساری دنیا میں منسوخ کر دی گئی! مجھے بمبئی ہو کر مدراس جانا تھا، بڑی کوفت ہوئی، مدراس جانے کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مگر نخشب کے تعلقات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے نہ جانے کہاں کہاں ٹیلی فون کر کے اور کس کس سے جوڑ ملا کر دلّی

کے راستے سے مجھے مدراس بھجوا کر چھوڑا، کراچی ایر پورٹ پر ہوائی جہاز کا ٹکٹ نخشب نے ایسے وقت پر دیا کہ جہاز کی سیڑھی کے قریب کھڑا تھا اور ایک دو منٹ میں سیڑھیاں ہٹنے والی تھیں، جب تک کوئی کام ہو نہ جائے مجھے اطمینان نہیں ہوتا، معاملہ کا دوسرا رُخ سامنے آتا رہتا ہے، راستے بھر یہی خیال آتا تھا کہ دلی سے مدراس کے لیے جہاز میں جگہ ملتی بھی ہے یا نہیں! دلی پہنچ کر اطمینان ہوا کہ مدراس جانے والے جہاز میں میری نشست محفوظ ہے۔ اس عظیم معرکہ کا سر کرنا بس نخشب ہی کا کام تھا! اس شخص کی آنکھ میں بوہنی تھی اور وہ اس فن میں کہ کون شخصیت کس زاویہ سے رام ہو سکتی ہے ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اسی فن اور آرٹ کی بدولت نخشب نے نہ جانے کتنے غزالانِ رمیدہ کو صید کیا۔

جھلکیاں

نخشب یاروں کا یار تھا، آنکھ میں بڑی مروت تھی، دوستوں کا ہمدرد اور بے غرض دوست! مگر ان تمام خوبیوں کے ساتھ زبان ایسی پائی تھی کہ ذرا کوئی خلاف طبیعت بات ہوئی، زبان قابو سے باہر ہو گئی، بڑے بڑوں کو جھاڑ دیا اور اچھے اچھوں کی کرکری کر دی! مشہور ایکٹر محمد علی نے بس اتنا پوچھ لیا تھا کہ جس فلم میں آپ مجھے لے رہے ہیں اُس کی اسٹوری تو مجھے پہلے سُنا دی جائے بس اس بات پر جو اُس کو صلواتیں سنائی ہیں، تو وہ بے چارہ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مشہور کہاوت ہے جہاں چار برتن ہوتے ہیں، کھڑکتے ہی ہیں، مخلص دوستوں کے درمیان بھی کبھی کبھار بدمزگی اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات باتوں باتوں میں نخشب سے اچھے خاصے معرکے اور مچیٹے ہو جاتے! اُن کا مزاج شعلہ اور راقم الحروف کا مزاج جو الامکھی! میں ان کا دوست بھی تھا اور سخت نقاد بھی! کوئی خاص کھانا وہ پکاتے اور اس کی تعریف اس قسم کے لفظوں میں کرتے :-

"تمہاری سات پشتوں نے ایسا کھانا نہیں کھایا ہو گا۔"

تو میں انہیں ٹوکتا کہ اہلِ ظرف ایسی باتیں نہیں کیا کرتے، مبالغہ کی بھی اُنہیں عادت تھی، میں نے اس پر بھی انہیں بارہا ٹوکا، کہ لوگ منہ پر کچھ نہیں کہتے، مگر بعد میں چرچے کرتے ہیں! اور تم جو شہرۂ آفاق ایکٹروں اور ایکٹرسوں اور گلوکاروں کے بارے میں ایسی ڈون کی لیتے ہو جیسے یہ سب تمہارے ہی بنائے ہوئے ہیں، اور تمہارے ممنونِ کرم اور خوشہ چین ہیں، تو سُننے

والے ایسی باتوں کا تمہارے بارے میں کوئی اچھا اثر نہیں لیتے۔

ایک بار بحث و گفتگو میں میں نے یہاں تک کہہ دیا:

تم سے میرے روابط اور تمہارے یہاں میرا آنا جانا میرے لیے موضعِ تہمت! اور مجھ سے تمہارے تعلقات تمہارے لیے نیکنامی کی سند۔۔"

انتہائی تلخی اور بدمزگی کے بعد پھر تھوڑی دیر میں ہنسی مذاق کی باتیں ہونے لگتیں، جیسے کسی نے کسی کو کچھ کہا ہی نہ تھا، یہ غبار زیادہ دیر تک ٹھہرنے نہ پاتا، مگر ایک بار نخشب سے ایک صاحب کے معاملے میں اتنی سخت گفتگو ہوئی کہ اس کے بعد ملنا جلنا اور بول چال تک بند ہوگئی۔ دوستوں نے ملاپ کے لیے بہت کچھ دوڑ دھوپ کی، کئی بار ہم دونوں کو دعوت میں بھی بلایا مگر یہ رشتہ ٹوٹ کر پھر جڑ نہ سکا۔

میانِ پختہ کاراں بود بحث خویشتن داری

نخشب نے لوگوں سے کہا کہ ماہر نے مجھ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا، کوئی غلط بات نہیں کہی، اُن کی دوستی ہمیشہ بے غرض رہی —— مگر ماہر نے ایک غیر شخص کے مقابلے میں مجھے جو ذلیل کیا بس اس بات سے دل پھٹ گیا۔۔۔۔۔۔۔!

نخشب کا یہ شعر:——

مجھے ملال ہے تم کو مگر خیال نہیں کہ لوگ کہتے ہیں آپس میں بول چال نہیں

بہت پسند تھا، میرے اور اُن کے معاملات میں یہی شعر واقعہ بن گیا! کشیدگی اور بے تعلقی کی انتہا ہوگئی کہ میری بیوی کی موت پر ٹیلیفون پر بھی پُرسا نہ دے سکے۔

نخشب کی صحت اچھی تھی مگر کئی کئی مہینے کے وقفے سے اُن کی آنتوں میں سُدا پھنس جاتا تھا، یہ تکلیف علاج معالجہ سے وقتی طور پر دُور ہو جاتی۔ اس مرض کے ازالے کی طرف اُن کا دھیان نہیں گیا۔ اب کی بار پیٹ ابھرا تو حالت بگڑتی ہی چلی گئی، معقول علاج بھی نہ ہو سکا۔ دو تین دن تکلیف رہی پھر اس کے بعد زندگی کے ڈرامے کا آخری پردہ گرا اور تماشا ختم!!

میں نو بجے کے قریب شب میں گھر آیا تو پتا چلا کہ تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون آیا ہے کہ نخشب صاحب کا انتقال ہوگیا! "نخشب کا انتقال ہوگیا" نہیں۔۔۔۔۔ یہ مذاق معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔! یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

میں نے تابش صاحب کو فوراً ٹیلیفون کیا، وہ بھی اس حادثے سے بے خبر تھے۔ نظامی دواخانہ سے دریافت کرنے پر پتا چلا کہ خبر صحیح ہے، حکیم نصیر الدین صاحب نخشب مرحوم کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔

ڈیڑھ سال کے بعد نخشب کے یہاں میرا جانا ہوا ان سے ملنے کے لیے نہیں، ان کی میت پر آنسو بہانے کے لیے! فلیٹ کا ہال تعزیت کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا، سب غمزدہ اور ساتھ ہی حیرت زدہ کہ ایکا ایکی کیا ہوا، مگر نخشب نے خود اپنے بارے میں پیش گوئی کی تھی ؂

ایسے انساں کی زیادہ زندگی ہوتی نہیں

ان کے منجھلے بھائی عباس ضیا (ایڈووکیٹ) دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ زنانے سے بھی عورتوں کی آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر ساری دنیا کی چیخیں اور زمین و آسمان کے آنسو بھی جسم سے نکلی ہوئی روح کو واپس نہیں لا سکتے۔ اُن کا مکان جنت نشان سوگ میں ڈوبا ہوا تھا، قدِ آدم آئینے دھندلے نظر آتے تھے، جھاڑ فانوس کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی، ریشمی گاؤ تکیوں اور ایرانی قالینوں پر ذرا سی دیر میں غم و الم کی گرد جم گئی۔

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ؂

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اٹھے

تو

صبح ساڑھے نو بجے نخشب کا جنازہ واقعی بڑی دھوم سے اٹھا، رات کو ریڈیو سے خبر سن کر لاہور سے اُن کے کئی فلمی دوست اور شناسا ہوائی جہاز کے ذریعہ کراچی پہنچ گئے۔ جنازے کے ساتھ دُور تک موٹروں کی قطاریں! پھر گیارہ بجے کے قریب اُن کا جنازہ سپردِ خاک کر دیا گیا، یہ وہ جسم تھا جو برسوں سے پھولوں میں تلتا تھا اور عطر میں بسا رہتا تھا۔ مگر اب قبر میں اتار کر لوگوں نے اس پر مٹی ڈال دی —— رہے نام اللہ کا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نخشب میں آگے بڑھنے اور سب سے اونچا رہنے کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا تھا، طالب علمی کے زمانہ میں ہاکی کے وہ ممتاز کھلاڑی تھے۔ مشاعروں میں شرکت شروع کی تو شاعروں کے فوٹو گروپ میں نخشب کو اساتذہ کی صفِ اول میں بیٹھا دیکھا گیا، مشاعروں میں اسٹیج پر کلکٹروں، سیشن ججوں اور دوسرے افسروں کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھتے

کسی سے مرعوب ہونا اور داب کھانا تو یہ شخص جانتا ہی نہ تھا، اجنبی لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے اور انہیں متاثر کرنے کا فن اُسے آتا تھا۔

انگریزی دور میں ریلوے کے محکمہ میں تعلقات اتنے بڑھے ہوئے کہ شاعروں کو فرسٹ اور سیکنڈ کلاس میں بے ٹکٹ اپنے ساتھ لے جاتے ۔۔۔ ایک بار اسی طرح نخشب، صابر دہلوی اور راقم الحروف سفر کر رہے تھے، جاڑے کا زمانہ تھا، سکھ ٹکٹ چیکر کشمیرے کی نیلی وردی پہنے ہوئے، ڈبے میں داخل ہوا، اُسے دیکھ کر میرے چہرے پر تو ہوائیاں چھوٹنے لگیں، نخشب نے صابر دہلوی سے کہا کہ ماہر سے کہو کہ وہ ٹھیک بیٹھا رہے، بدحواسی کا مظاہرہ نہ کرے ۔۔۔ اتنے میں ٹکٹ چیکر نے نخشب سے ٹکٹ مانگا، نخشب نے اپنی اور ہم دونوں کی طرف اشارہ کر کے چپکے سے نہ جانے کون سے "مقررہ الفاظ" (Code words) استعمال کیے کہ ٹکٹ چیکر نے ہم سے ٹکٹ نہیں مانگے اور جنکشن آنے پر خاموشی کے ساتھ ڈبے سے باہر چلا گیا۔

موٹر چلانے میں اپنی آپ مثال، جس موڑ پر چاہا کار کو چابکدستی کے ساتھ گھما دیا، بعض اوقات کراچی شہر میں موٹر کی رفتار ستر اسی میل فی گھنٹہ ہو جاتی، ایسا ہوتا رہتا کہ ہم دونوں ساتھ جا رہے ہیں، نخشب نے کسی سائیکل، گھوڑا گاڑی یا بس سے موٹر اس طرح بچا کر آگے نکالی ۔۔۔ میں سمجھا ٹکر ہو گئی، میرے منہ سے بے ساختہ "ارے بھئی! بچا کر، احتیاط سے۔" اس پر وہ بگڑ جاتے! چوراہے پر سواریاں کھڑی ہیں سرخ بتی پر سب کی نگاہیں لگی ہیں، مگر نخشب نے تیزی کے ساتھ کار گزار دی، کانسٹیبل سیٹی بجاتا رہا اور نخشب کی موٹر یہ جا وہ جا! اُن کی تیزی بے باکی اور خود اعتمادی قانون دانوں کی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔

یاروں کے یار، ایثار و ہمدردی کا بے پناہ جذبہ مگر جب کسی سے اَن بَن ہوئی اور بات قطع تعلق تک پہنچ گئی تو پھر طبیعت کی بیگانگی کا یہ عالم کہ جیسے اس دوست سے جان پہچان ہی نہ تھی۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے بڑے گہرے تعلقات تھے مگر ان سے فلم سازی کے سلسلے میں نوبت مقدمہ بازی تک پہنچ گئی، نواب جمشید علی خاں مرحوم رئیس باغپت کے صاحبزادے کنور شمشاد علی خاں سے طالب علمی کے زمانہ کی دوستی تھی، تعلقات کی

کوئی حد نہایت نہیں، لیکن جب اختلاف ہوا تو کچے دھاگے کی طرح تعلقات ٹوٹ گئے، یہی صورت صابر دہلوی کے ساتھ پیش آئی۔ میں نے میل ملاپ کی بہت کوشش کی مگر نخشب دوستی کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنے کے لیے کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوئے، شوکت تھانوی سے بھی بس منہ دیکھے کی صاحب سلامت رہ گئی تھی، پرانے دوستوں میں ایک میں ہی رہ گیا تھا، سو میرے ساتھ جو معاملہ پیش آیا اُس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔

طبیعت میں ضد تھی، ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بلکہ خود نگری بھی، اس کی بدولت انہیں بڑے مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔ اہلی زندگی سے لیکر فلم اور ریس کی دنیا تک مقدمہ بازی اور شدید اختلاف و ہنگامہ آرائی! نخشب نے سب سے پہلی فلم (میخانہ) پاکستان میں جب بنائی ہے تو اس کے لیے طہران سے ہیروئن انتخاب کر کے لائے۔ اسکیم یہ تھی کہ یہ فلم اردو، فارسی دونوں زبانوں میں تیار ہو گی۔ فلم کی ابتدائی شوٹنگ کے زمانے میں ایرانی ہیروئن سے شدید اختلاف ہو گیا اور بات بڑھتے بڑھتے ایرانی سفارت خانے تک پہنچی۔ ہیروئن نے بڑی خوشامد کی مگر نخشب کی طبیعت کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ اس عورت کو بالآخر ایران واپس جانا پڑا، اس جھگڑے میں پچاس ہزار سے کم کا کیا نقصان ہوا ہو گا؟ یہی صورت دوسرے پاکستانی ایکٹر کے ساتھ پیش آئی اس نے جتنا کام کیا تھا فلم کے وہ ٹکڑے بھی ضائع کر دیے گئے۔

نخشب ایک بے باک جری طالع آزما (Adventurer) شخص تھا ہم نے اُس کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب میرٹھ میں دو چار آنے کی گنڈیریوں سے دوستوں کی تواضع کرتا تھا اور پھر اُس کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ بھی ان آنکھوں نے دیکھے۔

مزاج و طبیعت شاہانہ اور آمرانہ پایا تھا، گھانا، تنزانیہ اور نائیجیریا جیسی حکومتیں جو چند سال پہلے آزاد ہوئی ہیں، اگر وہ ان ملکوں میں ہوتا اور سیاسیات کی طرف توجہ کرتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ کسی علاقے کا ڈکٹیٹر بن جاتا۔

نام اختر عباس تخلص نخشب رکھا اسی سے ان کی شانِ انفرادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کسی شاعر کا تخلص اس سے پہلے نہ سنا اور نہ کسی کتاب میں پڑھا۔ شاعری میں کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا، جب وہ پندرہ سولہ سال کے ہوں گے، اُس زمانہ میں عیاںؔ صاحب میرٹھ کے سب سے بڑے شاعر تھے اور اس نواح میں

اُن کا طوطی بول رہا تھا، اُن کے دو شعر :-

پسِ مردانِ تپش کی یادگاریں چھوڑ آیا ہوں
شکن جو جو جہاں پر ہے وہیں رہنے دو بستر میں

مری نگاہ کی تصویر کوئی لے لیتا
اٹھا رہا ہے زمانہ اس آستاں سے مجھے

عیاںؔ صاحب کے رنگِ شاعری کا نخشبؔ نے اثر قبول کیا! (غالباً) ۱۹۴۲ء میں اُن کی غزلوں کا مجموعہ ــــ مشعلِ راہ ــــ شائع ہوا! میں نے اس پر ایک مضمون لکھا، جسے نخشبؔ نے کسی رسالہ میں چھپوایا۔ کہتے تھے کہ "مشعلِ راہ" کا دوسرا ایڈیشن جب چھپے گا تو تمہارے اس تنقیدی مضمون کو شامل کروں گا، مگر طبعِ ثانی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اُس دورِ شاعری کے چند اشعار جو اس وقت یاد آتے جا رہے ہیں :-

کوئی کس طرح رازِ الفت چھپائے ۔۔۔ نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے
مرا حالِ دل سُن کے وہ مسکرائے ۔۔۔ یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

اشارۃً بھی نہ شکوے بیاں کیے ہوتے ۔۔۔ سیے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لیے ہوتے

سر جھکاتا ہوں کہ دنیا دوسری ہو جائے گی ۔۔۔ سر اُٹھاتا ہوں تو دنیا دوسری ہوتی نہیں

دل الجھ جائے تو پھر تفریحِ نظارہ کہاں ۔۔۔ کوئی منظر ہو مگر، دامن بچاتے جائیے

آپ ہی کے دم سے وابستہ ہے میری زندگی[1] ۔۔۔ آپ جس عالم میں چاہیں گے بسر ہو جائے گی

فلمی دنیا سے وابستگی کے بعد اُن کی شعر گوئی کی رفتار بہت سست ہو گئی اور ریس (Race) کی مشغولیت نے تو اُن کو عملاً شاعری نہیں رہنے دیا، پاکستان میں آنے کے بعد کی اس مدت میں مشکل سے تین چار غزلیں کہیں!

کوئی رشتہ کسی عنواں ہی سہی ۔۔۔ میرا ہاتھ اُن کا گریباں ہی سہی
ہر پریشاں سے مجھے ہمدردی ۔۔۔ وہ تری زلف پریشاں ہی سہی
حالِ دل اُن کو سنائیں گے ضرور ۔۔۔ حالِ دل اُن پہ نمایاں ہی سہی

غالبؔ کی غزل پر بڑے معرکے کی غزل کہی، ایک مصرع یاد رہ گیا ہے :

---

[1] ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ مصرع میں میرے حافظے نے کچھ ردو بدل کر دیا ہو

؎ وار اوچھا ہے زخم کاری ہے

نخشب کا مزاج خالص غزل کا مزاج تھا۔ اپنی فلم کمپنی کا نام بھی انہوں نے غزلستان رکھا اور "غزل" نام کی فلم بنانے کا ارادہ بھی تھا، غالباً اس نام کا ہندوستان ہی کے قیام کے زمانے میں اعلان بھی کر دیا تھا! اچھا شعر سن کر جھومنے لگتے اور بے ساختہ داد دیتے۔ میں نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی تو اس شعر:

تذکرہ جب وفا کا ہوتا ہے
میں تمہاری مثال دیتا ہوں

کے بارے میں ایک دن بولے، بھئی! تین چار دن سے تمہارے اسی شعر میں گم ہوں۔
ایک غزل کا بس مطلع ہی کہہ کر رہ گئے، مگر ظالم نے کس قیامت کا مطلع کہا:

آخری وقت آہ کرتا ہوں
آج پہلا گناہ کرتا ہوں

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۷ء)

ڈاکٹر نذیر احمد شہید

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم سے پہلی ملاقات غالباً کراچی میں ہوئی تھی۔ تقریبِ ملاقات جماعتِ اسلامی کا سالانہ اجلاس جس نے لکری گراؤنڈ کو دین و دانش اور عبادت و اخلاق کا "گلشنِ بے خار" بنا دیا تھا۔ یہ تقریباً اٹھارہ اُنیس سال پہلے کی بات ہے! اس کے بعد جماعتِ اسلامی کے اجتماعات میں کئی کئی سال کے وقفے سے ملاقات ہوتی رہتی تھی! میرے ملنے والوں کی کوئی حد و شمار ہی نہیں ہے ہر قماش اور مزاج کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ان میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ملاقات کا دل و دماغ پر نقش چھوڑتے ہیں، تعارف و ملاقات کے بعض نقوش بہت جلد مٹ جاتے ہیں، بعض دیر سے! اور کچھ نقوش انمٹ ہوتے ہیں ——— ڈاکٹر نذیر احمد کی ملاقات کا نقش نہ مٹنے والا نقش ثابت ہوا اور ہر ملاقات اس نقش کو خلوص کی روشنائی سے تابندہ تر بناتی چلی گئی۔

تقسیمِ ہند سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل میں نے اپنی بیوی کے نام سے سبزی منڈی دہلی میں ادھ بنا مکان خریدا تھا، اس کی تعمیر مکمل ہوئی تو دلی میں ہندوؤں نے آتشزنی، مار دھاڑ اور خونریزی شروع کر دی اور پھر یہ آگ ہندوستان میں چاروں کھونٹ پھیل گئی، لاکھوں مسلمانوں کو آتش و خون کے اس دریا سے گزر کر پاکستان آنا پڑا۔ یہ داستان بڑی دلخراش اور کرب انگیز ہے! برسوں کی جد و جہد کے بعد اہلیہ مرحومہ کے کلیم کا قرعہ ڈیرہ غازی خاں کے نام نکلا اس سلسلے میں راقم الحروف کو دو بار ڈیرہ غازی خاں جانا پڑا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ڈیرہ غازی خان جاتا اور ڈاکٹر نذیر احمد سے ملے بغیر چلا آتا، ان کا مکان ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ سارا شہر اُن کا شناسا تھا، مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گئے! مزاج پرسی کے بعد معلوم ہوا کہ اُن پر سات مقدمے قائم ہیں اور وہ ڈیرہ غازی خان سے باہر جا رہے ہیں اُن کے خلاف کسی مقدمہ کی پیشی ہے! شام تک وہ واپس آ گئے اور دوسرے دن ڈاکٹر نذیر احمد کی تحریک پر مشاعرہ ہوا۔

شعر وسخن کا وہ خاصا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اور شریعت کی تمام پابندیوں کے باوجود خوش طبع، ہنس مکھ اور ظریف تھے۔

دوسری بار میں ڈیرہ غازی خان گیا تو ڈاکٹر صاحب ہی کے مکان میں قیام کیا، خلوص میزبانی اور پذیرائی کا یہ عالم جیسے فرطِ تواضع سے بچھ بچھ جا رہے ہیں۔ مکان صاف ستھرا، ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ میری وجہ سے کچھ احباب کو کھانے پر بلایا۔ چائے ایسی ذائقہ دار پلائی کہ احباب میں اب تک اس کا ذکر ہو جاتا ہے۔ چائے کے بارے میں اُن کا تجربہ اور ذوق مثالی تھا، میں نے دریافت کیا تو چائے کی نہ جانے کتنی قسموں کے نام فرفر سنا دیے۔ پھر بتایا کہ لیمن کا چورا فلاں چائے میں شامل کر دیا جائے تو رنگ چوکھا آتا ہے۔ اور مزا دوبالا ہو جاتا ہے! اور ہاں چائے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ جس برتن میں بنائی جائے، جس چائے دانی میں رکھی جائے اور جن پیالیوں میں پی جائے وہ سب خشک بلکہ نیم گرم ہونی چاہئیں! وقت کے وقت پیالیاں دھو کر، گیلی پیالیوں میں چائے ڈالنے سے چائے کا مزا غارت ہو جاتا ہے! قدرے مسکرا کر فرمانے لگے: "ماہر صاحب! آپ کی طرح مولانا مودودی صاحب نے بھی میرے یہاں کی چائے کو بہت پسند فرمایا! اور میرے یہاں جب بھی چائے بنتی ہے یہی (Flavour) ہوتا ہے! میں نے عرض کیا شرابِ صالحین تیار کرنے میں آپ کا ذوق اور مہارت قابلِ داد و ستائش ہے۔

دو رات اور ایک دن ڈاکٹر صاحب کے یہاں قیام کیا، پھر مجھے لاری سے ملتان کو ہوتے ہوئے رحیم یار خان جانا تھا۔ گلابی جاڑے تھے، لاری صبح سویرے دن نکلنے سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ڈیرہ غازی خان سے روانہ ہوتی تھی! ڈاکٹر صاحب کے مکان سے لبوں کا اڈہ کئی فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ہم اُن کے مکان سے اس طرح روانہ ہوئے کہ میرا بستر ڈاکٹر صاحب اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھے، سوٹ کیس اُن کے کسی عزیز کی بغل میں اور میرے ہاتھ میں ٹوپی تھا۔

اس کے بعد کئی سال "فترت" رہی، اور اب دو مہینے پہلے ڈاکٹر صاحب مرحوم جماعت اسلامی کے رہنماؤں کے ساتھ کراچی تشریف لائے تھے تو ایک جلسہ میں انہیں دور سے دیکھا، میں نے محسوس کیا کہ ان کا چہرہ اور زیادہ پاکیزہ اور نورانی ہو گیا ہے، اُن کی

مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ ملاقات کا موقع ہی نہ مل سکا۔
دو ہفتے ہوئے اخبارات میں اُن کی شہادت کی خبر پڑھی اور دل و دماغ سناٹے میں آگئے، پورے ملک میں اُن کے خونِ ناحق اور ظالمانہ قتل نے غم و غصہ کی لہر دوڑا دی۔ پندرہ سولہ دن گزرنے کے بعد بھی اخبارات میں تعزیت و احتجاج کی خبریں آرہی ہیں! ہر طرف یہی چرچے ہیں کہ ایک حق گو، حق پسند اور شریف و خوددار انسان کو حق و صداقت کے راستے سے ہٹایا گیا ہے!

ڈاکٹر نذیر احمد شرافت و ایثار کا مجسمہ اور عزیمت و استقامت کی تصویر تھے۔ حق گوئی کے جرم میں (۳۱) بار گرفتار ہوئے اور کئی برس حوالاتوں اور جیل خانوں میں کاٹے! ان پر مقدمے قائم کیے جاتے اور خارج ہوتے رہتے اور پھر کوئی نہ کوئی نیا الزام لگا کر انہیں پھانس لیا جاتا۔ اس مردِ مجاہد پر اللہ کی رحمت ہو ہر مصیبت اُس کے عزم کو قوی تر بنا دیتی۔ ظلم کے آگے جھکنا اور ہمت ہار کر جی چھوڑنا اور سپر انداختہ ہو جانا اُن کے مذہب میں کفر تھا! اس علاقہ میں جماعتِ اسلامی کا بھرم تنہا ان کی ذات سے قائم تھا۔ عوام میں ہر دلعزیزی کا یہ عالم کہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے امیدوار کو شکست دی۔ ۱۹۶۵ء کے جہاد میں اپنا سب کچھ اثاثہ خدا کی راہ میں دے کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے انفاق و ایثار کی ایک جھلک اس دورِ انحطاط میں دنیا کو دکھا دی۔

مشہور شاعر شفقت کاظمی صاحب جو فرقۂ امامیہ سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے راقم الحروف کو جو خط لکھا ہے وہ ڈاکٹر نذیر احمد شہید کی شخصیت پر معتبر اور غیر جانبدارانہ شہادت ہے:

"جناب ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کی وفات بہت بڑا قومی المیہ ہے۔ موصوف مولانا حسرت مرحوم کی طرح جہاں قدما کی شرافت اور سادگی کا چلتا پھرتا خاکہ تھے وہاں ایک نڈر اور حق گو سیاسی لیڈر بھی تھے۔ یہاں کے غریب اور سرمایہ داروں کے ستائے ہوئے عوام کا اُن کی ذات ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ ڈیرہ غازی خان کی پوری سیاسی تاریخ میں پہلی بار ایک عوام دوست نمائندہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا مگر افسوس ہے کہ اسے اپنی آزاد روی اور حق گوئی کی پاداش میں گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ یوں تو

پورے پاکستان میں ان کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا گیا ہے۔ مگر ڈیرہ غازیخان اور اس کے ملحقہ اضلاع میں اُن کی دائمی مفارقت کو بری طرح محسوس کیا گیا ہے ـــ اُن کے جنازے کے ساتھ سوگواروں کا اتنا بڑا ہجوم تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں یہاں کی بڑی سے بڑی شخصیت کے جنازے کے ساتھ نہیں دیکھا۔ کل ان کی فاتحہ خوانی تھی اور پورے شہر میں ہڑتال رہی ......"

ڈاکٹر نذیر احمد شہید کے چہرے سے نیکی برستی تھی۔ اُن کی چال ڈھال شرافت اور صداقت کی گواہی دیتی تھی، علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو خوش ہوتے کہ مردِ مومن مجاہد اور قلندر کو جیتے جی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا! اللہ اور رسولؐ کی محبت نذیر احمد شہید کے ضمیر میں، ذہن و فکر اور دل و دماغ میں اس طرح بسی ہوئی تھی جیسے گلاب میں خوشبو! دینداری اور شریعت کی پابندی میں اپنی آپ نظیر! اُنہوں نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر ہر دَور میں وقت کے فرعونوں کو للکارا، اُن کی کمزوریاں ڈنکے کی چوٹ بیان کیں، اُن کی تقریریں بڑی ولولہ انگیز ہوتی تھیں ـــ دینی انقلاب کے وہ پُرجوش داعی تھے۔ اس لیے اربابِ حکومت اپنے اقتدار کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد کو مستقل خطرہ سمجھتے رہے۔

موت تو اُنہیں بہرحال آنی تھی مگر ایسی موت جس کو "شہادت" کہا جاتا ہے خوش قسمتوں کو ملتی ہے۔ دنیا میں بھی نیک نامی اور عقبیٰ میں بھی سرخروئی! قیامت میں جب احکم الحاکمین انصاف فرمائے گا، اُس دن ڈاکٹر نذیر احمد کے قاتل اور حمایتی اپنی ذلت و رسوائی اور نذیر احمد شہید کی عزت و فلاح کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ (ان شاء اللہ العزیز)۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۷۲ء)

نذیر دہقانی

ورنگل حیدرآباد دکن کے ایک صوبے کا مستقر تھا، ورنگل کے سینٹرل جیل کے قالین اور شطرنجیاں مشہور اور مقبول تھیں: وہاں کے انٹرمیڈیٹ کالج میں بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہوا یہ ۱۹۳۷ء یعنی اب سے ۳۶ سال پہلے کی بات ہے، حضرت فانی بدایونی نے ورنگل سے واپس آکر بڑی تعریفیں کیں کہ ماہر! اس مشاعرے میں ایک عجیب و نفیس شاعر کو سنا، زبان خالص دکنی تخلص دہقانی کلام ایسا کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

چند دن کے بعد نذیر دہقانی کو بلدہ حیدرآباد بلایا گیا۔ جس نشست اور مشاعرے میں بھی انہوں نے اپنا کلام سنایا دھوم مچ گئی۔ اخبارات میں دہقانی کی شاعری پر مضامین شائع ہوئے جس نے نو وارد شاعر کی شہرت کے پر لگا دیئے ـــــ مہاراجہ کشن بہادر یمین السلطنت صدر اعظم نے بھی عشائیہ میں دہقانی کو بلایا۔ چہرے مہرے سے وہ واقعی دہقانی معلوم ہوتے تھے سچ مچ اسم بامسمّٰی! دبلا پتلا بدن، ملتے کی رگیں ابھری ہوئیں! چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی نذیر دہقانی کے جسم پر اجنبی سے لگتے تھے جیسے یہ لباس اس دہقانی شاعر نے پہلی بار پہنا ہے یا کسی بد ذوق قدر دان نے پہنا دیا ہے! مہاراجہ بہادر کے ڈنر میں ہر چیز کو نذیر دہقانی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کہاں ان کے گاؤں کی چوپال اور بیٹھک اور کہاں مہاراجہ کشن پرشاد صدر اعظم دولت آصفیہ کا دربار! اس عروج اور پزیرائی کا شاید دہقانی کے ذہن میں خیال بھی نہ آیا ہو۔

پھر انہوں نے بلدہ حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی، غالباً محکمہ امداد باہمی سے ملازمت کا تعلق تھا، مجلس اتحاد المسلمین جس کی روح رواں نواب بہادر یار جنگ مرحوم تھے، اس کے عام جلسوں میں نذیر دہقانی کی نظمیں بڑی دلچسپی کے ساتھ سنی جاتیں، مشاعروں میں اُنہیں بڑی داد ملتی! اُن کی نظموں میں سیاست کا رنگ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ کانگریس اور ہندوؤں کی ذہنیت پر طنز! ایک نظم میں انہوں نے گاندھی جی کے حلیہ اور وضع

قطع پر بھی طنز کی تھی، اتحاد المسلمین اور مسلم لیگ کے جلسوں میں اس نظم پر قہقہوں کا طوفان اٹھنے لگتا، نظم کے اشعار تو ذہن میں محفوظ نہیں رہے، مصرعوں کے دو چار بول یاد رہ گئے ہیں:

گر کے دانتاں توڑ لیے ہیں .... حالت کیا کہیے

.... پیٹ کنڈالا حقہ کی صورت کیا کہیے!

ریاست حیدرآباد دکن کے علاوہ رائے پور، جبل پور اور ناگپور کے مشاعروں میں نذیر دہقانی کے ساتھ راقم الحروف کا ساتھ رہا، اُن سے جلوت و خلوت میں بڑی بے تکلفی رہتی تھی۔ بلاس پور (سی پی) کے مشاعرے میں عجیب لطیفہ رہا، ایک مسلمان سب جج کے ہم مہمان تھے، کھانا کھانے کے بعد مشاعرہ گاہ کے قریب ہوٹل میں چائے پینے کے لیے رُک گئے اس کے بعد جو ہم پنڈال کے دروازے پر پہنچے تو ہمیں کوئی اندر نہیں جانے دیتا، اور مشاعرے میں ہمارے آنے کا انتظار ہو رہا تھا کہ ہم آئیں تو مشاعرہ شروع ہو! بڑی مشکل سے ایک رضا کار کے ہاتھ پرچہ بھجوایا پرچہ پڑھتے ہی منتظمین ہمیں لینے کے لیے دوڑتے ہوئے گیٹ پر آئے اور بڑی معذرت کی! اس مشاعرے کا اس سے زیادہ دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ حضرت نوح ناروی کے مہند و شاگرد بسمل الٰہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں رباعیاں پڑھیں۔ ایک رباعی پڑھتے ہوئے داد و ستائش کے ہجوم میں اس طرح ہاتھ اٹھایا کہ اُن کا ہلتا ہوا دانت ٹوٹ گیا اور وہ درد کی تکلیف سے اسٹیج پر منہ کو پکڑے ہوئے خاموش بیٹھے رہے۔

حیدرآباد دکن پر بھارت نے مسلح افواج سے حملہ کیا، مگر اس کو "پولیس ایکشن" کا نام دیا گیا۔ اس خونریز تباہی کے بعد دکن کے ہزاروں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ نذیر دہقانی کو بھی ترکِ وطن کرنا پڑا، یہاں کراچی میں ان سے دو چار مہینوں کے وقفے سے ملاقاتیں ہوتی رہتیں پھر وہ زرعی جائداد کی دیکھ بھال کے لیے سندھ میں جا بسے، انھوں نے قصبہ الٰہ آباد میں ایک مشاعرہ بھی کیا تھا، کراچی آکر کئی شاعروں کو اپنے ساتھ لے گئے، لیاقت پور ریلوے اسٹیشن پر اتر کر چند میل جیپ میں سفر کرنا پڑا، خاصا کامیاب مشاعرہ ہوا، شاعروں کی بڑی خاطر و مدارات کی! ادیب سہارنپوری ۔ اور نظر حیدرآبادی بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے افسوس ہے کہ یہ دونوں خوش نوا اور

خوش گو شاعر اب اس دنیا میں نہیں رہے! مولوی شبیر حسین بخاری (ایم۔اے) جو فنِ تعلیم میں غیر معمولی مہارت و بصیرت رکھتے ہیں، محکمہ تعلیمات کے نیک نام افسر ہیں اور بہاولپور کے نواح میں خاص طور سے جن کی بڑی اچھی شہرت ہے انھوں نے بھی اس مشاعرے میں اپنا کلام سنا کر خاصا رنگ جما دیا۔

نذیر دہقانی دکن کی قدیم دمتوسط اردو میں جس کا اب بھی وہاں کے دیہات میں تھوڑا بہت چلن ہے شاعری کرتے تھے۔ مدراس سے لے کر ناگپور تک اُن کی شاعری کو لوگ سمجھتے اور لطف لیتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کے لیے یہ زبان اجنبی تھی! اس لیے پاکستان آنے کے بعد وہ گمنام سے رہے! انھوں نے یہاں آکر دکنی اور عام اردو زبان میں ملی جُلی غزلیں کہیں، پاکستان میں اُن کے کلام کی خاص پزیرائی نہیں ہوئی لیکن زبان کی اس اجنبیت کے باوجود بعض مشاعروں میں ان کا کلام سن کر داد و ستائش کے شور سے چھتیں اڑ گئیں۔

نذیر دہقانی کی زبان، لب و لہجہ، طرزِ ادا اور ساتھ ہی فکر و تخیل نے انہیں عظیم شاعر بنا دیا تھا، انھوں نے شاعر کے عالمِ خواب اور عالمِ تصورات پر جو نظم کہی ہے اور آزاد منش شوہر کے بارے میں بیوی کے جذبات و احساسات کی جو ترجمانی کی ہے، یہ دونوں نظمیں بلند پایہ بلکہ اپنے رنگ میں منفرد نظمیں ہیں! نذیر دہقانی کے بعد کھٹا اور ڈنڈا لے نے بھی دکنی زبان کی شاعری میں نام پایا مگر نذیر دہقانی کا رنگ سب سے الگ اور انوکھا تھا۔

نذیر دہقانی کو حیدرآباد دکن کی اراضی کے معاوضے میں سینکڑوں بیگھے زمین ملی! اگر وہ زمین کی کاشت کا خود بندوبست کرتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ سال کے سال ایک لاکھ کی آمدنی ہو جاتی ــــــ مگر انھوں نے یہ روش اختیار کی کہ زمین کا کوئی قطعہ کئی ہزار روپے میں فروخت کیا اور لاہور چلے گئے اور وہاں لطف و تفریح کر کے خالی ہاتھ کراچی لوٹ کر آگئے۔ چند ماہ کے وقفے کے بعد پھر دوسرا قطعہ اراضی بیچ ڈالا اس طرح انھوں نے قریب قریب تمام زرخیز اراضی کو ٹھکانے لگا دیا۔ ایک بار مجھ سے کہا کہ ماہر! میرے ساتھ لاہور چلو، سمن آباد کے بنگلہ میں رہیں گے اور خوب تفریح کریں گے۔

نذیر دہقانی کے لڑکے، داماد، بھائی اور دوسرے رشتہ دار ایک ہی ساتھ رہتے

تھے۔ گھریلو زندگی کا ذکر نکلا تو مجھ سے کہنے لگے کہ ایک ٹبر اور بڑا کنبہ میرے ساتھ ہے، جن کے لیے کم سے کم تیس سیر چاول روزانہ چاہئیں۔

ڈھائی تین سال ہوئے احباب اور عزیزوں سے ملنے کے لیے وہ حیدر آباد دکن گئے اور وہاں اُن کی اتنی پزیرائی ہوئی کہ واپسی کا نام ہی نہیں لیا۔ ان کی قدر افزائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بھارت کی نیشنلٹی انہیں مل گئی! اُن کی اہلیہ کا کراچی میں انتقال ہو چکا تھا۔ ہندوستان جا کر ایک کمسن لڑکی سے شادی کی اور اس کے چند مہینے بعد بیمار پڑ گئے اور یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ کراچی کے اخباروں میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی ــــــ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے!

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۳ء)

سردار عبدالرّب نشتر

پاکستان بننے سے تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں اپنے گھر سے دوست نواب محی الدین خاں مرحوم (رئیس ناگپور) سے ملنے کے لیے دہلی کے لکشمی ہوٹل میں گیا، وہاں صابر صاحب دہلوی کی زبانی معلوم ہوا کہ اسی ہوٹل میں سردار عبدالرب نشتر تین چار دن قیام کر کے چلے گئے، دو ڈھائی روپیہ روز کا کمرہ کرایہ پر لیا تھا۔ اخبارات میں نشتر صاحب مرحوم کا نام پڑھ چکا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس طرز پر شاید سوچتا کہ ہندوستان کی ملی جلی حکومت (Interim Government) میں وزارت کے لیے جن کا نام اخبارات میں آرہا ہے، انھیں تو دہلی کے کسی بڑھیا ہوٹل میں قیام کرنا تھا، یہ کیا کہ اتنے معمولی ہوٹل میں وہ ٹھہرے، اور سب سے گھٹیا کمرے میں!—— مگر سردار نشتر مرحوم کی اس شانِ قلندری نے مجھے بے حد متاثر کیا کہ مسلم لیگ کا یہ لیڈر کوئی دولت مند اور جاگیردار نہیں ہے، بلکہ ہمیں جیسا مردِ بے سروساماں ہے!

اگر مجھے بڑے آدمیوں سے ملنے کا شوق ہوتا، اور اکابر و مشاہیر سے از خود کوشش کر کے ملتا، تو سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملتا، مگر طبیعت کا اس طرف شروع ہی سے کچھ زیادہ میلان نہیں رہا، بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقاتیں میری کوشش کے بغیر ہی ہوگئی ہیں، اللہ تعالیٰ سے اب تک میرا معاملہ "آسانی" کا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت نے میری آرزوؤں کے لیے از خود سہولتیں پیدا کی ہیں۔ الحمدللہ علیٰ احسانہ

سردار عبدالرب نشتر مرحوم سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد ہوئی، وہ وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے، مگر جب بھی ملنا ہوا، انھوں نے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کرسی نشین ہیں اور میں بوریا نشین ہوں! ایک بار کراچی کے کسی کالج میں شام کے وقت کوئی تقریب تھی، سردار نشتر مرحوم اس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے، میری

نشست اُن کے سامنے تھی۔ طلباء کو جو شوخی سوجھی تو انھوں نے میری غزل کے اس مصرع :- تم نے تو وہ شب دیکھی ہوگی، جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

کی "پیروڈی" کی اور قوالی کے انداز میں گا کر سنائی، پھر شعر و شاعری ہوئی، نشتر مرحوم طلباء اور شاعروں کی اس شوخ محفل میں ذرا بھی اجنبی نہیں لگتے تھے! اسی محفل میں " احادیث " کا موضوع باتوں باتوں میں چھڑ گیا، اور اُن سے کچھ دیر تک گفتگو رہی!

سردار نشتر مرحوم پنجاب کی گورنری کے زمانہ میں کسی سرکاری کام سے کراچی آئے ہوئے تھے، اتفاق کی بات کہ انہیں دنوں گورنر جنرل ہاؤس میں شعر و سخن کی محفل منعقد ہوئی، خواجہ ناظم الدین صاحب کا دورِ حکومت تھا، اس بزم شعر و سخن کے میر مجلس نشتر صاحب ہی قرار پائے، حضرت جگر مرادآبادی کی باری آئی تو نشتر مرحوم نے اُن کی غزل کا یہ مصرع پڑھا ؎ توبہ کو توڑ تاڑ کے لہرا کے پی گیا

اُن کے پڑھنے کا انداز بھی خاصا دل نشیں تھا، محفل میں سرخوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی!

ایک بار حکیم نصیر الدین ندوی (مالک نظامی دواخانہ) کے یہاں کھانے پر ملاقات ہوئی، تو بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر چھیڑا، اور اُن کی خیریت پوچھنے لگے۔

چار سال سے کچھ زیادہ مدت ہونے کو آئی کہ میں شدید بیمار ہو گیا تھا، ایک مہینہ جناح ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں رہنا پڑا، ہسپتال کی زندگی کا یہ پہلا تجربہ تھا.... ؎ .... ولے بخیر گزشت

میری صحت یابی کی خوشی میں مخلص احباب نے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کر ڈالا، سردار نشتر مرحوم کو بھی دعوت دی گئی، وہ اس دن پہلے سے کہیں اور مدعو تھے مگر دعوت دینے والوں سے بولے کہ یہ ماہر کی صحت یابی کا جلسہ ہے میں ضرور شرکت کروں گا، چنانچہ دعوت سے فارغ ہو کر، اس تقریب میں شرکت فرمائی اور آخر تک ٹھہرے رہے۔

جس دن مسٹر غلام محمد مرحوم نے ناظم الدین وزارت کا تیا پانچہ کیا ہے، وہ دن " اسلام پسندوں " کے لیے سخت اذیت کوش تھا، اسلامی دستور کا بنا بنایا کھیل ہی بگڑ گیا، کمند اس وقت توڑی گئی، جب کہ " بام " سچ مچ دو چار ہاتھ رہ گیا تھا۔ جناب ظفر احمد انصاری اور میں اسی دن شب میں نشتر صاحب کے یہاں پہنچے، وہ اپنے بنگلے کے

ہال میں تنہا بیٹھے تھے، ہمیں دیکھ کر تپاک سے ملے، مگر مندضر ورکھنے مگر ان کی باتوں کی سنجیدگی سے گھبراہٹ ظاہر نہ ہوتی تھی مونچھوں پر مسلسل ہاتھ پھیرتے ہوئے، بنگلے کے گیٹ پر اُن کی نگاہ بار بار جاتی تھی!

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی جہاں قبر ہے، وہاں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے قائم کردہ "دارالعلوم" کا جلسہ ہوا۔ سردار نشتر مرحوم نے بھی اس جلسہ میں تقریر کی، تقریر کے بعد جلسہ گاہ کے ایک گوشے میں وہ چلے گئے، میں ان کے ساتھ تھا۔ بہت دیر تک بات چیت کرتے رہے، میں نے عرض کیا کہ ملک کے حالات آپ دیکھ رہے ہیں، فرمائیے، اب کیا ہوگا؟ —— بولے:-

"ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہی ہو جائے گا....."

ان کے لہجے میں یقین کی گرمی سموئی ہوئی تھی، کہ حالات کتنے ہی نازک اور ابتر ہوں مگر وہ مایوس نہیں ہیں! گفتگو میں چوہدری محمد علی صاحب کا ذکر آیا، تو اُن کے بارے میں نشتر صاحب کو شکوہ سنج ہی پایا۔

اس بات کو بھی پانچ مہینے ہونے کو آئے کہ میں جناح ہسپتال میں جناب فضل کریم فضلی کو دیکھنے کے لیے گیا، فضلی صاحب کی عیادت کر کے، سامنے کے وارڈ میں پہنچا معلوم ہوا کہ نشتر صاحب مرحوم سے لوگ مل نہیں سکتے، ڈاکٹروں نے پابندی لگا دی ہے، میں اُن تک اپنی اطلاع بھجوا دیتا، تو یقین تھا کہ وہ مجھے بلوا لیتے مگر میں نے اُن کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھا، وزیٹرس بُک پر اپنا نام لکھ کر چلا آیا —— بس پھر اس کے بعد اُن کے انتقال کی خبر ہی اُن کانوں نے سُنی، جو اُن کی صحتیابی کی نوید سننے کے منتظر تھے، دل کو بڑا سخت دھچکا لگا، دل نے کہا، اب کیا ہوگا؟ چڑھتی ہوئی دھوپ میں کراچی کی فضا ایک دم دھندلی ہوگئی! جس کسی نے بھی اس خبر کو سنا، کلیجہ تھام کر رہ گیا، اخبارات کے ضمیمے نکلنے لگے، سارا شہر سوگ میں ڈوبا ہوا، لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ملک و ملت کا سچا دردمند موت نے چھین لیا!

ہم سردار نشتر مرحوم کی کوٹھی پر پہنچے، عزاداروں کا ایک ہجوم تھا جو اپنے قائد کے آخری دیدار کے لیے مضطرب تھا، اس ہجوم میں اندر جانے کا مجھے موقع نہ مل سکا، معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کے اکابر کا ایک وفد وزیر اعظم سے ملنے کے لیے گیا ہوا ہے،

وزیراعظم کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح تو قائدِ اعظم مرحوم کی قبر کے آس پاس کی زمین عام

قبرستان بن جائے گی، اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ کل سہروردی صاحب کا انتقال ہوا تو وہ کہاں دفن ہوں گے؟ —— حکیم احسن صاحب اس گفتگو کے راوی تھے، پھر وہ خود ہی بولے کہ:

"سہروردی صاحب تو میٹروپول ہوٹل میں اپنے دفن ہونے کے لیے وصیت فرمائیں گے ——"

معلوم ہوا کہ تین بجے کے قریب جہانگیر پارک میں نمازِ جنازہ ہوگی، ہم وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے، جہانگیر پارک کا بہت بڑا حصہ عزاداروں سے بھر چکا تھا، اور لوگ آئے چلے جا رہے تھے، نمازِ عصر کے بعد سردارِ ملت کا جنازہ آیا، دور دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، بلا مبالغہ لاکھوں کا مجمع! نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے جنازے اور نماز کا سماں نگاہوں میں پھر گیا! جس کو زمین پر اتنی مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہوئی ہو، کیا عجب ہے کہ آسمان پر غفران و رحمت کے دریچے اس کے لیے باز کر دیے گئے ہوں —— !

سردار عبدالرب نشتر مرحوم کو یہ بڑائی اور عزت خاندانی طور پر ورثہ میں نہیں ملی تھی۔ وہ (شاید) ایک معمولی درجہ کے خاندان کے فرد تھے، ان کی وضع کی یک رنگی، خلوص و استقامت اور مقصد کی لگن نے اُن کو اس اونچے رتبے تک پہنچایا! اور عوام کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی محبت ڈال دی۔

جس زمانے میں وہ حکومتِ پاکستان کے مرکزی وزیر تھے اور دستور سازی کا مسئلہ درپیش تھا، تو اُن پر ایک ایسا دور بھی گزرا کہ ایوانِ حکومت میں جب دستور کی کمیٹیاں ہوتیں، تو وہ حکومت کی طرف سے نمائندگی کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوئے "دستور" میں کاٹ چھانٹ کے لیے بحث مباحثہ کرتے!

"ناظم الدین وزارت" کے دور میں نشتر مرحوم کو یہ کشمکش پیش آئی کہ خواجہ ناظم الدین کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ نشتر صاحب وزیراعظم بننے کی تمنا رکھتے ہیں! "ناظم الدین وزارت" کو جب غلام محمد مرحوم نے ٹھکانے لگا دیا، اس کے بعد سے سردار نشتر مرحوم کے حالات

میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو گئی! شروع شروع میں لوگوں کو ان سے یہ شکایت رہی کہ وہ جتنا زیادہ سوچتے ہیں، اتنے زیادہ فعال نہیں ہیں، ان کی جرأت کی کمی کے جو عوام میں تذکرے مشہور ہوئے، تو ان کا قدوقامت یہاں تک کہ ان کی "مونچھیں" بھی اچھا خاصا مبحث بن گئیں۔ مگر یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی، انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ سوچنے والا دماغ ہی نہیں دلِ جرأت آزما بھی رکھتے ہیں۔

"مسلم لیگ" سچ مچ مر چکی تھی، نشتر ہی کی مسیحائی نے اس کے تنِ بے جان میں روح پھونکی۔ مسلم لیگ کے وقارِ رفتہ کو واپس لانے کے لیے انھوں نے طوفانی دورہ کیا، وہ جس شہر میں بھی گئے، عوام ان کے لیے فرشِ راہ بن گئے۔ تقریریں اس قدر تند و تیز کیں جیسے ہر قسم کے خوف کو انھوں نے دل سے نکال دیا ہے، اور اپنے اللہ کے سوا، کسی اور سے وہ نہیں ڈرتے، حکومت کی اونچی سے اونچی شخصیتوں کو انھوں نے بے نقاب کیا، کسی کسی کے بارے میں تو یہ تک کہہ دیا کہ:۔

"یہ حضرت! خاندانی طور پر انگریزوں کے غلام رہے ہیں، ملک و ملت سے غداری کرنا ان کے خمیر میں شامل ہے!"

کسی کو جرأت نہ ہو سکی جو ان حقائق کی تردید کرتا، اس لیے کہ ؎

قلندر ہر چہ گوید، دیدہ گوید!

سردار نشتر مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے وجاہت کے ساتھ حسن و دلکشی سے بھی نوازا تھا، وہ کچھ بھی نہ ہوتے، پھر بھی ہر جلسہ اور محفل میں لوگوں کی نظریں انھی کی طرف اٹھتیں، قیادت، شہرت اور عوام کی ہر دلعزیزی نے ان کی شخصیت میں اور چار چاند لگا دیے، جس محفل میں پہنچ جاتے، وہ ہی وہ نظر آتے، یہاں تک کہ پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم کی موجودگی میں بھی، انہی کی ذات لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی، اور بڑے بڑے ان سے دبتے ہوئے ہی دکھائی دیتے!

نشتر مرحوم شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، تقریر شستہ، مدلل اور اثر انگیز ہوتی تھی، مذہب ان کی گھٹی میں پڑا تھا، ان کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ پاکستان میں اللہ کا دین قائم ہو اور یہاں

کا معاشرہ اخلاقِ نبویؐ کا آئینہ دار بن جائے، مذہبی معلومات بھی خاصی رکھتے تھے، علماء دیوبند کے قدر شناس اور اُن سے بہت متأثر تھے، جس دن انھوں نے اس دُنیا سے رختِ سفر باندھا ہے، اس دن بھی صبح کو فجر کی نماز ادا کی —— اور اوراد و وظائف بھی پورے کیے۔ ان کی موت نے حکومتِ پاکستان کے جھنڈوں ہی کو خم نہیں کیا، عوام کے دلوں کو جھکا دیا —— ایک ایسی کامیاب موت جس پر "زندگی" کو رشک آئے! جس کسی نے بھی اُن کی تاریخِ وفات،

غریقِ رحمت

(۱۹۵۸ء)

کہی، الہامی تاریخ کہی! اللہ تعالیٰ کی رحمت کے پھول اُن کی قبر پر سدا برستے رہیں۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۵۸ء)

نصرت قریشی

جناب نصرت قریشی نے تحریکِ پاکستان میں ایک پُرجوش عملی کارکن کی حیثیت سے حصہ لیا، پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے سماجی خدمات انجام دیں! شعر و ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔، اسی ایک شعر سے اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

میں نے تو یہی مقصدِ تخلیق سمجھ کر جو عمر ملی تھی وہ محبت میں بسر کی

نوآموز شاعروں کو انہوں نے آگے بڑھایا اور پوری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت، ترقی اور ترویج میں صرف کردی۔ ——— نصرت قریشی کی شاعری میں مقصدیت اور دینی غیرت بھی پائی جاتی ہے ——— جناب انوار قمر چشتی نے مرحوم کے حالات اور اُن کا کلام بھیجا ہے جس کے انتخاب سے "قارئینِ فاران" یقیناً محظوظ ہوں گے۔

کچھ سعیٔ جستجو بھی تو کر منکرِ خدا
آجائے گی یقین کی منزل گماں کے بعد

خدا خود بھی نصرت جسے چاہتا ہے
میں اُس کو خدا کی قسم چاہتا ہوں!

بلند فکر و نظر مل گئے تو کیا حاصل!
مزا تو جب ہے کہ سوزِ دروں میسر ہو!

نفی سے اور بڑھے گی تری پریشانی
خدا کو مان کہ دل کو سکوں میسر ہو!

جب مجھے بے خودی سی رہتی ہے
دل کو کیا کیا خوشی سی رہتی ہے

اور کچھ ہو نہ ہو محبت سے
دل میں اک روشنی سی رہتی ہے

حکایتِ گل و شبنم ہے یوں پسند مجھے
یہ حرف حرف مری داستاں سے ملتی ہے

قطعہ

حالی کے خیالوں کا سہارا اردو
اقبال کے اقبال کا تارا اُردو

تہذیب و تمدن کا بدلنا معلوم
تہذیب و تمدن ہے ہمارا اردو

(ماہنامہ "فاران" ستمبر ۱۹۶۸ء)

نظر حیدر آبادی

نظر کے والد سید علی اختر مرحوم سے میری ملاقات سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں ہوئی، اس وقت نظر مرحوم کی عمر بہت سے بہت دس گیارہ برس کی ہوگی، پھر میں جدید ملک پیٹ کے نوتعمیر سرکاری کوارٹروں میں رہنے لگا اور علی اختر صاحب کا ہم محلہ ہوگیا۔ اُن کے یہاں دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا رہتا۔ شعر خوانی، علمی و ادبی تذکرے اور تاش کی بازی بھی۔ ان مشاغل میں کافی وقت علی اختر مرحوم کی صحبت میں گزرتا۔

میں شعر و شاعری کے معاملے میں استادی اور شاگردی کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ ایک ہزار اساتذہ بھی اپنی کوشش اور توجہ سے کسی غیر شاعر کو شاعر نہیں بنا سکتے۔ میں نے خود کسی استاد کے آگے شاعری میں زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا، ہاں! یہ ضرور ہے کہ جس شاعر سے کوئی نوآموز شعر گو متاثر ہوتا ہے تو اس کی صحبت سے، شعر و سخن کے باہمی مذاکروں سے اور اس کے کلام کے مطالعے سے فائدہ ضرور پہنچتا ہے! اگر حیدر آباد دکن کے چھپے ہوئے تذکروں میں یہ واقعہ بیان نہ ہوتا تو میں اس کا ذکر بھی نہ کرتا کہ نظر حیدر آبادی نے اپنے والد مرحوم سید علی اختر کے ایماء سے آغازِ شعر گوئی میں مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ یہ سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا۔ میں نے جس کسی کو بھی شعر و سخن میں مشورہ دیا ہے، اپنی حیثیت استاد کی نہیں مشیر کی سمجھی ہے اس لیے نہ میں کسی کا شاعری میں استاد ہوں اور نہ میرا کوئی شاگرد ہے۔ اگر کوئی شخص فطری اور حقیقی شاعر ہے تو اس کی اپنی شخصیت وزن رکھتی ہے ارباب نظر کی طرف سے جس کا اعتراف ہونا چاہیے، نہ کہ شاگردوں کے واسطے سے اُس کی شخصیت پہچانی جائے۔

حضرت جگر مرادآبادی غالباً ۱۹۳۷ء میں سب سے پہلے حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ اُن کی وہاں بڑی پذیرائی ہوئی، قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ، جگر کے کلام کے نہ صرف یہ کہ مداح بلکہ شیدائی تھے۔ انھوں نے اپنی ڈیوڑھی میں جناب جگر کے اعزاز میں ایک عام مشاعرے کا اہتمام کیا، وہ منظر میری نگاہوں میں اب تک

پھر رہا ہے کہ نواب صاحب کی ڈیوڑھی سامعین سے کھچا کھچ بھری تھی اور بلدہ حیدرآباد کے تمام جدید و قدیم شعرا اس مشاعرے میں کھنچ کر آ گئے تھے۔ جگر کی غزل جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

ان دنوں بہت مشہور تھی۔ گانے بجانے کی محفلوں میں یہ غزل عام طور پر گائی جاتی تھی۔ نظر مرحوم نے اس مشاعرے میں جگر صاحب کی اس غزل پر اپنی غزل جو سنائی، تو دھوم مچ گئی وہ مشاعرے پر چھا گئے۔ حیدرآباد کے عوام سے اُن کی شاعری کا یہ پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد وہ دکن میں مشہور اور مقبول ہوتے چلے گئے۔

مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد اور میکش اکبرآبادی یہ شعرا نظر سے عمر میں بڑے اور پہلے سے مشہور تھے مگر نظر کا شمار ان شعرا کی صف میں ہونے لگا۔ پھر اتحاد المسلمین کے عظیم الشان جلسوں میں نظر نظمیں پڑھنے لگے اور اس طرح وہ دکن میں غزل گو کے علاوہ قومی شاعر بھی سمجھے جانے لگے، نواب بہادر یار جنگ مرحوم نظر کے مداح اور قدر شناس تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نظر نے سب سے پہلی رومانی نظم جو کہی تھی اس کا عنوان تھا —— "میرے گھر کے سامنے" —— یہ دَور اُن کے عنفوانِ شباب کا تھا جب شاعری رنگین موضوعات چاہتی ہے، خیالی بھی اور عالمِ واقعہ میں بھی! اس زمانے میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ میرے یہاں رات کو ایک دو بجے آتے۔ عمر مہاجر[1] صاحب خاص طور پر اُن کے ساتھ ہوتے، پھر صبح کے تین چار بجے تک شعر خوانی، گفتگو، ادبی لطیفے اور ہنسی خوشی کی باتیں رہتیں۔ اس طرح مہینے میں دو تین بار ضرور شب بیداری کی نوبت آجاتی۔ علامہ اقبال نے سوزِ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کا طرح طرح سے ذکر کیا

---

[1] محمد عمر مہاجر عثمانیہ یونیورسٹی کے قابلِ فخر گریجویٹ ہیں، اچھے مقرر اور اس سے زیادہ اچھے مضمون نگار! میرے "سو شعروں" پر انہی نے مقدمہ لکھا تھا، حکومتِ دکن میں گزیٹیڈ افسر تھے۔ یہاں پاکستان ریڈیو میں برسوں پروگرام ڈائرکٹر رہے، اور اب اپلیکیشن ڈیپارٹمنٹ میں عہدہ دار ہیں! نظر مرحوم سے ان کی غایت درجہ کی بے تکلفی، اخلاص اور گہرا یارانہ تھا۔

ہے ، ہم چند دوستوں اور ہم نشینوں کو لطفِ نیم شبی اور نعرۂ سحر گاہی میسر تھا۔

بلدہ حیدرآباد میں ادارۂ شرقیہ نام کی ایک مشہور درسگاہ تھی ــــــ مولانا حمید الدین قمر فاروقی سنبھلی (فاضل دیوبند) اس کے بانی ، سرپرست اور صدر معلم تھے۔ پنجاب کے علوم مشرقی کے امتحانات میں شریک ہونے کے لیے طلبا راس ادارے میں تعلیم پاتے تھے ، نظر حیدرآبادی نے ادارۂ شرقیہ میں تعلیم پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اُردو شاعری کے لیے عربی سے ایک حد تک اور فارسی سے کامل مناسبت بہت ضروری ہے ، چاہے کسی اردو شاعر کو انگریزی نہ آتی ہو مگر عربی اور فارسی سے اُسے لگاؤ ضرور ہونا چاہیے ، نظر حیدرآبادی نے منشی فاضل کے نصاب کی سبقاً سبقاً تکمیل کی تھی فارسی سے اُن کی یہ مناسبت اردو شاعری میں کام آئی۔

تقسیم ہند سے قبل نظر حیدرآبادی کی شاعرانہ شہرت دکن تک محدود نہ رہی تھی ، دکن کے باہر بھی لوگ اُن کو جانتے تھے ، پاکستان آنے کے بعد تو اُن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے! اقبال اکیڈمی نے نثر میں اُن کی ایک کتاب (اقبال اور حیدرآباد) بھی شائع ہوئی، جس کا معاوضہ انہیں دیا گیا ، اس کتاب کی تصنیف سے پہلے اُن کا کوئی نثر کا مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا تھا ، جو بات بھی کہی سلیقے سے کہی اور دل نشین انداز میں کہی۔

نظر کے والد علی اختر مرحوم کو شروع شروع میں حیدرآباد ٹرسٹ سے تنخواہ ملتی تھی ، مگر جتنی تنخواہ یا پنشن ملتی تھی ، اُس سے کئی گنا اُن کے گھر کا خرچ تھا ، پھر وہ پنشن بھی بند ہو گئی ، علی اختر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں ، کسی کسی دن ناداری اور افلاس کا یہ عالم بھی اس گھرانے پر گزر جاتا کہ آذوقہ مسیات بھی پوری طرح میسر نہ آتا ، کم و بیش پچیس افراد کھانے والے اور ایک دو آدمی کمانے والے!

ہر فن کار کو اُس کی شہرت سے اس دُنیا میں مادّی فائدہ بھی پہنچتا ہے ، سالہا سال کی عسرت و پریشانی کے بعد اب وقت آیا تھا کہ نظر حیدرآبادی اپنی شہرت کی بہار دیکھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ تین چار مہینے سے اُن کے معاشی حالات بہتر ہوتے جا رہے تھے اور آئندہ اور زیادہ بہتر ہونے کی توقعات تھیں ــــــ میر ہوئی عید شام کو ــــــ والا معاملہ اُن کے ساتھ پیش آیا اور چار پانچ دن بیمار رہ کر وہ چٹ پٹ ہو گئے!

نبیوں، رسولوں، صحابہ کرامؓ اور صلحاء امت کے علاوہ دوسرے مشاہیر مثلاً، سیاسی لیڈروں، انشاپردازوں، ناول نگاروں اور شاعروں کی زندگیوں کے کچھ پہلو دوسروں کے لیے قابل تقلید اور بعض پہلو عبرت انگیز ہوتے ہیں۔ ہمیں مرحوموں کے بارے میں بھلائی کے ساتھ ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے اشارتاً اتنا عرض کردینا ضروری سمجھا گیا کہ نظرؔ حیدرآبادی کی زندگی کا رنگ مجازؔ لکھنوی سے ملتا جلتا تھا، اس چیز نے اُن کی صحت کو متاثر کیا اور اُن کی آواز میں پہلی سی نغمگی باقی نہیں رہی، نظرؔ کی زندگی کا یہ رُخ نئی نسل اور جدید شعراء کو زبانِ حال سے خطاب کررہا ہے ؎ من نہ کردم شما حذر بکنید

نظرؔ کے دادا سید کاظم علی باغؔ اور اُن کے دادا کے حقیقی بھائی نواب نثار یار جنگ بہادر مزاجؔ (سابق کلکٹر، حکومت دکن) دونوں حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ علی اخترؔ مشہور شاعر اُن کے والد تھے، اس لیے یہ کہنا عین واقعہ کے مطابق ہے کہ شاعری تو نظرؔ کی گھٹی میں پڑی تھی، وہ بہتی اچھی غزل کہتے تھے، اسی انداز کی نظمیں انھوں نے کہی ہیں، حیدرآباد کی غارت گری اور مسلمانوں کی جمی جمائی بادشاہت کی تباہی نے نظرؔ کے قلب میں گداز اور اُن کی شاعری میں اور زیادہ سوز پیدا کردیا تھا۔ اُن کی غزل کا تنہا یہ ایک مطلع مکمل مرثیہ ہے، فرماتے ہیں:

ملی جو چشم ساقی پیمانہ چھوڑ آیا ۔۔۔ کس تشنگی میں کیسا میخانہ چھوڑ آیا

اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

جنگل کا گوشہ گوشہ دامانِ باغباں ہے ۔۔۔ صحرا میں کیا شگوفہ دیوانہ چھوڑ آیا

شاعری کے علاوہ کثرتِ اولاد میں بھی وہ اپنے والد کے جانشین تھے ـــــ الولد سر لابیہ کے مصداق اُن کی شادی کو غالباً بیس سال سے زیادہ مدت نہیں ہوئی، اور ان کے سولہ سترہ بچے پیدا ہوئے، گیارہ زندہ ہیں، چار پانچ فوت ہوگئے، ایک بچہ ہونے والا ہے! اللہ تعالیٰ ہی اتنے بڑے کنبہ کی پرورش فرمائے گا (وَاللّٰہُ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ)

نظرؔ کا جنازہ بڑے دھوم سے اٹھا، خاص طور سے حیدرآبادیوں نے پوری طرح سے حق وطنیت ادا کیا، اور میری ان آنکھوں نے جس کے گلے میں شادی کے پھول دیکھے تھے، ان آنکھوں نے اس کے جنازے کو بھی دیکھا اور قبر میں اُس کا آخری دیدار کیا ـــ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" اکتوبر ۱۹۶۳ء)

ن، م، راشد

ن،م، راشد نے اردو شاعری میں بے سرد پا نظمیں (بلینک ورس) کہہ کر اُردو شاعری کا مزاج بگاڑ دیا۔ آج جیسی مضحکہ خیز اور پست و بے معنی آزاد نظمیں رسالوں میں آرہی ہیں اس کا کریڈٹ نہیں ڈیبیٹ (DEBIT) ن،م، راشد ہی کو ملنا چاہیے، اس شخص سے ملنے اور اسے دیکھنے کا میرے دل و دماغ میں کبھی داعیہ پیدا نہیں ہوا۔ مگر سنہ ۱۹۴۰ء میں اتفاق سے علی گڑھ میں ملاقات ہوگئی۔

اس زمانے میں مسٹر اے، ڈی نقوی علی گڑھ کے کلکٹر تھے۔ نمائش میں بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا۔ مسٹر عبدالعزیز پوری اس مشاعرے کے صدر تھے۔ مجھے علی گڑھ سے لاہور جانا تھا مسٹر پوری نے اصرار کیا کہ لاہور سے واپسی میں چند دن آپ میرے یہاں قیام کریں، میں مالیر کوٹلہ کے مشاعرے میں شریک ہو کر لاہور پہنچا، وہاں چند دن نشاط ہوٹل میں قیام کیا۔ سر شیخ عبدالقادر، خورشتر گرامی، ایڈیٹر "بیسویں صدی"، سردار بیدھی سنگھ ایڈیٹر "مست قلندر" اور ماہنامہ ادب لطیف اور مکتبہ جدید کے مالک کے یہاں دعوتیں ہوئیں مگر آخر الذکر دعوت میں شریک نہ ہو سکا جس کا بڑا قلق رہا۔ ایک ایسی ہی مجبوری پیش آگئی تھی جس پر مجھے رنگین نظم کہنی چاہیے تھی ——— لاہور کی سیر و تفریح کے بعد علی گڑھ آیا اور کئی دن پروفیسر عبدالعزیز پوری کے بنگلے میں مہمان رہا، وہ مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے اور مسلم یونیورسٹی میں وقتی پروفیسر بھی۔ راقم الحروف اور مسٹر پوری ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے ہائی اسکول سے چپراسی بھاگا ہوا آیا کہ ہوسٹل کے طلبہ نے ڈائننگ روم میں شور مچا رکھا ہے۔ نعرے لگا رہے ہیں اور بعض نے تو کھانے کی رکابیاں توڑ دی ہیں۔ پوری صاحب نے اُسی وقت تانگہ منگایا اور مجھ سے کہا آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس ہنگامے میں میرے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ بولے نہیں آپ چلیے! تانگے کا گھوڑا خاصا تیز تھا اور پوری صاحب کے کہنے پر تانگہ والے نے ایک دو چابک بھی رسید کر دیے، اب تو گھوڑا فراٹے بھرنے لگا۔ ہم چند منٹ

میں ہائی اسکول کے ہوسٹل میں پہنچ گئے۔ مسٹر پوری نے گرجدار آواز میں تقریر کی۔ لڑکوں کو دھمکایا کہ ڈسپلن کی خلاف ورزی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ میں تمام طلبہ کو ہوسٹل سے رخصت کرکے ہوسٹل میں تالے ڈال دوں گا، پھر لہجہ بدل کر شفقت آمیز انداز میں فرمایا، میں تو اپنے بچو! تم پر ناز کرتا ہوں، آج تم نے یہ کیسا مظاہرہ کیا۔ مسلمان بھلا روٹی سالن پر لڑا کرتا ہے......!

طلبہ نے کہا اچھا آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر مگر آپ ماہرالقادری کا کلام ہمیں سنوا دیجیے، میں نے کئی غزلیں سنائیں، برہمی اور تکدر کی وہ فضا ہی بدل گئی۔ تھوڑی دیر میں طاہری تیار ہوکر طلبہ کے سامنے پلیٹوں میں آنے لگی۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے پوری صاحب نے فرمایا: "ماہر صاحب! دیکھا میں تمہیں کس مقصد سے لے کر آیا تھا......"

اس واقعے کے دوسرے دن معلوم ہوا کہ ن، م، راشد صاحب دلی سے علی گڑھ آئے ہوئے ہیں اور ریڈیو کے لیے بعض پروفیسروں کے پروگرام بک کر رہے ہیں۔ وہ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پروگرام پروڈیوسر تھے۔ دوپہر میں مسٹر پوری نے انہیں کھانے پر بلایا تھا۔ ن، م، راشد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ زبان وادب کے مسائل پر کھانا کھاتے میں گفتگو رہی۔ اُن کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ ذہن وفکر الجھے ہوئے ہیں۔

علی گڑھ کے بعد لاہور اور کراچی کی بعض دعوتوں اور ادبی نشستوں میں انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وقت گزر گیا فاصلے بڑھتے گئے۔ ن، م، راشد کے بارے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ کہاں ہیں؟ اور کیا کر رہے ہیں، بس اتنا سننے میں آیا کہ پاکستان سے باہر ملازم ہیں اور تنخواہ ہزاروں روپے ماہوار ہے۔

پھر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں اخبار جنگ میں خبر پڑھی کہ اُن کا انتقال ہوگیا مگر اُن کی وصیت پڑھ کر جو اذیت ہوئی ہے اس کا لفظوں میں اظہار نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص جو نسلاً مسلمان گھرانے میں پلا بڑھا، نام نذر محمد، وہ مرنے سے پہلے وصیت کرتا ہے کہ دفن کرنے کی بجائے اس کی لاش کو آگ میں جلایا جائے......! حالانکہ مرتے وقت تو بڑے بڑے کٹر منکروں اور آزاد خیالوں کو توبہ تلا کرتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع

ہوتے دیکھا گیا ہے!

ن م راشد آنجہانی نے مرنے اور ہندوؤں کی ارتھی کی طرح کریا کرم سے چند مہینے پہلے جو نظم کہی تھی وہ یہاں درج کی جاتی ہے:

بات کر ——— بات کر مجھ سے ——— مجھے چہرہ دکھا میرا کہ ہے
تیری آنکھوں کی تمازت ہی سے جھلسا ہوا
میرے رُخ سے ہٹا پردہ
کہ جس پر ہے ریا کاری کے رنگوں کی دھنک پھیلی ہوئی،
وہ دھنک جو آرزومندی کا آئینہ نہیں
تو نے دیکھا تھا کہ کل (میں ایک گداگر)
صبح کی دیوار کے سائے تلے ٹھٹھرا ہوا پایا گیا،
تیری آنکھیں تیرے لب تکتے رہے
ان کی گرمی پر یقیں کیسے مجھے آتا کہ میں
اپنے دل کے حادثوں کی تہہ میں تھا
یا دوں سے غز لایا ہوا
بات کر مجھ سے ——— کہ اب شب کے سحر بننے میں کوئی فاصلہ باقی نہیں
بات کر مجھ سے کہ تیری بات
خطِ نسخ ہو میرے روئے مرگ
اب اتر جا چشم و گوش و لب کے پار
اجڑے شہروں کی گزرگاہوں آوازوں کی قندیلیں آمار
راز کی لہریں اتر آئیں قطار قطار (روزنامہ جنگ لندن ۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

ن م راشد کی اس قبیل کی یہ بے سر و پا نظمیں شاعری ادب فکر و خیال اور اظہار و ادا بلکہ خود اردو زبان کے ساتھ دردناک مذاق ہیں! ن م راشد کی بے تکی نظموں نے اردو شاعری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیا۔ خدا کرے اس وبا سے اردو کے شعرا محفوظ رہیں! اُن کے مجموعۂ کلام "مادرا" کے جواب میں فرقت کاکوروی نے "ناروا" لکھی جو نہایت دلکش "پیروڈی" ہے۔ (ماہنامہ "فاران" دسمبر ۱۹۷۵ء)

ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی

شعر کہنے اور شعر سمجھنے کا جب تھوڑا بہت شعور پیدا ہوا، اس وقت میری عمر بہت سے بہت تیرہ چودہ سال کی ہو گی، اُسی زمانہ میں حضرت نوح ناروی کا کلام رسالوں میں پڑھا، اُن کے نام کے ساتھ "جانشینِ داغ" لکھا جاتا تھا۔ یہ نسبت میرے لیے مرعوب کن بھی تھی اور محبوب و پسندیدہ بھی!

سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ کا ایک مشہور قصبہ ہے، وہاں سال کے سال بڑی دھوم دھام سے شاعرہ ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شعراء کسی معاوضے اور نذرانے کے بغیر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور دو چار شاعروں کو چھوڑ کر، باقی حضرات تو اپنی گرہ سے ریل کا کرایہ خرچ کر کے مشاعروں کو گرماتے تھے۔

ہاں! تو جن دنوں (۱۹۲۶ء) میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا، اُسی سال سکندرہ راؤ کے مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا، حضرت نوح ناروی کے دیکھنے کا شوق وہاں کھینچ کر لے گیا، مگر اُن کے آنے کی خبر "افواہ" نکلی، وہ وہاں نہیں آئے! اُس نواح کے مشہور شعراء میں تین استادوں (دلیر مارہروی، طیش مارہروی اور اختر فیروزآبادی) کو اس مشاعرے میں سُنا حضرت دلیر مارہروی کی عمر ستر سے کیا کم ہو گی، مگر ترنم میں وہ سوز، دل کشی اور گرمی تھی کہ سننے والے سچ مچ دل تھام کر رہ جاتے تھے۔ جوان بیٹے کی موت نے دلیر مرحوم کے کلام اور آواز میں اور زیادہ درد اور سوز پیدا کر دیا تھا اُن کے یہ شعر آج تک یاد ہیں ؎

جو خون دل میں تھا، وہ مری چشمِ تر میں ہے
اے ضبط! روکنا کہ ابھی گھر کے گھر میں ہے

پہلے ہی خاکِ دل تھی مری فخر کائنات
اب پوچھنا ہی کیا کہ تری رہگذر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اُسے عمر بھر میں ہے!

زمانہ گزرتا گیا، راقم الحروف کی شعر فہمی اور شعر گوئی کا معیار بھی مشق و مطالعہ

کے ساتھ بلند ہوتا اور نکھرتا چلا گیا۔ بدوِ شعور اور آغازِ شباب میں علم و سیاست اور شعر و ادب کی جن شخصیتوں سے متاثر ہوا تھا، اُن کے بارے میں بھی رائے پہلی جیسی نہیں رہی! انفعال و تاثر کے یہ پہلے نقوش کچھ اور زیادہ ابھرے، کچھ دھندلا گئے، اور بعض مٹ گئے۔

پھر وہ دَور بھی آ گیا کہ میں خود شہر شہر مشاعروں میں جانے لگا، آج مدراس میں مشاعرہ پڑھا، پرسوں بمبئی میں اور اس کے تیسرے دن بعد کھڑک پور (بنگال) میں! یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا، مگر حضرت نوحؔ ناروی مرحوم سے ملاقات نہیں ہوئی، ہاں! اُن کے شاگرد سکھ دیو سہلاؔ بسمل الہ آبادی کو کئی مشاعروں میں سُنا، وہ ازراہِ عقیدت اپنے استاد کی مدح میں ایک دو رباعیاں اور قطعے ضرور پڑھتے تھے!

حضرت نوحؔ ناروی سے علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں سب سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ یہ غالباً ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے، یہ ملاقات بہت ہی سرسری سی تھی، مشاعرے کے اسٹیج پر طویل ملاقات کا کہاں موقع تھا! اس کے بعد حضرت سائلؔ دہلوی مرحوم کے دولت کدے پر دلی میں حضرت نوحؔ ناروی مرحوم سے نہ صرف ملاقات بلکہ طویل صحبتیں رہیں! سائلؔ اور نوحؔ میں بڑا یارانہ اور بھائی چارہ تھا، ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے اور ساتھ ہی ادب و احترام کے حدود کا بھی پورا لحاظ رکھتے! یہ وضعداری اب عنقا ہوتی جاری ہے۔

حضرت سائلؔ مرحوم مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے، حیدرآباد دکن میں اُن سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا، یہ اب سے پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ نواب نثار یار جنگ بہادر مزاجؔ مرحوم، جو حضرت داغؔ سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے، مجھے سائلؔ مرحوم کی قیام گاہ پر لے کر گئے۔ پہلی ملاقات ہی میں دل نے اُن سے قربت محسوس کی، فرمایا جب وطن کی طرف آنا ہو، تو دلی میں میرے یہاں قیام کرنا۔

۱۹۴۸ء میں میرا دلی جانا ہوا، میں تانگہ میں سامان رکھے ہوئے، قاضی حوض کے آس پاس حضرت سائلؔ مرحوم کا، مکان پوچھ رہا تھا آگے بڑھ کر گلی کے نکڑ پر ایک خوش رو نوجوان ملا، وہ مجھے سائلؔ صاحب کے یہاں پہنچا آیا —— یہ نوجوان صاحبزادہ جمیل الدین عالیؔ تھے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ کے لگ بھگ تھی، مسیں بھیگ

رہی تھیں اور ــــــــ بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

حضرت سائل مرحوم کے یہاں چھ سات دن قیام کیا۔ اُن کی بیگم صاحبہ مجھ سے پردے سے بات چیت کرتی تھیں، اُن کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کی لذت آج تک یاد ہے، کس خلوص و شفقت کے ساتھ میزبانی فرمائی، حضرت سائل مرحوم نام کے نہیں دل کے نواب تھے، گرمی میں برف کا پانی پیتے، تو اُس میں گلاب حل کیا جاتا، بعض اوقات مجھے خاصے کے اس پانی کا گلاس مرحمت کرتے ہوئے فرماتے:

"ماہر! میں ہر کسی کو یہ پانی نہیں دیتا، تجھے دے رہا ہوں تجھے ......"

نوح ناروی مرحوم کا ذکر چلا تو اُن کے استاد بھائی سائل دہلوی کی بھی یاد آگئی، حضرت نوح ناروی سے میری کئی مفصل ملاقاتیں حضرت سائل دہلوی ہی کے یہاں ہوئیں! ایک بار انھوں نے جوانی اور پیری کے عنوان پر اپنی رباعیاں سنائیں! بعض رُباعیاں تو خیام اور سرمد کی رباعیوں سے ملتی جلتی تھیں ــــ ان کی غزلوں کے رنگ سے بالکل مختلف!

دھولیا، صوبہ مہاراشٹر کا ایک ضلع ہے، وہاں کے مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا، حضرت نوح ناروی کے شاگرد حافظ دھولیوی (مرحوم) تھے۔ اُن کے شاگردوں کا سلسلہ اُس نواح میں پھیلا ہوا ہے، اس رشتے اور نسبت سے وہ اپنے دادا استاد (حضرت نوح) کا عزت و احترام پیروں کی طرح کرتے تھے۔ نہایت ادب کے ساتھ عقیدت مندوں کا ایک ہجوم اُن کے اردگرد بیٹھا رہتا ــــ اس مشاعرہ کا یہ لطیفہ میں بھولنا چاہوں تو بھی نہیں بھول سکتا: ــــــ

مشاعرہ اپنے شباب پر تھا، رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ اناؤنسر صاحب نے مائیکروفون ہاتھ میں پکڑ کر اعلان فرمایا:-

"حضرات! مشاعرہ دس منٹ کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے، کیونکہ ناخدائے سخن فصیح العصر جانشینِ داغ حضرت قبلہ نوح ناروی مدظلہٗ استنجا کرنے جا رہے ہیں۔"

یہاں یہ حال کہ ہنسی کا ضبط کرنا مشکل تھا، اور وہاں سامعین میں سے کسی کے ہونٹوں پہ

مسکراہٹ تک نہیں آئی، وہ لوگ اس قسم کے اعلانات سننے کے عادی ہوں گے۔

بمبئی میں پنجاب مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے بڑے شاندار پیمانے پر "یوم اقبال" منایا جاتا تھا تین دن کا پروگرام ہوتا! پہلے دن مذاکرہ، دوسرے دن قوالی، تیسرے دن مشاعرہ! جو شعرا مترنم ہیں، زیادہ تر انہیں کو بلایا جاتا، یوم اقبال کمیٹی کی ایک غیر رسمی گفتگو میں حضرت نوح ناروی کا ذکر چھڑا، بعض نے کہا کہ وہ تحت لفظ پڑھتے ہیں۔ میں بیساختہ بول پڑا کہ ان کا تحت لفظ مشاعرے میں رنگ جما دیتا ہے، آپ ان کو ایک بار بلا لیجئے تو سہی! یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے، حضرت نوح ناروی مرحوم کو دعوت دی گئی، وہ تشریف لائے اور مشاعرے پر چھا گئے۔

کراچی سے جب میں نے "فاران" نکالا، تو ان کی خدمت میں عریضہ گزرانا کہ اپنے استاد داغ کے حالات اور ان کی "اصلاحوں" پر کوئی مضمون مرحمت فرمایئے، انھوں نے اس کے جواب میں اپنی کئی غزلیں بھیج دیں اور مجھے خط میں لکھا:

"..... علی گڑھ کی پہلی ملاقات میں آپ کو جتنا مغرور پایا، اس کے بعد کی ملاقاتوں میں اتنا ہی ملنسار پایا ......"

شروع شروع میں ان کے خطوط کئی کئی مہینے کے وقفے سے میرے نام آتے رہے، پھر یہ وقفہ مہینوں سے بڑھ کر برسوں تک پہنچ گیا، آخر میں وہ آنکھوں سے معذور ہو گئے، تو اپنے کسی شاگرد اور عزیز سے خط لکھوا تے! میں نے ان سے "سر میں خاک ڈالنا" اور "سر پر خاک ڈالنا" کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ "فاران" میں چھپ چکا ہے! بس یہ ان کا آخری خط تھا، اس خط کے ساتھ ایک طویل غزل بھی بھیجی، جس کی ردیف —— بارہ مہینہ تیس دن —— تھی!

نوح ناروی، استاد داغ دہلوی کے محبوب اور مخصوص شاگرد تھے، حیدرآباد دکن میں مہینوں استاد کے یہاں جا کر رہتے اور ان کی صحبت سے استفادہ کرتے، حضرت احسن مارہروی کی طرح غالباً خطوط نویسی کی خدمت بھی ان سے متعلق تھی!

حضرت نوح کی شاعری زبان، روزمرہ اور معاملہ بندی کی شاعری ہے جس میں سادگی کے ساتھ بڑی گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ ان کے شعر پڑھنے کا انداز اتنا دل کش تھا کہ بڑے بڑے گلے باز شاعروں کی کور ان سے دبتی تھی۔ ان کے "تحت لفظ" کا یہ کمال تھا کہ اس قسم کے شعروں:

ایک، دو تین چار پانچ نہیں — سب خطائیں عمر کی معاف کرو

ہاتھ رکھنے سے کہیں دردِ جگر جاتا ہے — ہاتھ رکھنے سے نہیں دردِ جگر جاتا ہے

سے وہ مُشاعروں میں دھوم مچا دیتے!

نوحؔ ناروی مرحوم نہ صرف شاعر بلکہ شاعر گر تھے، نہ جانے کتنوں کو اپنے فیضِ اصلاح سے "اُستادِ سخن" بنا دیا، شاعر ہونے کے علاوہ وہ مشرقی تہذیب تمدن کا نمونہ اور یادگار تھے۔ چال ڈھال، بات چیت اور اٹھنے بیٹھنے میں شائستگی اور وقار پایا جاتا تھا۔ گھر کے خوشحال زمیندار تھے، ہزاروں رُوپے سالانہ آمدنی تھی، شاعر ہونے کے باوجود محتاط اور جُز رس تھے۔ اس لیے مالی طور پر کبھی پریشان نہیں رہے! پوری زندگی اطمینان اور خوشحالی کی فضا میں بسر ہوئی!

ایک مہینہ سے بھی کچھ اوپر دن ہونے کو آئے، ایک دن صبح کے وقت میرے چھوٹے بھائی (مسرور) نے مجھے بتایا کہ ابھی ابھی آل انڈیا ریڈیو سے نوحؔ ناروی کے انتقال کی خبر اور اُن کی زندگی کے حالات نشر ہوئے ہیں! اس کے کئی دن بعد پاکستان کے اخباروں میں اُن کی وفات کی خبر شائع ہوئی، پھر مرحوم کے نواسے کا یہ خط ملا:

محترم۔ السلام علیکم! —— ۱۰ اکتوبر ۶۲ء کی منحوس شام کو پونے سات بجے ہم لوگوں کو ایک زبردست صدمے سے دوچار ہونا پڑا یعنی قبلہ نانا نوحؔ ناروی مرحوم نے اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اس صدمۂ جانکاہ کی تلافی کسی طور ممکن نہیں، دل بیٹھا جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں، لیکن چونکہ مرحوم کو جناب سے خاص تعلق تھا، اس لیے آپ کو خاص طور سے مطلع کر رہا ہوں۔

غمزدہ سُہیلؔ ناروی —— از نارا ضلع الٰہ آباد ۱۲ اکتوبر ۶۲ء

سچ تو یہ ہے: ——

موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ، کل ہماری باری ہے

مقامِ عبرت ہے کہ کشتیٔ نوحؔ بھی گرداب میں آگئی اور موت کے طوفان نے ناخدائے سخن کی زندگی کے سفینہ کو بھی غرق کر کے چھوڑا، اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے، یہ وہ لوگ تھے —— کہ

؎ اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

نہالؔ سیوہاروی

اگر ہے احساسِ جیبِ دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

اور

مرے بغیر کہاں اُن کی گرمیٔ محفل
بہ طورِ خاص بلایا گیا فغاں کے لیے

(نہالؔ سیوہاروی)

نہالؔ سیوہاروی مرحوم کا نام "عبدالخالق" تھا، یہ بات اُن کے مرنے کے بعد معلوم ہوئی، تخلص کی شہرت نے اُن کے اصلی نام کو چھپائے رکھا، اور اُن کی موت نے شاید سب سے پہلی بار اس پردے کو اٹھایا۔ موت پردہ کشا بھی ہوتی ہے اور پردہ پوش بھی!

نہالؔ مرحوم اور میں ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے تھے، کلام اور مضامین کے ذریعہ، مگر یہ بالواسطہ تعارف اور غائبانہ شناسائی تھی، ہم دونوں کی سب سے پہلی ملاقات دلی میں ہوئی، سنہ تو ٹھیک طرح یاد نہیں رہا، مگر یہ اب سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ حکیم آزادؔ انصاری مرحوم بھی اس ملاقات میں شریک تھے اور شریک کیا تھے، اس ملاقات کی "تقریب" خود اُن کی ذات تھی!

وہ نوجوان جن کے ادبی شعور کی عمر دس بارہ سال سے زائد نہیں ہے، حکیم آزادؔ انصاری کے نام پر غالباً چونکیں گے کہ یہ کون صاحب ہیں؟ افسوس ہے کہ اُردو دُنیا نے آزادؔ انصاری کو اتنی جلد بھلا دیا، اور بھلایا بھی تو اس طرح بھلایا جیسے اس نام کا کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

اب سے پندرہ بیس سال پہلے اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا موقر اور سنجیدہ رسالہ ہو جس میں حکیم آزادؔ انصاری کا کلام نہ چھپتا ہو، گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک علمی خانوادہ سے آزادؔ کا نسبی تعلق تھا، مولانا الطاف حسین حالیؔ سے تلمذ تھا، درسِ نظامی متوسط کتابوں

تک پڑھا تھا، صاحبِ نظر شاعر تھے، نظم اور غزل دونوں اصناف پر قدرت رکھتے تھے،
یہ شعر انھی کا ہے : شاید تمھیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں
تجھ سے دغا کرے تو خدا سے دغا کرے

آزاد انصاری کی غزلوں کا مجموعہ —— معارفِ جمیل —— حیدر آباد دکن میں انھی کی زندگی میں شائع ہوا تھا، نظموں کے مجموعہ کا نام "معارفِ جلیل" رکھا تھا جو افسوس ہے کہ چھپنے سے رہ گیا، اور اب کیا چھپے گا، جبکہ آزاد اردو داں دنیا کے حافظہ کی کمزوری کا شکار ہو گئے۔

جوش ملیح آبادی سے حکیم آزاد انصاری کی خوب گہری چھنتی تھی اور جوش صاحب نے اُن کی صحبتوں سے علمی اور فنی استفادہ کیا ہے۔ "غزل" کے خلاف جوش ملیح آبادی کی سرکردگی میں جب ہنگامہ بپا ہوا تو آزاد انصاری نے دوستانہ تعلقات تہہ کر کے رکھ دیے اور "غزل" کی پرجوش حمایت کی، انھوں نے غزل کے مخالفین کو "نمک حرامانِ غزل" کہا اور یہ لفظی ترکیب اور طنز بہت پسند کی گئی۔

نہال سیوہاروی کے حکیم آزاد انصاری سے بہت گہرے تعلقات تھے اس لیے ایک دوست کا ذکر نکلا تو دوسرے دوست کا ذکر بھی بیساختہ زبانِ خامہ پر آ گیا —— ہاں! تو نہال، آزاد انصاری اور راقم الحروف کی یہ ملاقات چائے نوشی کے بعد شعر خوانی پر ختم ہوئی! یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب میں حیدر آباد دکن میں رہتا تھا، اور مشاعروں کے سلسلے میں دلّی آنا جانا ہوتا تھا، دکن چھٹا تو چند مہینے بمبئی رہا اور پھر دلّی میں سکونت اختیار کر لی۔

نہال مرحوم سے دلّی میں اکثر ملنا ہوتا تھا، اردو بازار میں شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ نگارستان، امین کا ہوٹل اور مولوی سمیع اللہ کی دکان، شاعروں کے یہ تین اڈے تھے۔ کبھی کبھی شام کو ایڈورڈ پارک میں بھی جماؤ ہو جاتا —— یا پھر خواجہ محمد شفیع دہلوی کی "اردو مجلس" ایک دوسرے کی ملاقات کا سب سے زیادہ آسان اور یقینی ذریعہ تھی —— نہال سیوہاروی محکمہ ریلوے کے دفتر میں ملازم تھے، شام کو دفتر سے آتے تو اُن کی بغل میں دفتر کی بہت سی فائلیں دبی ہوتیں، جس کی زندگی دانش گاہوں اور علمی اداروں میں بسر ہونی چاہیے تھی قسمت نے اُسے دفتر میں پھینک دیا تھا، اس کی ساری

جوانی دفتر ہی کی نذر ہو گئی۔ پاکستان میں نہال کی قدر دانی کی توقع تھی، مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی، یہاں "صوبہ پرستی" کا کابوس قلب و دماغ پر سوار ہے، نذر الاسلام کے لیے سب کچھ ہو رہا ہے مگر نہال سیوہاروی کو کسی نے پوچھا نہیں یہاں تک کہ وہ بیچارہ سول اسپتال کے جنرل وارڈ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ — حالانکہ نذر الاسلام کی شاعری کا جتنا ترجمہ میری نگاہ سے گزرا ہے، اُس کے مقابلے میں نہال سیوہاروی کا کلام ذرا بھی دبتا ہوا نظر نہیں آتا، کسی کو شبہ ہو تو موازنہ کر کے دیکھ لے۔

نہال سے اچھی خاصی بے تکلفی تھی اور دلّی میں ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن تو ملاقات ضرور ہی ہو جاتی تھی، لیکن نہ اُن کا مکان مجھے معلوم تھا اور نہ وہ میرے گھر کو جانتے تھے، چار پانچ سال کی مدت میں بس وہ ایک دن ڈھونڈتے ہوئے شورہ کوٹھی (سبزی منڈی) پہنچے، دوپہر کا وقت تھا، دروازہ پر کسی نے دستک دی، میں نے کواڑ کھول کر دیکھا تو نہال سیوہاروی نظر آئے۔ اُن کے ساتھ دو تین اور آدمی بھی تھے، کمرے میں بیٹھتے ہی بولے کہ یہ ہمارے دفتر کے لوگ ایک مشاعرہ کر رہے ہیں، تمھیں ضرور شریک ہونا پڑے گا، میں نے اس کے جواب میں کچھ کہا ہی تھا کہ نہال قدرے مسکرا کر بولے۔ —
" اُس بات کا انتظام کر لیا گیا ہے، میں نے ان لوگوں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ماہر معاوضہ کے بغیر شریک نہ ہو گا ..... " وہ لوگ تو کمرے ہی میں بیٹھے رہے، میں نے اور نہال نے گلی میں پہنچ کر بات چیت کی، تخلیہ کی ضرورت تھی، ایک رقم طے ہو گئی، اور معینہ تاریخ پر ریلوے کے مشاعرے میں شریک ہوا، صدر بازار (دہلی) کے پُل کے قریب پنڈال میں مشاعرہ کا انتظام تھا، مشاعرہ خاصا کامیاب رہا۔

کراچی میں نہال مرحوم سے دلّی کی طرح جلد جلد ملنا نہ ہوتا تھا، پھر بھی ہفتہ دو ہفتے کے بعد کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی۔ وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے، ترنم کی تو اُن کو ہوا بھی نہ لگی تھی، "تحت لفظ" بھی ٹھیک طرح پڑھنا نہ آتا تھا، کلام کی بلندی اور دلکشی اُن کے پڑھنے کے انداز کی کمزوری پر غالب آ جاتی۔

مشاعروں میں عام طور پر گلے باز قسم کے شاعروں کی پوچھ ہوتی ہے اور نہال کو قدرت نے پوری فیاضی کے ساتھ شاعر تو بنایا تھا مگر "موسیقار" نہ بنایا تھا اس لیے مشاعروں میں اُن کو کم ہی دیکھا گیا۔ اب سے ڈیڑھ سال پہلے راولپنڈی میں "کل پاکستان مشاعرہ"

میں منتظمین مشاعرہ نے کراچی سے نہال مرحوم کو بلا کر حقیقت میں جوہر شناسی کا ثبوت دیا، وہاں تین دن تک میرا اور اُن کا ساتھ رہا۔

جب نہال سیوہاروی دلی میں تھے تو نوجوان لکھے پڑھے بیٹے کی موت کا صدمہ سہنا پڑا، کوئی دوسرا اُن کی جگہ ہوتا تو اس کی کمر ٹوٹ جاتی مگر نہال کا دل غم کے اس پہاڑ کو سہہ گیا۔ اُن کی زندگی آسودہ حالی سے بہت ہی کم آشنا رہی —— اور شاید نہ بھی رہی ہو، میں نے اُن کے جسم پر اچھا لباس کبھی نہیں دیکھا۔ سادگی اُن کی فطرت تھی اور شکستہ حالی اُن کا مقدر! وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اور چہرے پر ربودگی ہر وقت چھائی رہتی، بات کرنے کا ایک خاص انداز تھا، نیا آدمی اُن کے اندازِ کلام اور طرزِ ادا کو دیکھ کر مسکرا دیتا، مگر اُن کے دوست آشنا اور شناسا اُن کی باتوں کے خوگر ہو چکے تھے اور اُن کی گفتگو میں لطف اور دلچسپی لیتے تھے۔

مجھے ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ نہال بیمار ہیں اور ہسپتال میں اُن کا علاج معالجہ ہو رہا ہے۔ اس اطلاع کے شاید دوسرے یا تیسرے دن اُن کی علالت کی خبر اخبار میں پڑھی۔ ایک دن شام کو مغرب کی نماز کے بعد سید شبیہ الحسن صاحب بختیاری بیرسٹر اور میں دونوں سول ہسپتال پہنچے۔ گیٹ کیپر نے ہمیں دروازے پر روکا، اور اس کا روکنا مناسب تھا، مگر منت سماجت پر اُس کا دل پسیج گیا اور ہمیں جانے دیا، اندر پہنچ کر سب سے پہلے انکوائری آفس کا رُخ کیا، وہاں مریض کے نام کا سوال کیا گیا، ہم نے کہا مریض کا نام تو ہمیں معلوم نہیں ہے، اُن کا شاعرانہ نام "نہال" ہے۔ رجسٹر میں یہی نام (تخلص) لکھا ہوگا، اس آفس میں ایک شناسا بھی مل گئے، اُن کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی۔ پھر ہم دونوں اپنے شناسا کے ساتھ مریضوں کے جنرل وارڈ میں پہنچے، جہاں "شبابِ انقلاب" کا مصنف ایک پلنگ پر، سُرخ رنگ کا کمبل اوڑھے ہوئے لیٹا تھا اور اُسے دوا پلائی جا رہی تھی۔ منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ یہ بسترِ مرگ پر لیٹے ہوئے مریض کی آوازیں تھیں جن کو دردناک ہونا ہی چاہیے تھا۔

دوا پلائی جا چکی تھی تو ہم دبے پاؤں اس طرح کہ چاپ سنائی نہ دے، نہال مرحوم کے پلنگ کے پاس پہنچے، اور اُن کی پٹی کے قریب کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمیں پہچان نہ سکے، پھر میں نے اور بختیاری صاحب نے اپنے اپنے نام بتائے۔ اس کے جواب میں "اچھا، اچھا"

کہا، شاید ہوش و حواس میں عدم اعتدال کی کیفیت پیدا ہو چلی تھی ——— رات کے وقت مریضوں کے جنرل وارڈ میں جانے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ در و دیوار پر اداسی اور حسرتناک سکوت چھایا ہوا تھا، کسی گھر میں ایک مریض ہوتا ہے تو گھر کی فضا بدل جاتی ہے اور یہاں تو چاروں طرف مریض ہی مریض دکھائی دیتے تھے!

پھر ہم نے "وارڈن" سے گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ ان کی حالت کل بہت ابتر ہو گئی تھی آج نسبتاً بہتر ہے مگر یہ خطرے سے باہر نہیں ہوئے، بہت سے امراض جمع ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہر مریض آپ کی یکساں توجہ کا مستحق ہے۔ ہم کسی امتیازی سلوک کا مطالبہ نہیں کرتے بس اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ یہ مریض شعر و ادب کی امانت ہے وارڈن نے اس پر دوا کی ایک شیشی دکھائی اور کہا کہ میں ابھی ابھی بازار سے یہ دوا چالیس روپے میں مول لے کر آیا ہوں ——— ہمارے جو کچھ امکان میں ہے وہ کر رہے ہیں۔

نہال کا یہ آخری دیدار تھا، تیسرے دن صبح کو روزنامہ "جنگ" میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی، اور اخباروں میں اب تک ان کی تعزیت کی اطلاعیں چھپ رہی ہیں، مگر جانے والا جا چکا، ساری دنیا کی سینہ کوبی بھی اُسے واپس نہیں لا سکتی۔ موت ہر جاندار کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے، اس سے مفر نہیں، سب اسی منزل کے مسافر ہیں۔ بس آگے پیچھے کی دیر ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کہ حیٔ و قیوم اور دائم و باقی ہے۔ ہر چیز فنا پر آمادہ ہے، آدمی اس زندگی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا، ہر کوئی دنیا جہان کی شہرتیں، عزتیں اور مال و دولت اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے! خواہشوں اور تمناؤں کی کوئی انتہا نہیں، ایک تمنا پوری ہوتی ہے تو دوسری آرزو فوراً ہی سامنے آ کھڑی ہوتی ہے کہ اب میرے لیے تگ و دو کیجیے! آدمی اس چکر سے مرتے دم تک نکل نہیں پاتا ——— مگر موت آتی ہے تو ساری تمنائیں، عزتیں اور شہرتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ دنیا کی عزت، شہرت اور مال و دولت کے انبار سے ایک تنکا بھی آدمی کے ساتھ نہیں جاتا۔ ہر چیز دنیا ہی میں چھوٹ جاتی ہے، ہاں! اعمال اور صرف اعمال ساتھ جاتے ہیں۔

بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی، جس کا ایک شعر تھا:

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

آبرو اور تندرستی کے ساتھ اللہ سے یہ بھی دعا کرنی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے ـــــ ہم نہال مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا عجز و نیاز بھی پیش کرتے ہیں اور نفس کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۵۲ء)

جناب نیاز احمد (سی ایس پی)

یہ اب سے چودہ برس پہلے یعنی سنہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے، جب سرگودہا میں بڑے دھوم کا مشاعرہ نیاز احمد مرحوم کے ایما سے بلکہ ان کی زیرِ سرپرستی ہوا تھا، ان دنوں مرحوم وہاں کے ڈپٹی کمشنر تھے، اس مشاعرے کے چند ماہ بعد اپنے ایک عزیز سے ملنے کے لیے سرگودہا میرا جانا ہوا، تو انہوں نے ایک شب کھانے پر مجھے بلایا، کھانے کے بعد شعر و شاعری کا دَور بھی رہا، مجھے کسی صاحب کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نیاز صاحب غالباً جونپور کے رہنے والے ہیں، حفیظ جون پوری کی اس غزل کے سننے کے بعد جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ۔۔۔ ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ ۔۔۔ صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے

اُن کا دیوان پڑھنے کا بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ نیاز مرحوم سے میں نے ذکر کیا تو انہوں نے دیوانِ حفیظ مجھے مطالعے کے لیے دیا جسے میں نے رات کی رات پڑھ کر انہیں واپس کر دیا۔

نیاز احمد مرحوم سے پھر دعوتوں، مشاعروں اور پارٹیوں میں ملنا ہوتا رہا، حیدرآباد (سندھ) میں جب وہ کمشنر تھے تو مسلسل تین سال تک اُن کے اہتمام سے شاندار مشاعرے ہوئے، پاکستان کے گوشے گوشے سے ایک ایک چیدہ اور مشہور شاعر چُن چُن کر بلایا جاتا، مشاعرے میں کوئی ٹکٹ نہیں، مشاعرہ گاہ کا وہ پُرشکوہ منظر جیسے شاہانہ دربار لگا ہوا ہے، مشاعرے کے دوسرے دن کمشنر ہاؤس میں عصرانہ اور مخصوص بزمِ شعر و سخن برپا ہوتی، اور کئی گھنٹے ہنسی خوشی کی باتیں اور لطفِ صحبت رہتا۔

تقریباً ڈیڑھ سال ہوا جب اُن سے آخری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی، کل پاکستان مشاعرے کے بعد ان کے بنگلے پر بھی ایک شام شاعروں کے ساتھ منائی گئی، یہ نشست ہر اعتبار سے کامیاب رہی۔

چند مہینے قبل پاکستان کی ایک کمپنی کے مشہور بحری جہاز "الشمس" میں ڈنر تھا، اس میں ان کی بیگم صاحبہ بھی شریک تھیں، کھانے کے بعد شاعری کا دَور شروع ہوا،

بیگم صاحبہ کی فرمائش اور اصرار پر میں نے کئی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔

——— اور پھر ———

کچھ مہینے گزر جانے کے بعد ایک دن صبح سویرے روزنامہ "جنگ" جو کھولا تو پہلے ہی صفحہ پر کار کے حادثہ سے جناب نیاز احمد اور اُن کی بیگم صاحبہ کی ہلاکت کی خبر پڑھی — خبر نہیں سانحہ، المیہ، یا اللہ یہ کیا ہوا؟ مگر اس سوال کا جواب کون دیتا ایسی صدا کی بازگشت بھی نہیں آیا کرتی! دونوں میاں بیوی اپنی کار میں پشاور سے راولپنڈی آ رہے تھے، راستے میں دو لاریوں نے اُن کی کار کو ٹکر دی، نیاز صاحب تو اُسی وقت جاں بحق ہو گئے بیوی زخمی ہو کر کار سے باہر گر پڑیں اور بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال پہنچتے پہنچتے انہوں نے بھی دم توڑ دیا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ ڈرائیور زندہ سلامت رہا، اُس کے چوٹ تک نہیں آئی۔

نیاز احمد مرحوم انگریزی دَور کے آئی، سی، ایس تھے، بے حد ذہین، علم دوست، سخن فہم اور شاعر نواز! راقم الحروف سے برابر کے دوستوں کی طرح بے تکلفی کے ساتھ ملتے! اب سے گیارہ بارہ سال پہلے صوبائی عصبیت کا ایسا چکر چلا کہ نیاز احمد مرحوم کو بھی اس کی جھپٹ لگ گئی اُن پر یہ الزام لگایا گیا کہ (Loose talk) کے عادی ہیں مگر اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے وہ بہت جلد اس چکر سے نکل گئے، ڈپٹی سیکرٹری اور کمشنری کے عہدوں کے بعد اب وہ ڈیڑھ سال سے ریونیو بورڈ کے رکن تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ (ریحانہ نیاز) شعر بھی کہتی تھیں اور افسانے بھی لکھتی تھیں، دونوں میاں بیوی خوش ذوق اور شعر و ادب سے بے حد بے نہایت شوق و دلچسپی بلکہ شغف رکھنے والے! مستقبل کے بارے میں تمناؤں کے نہ جانے کتنے تاج محل اور آرزوؤں کے کتنے شالا مار انہوں نے ذہن و فکر میں مرتب کیے ہوں گے، آرزو اور اُمید کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا ——— مگر موت نے زندگی کی بچھی بچھائی بساط کو دم بھر میں الٹ دیا، اس سانحہ کی اطلاع ملتے ہی ان کے بڑے بھائی جناب محمد شعیب وزیر خزانہ موقع واردات پر پہنچے مگر اب کیا ہو سکتا تھا موت اپنا کام پورا کر چکی تھی ——— جنازے میں صف اوّل کے عہدیداروں کے ساتھ خود صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں بھی شریک تھے، عہدیداروں کی بیماری اور موت کی خبریں سننے اور پڑھنے میں آتی رہتی ہیں اور بات خبر و

اطلاع نے آگے بڑھنے نہیں پائی مگر نیاز احمد مرحوم کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ متعدد ادبی اداروں اور قومی انجمنوں نے اُن کا سوگ منایا ہے۔ جگہ جگہ اسی سانحے کے چرچے اور افسوس و ملال کا اظہار! اُن کی موت کو کئی ہفتے ہو چکے ہیں مگر اخباروں میں برابر مضامین اور تصویریں آ رہی ہیں! مرحوم جس مقام پر بھی تعینات رہے وہاں اپنی کارکردگی، فرض شناسی، ذہانت علم دوستی اور ادب نوازی کا نقش چھوڑ آئے! اُن کی موت عام و خاص سب کے لیے اور خاص طور سے خواص کے لیے مرقعِ عبرت ہے کہ قضائے الٰہی کے سامنے ہر کوئی بے بس ہے، موت کا فرشتہ محافظ فوجی دستوں سے گزرتا ہوا فولادی قلعوں میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ جس کسی نے اقتدار و اختیار کو لازوال سمجھا اور اسی نشے میں سرشار رہا وہ بڑے دھوکے اور ٹوٹے میں رہا، موت کا دھیان آتا ہے اور آخرت کی بازپرس کا احساس کھٹکتا رہے تو اقتدار رحمت بن جاتا ہے، موت آخرت اور خوفِ خدا سے غفلت ہوئی تو پھر اقتدار جور و ستم کے طرح طرح کے روپ دھارتا ہے! اور دنیا ایسے آخرت ناشناس اور خدا فراموش اقتدار سے پناہ مانگنے لگتی ہے۔

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۶۴ء)

نیاز فتحپوری

میری عمر بہت سے بہت تیرہ چودہ سال کی ہوگی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ نیاز صاحب کی ایک دو نظمیں رسالوں میں میری نگاہ سے گزری تھیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں رسالہ نگار کے دو چار شمارے کسی کے یہاں پڑھنے کو مل گئے، مضامین کی ترتیب و تنوع اور ایڈیٹر کے اندازِ نگارش نے وجدان و طبیعت کو چونکایا۔ اس زمانہ تک میرا مطالعہ انتہائی محدود تھا، اس سے پہلے کانپور کے ماہنامہ" زمانہ" بدایوں کے" نقیب" و" نقاش" اور رسالہ آباد کے رسالہ" ادیب" کے چند شمارے پڑھ چکا تھا! یہ وہ دور تھا کہ کسی ادیب انشا پرداز کی تحریر میں —— علیٰ قدر مراتب، شعلۂ مشتعل، مابہ الاشتراک، علیٰ وجہ البصیرت —— جیسی ترکیبیں نظر آتیں تو ذہن مرعوب ہو جاتا۔ ۱۹۲۴ء میں قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر کے شاعر عاشق ڈبائوی صاحب نے مجھ سے اردو کے کسی رسالہ کی خریداری کا مشورہ کیا، تو میں نے چھوٹتے ہی" نگار" کا نام بتایا اور وہ" نگار" کے خریدار بن گئے۔

۱۹۲۸ء میں سب سے پہلی بار حیدر آباد دکن جانا ہوا، وہاں دار المطالعے بھی تھے، آصفیہ لائبریری بھی اور گشتی کتب خانہ بھی! مطالعہ کی کوئی حد و نہایت نہ رہی، جو کتاب بھی مل گئی اُسے پڑھ ڈالا۔ رسالہ نگار بھی نگاہ سے گزرتا رہا۔ یہ تقریباً وہ زمانہ ہے جب نیاز فتحپوری نے بڑی شدت کے ساتھ" مولویوں" اور" مولاناؤں" پر طعن و طنز کی شدید بوچھار شروع کر دی تھی۔ اس طنز کا دوسرا قدم" اسلامی فقہ" کا مذاق اڑانا اور بعض دینی معتقدات بلکہ مسلّمات کو مجروح کرنا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن شام کے وقت مہاراجہ سرکشن بہادر یمین السلطنت صدرِ اعظم حکومتِ حیدر آباد کے دربار میں ہوش بلگرامی[1]، نیاز صاحب کا وہ مضمون مزے لے لے کر سنا رہے تھے، جس میں" جنّت" کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

---

[1] ناظر الحسن نام تھا ہوشؔ تخلص۔ بلگرام کے رہنے والے تھے اور اپنے نام کے ساتھ" سیّد"

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(غالباً) ۱۹۳۰ء میں نیاز صاحب کو میں نے زندگی میں سب سے پہلے خط لکھا، خط

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لکھتے تھے، بڑی بذلہ سنج اور ظریفانہ طبیعت پائی تھی، دربارداری کے فن میں طاق! کئی سال نواب حامد علی خاں والئ رام پور کے مصاحب رہے، پھر حیدرآباد دکن میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر اور دوسرے امرا کے درباروں میں اپنی بذلہ سنجی کے سبب باریابی اور قرب حاصل کیا۔ نیاز فتحپوری سے بڑا یارانہ تھا، نیاز صاحب کو بارہا حیدرآباد بلایا، اور امرا سے ہزاروں روپیہ دلوایا۔

ناظر الحسن ہوش بلگرامی نے حیدرآباد دکن سے ماہنامہ "ذخیرہ" نکالا جو کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا، اس ماہنامہ کا خاصا بلند معیار تھا، پھر ہوش صاحب کے لیے ناظم پیشہ (پوسٹ ماسٹر جنرل) کے دفتر میں سیونگ بینک کے انسپکٹر کی خاص طور سے پوسٹ بنائی گئی۔ دو سو روپے ماہوار کے قریب تنخواہ تھی، مگر اس زمانے میں وہ جتنے ٹھاٹ سے رہتے اور سواری کے لیے فٹن رکھتے! ماہانہ مصارف پانسو روپے سے کیا کم ہوں گے! ہوش صاحب کے ٹھاٹ باٹ کا ایک محفل میں ذکر آیا تو مولانا مفتی عبدالعزیز بدایونی مرحوم نے بڑے مزے اور تیقّن کی بات کہی لطیفے کے طور پر آج تک بیان کی جاتی ہے کہ ــــــ "ہوش صاحب کو قرضہ کی خاصی آمدنی ہے!"

مہاراجہ سرکشن پرشاد کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر اور راجہ دھن راج گیر کے یہاں سے بھی ہوش صاحب کو "مالی فتوحات" ہو جاتیں۔ اس کے بعد وہ محکمۂ فوج میں مددگار معتمد (ڈپٹی سیکرٹری) ہو گئے۔ اور کئی سال بڑی محنت اور قابلیت کے ساتھ سرکاری فرائض انجام دیئے، سینکڑوں صفحوں کی پرانی مسلوں (فائلوں) کا خلاصہ چند صفحوں میں کر دیتے، نواب صمد یار جنگ بہادر جو محکمہ فوج کے سیکرٹری (معتمد) تھے۔ ہوش صاحب کی دفتری کارگزاری، سنجیدہ تحریر اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر تھے۔

نواب اعظم جاہ بہادر اور نواب معظم جاہ بہادر کی نئی نئی شادیاں ہوئی تھیں اور وہ بارغِ عدن کے پابند ماحول کی بجائے "بلادستا" کی آزاد فضا میں رہنے لگے، ہزاروں روپے ماہوار کی تنخواہیں مقرر ہوئیں۔ ہوش بلگرامی بھی ان کے یہاں حاضری دینے لگے اور سنا ہے کہ "تعارف و باریابی" کا آغاز "کھانوں" سے ہوا۔ ہوش صاحب کو انواع و اقسام کے اچھے سے اچھے کھانے پکوانے کا بڑا شوق اور تجربہ تھا۔ شاہزادوں کے یہاں ہوش بلگرامی نے طرح طرح کے لذیذ و نفیس کھانے بھجوائے، اس کی خبر نواب میر عثمان علی خاں والئ دکن کو بھی ملی۔ حضور نظام کے ایما پر ہوش صاحب ایک دن کھانوں کے خوان کنگ کوٹھی مبارک میں لے کر حاضر ہوئے، کھانوں سے زیادہ ہوش صاحب کی بذلہ سنجی نظامِ دکن کو پسند آئی اور اس دن سے وہ روزانہ دربارِ شاہی میں حاضری دینے لگے ــــــ تمام درباریوں اور مصاحبوں میں نظامِ دکن

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لکھنے کی تقریب میری ایک "نظم" تھی، جو میں نے "نگار" میں چھپنے کے لیے ان کی خدمت میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کے سب سے زیادہ مزاج شناس ہوش بلگرامی تھے۔ اس لیے شاہانہ عتاب کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قدرت نے اس شخص کو درباداری کے لیے ہی شاید پیدا کیا تھا۔ فرماں روائے دکن نواب میر عثمان علی نے جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا معائنہ کرنے کے لیے سفر کیا تو اس سفر میں ہوش بلگرامی اُن کے ہم رکاب تھے، اس سفر کی رُوداد انہوں نے روزنامہ "رہبر دکن" میں چھپوائی۔ اُن کے مضامین کی ترتیب و تسوید میں مشہور شاعر علی اختر مرحوم کے قلم کو بہت کچھ دخل تھا ــــ علی اختر مرحوم سے ہوش بلگرامی کے گہرے تعلقات تھے، محکمہ تعمیرات میں ہوش صاحب ہی کی سعی و سفارش سے وہ مددگار معتمد (ڈپٹی سیکرٹری) بنے۔ تنخواہ ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ جناب جوش ملیح آبادی سے ہوش بلگرامی کی صفائی نہ تھی۔ نیاز فتحپوری نے جوش صاحب کے کلام پر "نگار" میں جب مفصل تنقید کی تو یہ تک لکھ دیا کہ علی اختر بھی جوش صاحب سے اچھا کہتے ہیں۔

ہوش بلگرامی کو خسروِ دکن نے پھر "ہوش یار جنگ" کا خطاب عطا فرمایا اور وہ محکمہ تعمیرات کے (سیکرٹری) ہوگئے۔ اب وہ دفتری امور میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ سارا کام علی اختر صاحب پر چھوڑ رکھا تھا، علی اختر صاحب انتہائی دیانت دار تھے مگر ہوش صاحب کے شاہانہ مصارف کے لیے مزید آمدنی کی ضرورت تھی، صرف تنخواہ میں نوابی ٹھاٹ باٹ کے لیے کہاں پورا پڑسکتا تھا۔

دربارِ شاہی میں تقرب کے سبب ہوش بلگرامی کی شخصیت بڑی ممتاز سمجھی جاتی تھی، بعض لوگ پیٹھ پیچھے ہوش صاحب کو چاہے "درباری مسخرہ" کہتے ہوں مگر سامنا ہوتا، تو جھک کر ملتے، سر اکبر حیدری ہوں یا نواب صاحب چھتاری اور غلام محمد صاحب (گورنر جنرل پاکستان، جو حیدرآباد میں وزیر مالیات تھے) ہوں یا کوئی اور بڑے عہدہ دار ہوش صاحب کی دعوتوں میں ان کی دل دہی کے لیے تمام اکابر و عمائد شریک ہوتے اور ان سے ربط و تعلق قائم رکھتے۔ ایک چھوڑ چار بیویاں، نفیس کوٹھی، دیدہ زیب فرنیچر، شاندار موٹر، چاندی کے پان دان سے لے کر موٹر کار کے قالین تک ہر چیز میں انتہا درجہ کی صفائی اور سلیقہ! راقم الحروف سے ہوش صاحب کی خاصی بے تکلفی تھی، اپنی ہر چیز کی تعریف کرنے اور سننے کا شوق تھا، ایک دن مجھ سے کہنے لگے ــــ ماہر صاحب! یہ جو میرے مکان کی صدر محراب ہے، اکثر امریکی سیاح اس کے فوٹو لے گئے ہیں۔

ساحل بلگرامی مرحوم ہوش صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، شہر حیدرآباد کی بلدیہ (کارپوریشن) میں ہوش صاحب نے ٹیکس کی وصولیابی کا انسپکٹر لگوا دیا تھا، ٹھکانے سے رہتے تو بڑی ترقی پاتے، مگر وہ دو تین ہزار روپے کا غبن کر کے حیدرآباد سے فرار ہو گئے، یہ رقم بعد میں ہوش صاحب کو بھرنی پڑی۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھیجی تھی۔ اس کے جواب میں اُن کا کارڈ حیدرآباد دکن کا لکھا ہوا میرے نام آیا کہ آپ کی نظم خوب ہے، نگار میں چھپے گی، آپ مجھ سے ہوشؔ بلگرامی صاحب کے یہاں آکر ملیے! کارڈ ملنے کے دوسرے دن میں اُن سے جاکر ملا، ملے تو وہ تپاک کے ساتھ مگر اُن کا اندازِ ملاقات بتا رہا تھا کہ وہ دیر آشنا اور کم آمیز واقع ہوئے ہیں۔ انہیں دنوں مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے یہاں طرحی مشاعرہ ہوا، جو بلی ہل پر اُن کے نو تعمیر بنگلہ میں! حسنِ اتفاق سے حضرت ناطقؔ لکھنوی مرحوم بھی حیدرآباد آئے ہوئے تھے، نیازؔ فتحپوری اس مشاعرے میں شریک ہوئے مگر انہوں نے غزل نہیں پڑھی، سب سے اچھی غزل ناطقؔ صاحب کی رہی دو شعر یاد رہ گئے ہیں:

اس اہتمام سے مجھ کو فلک وقار کیا ۔۔۔ جلا کے خاک کیا، خاک کو غبار کیا
یہ دو سبب ہوئے اے دل تری تباہی کے ۔۔۔ کہ اس نے وعدہ کیا تو نے اعتبار کیا

میری غزل کا بس یہ شعر کچھ غنیمت تھا:

دلِ حزیں! تری سب زہد کوشیاں معلوم
جو کوئی بس نہ چلا، صبر اختیار کیا[1]

میری نظم "تتلی" کے بعد ماہنامہ "نگار" میں میرا کلام وقتاً فوقتاً چھپتا رہا (غالباً)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) حکومت حیدرآباد کے زوال کے بعد ہوشؔ بلگرامی نے بھارت کے نیتاؤں کی خوشنودی کے لیے ایک کتاب لکھی جس میں حضور نظام جو اُن کے مربی اور محسن تھے، اُن پر خوب پھبتیاں کسیں اور قصر و ایوان کی پردے اور راز کی باتوں کو قلم کے ذریعہ منظرِ عام پر لائے! مگر اس کتاب نے ہندوستان کے اربابِ اقتدار کے یہاں بار پانے اور رسائی حاصل کرنے میں ہوشؔ صاحب کی مدد نہیں کی۔

ہوشؔ بلگرامی کا انتقال ایسے عالم میں ہوا کہ وہ اپنی پچھلی قدر و منزلت کے آثار ڈھونڈتے تھے مگر کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

[1] ـــــــــــ اس نظم کو بھیجتے ہوئے میں نے نیازؔ فتحپوری کو لکھا کہ تتلی اور تیتری دونوں طرح بولا اور لکھا جاتا ہے۔ آپ جس لفظ کو پسند فرماتے ہوں، نظم کا "عنوان" بنا دیں! انہوں نے "تیتری" پسند کیا۔ دلّی میں بھی زیادہ تر "تیتری" ہی بولا جاتا ہے مگر میں "تتلی" کو صوتی لطافت اور نغمگی کی بنا پر ترجیح دیتا ہوں اور اس "ترجیح" پر مجھے اصرار ہے! میری ایک دوسری نظم کا ایک شعر ہے۔

ہواؤں میں اڑتی ہوئی تتلیاں ۔۔۔ پلک مارتے میں یہاں سے وہاں

۱۹۴۰ء میں نیاز صاحب حیدر آباد آئے ہوئے تھے، ان سے ملنا ہوا تو بولے کہ آپ کی ایک نظم پر نگار میں تنقید آرہی ہے! میں نے عرض کیا کہ اگر تنقید میں کچھ باتیں محلِ نظر ہوئیں تو کیا ان پر بحث و گفتگو کو آپ نگار میں شائع فرمائیں گے، بولے، ضرور ضرور ۔۔۔۔ اسی لیے تو تنقید کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ چند ماہ کے بعد میرا احمد آباد (گجرات) جانا نکل آیا۔ وہاں ایک مشاعرہ تھا، ایک صاحب نے مجھے اُس مہینے کا نگار لاکر دیا جس میں میری نظم پر "مالہ ما علیہ" کے تحت نیاز صاحب نے تنقید فرمائی تھی، یہ تنقید پڑھی تو مجھے بڑی حیرت ہوئی بعض اعتراضات بالکل سطحی بلکہ غلط تھے۔ مثلاً میں نے "بادہ ہائے ناب" نظم کیا تھا۔ اس پر نیاز صاحب نے یہ اعتراض وارد کیا کہ "بادہ ناب" کی جمع نہیں آتی۔ میں نے اس کے جواب میں غالب کی "مسلسل غزل" کا یہ مصرعہ ثبوت میں پیش کیا:

وہ بادۂ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اسی طرح بعض دوسرے اعتراضات کا دلیل کے ساتھ جواب دیا گیا مگر نیاز صاحب نے میرا یہ خط نگار میں شائع نہیں فرمایا۔ میں نے یاد دہانی بھی کی لیکن شنوائی نہیں ہوئی۔ آخرکار ماہنامہ "شاعر" میں جو اُن دنوں آگرہ سے نکلتا تھا، میں نے اپنا یہ خط چھپوا دیا۔

نیاز صاحب سے میرے مراسم بس اسی حد تک تھے کہ میں نے کوئی نظم یا غزل اُن کے

لہ مہاراجہ سرکشن بہادر کی ایک مثنوی ہے، جس میں اکبر یا جہانگیر میں سے کسی ایک بادشاہ کا واقعہ نظم کیا گیا ہے۔ رواداری اور ہندو مسلم اتحاد، اس نظم کا مرکزی تخیل ہے۔ اس نظم کی فلم بنانے کے لیے ایک کمیٹی قائم ہوئی اور ہوش بلگرامی کے مشورے اور سفارش سے نیاز فتحپوری کو اس کا مکالمے لکھنے کے لیے حیدرآباد دکن بلایا گیا، تنخواہ غالباً ساڑھے تین سو روپے ماہوار قرار پائی۔ رہنے کے لیے مکان اس کے علاوہ! نیاز صاحب نے کئی مہینے بلدہ حیدرآباد میں قیام کیا۔ نگار کے کاتب کو بھی انہوں نے لکھنؤ سے حیدرآباد بلا لیا تھا مگر یہ فلم تھوڑی سی بن کر رہ گئی۔ (یہ سنہ ۱۹۴۰ء سے آٹھ سال قبل کا واقعہ بیان کر رہا ہوں)

علی اختر مرحوم اور میں شام کے وقت اکثر نیاز صاحب کی قیامگاہ پر جایا کرتے تھے، ایک دو گھنٹے تاش کا شغل رہتا، نیاز صاحب کو تاش سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ہماری خاطر وہ کھیل میں شامل ہو جاتے اور "کٹ تھروٹ" میں بار بار غلطیاں کرتے۔ یہ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے، حضرت فانی بدایونی سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات نیاز صاحب کی قیام گاہ پر ہوئی۔ ہوش بلگرامی اُنہیں مہاراجہ کشن پرشاد کے یہاں سے اپنی کار میں لے کر آئے تھے۔

یہاں چھپنے کے لیے بھیج دی اور انہوں نے رسید کے طور پر خط لکھ دیا..... اپنے رسالہ میں مالہ و علیہ کے تحت انہوں نے میری کتنی غزلوں اور نظموں پر تنقید فرمائی اور ثاقب کان پوری کی ایک غزل پر تنقید کرتے ہوئے اس کا اعلان کیا کہ میں ان شاعروں کے کلام پر تنقید کرتا ہوں جن کو اپنے نزدیک بلند پایہ صفِ اوّل کا شاعر سمجھتا ہوں (الفاظ ٹھیک طرح ذہن میں محفوظ نہیں ہے مفہوم یہی تھا۔)

پاکستان بننے کے (غالباً) چار پانچ سال بعد نیاز صاحب یہاں تشریف لائے اور "پاک و ہند مشاعرے" کی صدارت فرمائی۔ جگر، جوش، فراق، حفیظ جالندھری جیسے مشاہیر شعراء اس مشاعرے میں شریک تھے۔ انہیں دنوں نیاز صاحب نے اپنے تمام دانت نکلوا دیے تھے، جس کے سبب وہ بوڑھے نظر آتے تھے حالانکہ صحت اچھی تھی اور قویٰ ایسے تھے جیسے ادھیڑ عمر والے کے ہوتے ہیں! ان دنوں یہ اطلاع بھی کئی محفلوں میں سننے میں آئی کہ اس وقت کی حکومت نیاز صاحب کو پاکستان اس غرض سے بلانا چاہتی تھی کہ یہاں آکر وہ دیندار اہلِ قلم اور اسلام پسند دانشوروں کے توڑ پر "آزاد خیالی اور تجدد" کا رنگ پیدا کریں گے مگر نیاز صاحب نے لمبے چوڑے مطالبے اور شرطیں پیش کیں، جس کے سبب معاملہ بیٹھ نہ سکا، یہ بھی سننے میں آیا کہ حکومت کو بعض مشیروں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ نیاز صاحب دینی حلقوں میں بدنام ہیں، اُن کے لکھے ہوئے مضامین اس بنیاد پر زیادہ کارگر نہ ہو سکیں گے!

اس مشاعرے کے بعد وہ اپنے عزیزوں سے ملنے اور ساتھ ہی یہاں کے ماحول اور فضا کا جائزہ لینے کے لیے ایک دو بار آئے، بشیر فاروقی صاحب کے ——— یہاں ان کے اعزاز میں ایک بزمِ مشاعرہ برپا ہوئی، میں نے بھی اس میں شرکت کی پھر وہ ۱۹۶۲ء میں مستقل طور پر پاکستان آ گئے، یہاں ان کی جو پذیرائی ہوئی وہ اُن کی توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی، کئی اداروں سے اُن کا قلمی تعلق تھا، ماہانہ آمدنی تین ہزار روپے سے کیا کم ہوگی، سب سے زیادہ فائدہ اُنہیں نیشنل بنک پاکستان کے ناظمِ اعلیٰ جناب ممتاز حسن کی ذات اور واسطے سے پہنچا، ممتاز صاحب بڑے علم دوست اور اہلِ علم کے قدر دان واقع ہوئے ہیں اور خود بھی صاحبِ علم و فضل ہیں! نیاز صاحب کو اس کا ملال تھا کہ پاکستان بہت پہلے وہ کیوں نہیں آ گئے۔

لکھنؤ میں وہ عام طور پر مشاعروں اور جلسوں میں شرکت سے گریز ہی کرتے تھے۔

مگر کراچی کی متعدد ادبی و شعری نشستوں میں انہیں دیکھا گیا۔ دو ایک جگہ انہوں نے اپنے شعر بھی سنائے، ان کی غزل پر جس کا ایک شعر یہ ہے:

چشم تر ہے اس طرف اور اس طرف ابرِ بہار
دیکھنا ہے آج کس سے، کتنا رویا جائے ہے

ایک نشست میں بہت داد لی! اعجاز صدیقی صاحب مدیر "شاعر" (بمبئی) کراچی تشریف لائے، تو ایک ادبی محفل میں ان کی مدح میں نیاز صاحب نے ایک نظم پڑھی! پاکستان میں آکر ان کی خلوت پسندی اور کم آمیزی میں "جلوت" کا خاصا رنگ پیدا ہو گیا۔

پاکستان میں مالی فراغت اور ہر طرح کے آرام و راحت سے وہ پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائے تھے کہ "کینسر" جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے، قیمتی سے قیمتی علاج جو کراچی میں ممکن ہو سکتا تھا اور میسر آسکتا تھا ہوا، مگر مرض بڑھتا ہی چلا گیا، ایک سال سے حالت بہت غیر تھی ہسپتال میں داخل ہوئے آپریشن ہوا جسے بہت کامیاب بتایا گیا، ان کے احباب اور قدر دان "جشنِ صحت" کا اہتمام کر رہے تھے، مگر یہ افاقہ دراصل "سنبھالا" نکلا۔ اور اسی مرض نے آخرکار، انہیں اس دنیا میں پہنچا دیا، جس کے بارے میں مظفر علی اسیر لکھنوی نے فرمایا ہے:

مُردہ سنتا ہی نہیں چلا کے روتے ہیں عزیز
دم میں کتنا فاصلہ اللہ اکبر ہو گیا

اخباروں، رسالوں، ادیبوں اور شاعروں نے ان کی تعزیت کی اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی، یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے!

اعتراف

جناب نیاز فتحپوری کے قلم نے نصف صدی سے بھی زائد مدت تک زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم ہیں۔ افسانہ، شاعری، تنقید، جنسیات، مذہب، معاشرت، معاشیات، سیرت و تذکرہ غرض زبان و ادب کی ہر صنف میں ان کی قلمکاری کے نمونے ملتے ہیں، یہ دلیل ہے ان کے مطالعہ کی وسعت اور ذہانت و ہمہ گیری کی! ان کا رسالہ نگار پاکستان اور ہندوستان کے صفِ اوّل کے مجلّوں میں شمار کیا جاتا ہے، کیسے کیسے شاندار "خاص نمبر" اس رسالہ کے شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہوئے ہیں۔ "نگار" کو دبستانِ فکر و ادب سمجھ کر بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ لکھتے وقت نیاز کا

بڑے سے بڑا مخالف بھی اُن کے نام اور کام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ نگار کے "نیاز نمبر" میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور ادیبوں اور انشا پردازوں نے نیاز کو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا، ہندوستانی حکومت نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ "پدم بھوشن" کا اعزاز دیا۔

نیاز فتحپوری کی خانگی زندگی مطمئن اور خوش گوار تھی، معاش و اقتصاد کے معاملات میں خاصے محتاط تھے، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے۔ ان میں انتظامی قابلیت بھی تھی اس لیے رسالہ "نگار" اور اس کی مطبوعات سے انہیں ہمیشہ فائدہ ہی ہوا۔ راگ رنگ، شراب، کباب اور اس قسم کے دوسرے کھیڑوں کی جانب اُن کے مزاج و طبیعت کا میلان نہ تھا۔ کتابوں کا مطالعہ اور تحریر و انشا ہی اُن کی سب سے بڑی تفریح اور دلچسپی کا سامان تھی! لکھنؤ رئیسوں نوابوں اور تعلقداروں کا شہر ہے مگر نیاز صاحب نے اپنی ابلا شہرت کو اُن کے یہاں باریابی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا! اپنی قوتِ بازو پر ہمیشہ اعتماد کیا اور قلم کے ذریعہ روزی کمائی! اور چین آرام کی زندگی بسر کی۔

دوسرا رُخ

نیاز فتحپوری دنیا کے شاید پہلے اور ممکن ہے آخری انشار پرداز ہوں[۱] جن کی تصنیف و تالیف کی حیثیت بہت مشتبہ ہے! یا اُن پر اہلِ نقد و نظر نے "نقل و سرقہ" کے الزامات لگائے ہیں اور اُن الزامات کی صحت کے لیے ثبوت پیش کیے ہیں۔ اُن کی کتاب "تاریخ الدولتین" مشہور مستشرق جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال (مصر) کی عربی تاریخ "التمدن الاسلامی" کی جلد چہارم کی تمام تر تلخیص ہے، اُن کی "صحابیات" دارالمصنفین کی "سیرت الصحابیات" کا چربہ ہے "ترغیباتِ جنسی" (۱۹۳۲ء کے نگار کا سالنامہ جو "شہوانیات" سے متعلق تھا) میں پورا مواد ایلیس سے حاصل کیا مگر اس نقل و استفادہ کا ذکر نہیں فرمایا ۔۔۔ اسی طرح اُن کی بعض دوسری کتابوں اور مضامین میں اس قسم کا توارد ملتا ہے جسے "سرقہ" کہا جائے، تو یہ کوئی خلافِ واقعہ یا مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی۔ جب میرا حیدرآباد دکن میں قیام تھا، تو جامعہ عثمانیہ کے ایک ایم۔اے کے طالب علم نے مجھ سے ذکر کیا کہ ۔۔۔

---

[۱] نیاز صاحب ایک سال سے صاحبِ فراش تھے مگر اس مدت میں اُن کے نام سے اُن کے مضامین برابر چھپتے رہے!! یہ "راز" بھی تحقیق طلب ہے۔

"میں نے ایک افسانہ ماہنامہ نگار میں چھپنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کی رسید تک نیاز صاحب نے نہیں بھیجی، یاد دہانی کی، اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا، ڈیڑھ دو سال کے بعد میرا وہی افسانہ تھوڑے بہت تغیر کے بعد نیاز صاحب کے نام سے "نگار" میں شائع ہوا....."

۱۹۵۶ء میں مجلّہ نگار کا سالنامہ "خدا نمبر" کے نام سے منظرِ عام پر آیا اور ادبی حلقوں میں اس کی بڑی دھوم مچ گئی تھی اس "خاص شمارے" کی ترتیب و تدوین کی داستان جناب محمد اسحاق صدیقی سے سنئے، جو ماہنامہ "فروغِ اردو" لکھنؤ کے اکتوبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

کچھ نگار کے "خدا نمبر کے بارے میں

اردو کے مشہور اور معتدر جریدوں میں نگار کا جو مقام ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۲۲ء سے حضرت نیاز فتحپوری کی ادارت میں جاری ہے جو اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ درجنوں علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں جنہیں ان کے تبحرِ علمی کی بنا پر علّامہ کہا جاتا ہے اور جنھیں حکومتِ ہند نے اپریل ۱۹۶۲ء میں اُن کے علمی و ادبی خدمات سے متاثر ہو کر سب سے بڑا ادبی اعزاز "پدم بھوشن" عنایت کیا تھا لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور عالم میں جو علمی دیانت داری ہونی چاہیے وہ نہیں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ہفتہ وار "سرفراز" (لکھنؤ) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا "علّامہ کیسے بنتے ہیں"[1] جس میں علامہ نیاز فتحپوری کے ادبی سرقوں کی متعدد مثالیں پیش کی گئی تھیں۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اُن کا دامنِ شہرت زیادہ داغدار نہ ہونے پائے اور اس کے لیے میں نے حضرت نیاز سے اُن کے کراچی جانے کے بعد خط و کتابت بھی کی لیکن افسوس کہ انہوں نے مجھ ناچیز کی درخواست کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا، اس لیے مجھے مجبوراً اس حقیقت کو ظاہر کرنا پڑ رہا ہے جسے میں نے اب تک ظاہر نہیں کیا تھا۔

حضرت نیاز فتحپوری عرصے سے ہر سال اپنے رسالہ "نگار" کا ایک خصوصی شمارہ بطور سالنامہ پیش کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء کا سالنامہ "خدا نمبر" تھا جس میں عہدِ وحشت سے

---

[1] مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۶۳ء

عہدِ حاضر تک مختلف مذاہب میں خدا کے تصور کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ نمبر تمام تر اس خاکسار نے درجنوں کتابوں کے مطالعے کے بعد نیاز صاحب کی فرمائش پر تیار کیا تھا اور نیاز صاحب نے پہلے اس کا تحریری طور پر اعتراف بھی کیا تھا۔ لیکن بعد میں انھوں نے مختلف (اور مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "ناپسندیدہ") طریقوں سے اُسے اپنا لیا اور میری ساری محنتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ سب کیسے ہوا، اس کا جاننا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

نگار کے سالنامہ ۱۹۵۶ء "خدا نمبر" لکھنے سے پہلے میرے حسبِ ذیل مضامین نگار میں شائع ہو چکے تھے:

(۱) آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا...... جون سے اگست ۱۹۴۷ء تک

(۲) اظہارِ اعداد کے طریقے زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک..... اگست سے دسمبر ۱۹۵۱ء تک۔

(۳) مذہبِ عالم کی تخلیق اور قطبِ شمالی (نامکمل)...... اگست سے نومبر ۱۹۵۲ء تک۔

(۴) پیدائشِ عالم اور اساطیری روایات کا تقابلی مطالعہ..... دسمبر ۱۹۵۲ء

(۵) فنِ تحریر کی تاریخ (نامکمل)...... جون سے نومبر ۱۹۵۳ء تک

جولائی سے دسمبر ۱۹۵۴ء تک

مارچ سے اکتوبر ۱۹۵۵ء تک

اگر اسے خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ نیاز صاحب میرے مضامین سے بہت متاثر تھے، اسی لیے ۱۹۵۵ء میں جب انھوں نے "خدا نمبر" نکالنے کا ارادہ کیا تو ساری ذمہ داری میرے سپرد کرنا چاہی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن میں اس نمبر کی تیاری کے سلسلے میں نیاز صاحب کی خواہش پر انھیں امیر الدولہ پبلک لائبریری (لکھنؤ) لے گیا اور انھیں وہ تمام کتابیں دکھائیں جن سے اس سالنامے کی تیاری میں مدد مل سکتی تھی۔ ان میں سے بیشتر کتابیں کتبِ محفوظہ (RESERVED) تھیں۔ کتابوں کی کثیر تعداد کو دیکھ کر اور اُن سے مفید مطلب معلومات اخذ کرنے میں جو غیر معمولی محنت کرنا پڑتی اُس کے پیشِ نظر نیاز صاحب کو "خدا نمبر" نکالنے میں تامل ہوا اور بولے ! مجھ سے بڑھاپے میں اتنی محنت نہیں ہو سکتی کیونکہ[1]

---

[1] نیاز صاحب کا سنہ پیدائش ۱۸۸۴ء ہے اور میرا ۱۹۲۹ء گویا وہ مجھ سے عمر میں ۴۵ سال بڑے ہیں۔ جب میں نے نگار کا "خدا نمبر" ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا اُس وقت نیاز صاحب کی عمر ۷۱ سال تھی اور میری ۲۶ سال۔

آکر سب کتابیں پڑھوں اور اتنے باریک ٹائپ کی۔ اگر آپ اس کام کا پورا ذمہ لیں تو میں "خدا نمبر" نکالوں گا۔ ورنہ کوئی دوسرا نمبر نکالنے کے متعلق سوچوں گا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں، لیکن میری دو شرطیں ہیں ــــ ایک تو یہ کہ "خدا نمبر" رسالے کی صورت میں نیوز پرنٹ پر شائع نہ ہو بلکہ کتابی صورت میں اچھے سفید کاغذ پر شائع ہو اور دوسرے یہ کہ پوری کتاب میرے نام سے چھپے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پیش لفظ میں یہ لکھیں کہ " اگر اسحاق صدیقی میری مدد نہ کرتے تو شاید یہ سالنامہ منظرِ عام پر نہ آتا۔ ظاہر ہے کہ آپ مشہور ادیب ہیں آپ کی شہرت کے آگے میرا نام ماند پڑ جائے گا۔" نیاز صاحب اس پر راضی ہو گئے کہ پورا "خدا نمبر" میں مرتب کروں گا اور رسالے پر مرتب کی حیثیت سے میرا نام دیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ مجھے اس محنت کے لیے معقول معاوضہ بھی دیں گے البتہ انہوں نے "خدا نمبر" کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی کیوں کہ اس طرح لاگت زیادہ آتی اور نگار کے خریداروں کو بھیجنے میں ڈاک خرچ بھی زیادہ لگتا۔ بات معقول تھی اس لیے میں نے اس پر اصرار نہ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے نیاز صاحب سے جا کر کہا، " آپ نے لائبریری میں جو کتابیں دیکھی تھیں، وہ سب پرانی ہیں۔ یہ چند نئی کتابوں کی فہرست ہے ان کا خریدنا نہایت ضروری ہے تاکہ جدید ترین تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔" نیاز صاحب فہرست دیکھ کر خوش ہوئے اور بولے "ضرور منگوائیے" اور اُسی وقت سو روپے کا چیک لکھ کر دیا۔

میں نے ایک مقامی کتب فروش کے ذریعہ کتابیں منگوالیں اور مطالعے میں غرق ہو گیا۔ اب میرا روز کا یہ معمول تھا کہ دفتر کے بعد سیدھا لائبریری پہنچتا اور جب تک وہ بند نہ ہو جاتی مختلف کتابوں سے نوٹس تیار کرتا۔ مجھے امیر الدولہ پبلک لائبریری کے علاوہ رام کرشنا مشن آشرم (لکھنؤ) کے کتب خانہ سے بھی بڑی مدد ملی، جہاں ہندو مذہب کے متعلق کافی کتابیں تھیں۔ میں ان دونوں کتب خانوں سے گھر بھی کتابیں پڑھنے کے لیے لایا کرتا تھا۔ گھر آکر کھانے کے بعد رات گئے تک لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا اور صبح کو ۶ بجے سے ۹ بجے تک بھی لکھتا پڑھتا اس کے بعد کھانا کھا کر دفتر چل دیتا۔

سالنامے کی تیاری کے سلسلے میں پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مذاہب کی قدامت کے لحاظ سے عنوانات کی ایک فہرست مرتب کی اور پھر ہر مذہب پر سلسلہ وار متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرنا اور مضمون لکھنا شروع کیا۔ جب ایک عنوان پر مضمون تیار ہو جاتا تو وہ نیاز صاحب

کے حوالے کر دیتا اور وہ اُسے دیکھنے کے بعد کاتب کے حوالے کر دیتے۔ یہ سلسلہ آٹھ نو تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ "خدا نمبر" مکمل ہو گیا اور جب وہ شائع ہو گیا تو میں بڑی اُمیدوں کے ساتھ نیاز صاحب کے پاس پہنچا اور معاوضہ طلب کیا۔

میرا خیال تھا کہ اس شبانہ روز کی محنت کے لیے نیاز صاحب مجھے کئی سو روپے معاوضہ دیں گے کیونکہ وہ اس سے پہلے بھی نگار میں مضامین لکھنے کے لیے کئی سال سے خصوصی معاوضہ دیا کرتے تھے یعنی فی صفحہ ایک روپیہ (لیکن بقول نیاز یہ معاوضہ نہ تھا بلکہ جن نامساعد حالات میں میں کام کر رہا تھا، اُسے جاری رکھنے کے لیے میری مدد تھی) لیکن نیاز صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا: "معاوضہ کیسا؟ جو کچھ مجھے دینا تھا دے چکا" میں اپنے اُس وقت کے جذبات کو ٹھیک طور سے بیان نہیں کر سکتا لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے ایک ادیب اور عالم نہیں ہے بلکہ ایک سرمایہ دار ہے جو مزدور کو اُس کی مزدوری بھی نہیں دینا چاہتا۔ اُنھوں نے دورانِ گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ "معاوضہ تو آپ کو تب دیتا، جب "خدا نمبر" آپ کے نام سے شائع نہ ہوتا اس سے آپ کی کتنی شہرت ہوگی یہ سوچیے!" میرے اور ان کے درمیان اور کیا گفتگو ہوئی۔ اس کا ذکر نہایت تکلیف دہ ہے۔ اخیر میں انھوں نے کہا کہ "فی الحال میں باہر جا رہا ہوں اور وہاں سے واپسی پر کچھ اور دوں گا۔" اس کے کئی مہینے بعد جب میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے ۵۰/ روپے عنایت کیے لیکن یہ رقم پا کر میں اور بھی دل برداشتہ ہو گیا اور یہ طے کر لیا کہ آئندہ نگار میں کوئی مضمون نہ لکھوں گا۔ حالانکہ میرے بعض مضامین نامکمل تھے۔

نیاز صاحب نے نگار کے "خدا نمبر" کی کچھ فالتو کاپیاں بھی اس خیال سے چھپوالی تھیں کہ نگار کے مستقل خریداروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس خصوصی پرچے کو خریدنا چاہیں گے اور جیسے جیسے مانگ آتی رہتی تھی رسالے بھیجے جاتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ نیاز صاحب کے کاتب میرے پاس آئے اور بولے "آج شاید نگار کے "خدا نمبر" کی مانگ اور آئی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ "نگار" کی کاپیاں اندرونی سرورق پھاڑ کر بھیجی جا رہی ہیں۔ (اُس کے پہلے صفحہ پر میرا نام تھا اور دوسرے صفحہ پر نیاز صاحب کا تعارف جس میں میری بڑی تعریف تھی) معلوم نہیں کہ اس سے قبل جو کاپیاں خریداروں کو بھیجی گئی تھیں ان کا اندرونی سرورق پھاڑ دیا گیا تھا یا نہیں؟ لیکن آج تو میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ معاوضے کے سلسلے میں

آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کا مجھے افسوس ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ نیاز صاحب آپ کا نام مٹانے کے درپے ہیں اور یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں "خدا نمبر اُن کا لکھا ہوا ہے۔" میں نے ارادہ کیا کہ نیاز صاحب سے جاکر دریافت کروں کہ آخر یہ کیا حرکت ہے؟ لیکن کاتب صاحب[1] نے منع کر دیا۔ اُن کی روزی کا سوال تھا اس لیے میں نے بھی نیاز صاحب کے وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن کاتب صاحب کے بیان کی تصدیق کرنے کے لیے سوچا کہ کسی مقامی کتب فروش کے وہاں جاکر دیکھ آؤں کہ ان کے وہاں نگار کی جو کاپیاں بکنے کے لیے گئی تھیں شاید ان میں کچھ بچ گئی ہوں اور ان کا اندرونی سرورق پھٹا ہوا ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں ایک مقامی پبلشر اور بک سیلر "کتابی دنیا" (نظیر آباد) لکھنؤ کے یہاں گیا۔ نگار کی کچھ کاپیاں موجود تھیں۔ انہیں دیکھا، اندرونی سرورق غائب تھا۔ میں نے دریافت کیا: "یہ رسالے آپ نے کہاں سے منگوائے؟" بولے "کیوں؟ ظاہر ہے کہ نگار کے دفتر سے — جب میں نے وجہ بتائی تو انہیں نیاز صاحب کی حرکت پر سخت تعجب ہوا۔ میں نے ایک سالنامہ خرید لیا اور رسید پر لکھوا لیا۔ "پہلا ورق پھٹا ہوا" تاکہ ثبوت رہے[2]۔ اس کے بعد میں گھر چلا آیا لیکن نگار کی ان کاپیوں کو دیکھ کر مجھے جو ذہنی اذیت پہنچی ہوگی اور میرے قلب کی جو حالت ہوگی، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں بہرحال میں نے اپنے چند احباب سے اس کا ذکر کیا اور انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اخبار میں سارے واقعات لکھو لیکن باوجود اس امر کے کہ میرے ساتھ انتہائی زیادتی کی گئی تھی میری مروت نے اس اقدام کو پسند نہ کیا اور سوچا کہ ایک مشہور ادیب اور عالم کی شہرت کو داغدار کرنے سے کیا فائدہ، جو چیز میری ہے وہ میری رہیگی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نیاز صاحب سے جاکر ملتا اور اس بارے میں اُن سے گفتگو کرتا لیکن میں اُن کی نیت سمجھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اُن کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ یہ گفتگو نہ محض لاحاصل ہوگی بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ بات چیت کے دوران مزید بے لطفی پیدا ہو جائے۔

کچھ دنوں کے بعد نیاز صاحب سے نظیر آباد میں ایک کتاب کی دوکان "بک لورز کا رنر" پر ملاقات ہو گئی (جہاں وہ انگریزی ناولیں کرائے پہلے کر پڑھا کرتے تھے، اور میں پرانی کتابیں

---

[1] نیاز صاحب کے کاتب شہنشاہ حسین صاحب کو جو انہیں کے گھر میں بیٹھ کر نگار کی کتابت کیا کرتے تھے سارے واقعات معلوم تھے اور انہیں مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ [2] جن صاحبان کے پاس ایسے رسالے موجود ہوں اگر وہ مجھے مطلع فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

اور رسائل خریدنے کے شوق میں جایا کرتا تھا) میں نے سلام کرنا اپنا فرض سمجھا۔ پھر اِدھر اُدھر

کی باتیں ہونے لگیں۔ اس دکان پر دو چار بار پھر ان سے اسی طرح ملاقات ہوتی رہی۔ ایک
دن انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ "بہت دنوں سے آپ آئے نہیں؟" میں نے اُن سے اس
وقت بھی اصل سبب بتانا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ میں اُن کے یہاں حسبِ سابق آنے جانے
لگا۔ اس واقعے کے کئی سال بعد نیاز صاحب جب "پدم بھوشن" ہو کر ۱۹۶۲ء میں پاکستان
تشریف لے گئے تو میں ان سے خط و کتابت کرنے لگا۔ اسی دوران نگار میں کئی اشتہار نظر سے
گزرے جن سے پتا چلا کہ "خدا نمبر" پھر شائع ہونے والا ہے لیکن ان اشتہاروں میں کہیں میرا
نام نہ تھا اس لیے مجھے شبہ ہوا کہ اس مرتبہ کہیں نیاز صاحب یہ نمبر اپنے ہی نام سے نہ شائع کر دیں۔
میرا یہ شبہ یقین سے بدل گیا۔ جب نگار کا سالنامہ ۱۹۶۳ء "نیاز نمبر" حصہ دوم مجھے ملا۔
اس میں فرمان فتحپوری صاحب کا ایک مضمون ہے۔ "نگار اور نگار کے خاص نمبر" اس سلسلے
میں وہ صفحہ ۱۳۴ پر فرماتے ہیں:

"جنوری۔ فروری ۱۹۵۶ء۔ "خدا نمبر" کے نام سے شائع کیا گیا۔ پورا نمبر نیاز کا نتیجۂ فکر ہے۔ اس میں نیاز فتحپوری نے دنیا کے مختلف مذاہب کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ مختلف عہدوں اور مختلف قوموں میں خدا کا تصور کیا تھا اور کیا ہے۔ اس نمبر سے جہاں مدیرِ نگار کی وسعتِ مطالعہ اور مذاہبِ عالم سے ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں مذاہب پر ایسا وافر مواد ہاتھ آجاتا ہے۔"
(جملہ نامکمل ہے۔ غالباً یہ کہنا چاہتے تھے " جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا۔")

مجھے اس تحریر سے جو تکلیف ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے فرمان صاحب اور
نیاز صاحب کو کئی خط لکھے کہ ایک تردیدی بیان نگار کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کیجیے کہ نگار
کا "خدا نمبر" اسحاق صدیقی کا لکھا ہوا تھا نہ کہ نیاز فتحپوری کا اور جب "خدا نمبر" دوبارہ شائع
ہو تو اس کا خیال رکھیے کہ اس میں مؤلف کی حیثیت سے میرا نام ہو اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو
مجھے مجبوراً اخبارات کے ذریعہ صداقت کو بے نقاب کرنا پڑے گا جو علامہ نیاز کے لیے کشفِ
ساق کا باعث ہوگا۔ میں اپنی چیز کو اپنا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا اور
میرے پاس اس کے لیے کافی ثبوت موجود ہیں۔ میرے دل میں علامہ نیاز کے لیے بے پناہ
عقیدت ہے لیکن آپ لوگ مجھے اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ میری عقیدت اور محبت

نفرت میں بدل جائے اور وہی زبان اور قلم جو نیاز کی تعریف سے کبھی نہ تھکتا تھا ان کے خلاف حرکت میں آ ئے۔ ظاہر ہے کہ علامہ نیاز کی شہرت کو داغدار کر کے مجھے خوشی نہ ہوگی لیکن یہاں سوال اندھی شخصیت پرستی کا نہیں ہے بلکہ یہ خیر و شر کی قدیم جنگ ہے اور مجھے امید ہے کہ آخر میں جیت سچ کی ہوگی۔"

۱۲ اگست ۱۹۶۳ء کو نیاز صاحب نے مجھے ایک خط لکھا:

" عزیزم، فرمان کے نام رجسٹری ملی۔ آپ کا اضطراب دیکھ کر تعجب ہوا۔ میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ خدا نمبر میں آپ کے نام کا اظہار کر دیا جائے گا اور آئندہ ستمبر کے اشتہار میں بھی۔ فرمان صاحب کا سہو تھا کہ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر اشتہار شائع کر دیا۔ میں خود اب کسی کام کو نہیں دیکھتا۔ بالکل فرصت نہیں ہے۔ "خدا نمبر" آپ کو ضرور بھیجا جائے گا۔ —— "نیاز"

یہ خط مجھے ۱۷ اگست ۱۹۶۳ء کو ملا۔ اس سے دو روز قبل مجھے فرمان صاحب کا ایک تار ملا تھا:

1915 APM 156 Karachi 12 12/13 Ishaque Siddiqui 26 Gwynne Talab

Lucknow

Don't worry see Next Issue

farman

ترجمہ: ——

۱۹۱۵ اے پی ایم ۱۵۶ کراچی ۱۲ ۱۲/۱۳

اسحاق صدیقی ۲۶ گوئن تالاب لکھنؤ

پریشان نہ ہوں۔ آئندہ شمارہ دیکھیے۔

فرمان

غالباً تار دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ کہیں میں اخبارات میں سارا واقعہ نہ لکھ دوں۔ بہر حال، فرمان صاحب نے ستمبر ۱۹۶۳ء یا اس کے بعد نگار کے کسی پرچے میں کوئی بیان اپنی غلط فہمی کے بارے میں شائع نہیں کیا۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں "خدا نمبر" کا جدید ایڈیشن مل گیا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نیاز صاحب نے میری اصل تالیف

میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے لیکن شروع کے چند صفحات میں بعض اہم تبدیلیاں مصلحتاً کی ہیں۔ مثلاً : ـــــ سالنامہ ۱۹۵۶ء کے اندرونی سرورق کے پہلے صفحہ کی عبارت حسبِ ذیل تھی :

> **خدا کا تصوّر**
> اور
> **اس کا ارتقاء**
> (عہدِ وحشت سے عہدِ حاضر تک)
>
> مرتبہ : محمد اسحاق صدیقی
> ناشر : نگار بک ایجنسی لکھنؤ
> قیمت تین روپیہ

اسی سرورق کے دوسرے صفحہ پر نیاز صاحب نے "تعارف" لکھا تھا جو یہ ہے :

تعارف

"مذہب بڑے دلچسپ و وسیع مطالعہ کی چیز ہے، علم الانسان، جغرافیہ، تاریخ، نفسیات اور ہیئت و علم النجوم سبھی علوم اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔"

مذہب فطری چیز ہو یا غیر فطری، لیکن اخلاقیات مذہبی یقیناً فطری چیز ہے کیونکہ متمدن انسان کی تمدنی تنظیم و ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

مذہب کی اساس خدا کے تصور پر قائم ہے اور گو وہ ایک منطقی نتیجہ ہے انسان کے جہل و مجبوری کا، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس تاریکی و بے اختیاری نے انسان میں خود آگہی پیدا کی اور خدا کی جستجو میں انسان خدا تک پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو

لیکن اس نے اپنے آپ کو ضرور دریافت کرلیا۔

انسان کا جمادات، نباتات و حیوانات سے گزر کر قوتِ مجردہ تک پہنچ جانا اور فطرت کے سربستہ رازوں کو واشگاف کر دینا عقلِ انسانی کا بڑا کارنامہ ہے، لیکن انسان کو اس منزل تک صرف خدا کی جستجو نے پہنچایا۔

مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ دراصل جغرافیہ، تاریخ و ماحول سے پیدا ہونے والے نفسیاتی رجحان کا مطالعہ ہے اور اس لیے گوناگوں دلچسپیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔

عہدِ قدیم سے عہدِ حاضر تک انسان نے کس کس طرح خدا کا تصور کیا، اس راہ میں اس نے کتنی ٹھوکریں کھائیں اور پھر کس طرح آہستہ آہستہ وہ کائنات پر چھا گیا۔ یہ داستان بہت منتشر و طویل ہے، لیکن بے انتہا دلچسپ اور انہیں منتشر اجزاء کو ہمارے عزیز دوست محمد اسحاق صاحب صدیقی نے یکجا کرکے اس مجلہ میں شائع کیا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر کسی ایشیائی زبان میں اتنی جامع و موجز کتاب اس سے قبل شائع ہوئی ہو اور قابل مؤلف یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے غیر معمولی محنت و جستجو سے کام لے کر بہت تھوڑے زمانہ میں ایسی قیمتی چیز پیش کرکے زبان کی بیش بہا خدمت انجام دی۔

نیاز

۱۹۶۴ء کے کراچی ایڈیشن میں نیاز صاحب نے یہ جدت کی کہ اندرونی سرورق کے پہلے صفحہ سے میرا نام یک قلم اڑا دیا اور تعارف کے آخری دو پیراگراف کے جلی الفاظ جن میں میرا ذکر ہے نکال دیئے یعنی اب سرورق کے پہلے صفحہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

(ماہنامہ "فروغ اردو" لکھنؤ)

نیاز صاحب کی ادبی زندگی کا یہ رُخ ہے جس پر جب بھی نظر پڑتی ہے تو ان کی شخصیت "سوالیہ نشان" کی طرح "بڑی عجیب" نظر آتی ہے! اتنا مشہور ادیب اور دوسرے اہلِ قلم کی کاوش و تحقیق کو "اپنانے" میں اس قدر مشاق اور بے باک!

نیاز فتحپوری کے یہاں شعر فہمی کے معاملہ میں بڑی شتر گربگی اور بلندی کے ساتھ پستی بھی پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ شعر کی کمزوری پر صحیح گرفت بھی کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ایسے بچکانہ اعتراضات بھی کر جاتے ہیں، جن سے اُن کے شاعرانہ ذوق کے بارے میں بری رائے قائم ہوتی ہے۔

الہلال جب نکلنا شروع ہوا ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد عربی آمیز اردو لکھتے تھے۔ نیاز فتحپوری اس اسلوب سے متاثر ہوئے۔ یہ تاثر ان کی تحریروں میں ملتا ہے لکھتے ہیں:

○—— "دنیائے شاعری مشکل سے ایسے ایجازِ سدید، بیانِ جزیل اور عباراتِ انیق کی مثال پیش کر سکتی ہے۔

○—— "میرے کوائف سے استیعاد حقیقی ہے،

○—— "جسارت مشمرہ اور سلاست مقالی عود کر آئی۔"

افسانہ نگاری میں انہوں نے سجاد حیدر یلدرم کے طرزِ نگارش کا اثر شروع شروع میں

قبول کیا، جن کے یہاں "احتساسات اور انجذابات" جیسے بوجھل الفاظ اور وزنی ترکیبیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد نیاز صاحب کا اسلوبِ تحریر سہل اور سلیس ہو گیا۔ وہ کوئی شک نہیں اچھے انشاء پرداز ہیں مگر سرسید، شبلی نعمانی، حالی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی اور آغا حیدر حسن کی طرح "صاحبِ طرز" انشاء پرداز نہیں ہیں ـــــ نیاز تحریر و انشاء میں قاضی عبدالغفار کے درجہ کے ادیب اور صاحبِ قلم ہیں ـــــ نیاز صاحب کے یہاں ایسے مہمل جملے بھی ملتے ہیں ـــــ "وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب جاتا تھا" مگر قاضی عبدالغفار کی تحریریں اس قسم کے اہمال سے پاک ہیں۔

نیاز صاحب کے نام کے ساتھ بعض لوگ "علامہ" لکھتے ہیں۔ یہ غلط قسم کی مرعوبیت ہے۔ علامہ کے لیے جس جامع قابلیت اور علم و فضل کے لوازم ضروری ہیں۔ اُن سے نیاز صاحب بڑی حد تک کورے تھے۔ ان کو "مولانا" بھی نہیں کہنا چاہیے کہ "مولانا" کے لیے لازمی شرط ہے "دین و مذہب" کا رنگ اور روش اختیار کرنا۔ مگر نیاز صاحب نے اس کے برعکس اپنی زندگی کا خاصا حصہ دین و مذہب کی تنقیص و تکذیب میں گزارا اور اس روش و رنگ کا مذاق اڑایا۔

نیاز صاحب اس کا سلیقہ رکھتے تھے کہ کسی فن پر کوئی کتاب یا مقالہ پڑھا اور اس کا خلاصہ اردو میں منتقل کر دیا۔ نگار کے "باب المراسلات" میں نہ جانے کتنے سوالات انھوں نے مرتب کیے اور خود ہی جواب دیے۔ مثلاً سامنے کی اور روزمرہ کے برتنے کی چیز "دیاسلائی" ہے۔ مگر اس کی تاریخ کون جانتا ہے، ہاں! انسائیکلوپیڈیا یا اس قسم کی دوسری کتابوں اور قاموسوں میں "دیاسلائی" کی تاریخ مل سکتی ہے، اب کوئی شخص انسائیکلوپیڈیا میں دیاسلائی کی تاریخ پڑھ کر اپنے رسالہ میں دیاسلائی پر کسی فرضی نام سے استفسار کرے اور جواب میں انسائیکلوپیڈیا کی عبارت کا ترجمہ حوالہ کے بغیر درج کر دے تو ایسے ناقل اور مترجم کو محقق ہرگز نہیں کہہ سکتے! ہاں! جن لوگوں کا مطالعہ محدود ہے یا مضمون نگار کی قابلیت و استعداد سے واقف نہیں ہیں وہ ضرور مرعوب ہو جائیں گے۔ یہی حال نیاز فتحپوری کی "باب المراسلات" والی تحریروں کا ہے! جن کو پڑھ کر لوگ انہیں علامہ اور محقق سمجھنے لگے ہیں۔

ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جو کسی فن میں عبور یا درک رکھتا ہے اور ایک شخص وہ ہے

جس نے کسی فن پر کوئی مضمون یا کتاب پڑھی اور جو باتیں اس کی سمجھ میں آئیں انہیں اپنی زبان میں منتقل کردیا، نیاز صاحب کا بھی اسی دوسری صف کے لوگوں میں ہوتا ہے، مثلاً فن عروض پر وہ بہت کچھ لکھتے رہے ہیں مگر اس کی زیادہ تر نوعیت عروض کی کتابوں سے اخذ و نقل کی ہے۔ اگر وہ عروض جانتے ہوتے تو رباعیوں کے ایک ایسے مجموعہ کی دیباچہ میں تعریف نہ کرتے جس کی ڈیڑھ سو رباعیوں میں کم از کم ۴۸ رباعیاں ساقط الوزن ہیں۔

نظام رامپوری کا تذکرہ لکھا تو ان کے بارے میں ایک آدھ مضمون یا کتاب کو پڑھا۔ حالات کی تحقیق نہیں کی، اس ناقص مطالعہ اور سرسری معلومات کا یہ نتیجہ نکلا کہ اول تو شاعر کا نام غلط لکھا پھر اُن کو "مجرد" بتایا حالانکہ نظام رامپوری کی شادی بھی ہوئی اور اولاد بھی! ہاں! یہ ضرور ہوا کہ اُن کی اولاد زندہ نہیں رہی۔

تاریک پہلو نیاز فتحپوری کی زندگی کا سب سے زیادہ افسوس ناک اور قابل مذمت و بیزاری پہلو دین کی مخالفت تکذیب اور تردید ہے! ان کی تحریروں نے نہ جانے کتنے نوجوانوں کو گمراہ کیا اور اُن کے اندر دین سے بُعد اور نفرت پیدا کردی۔

نیاز صاحب نوجوانی میں ڈاڑھی رکھتے تھے، نماز روزے کے بڑے پابند تھے، جس زمانے میں وہ مسیح الملک اجمل خاں مرحوم کے صاحبزادے جمیل خاں کے ملی میں اتالیق تھے، تو ملا واحدی دہلوی کا بیان ہے کہ نیاز صاحب کے ڈاڑھی تھی اور نماز کی شدت کے ساتھ پابندی کرتے تھے —— پھر نہ جانے کسی مولوی کے ساتھ اُن کا کیا معاملہ پیش آیا کہ مولویوں کے شدت کے ساتھ مخالف ہو گئے اور یہ مخالفت جو مولویت کی تردید سے شروع ہوئی ہے، فقہ، حدیث، قرآن، خدا، انبیاء، ملائک، نماز، روزہ ...... کی تنقیص و توہین کی حد تک پہنچ گئی، انہوں نے یہ تک لکھ مارا:

> "کلام مجید کو میں کلام خدا سمجھتا ہوں، نہ الہام ربانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں ...." (نگار، ماہ جون ۱۹۲۰ء)

ہمیں نہیں معلوم کہ ان ملحدانہ اور کافرانہ خیالات سے انہیں توبہ کی توفیق نصیب ہوئی یا نہیں، ان کی ملحدانہ تحریروں پر جب مسلمانوں نے لکھنؤ میں احتجاج کیا، تو معاشرے کے دباؤ میں آکر انہوں نے باقاعدہ توبہ نامہ اپنے رسالے میں چھاپا! مگر وہ اپنے اس عہد

پر قائم نہ رہ سکے اور پھر اُسی بے دینی و الحاد کی اشاعت و تبلیغ شروع کر دی۔

عمر کے آخری حصہ میں نیاز فتحپوری کے قلم کو یہ کالک بھی لگ کر رہی کہ انہیں "قادیان" بلایا گیا، وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور اس مہمان نوازی اور میزبانی میں خالی عزت و تکریم ہی نہیں، فتوحات بھی شریک تھیں۔ قادیانیوں کے اس کرم و نوازش کا انہوں نے بدلہ اس طرح ادا کیا کہ اپنے مجلہ "نگار" میں مرزا غلام احمد قادیانی کی خوب خوب تعریفیں کیں اور اس حریفِ نبوت اور نبی کاذب کو "عاشقِ رسول" تک لکھ دیا۔

نیازؔ فتح پوری نے متحدہ ہندوستان میں مسز اینی بسنٹ کی ہوم رول کی تحریک سے لے کر خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کے تمام دور اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، وہ جمہوریت اور مطلق العنانی، آزادی اور غلامی کے فرق کو اچھی طرح جانتے تھے، اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ کرسیٔ اقتدار پر جمے رہنے کے لیے کیسی کیسی حکمت عملیوں سے کام لیا جاتا ہے، پاکستانی عوام کے تقاضوں سے بھی وہ اچھی طرح باخبر تھے۔ انگریز کے جور و استبداد اور اُس کے سیاسی ہتھکنڈوں کا بھی اُن کو پوری طرح تجربہ تھا۔ مگر پاکستان میں آکر اُن کا قلم حریتِ فکر کے مقابلہ میں زیادہ تر مصلحت شناس رہا، خوف یہ تھا کہ اگر آزادیٔ رائے کو استعمال کیا گیا تو اُردو ترقی بورڈ، نیشنل میوزیم اور روزنامہ "جنگ" سے جو مالی فائدہ کا تعلق ہے وہ خطرے میں پڑ جائے گا، حالانکہ دین اور خدا کے باغیوں کو حکومت و سیاست کے معاملے میں نڈر اور بے باک دیکھا گیا ہے مگر نیاز صاحب ......!

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۶۶ء)

واحد بخش قادری

بدایوں میں ایک خاندان ہے، جس کے افراد "بخوش" کہلاتے ہیں۔ "بخوش" کوئی ذات قبیلہ یا قوم نہیں ہے، بلکہ تین پشتوں سے اس خاندان میں "بخش" ہر فرد کے نام کا جزو ہوتا ہے، مثلاً رحمان بخش، ستار بخش، غفور بخش[1] ـــــــ! اس گھرانے کے لوگ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خوش حال بھی رہے ہیں۔

بدایوں کے اس خاندان کے ایک رکن غفور بخش بلند شہر میں مختار تھے۔ یہ اب سے ساٹھ ستر سال پہلے کی بات ہے، اس پیشہ میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا اور نام کے ساتھ دولت بھی! انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی رزاق بخش کو ولایت بیرسٹری کی تعلیم کے لیے بھیجا، اُس زمانے میں بیرسٹری کے لیے غالباً میٹرک کی بھی قید نہ تھی، انگریزی کے مڈل پاس انگلستان جاتے اور وہاں ابتدائی امتحان (Little Go) میں کامیاب ہوکر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرتے اور دو تین سال میں بیرسٹری کی سند لے کر ہندوستان چلے آتے۔

رزاق بخش مرحوم نے بھی اسی طرح بیرسٹری کی سند حاصل کی اور انگلستان سے واپس آکر علی گڑھ میں وکالت کا آغاز کیا، وہ بہت ذہین، خوش نصیب اور اقبال مند تھے۔ دو تین سال ہی میں ان کی پریکٹس خوب چمک گئی، اور ان کا شمار ضلع کے نامور وکلاء میں ہونے لگا، مسٹر اقبال احمد مرحوم، جو الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے ہیں، رزاق بخش مرحوم کے جونیئر وکیل اور اُن کے تربیت یافتہ تھے! اس خاندان کے اکثر افراد بدایوں کے مشہور قادری[2] خانوادے سے سلسلہ بیعت رکھتے تھے، اس لیے "قادری" کہلاتے تھے۔ رزاق بخش آر۔بی قادری (R.B. Qadri)

---

[1] مولانا فضل رسول بدایونی "وہابیت" کی رد میں خاصی شہرت رکھتے تھے، انہیں نے توحید و سنت کے داعیوں کو بدنام کرنے میں پہل کی۔ اُن کے فرزند عبدالقادر بدایونی تھے اور پھر ان کے صاحبزادے مولانا عبدالقدیر بدایونی سے اس گھرانے کی خاصی شہرت ہوئی! اب مولوی محمد سالم سجادہ نشین ہیں، ہندوستان کے مشہور عالم و خطیب مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کا اسی خانوادے سے تعلق تھا۔ [2] مولوی یعقوب بخش راغب اسی خاندان کے ایک فرد تھے، عالم دین، برسوں مسلم یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کے لیکچرار رہے، عربی ادب میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

کے نام سے مشہور تھے۔

رزاق بخش قادری کا سکہ علی گڑھ ہی نہیں، یو، پی کے چوٹی کے وکیلوں میں شمار ہونے لگا انہوں نے ہزاروں روپے کی جائداد خریدی، علی گڑھ اور بدایوں میں شاندار کوٹھیاں بنائیں۔ متحدہ ہندوستان میں ترکِ موالات کا جن دنوں زور شور تھا اُسی زمانہ کی بات ہے کہ قوم پرستوں نے انگریز دشمنی کے جوش میں "چوراچوری" پولس اسٹیشن کو آگ لگا کر کتنے ہی سپاہیوں کو زندہ جلا دیا۔ چوراچوری کے اس مشہور مقدمہ کی پیروی سرکار کی طرف سے انہی قادری بیرسٹر نے کی جن میں انہیں ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ محنتانہ ملا۔ اسی دوران میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے میں ان دنوں نویں کلاس[1] میں پڑھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے نواح میں قادری بیرسٹر کے انتقال کا خاصا چرچا تھا ـــــ انہوں نے تین بیٹے چھوڑے جواد بخش، واجد بخش، واحد بخش! ان سب کے ناموں کے ساتھ شروع ہی سے "قادری" لکھا جاتا تھا۔

۱۹۲۵ء میں راقم الحروف جب سب سے پہلے بدایوں گیا، تو مدرسہ قادریہ کے سامنے قادری منزل میں ان بھائیوں کو دُور سے دیکھا۔ پھر بدایوں میں میرا آنا جانا ہوتا رہا اور وہاں کئی کئی ہفتے قیام کیا! جواد بخش قادری میرے ہم عمر تھے، اُن سے خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی، واحد بخش کی عمر بہت سے بہت گیارہ سال کی ہوگی، چھریرا بدن، موزوں قامت، کھلتا ہوا رنگ اور دیدہ زیب ناک نقشہ! مدرسہ قادریہ کے صحن میں ہم کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ اور وکٹوں کی بجائے کھڑے یا بیرڑ کے بنے ہوئے بکس سے کام لیتے۔ واحد بخش اس کم سنی میں خاصی تیز بولنگ کرتے اور کسی بیٹس مین کو مشکل ہی سے جمنے دیتے۔

حیدرآباد دکن جانے کے بعد میرا وطن ہر سال آنا جانا رہتا، علی گڑھ تو راستے ہی میں پڑتا تھا، کئی بار "ابنا قادری بیرسٹر" کے یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، خوشحال گھرانا، رہنے سہنے کا انداز امیرانہ، کئی کئی نوکر اور مامائیں! آئے دن یہ پروفیسروں، بڑی کلاسوں کے ممتاز طلباء اور باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی دعوتیں ہوتی رہتیں۔ جواد بخش مرحوم نے دو تین بار میرے آنے پر پارٹیوں کا اہتمام کیا، وہ شعر کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ یہ شعر میں نے انہی کی زبان سے سب سے پہلی بار سنا:

---

[1] کبیر ہائی اسکول قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر۔ (اب یہ ڈگری کالج ہو گیا ہے)

مجھے زہر ہے ہجرِ ساقی میں پینا
یہ رکھا ہے ساغر، یہ رکھا ہے مینا

جواد بخش بچپن سے دمہ کے مریض تھے، ایک بار ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے ساتھ اور دوسری بار مسٹر اے کے حیدر کی ہمراہی میں، مسٹر رزاق بخش قادری مرحوم نے انہیں علاج کے لیے انگلستان بھیجا، مگر مرض کو بس وقتی افاقہ ہو کر رہ گیا۔ شاید اسی بیماری کی وجہ سے انہوں نے شادی نہیں کی، یہ مرض بالآخر جان لیوا ثابت ہوا، تقریباً ۳۰-۳۲ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جواد بخش مرحوم کے دونوں بھائی واحد بخش اور داحد بخش بلا کے ذہین نکلے اور اپنی ذہانت اور تقریر و خطابت کی بدولت مسلم یونیورسٹی کی یونین کے صدر منتخب ہوئے، پاکستان بننے سے غالباً چار سال پہلے ایم۔اے کرنے کے بعد واحد بخش قادری انڈین سول سروس میں لے لیے گئے اور ان کی تعیناتی صوبہ بنگال میں ہوئی، اور وہیں ڈھاکہ میں خواجہ ناظم الدین کے خاندان میں اُن کی شادی ہو گئی۔

جس عہدے پر بھی مرحوم رہے، نیکنامی، فرض شناسی، دیانت داری اور ساتھ ہی بڑی قابلیت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ انہوں نے اپنے فرائض انجام دیے۔ ڈیڑھ دو سال مسٹر محمد علی بوگرہ وزیرِاعظم پاکستان کے سیکرٹری کی حیثیت سے اُن کا کراچی میں بھی رہنا ہوا، اس مدت میں کئی بار اُن کے بنگلے پر شعر و ادب کی محفلیں اور شاعروں کے جمگھٹے رہے! ایک بار حضرت جگر مرادآبادی کے اعزاز میں دعوت دی۔

۱۹۵۴ء میں جس سال راقم الحروف کو حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اسی سال واحد بخش قادری مرحوم کو پاکستان کے وزیرِاعظم کی معیت میں اس سعادت سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملا۔ حج کے دنوں میں منیٰ میں مسجدِ خیف کے پاس اُن سے اتفاقیہ طور پر ملاقات ہو گئی۔ وہ شاہی مہمان تھے اور پولس کا سپاہی رائفل لیے ہوئے باڈی گارڈ کی حیثیت سے اُن کے ساتھ تھا، میں نے کہا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب ہوا تھا، یہ سن کر اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی! احرام نے اُن کی ظاہری شخصیت اور جسمانی خوب صورتی کو اور نمایاں کر دیا تھا۔

اب سے چند ماہ پہلے گرمیوں کے زمانہ میں اُردو زبان کے مشہور استاد شاعر منشی امیر احمد مینائی رحمۃ اللہ علیہ کے لائق پوتے اسمٰعیل احمد صاحب تسنیم مینائی نے راولپنڈی کے سفر سے واپس آکر کہا کہ مسٹر واحد بخش قادری نے تم سے ملنے کا بے حد اشتیاق ظاہر کیا، انہوں نے تاکید کردی ہے کہ فلاں تاریخ کو میں یورپ کے سرکاری دورے سے واپس کراچی پہنچ رہا ہوں، ایئرپورٹ پر ماہر سے کہنا کہ وہ مجھ سے ضرور مل لیں — ! میں مقررہ تاریخ پر ہوائی اڈے پہنچا تو پتا لگا کہ جہاز کو آئے ہوئے آدھ گھنٹہ سے بھی زیادہ ہوگیا، ایک صاحب نے رہنمائی کی کہ مسٹر قادری کے، ایل، ایم کے ریسٹ ہاؤس تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں پہنچا تو دیکھتے ہی بغل گیر ہوگئے اور خوشی کے مارے چہرہ کھل گیا، یہ دیکھ کر دل نے خلش محسوس کی کہ شگفتگی اور خندہ لبی اُن کی صحت کے اضمحلال کو چھپا نہیں سکی! تھوڑی دیر میں کافی آگئی، کافی پینے میں بے تکلفی کی گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے کئی غزلیں مجھ سے سُنیں! بڑی محبت کے انداز میں بولے "ماہر بھائی! دل نہیں بھرا، آپ پنڈی آیئے، میرے یہاں قیام کیجیے، بس بہتر ہیں چار دن جی بھر کے آپ کا کلام سنیں گے" — اتنے میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اُن سے ملنے کے لیے آگئے اور میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کے ساتھ اُن کی کار میں شہر چلا آیا۔

یہ اتفاق نہیں حُسنِ اتفاق تھا کہ جن دنوں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی ملازمت کی توسیع کا مسئلہ زیرِ غور تھا، واحد بخش قادری جیسا شریف النفس، قدر شناس اور جوہر قابل محکمہ تعلیمات کا سیکرٹری تھا۔

واحد بخش قادری نے پاکستان میں کتنی بہت سی حکومتیں دیکھی تھیں۔ سرکاری عہدے دار کی حیثیت سے وہ ہر حکومت کے وفادار رہے مگر اُن کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے اور ان کوتاہیوں پر اُن کا دل کڑھتا تھا۔ پاکستان میں صحیح معنی میں "اسلامی حکومت کا قیام" اُن کی سب سے بڑی تمنا اور عشقِ رسول اُن کی سب سے زیادہ گرانقدر متاع تھی۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند، کلب گھروں کی زندگی سے نفور اور اس قسم کی تمام لغویتوں سے گریزاں، نیکی اور بھلائی کی طرف طبیعت کا رجحان تھا، فطرتاً خیر پسند اور شریف النفس، صاحبِ کردار اور اہلِ دل! اپنی ملازمت اور عہدے سے کسی قسم کا کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پاکستان کے دن اس وقت پھریں گے جب کرسیوں پر بہت سے "واحد بخش" نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے! (آمین)

(ماہنامہ "فاران فروری ۱۹۶۷ء)

مُلّا واحدی

میری عمر بہت سے بہت بارہ تیرہ برس کی ہوگی، اس زمانے میں "رسالہ خطیب" - یا ماہنامہ "نظام المشائخ" کے سرورق پر مُلّا واحدی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھا ہوا دیکھا۔ پھر خواجہ حسن نظامی صاحب کا "روزنامچہ" جب بھی نظر سے گزرتا تو اس میں مُلّا واحدی اور بھتیجا احسان الحق کا سب سے زیادہ ذکر ہوتا۔ مُلّا واحدی سے راقم الحروف کا یہ غائبانہ تعارف تھا۔

حیدرآباد دکن کے زمانۂ قیام میں مجھے شاعری اور نثر نگاری کی مشق کے لیے خاطر خواہ فرصت میسر آئی، طبیعت شعر گوئی اور مضمون نگاری کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتی، آورد اور انقباض کی شاذ و نادر ہی نوبت آتی، کسی رسالہ کے ایڈیٹر کا مضمون کے لیے خط آتا تو میں دوسرے ہی دن کوئی مضمون یا افسانہ لکھ کر بھیج دیتا۔ مشاقی اور زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ دلی کے ماہنامہ "پیشوا" کے رسول نمبر میں راقم الحروف کے دس گیارہ مضامین شائع ہوئے! پنڈی بہاؤالدین کے رسالہ "صوفی" اور جنتریوں سے لے کر معارف، ساقی، نگار، ادبی دنیا، شاہکار اور ادب لطیف جیسے بلند پایہ رسالوں تک میں میری غزلیں، نظمیں اور مضامین شائع ہوتے رہتے۔ درجنوں رسالے اعزازی طور پر میرے نام آتے تھے! ایک دن دلی کا ماہنامہ "ادیب" ڈاک سے ملا، یہ رسالہ نیا نیا نکلا تھا، ہارڈنگ لائبریری (دہلی) کے سیکرٹری فصیح الدین ایم۔اے اس کے ایڈیٹر تھے اور مُلّا واحدی کا نام بھی سرورق پر لکھا تھا۔ میرے مضامین ماہنامہ "ادیب" میں چھپتے رہے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ چند مضامین کا معاوضہ بھی مجھے دیا گیا تھا۔

میں تقریباً ہر سال حیدرآباد دکن سے وطن آیا کرتا تھا اور اس سفر میں لکھنؤ، دلی اور علی گڑھ کا بھی ایک آدھ پھیرا ہو جاتا، ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء ہوگا، میرا دلی آنا ہوا۔ حسب معمول لال قلعہ کی سیر کی، دلی کی جامع مسجد میں نماز پڑھی اور حوض کے قریب بیٹھ کر جامع مسجد کا دیر تک نظارہ کرتا رہا۔ پھر ایک دن مُلّا واحدی صاحب سے ملنے کے

لیے کوچہ چیلاں پہنچا، میں اُن کے مکان کا پتا پوچھ ہی رہا تھا کہ مُلا واحدی حسنِ اتفاق سے مل گئے۔ ان کے نام کے ساتھ "مُلّا" لکھا جاتا تھا اس نسبت سے میں سمجھتا تھا کہ جسمانی طور پر وہ بھاری بھرکم ہوں گے اور اُن کے چہرے پر ڈاڑھی ضرور ہو گی، نیچا کرتا یا عبا اور عمامہ اُن کا پہناوا ہو گا مگر اُن کا جو حلیہ میرے ذہن میں تھا اس کے خلاف نکلے۔ پست قد، منحنی بدن، ڈاڑھی منڈی ہوئی، صاف ستھری اچکن زیبِ تن کیے ہوئے اور سر پر رامپوری مخملی ٹوپی! ان سے کھڑے کھڑے بات چیت ہوئی، اُن کا مکان سامنے تھا وہاں بیٹھ کر بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ دو ادردی کی ملاقات تھی، میرے ذہن و قلب نے اُن کی شخصیت کا کوئی نقش قبول نہیں کیا۔ راقم الحروف کو اخباروں اور رسالوں کی شہرت کا جو تھوڑا بہت غرہ تھا اس کی قلعی بھی کھل گئی۔

زمانہ تیزی سے گزرتا گیا، میں حیدرآباد دکن سے ترکِ اقامت کر کے دلی آگیا اور ڈھائی تین برس دلی میں رہا مگر مُلا واحدی صاحب سے کسی محفل، دعوت یا اجتماع میں ملنے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں! خواجہ حسن نظامی صاحب کو کئی بار ادبی اجتماعات میں دیکھا اور اُن سے صاحب سلامت ہوئی۔ تقسیمِ ہند کے بعد میں پاکستان چلا آیا۔ ۱۹۴۹ء میں کئی مہینے ملتان میں قیام رہا پھر ۱۹۴۹ء میں ماہنامہ فاران" نکلنا شروع ہوا، اُن دنوں بنزرٹا لائن میں مولانا محمد ایوب دہلوی مرحوم ہر اتوار کو تقریر کیا کرتے تھے، وہاں میرا جانا ہوتا تو مُلا واحدی سے بھی علیک سلیک ہو جاتی۔ مولانا محمد ایوب دینی مسائل کو فلسفہ و کلام کے پیرایہ میں جس انداز سے سمجھاتے تھے بس وہ اُنہی کا حصہ تھا!

میرے ہم زلف بابو محمد عبدالکریم خاں مرحوم جیکب لائن میں رہتے تھے میرا وہاں آنا جانا رہتا۔ اُن کے کوارٹر سے پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر مُلا واحدی کا کوارٹر تھا۔ اب ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں نے مُلا واحدی مرحوم سے شروع ہی میں عرض کر دیا تھا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب سے آپ کے بیحد تعلقات تھے اور آپ اُن کے سب سے زیادہ چہیتے رفیق تھے اس نسبت کے سبب میں آپ سے کھٹکا ہوا تھا، میں نے اس ضمن میں خاص طور سے خواجہ حسن نظامی کی اُس خط و کتابت کا ذکر کیا، جو نواب سر رضا علی والیٔ رامپور کی ہمشیرہ سے متعلق تھی، جسے سردار دیوان سنگھ مفتوں نے اپنے ہفتہ وار "ریاست" میں چھاپ دیا تھا۔ ان خطوں میں کئی ہزار رقم کا ذکر تھا! مُلا واحدی خواجہ صاحب کے

بے حد عقیدت مند تھے مگر میری تنقید کا انہوں نے برا نہیں مانا۔ وہ کہنے لگے کہ خواجہ حسن نظامی صاحب سجدۂ تعظیمی کے قائل تھے مگر میں اس مسئلہ میں اُن کا موید نہیں تھا، میں نے تو "سجدۂ تعظیمی" کے جواز کی تردید میں مضامین لکھے تھے۔ خواجہ صاحب کی زندگی طوفان و ہنگامہ کی زندگی تھی۔ کسی تحریک کو بڑے زور سے شروع کیا مگر چند دنوں کے بعد وہ ٹھپ ہو کر رہ گئی، مگر میری زندگی مستقل مزاجی اور سکون و اعتدال کی زندگی رہی ہے میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں اُسے ادھورا نہیں چھوڑتا، خواجہ صاحب روپے پیسے کے معاملے میں شاہ خرچ تھے! روپیہ اُن پر برستا تھا مگر اخراجات بھی امیرانہ تھے اور میں خرچ اخراجات کے معاملات میں بہت زیادہ محتاط! مُلّا صاحب کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ خواجہ حسن نظامی کا میں اندھا مقلد نہیں رہا۔ اس آزادیٔ فکر کے باوجود خواجہ حسن نظامی کی ذات سے اُن کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ خواجہ صاحب کا فوٹو کمرے میں آویزاں رہتا۔ فرماتے تھے کہ نظام المشائخ کا جب پہلا شمارہ نکلا تو اس کو ڈاک خانہ میں جا کر پوسٹ کرنے کا مرحلہ سامنے آیا، خواجہ صاحب نے جب یہ دیکھا کہ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں تو رسالوں کے بنڈلوں کا تھیلا اٹھایا اور کاندھے پر رکھ کر ڈاکخانے پہنچے، یہ وہ زمانہ تھا جب خواجہ حسن نظامی بستی نظام الدین سے پیدل چل کر دلی آتے تھے، اس ناداری کے زمانے میں بھی شربت کے پیسے خواجہ صاحب اپنے پاس سے دیتے۔

میں مُلّا واحدی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اپنی زندگی کے پچھلے واقعات وہ بڑے انہماک کے ساتھ سناتے۔ یہ سلسلہ بعض اوقات کئی کئی گھنٹے چلتا رہتا مثلاً انہوں نے سید حیدر رضا کا ذکر چھیڑا کہ "ایک زمانے میں یہ صاحب دلی کے سب سے زیادہ مقبول لیڈر تھے، گھنٹہ پون گھنٹہ حیدر رضا ہی کا ذکر فرماتے رہے۔" میں نے گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے عرض کیا—— "یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ جیل جانے سے بچ گئے!" اس پر وہ بولے کہ یہ بھی سن لیجیے کہ حیدر رضا انگریزی حکومت کے احتساب سے کس طرح محفوظ رہے۔ یہ داستان پون گھنٹہ میں جا کر ختم ہوئی کہ کوئی اور ذکر نکل آیا۔ مُلّا واحدی کی یہ واقعاتی گفتگو بڑی معلومات افزا ہوتی تھی، ان کی گفتگو میں بڑا ربط پایا جاتا تھا، ان کی باتیں کانوں میں رس ٹپکاتی تھیں مگر بعض اوقات تین ساڑھے تین گھنٹے کی مسلسل گفتگو قوتِ سامعہ کے لیے صبر آزما بن جاتی! مشہور کانگریسی لیڈر عارف ہسوی کا ذکر، میونسپل کمیٹی کے ممبر

دلیس راج کے واقعات، دلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر لابیلی کے مزاج وطبیعت اور انتظامی قابلیت کا تذکرہ غرض مختلف شخصیتوں کی سوانح عمریوں کے خلاصے اُن کی زبان سے سُننے میں آتے جو دلی کی معاشرت وتمدن کے قیمتی ابواب تھے! جب وہ جیکیب لائن سے ناظم آباد منتقل ہو گئے تو طویل ملاقاتوں اور گزشتہ واقعات اور قصوں کا یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

دلی میں مُلّا واحدی مرحوم کا مکان خاصا آرام دہ تھا مگر جیکیب لائن کے کوارٹر میں صرف دو کمرے اور دو برآمدے تھے، ایک طرف کا برآمدہ مُلّا واحدی کا بیڈ روم بھی تھا اور ڈرائنگ روم بھی! کتابیں اور رسالے بھی اسی برآمدے میں رکھے رہتے اور "واحدی منجن" بنانے والا بھی اسی برآمدے میں ہاون دستہ سامنے رکھ کر منجن کوٹتا رہتا۔ یہ کوارٹر اُن کے صاحبزادے کے نام الاٹ تھا۔ جب اُن کا کراچی سے باہر تبادلہ ہو گیا تو اسٹیٹ آفس نے کوارٹر خالی کرنے کا حکمنامہ بھیج دیا۔ اس کوارٹر کے چھوٹنے کا انہیں خاصا ملال رہا، مگر حکم حاکم مرگِ مفاجات والا معاملہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی صاحبزادی گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر ہیں اُن کے نام یہ کوارٹر منتقل ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے سعی سفارش سے کام لینا پڑے گا، اس جھنجھٹ میں وہ پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور تھوڑی بہت تگ ودو کی بھی ہو تو وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔

مُلّا واحدی کوچہ چیلان کے خانوادۂ سادات کے چشم وچراغ تھے، اُن کے والد اب سے نوّے برس پہلے انجنیئر تھے۔ واحدی صاحب نے مکتب میں تعلیم پائی اور پھر انگریزی اسکول سے میٹرک پاس کیا! آصف علی بیرسٹر اُن کے ہم جماعت تھے۔ جب وہ اڑیسہ کے گورنر تھے تو مُلّا واحدی سے ان کی خط وکتابت ہوتی رہی! مُلّا صاحب کی عمر بہت سے بہت تیئیس چوبیس برس کی ہوگی جب وہ رسالے کے ایڈیٹر رہے، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے طبی رسالے کا انتظام بھی واحدی صاحب سے متعلق تھا! خواجہ حسن نظامی کی معیت و رفاقت کے سبب اونچے درجے کے لیڈروں، شاعروں، ادیبوں اور نامور شخصیتوں سے ملنے کے مواقع انہیں میسر آئے۔ کئی برس دلی میونسپلٹی کے وہ ممبر بھی رہے، دوسری جنگِ عظیم کے بعد محکمہ راشننگ میں انہوں نے ملازمت بھی قبول کر لی یا یوں کہیے کہ کرنی پڑی، چار سو روپے ماہوار تنخواہ تھی وہ جہاں بھی رہے، دیانت اور فرض شناسی کی مثال قائم کر دی! اصول، وضع کی پابندی اور محنت یہ خوبیاں اُن کا (ROUTINE)

بن گئی تھیں۔

مُلّا واحدی جیسے وضعدار اور با اصول آدمی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں، جس کام کے لیے جو وقت مقرر تھا وہ ٹلنے نہ پاتا۔ جب وہ جیکب لائن میں تھے تو شام کو عصر کی نماز کے بعد صدر پوسٹ آفس اپنے پوسٹ بکس سے ڈاک لینے کے لیے پیدل جاتے، شدید بارش کے علاوہ اُن کا ڈاک خانہ جانا ناغہ نہ ہوتا۔ رات کو عشا کی نماز پڑھتے ہی سو جاتے! دونوں وقت کھانے میں گرم گرم تازہ پھلکے ہوتے اور کھانے کے بعد چائے لازمی تھی۔ سلیقے کے ساتھ ساتھ صفائی، ستھرائی بھی اُن کا شعار تھا۔ بستر کے تکیہ کے غلاف سے لے کر تولیہ تک ہر چیز اُجلی! لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں کے عادی تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ اُن کے لیے ایک طرح کا عذاب تھی۔ ہر چیز خالص منگانے کا خاص طور سے اہتمام کرتے۔

جب دِلّی میں تھے تو ہر اتوار کو قطب صاحب یا کسی دوسرے تفریحی مقام پر جا کر دن گزارنا اُن کا معمول تھا، مولانا راشد الخیری، عارف ہسوی وغیرہ احباب کا ساتھ رہتا، کسی اتوار کو احباب ناغہ کر دیتے تو مُلّا واحدی صبح سویرے کا مکا جنکشن کا ٹکٹ لے کر ریل کا سفر فرماتے اور رات کو واپس آ جاتے اس طرح اُن کا اتوار گھر سے باہر سیر سفر میں بسر ہوتا۔ دلی سے انہیں لگاؤ اور دلچسپی نہیں عشق تھا۔ فرماتے تھے کہ میں ساٹھ برس مسلسل دلی میں رہا ہوں اور اس طویل مدت میں پندرہ سولہ دن اور راتیں دلی سے باہر گزری ہیں! ایک بار خواجہ حسن نظامی صاحب نے کسی کام سے مجھے حیدرآباد دکن اور بمبئی بھیجا تھا، بس یہ سات آٹھ دن کا سفر میرا سب سے زیادہ طویل سفر تھا۔

پاکستان آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ایسے ذرائع مہیا فرما دیے کہ اُن کی کوئی ضرورت رُکنے نہ پاتی اور انہیں مالی پریشانی سے سابقہ نہیں پڑا، اُن کے صاحبزادے برسرِ کار تھے حکومتِ پاکستان نے اُن کا دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا، فوجی اخبار "ہلال" (راولپنڈی) سے بھی ہر مہینہ ڈیڑھ سو پونے دو سو روپے کے قریب مضامین کا معاوضہ ملتا رہا۔ روزنامہ "جنگ" اور "ہمدرد صحت" کے مضامین کا بھی یک مشت "اعزازیہ" کبھی کبھی مل جاتا۔ "واحدی منجن" سے بھی خاصی آمدنی ہو جاتی مگر ہر آمدنی کے لیے ایک مد مقرر تھی، اُس مد میں روپیہ جمع ہو جاتا۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ حریص نہیں تھے۔

غیر شادی شدہ لڑکیوں کے حساب بنک میں انھوں نے کھول دیے تھے اس مد کی رقم میں اضافہ کی انھیں ضرور فکر رہتی تھی! کثیر الاولاد تھے، چودہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے! اس طرح خاندانی منصوبہ بندی کی عملاً مخالفت کی!

مذہب وسیاست میں بحث، نوک جھونک اور تنقید اُن کا مزاج ہی نہ تھا۔ میں نے اُن کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سُنی۔ اُن کی محفل لوگوں کی غیبت سے پاک رہتی، ان کی پوری زندگی شرافت اور بھلمنساہت کی زندگی تھی، غلط قسم کے لوگوں سے اُن کا کوئی ربط ہی نہیں رہا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، آصف علی بیرسٹر، رئیس الاحرار مولانا محمد علی، خواجہ حسن نظامی، علامہ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، سید احمد امام جامع مسجد دلی کلاتھ ملز کے مالک سر سری رام، مولانا راشد الخیری جیسے اکابر و مشاہیر سے اُن کے روابط تھے! اس بات کا انہوں نے کئی بار قلق آمیز انداز میں ذکر کیا کہ مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی جب قلمی جنگ ہوئی تو میں اُس سے بالکل غیر متعلق تھا مگر مولانا محمد علی یہ سمجھتے تھے کہ میں اس نزاع میں خواجہ صاحب کا معاون و مددگار رہوں۔

خان بہادر حبیب الرحمٰن دلی میونسپلٹی کے وائس چیرمین اور مُلّا واحدی میونسپل کمشنر تھے۔ خان بہادر صاحب سے واحدی صاحب کی بڑی گہری دوستی تھی، پاکستان آنے کے بعد بھی خان بہادر صاحب سے دوستانہ تعلقات کا وہی عالم رہا، خان بہادر صاحب کی صاحبزادی کا نام فردوس تھا وہ کراچی ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں، مرحومہ کی یاد میں "ماہنامہ فردوس" غالباً دو ڈھائی برس کراچی سے شائع ہوتا رہا، اس کے تمام مصارف خان بہادر صاحب برداشت کرتے، رسالے کی ادارت مُلّا واحدی کو سونپ دی تھی، مُلّا واحدی پر فالج کا حملہ ہونے کے بعد برسوں تک علاج معالجہ کے مصارف خان بہادر حبیب الرحمٰن نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ یہ رقم مجموعی طور پر پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہوگی۔ مُلّا واحدی نے خان بہادر[1] صاحب کی اس دوست نوازی اور فیاضی کا مجھ سے

---

[1] افسوس ہے تین چار برس سے خان بہادر صاحب کا تجارتی کاروبار شدید ضعف سے دوچار ہے۔ اب ان کے پہلے سے حالات نہیں رہے اولاد اور عزیزوں کی غفلت اور اللّے تللّے کی روش بڑی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

بارہا ذکر کیا۔ اس زمانے میں ایسے درد مند دوست ہر کسی کو کہاں میسر آتے ہیں!

تقسیم ہند سے قبل اُن کی کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی تھی، پاکستان آنے کے بعد اُن کی نثر نگاری جواب تک "بالقوہ" کے درجہ میں تھی دفعتہً "بالفعل" بن گئی۔ یوں کہیے کہ اُن کے قلم کی گرہ کھول دی گئی۔ اب سے بیس برس قبل روزنامہ "نوائے وقت" میں اُن کے شہ پارے شائع ہوتے رہتے اور عوام و خواص میں پسند کیے جاتے پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دو جلدوں میں لکھی، دلی پر ایک کتاب تصنیف کی، خواجہ حسن نظامی کے سوانح حیات قلمبند کیے، اب کئی برس سے قرآن کریم کے ترجمہ میں دل و جان سے لگے ہوئے تھے۔ وہ عربی زبان نہیں جانتے تھے۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کے اردو ترجمۂ قرآن کی آسان اور سلیس زبان میں ترجمانی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اور اس ذمہ داری کے تقاضوں کو فرض سمجھ کر پورا کر رہے تھے۔

مُلّا واحدی کی زبان قلعہ معلّٰی کی ٹکسالی زبان ہے، ان کی نثر سادہ، عام فہم اور تکلفات سے پاک ہے۔ اظہارِ مفہوم اور ادائے مطلب کے لیے اتنے ہی الفاظ استعمال کرتے جتنے الفاظ کی ضرورت ہوتی۔ اُن کی تحریروں میں زبان کی چاشنی اور روزمرہ کے چٹخارے کے علاوہ سادگی و پُرکاری بھی ملتی ہے۔ وہ کاغذ پر سادہ کاروں کی طرح الفاظ کے گل بوٹے بناتے تھے۔ اُن کا قلم نرم و شاداب موجوں کی طرح رواں دواں رہتا۔ اُن کا خط حسین اور نستعلیق تھا، میں نے اُن کی ایک سطر بھی شکستہ خط میں لکھی ہوئی نہیں دیکھی، اُن کا مسودہ ہی مبیضہ ہوتا۔

"اپیل" مونث ہے یا مذکر ہے، "برف" اور "دہی" کو دلی والے مذکر بولتے ہیں یا مونث! لاپروائی فصیح تر ہے یا بے پرواہی! "ہدڑا" کے کیا معنی ہیں؟ کیا دلی میں "زنا" کو مونث بھی بولا جاتا ہے! "ڈکاریں مارنا" روزمرہ ہے یا "ڈکاریں لینا"! اہلِ دلی "تَخُت" کا تلفظ "تَخَت" (خ پر زبر) کرتے ہیں؟ "نلوہ کسے کہتے ہیں — ؟ اس قسم کے الفاظ کے بارے میں مُلّا واحدی کو میں خط لکھتا رہتا اور وہ ہر خط کا ہاتھ کے ہاتھ جواب عنایت فرماتے! استفسار کے جواب میں فقہی فتاویٰ کی طرح جامع، مختصر اور مفید مطلب الفاظ استعمال کرتے۔

میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اکثر نشستوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا

ذکر چھڑ جاتا، واحدی صاحب مولانا مودودی کے بڑے مداح تھے۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن کی ترجمانی میں قرآن کریم کے جو اردو ترجمے اُن کے سامنے رہتے اُن میں مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" بھی شامل تھی۔ زبان و روزمرہ کے بارے میں اُن کی یہ رائے تھی کہ جو اہلِ قلم دلی میں پیدا ہوا ہو اور اُس کی عمر کا زیادہ تر حصہ بھی دلی میں گزرا ہو اُس کی زبان پوری طرح مستند مانی جائے گی! دوسرے صوبوں اور خطوں میں رہ کر غیر شعوری طور پر وہاں کی زبان سے آدمی متاثر ہو جاتا ہے۔

"فاران" میں قرآنِ کریم کے تیسویں پارے کی مُلا واحدی کی اردو ترجمانی کم و بیش ڈھائی تین برس تک چھپتی رہی ہے، مجھے جس لفظ میں کھٹک محسوس ہوتی تو اُن پر ظاہر کر دیتا اور وہ مجھے لکھتے کہ آپ کی بات کو میں درست سمجھتا ہوں میرے لفظ کو ٹھیک کر دیجیے! میں نے ایک بار انہیں لکھا کہ آپ سے ترجمہ میں تسامح ہوا ہے اُس کا سبب عربی زبان سے ناواقفیت ہے! میری نیازمندانہ جرأت اور ان کی بزرگانہ شفقت اور حق پسندی کہ میرے کسی اعتراض پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ اکثر و بیشتر میری رائے سے اتفاق فرمایا اور مجھے خط میں یہاں تک لکھ دیا کہ میرے ترجمہ میں آپ کو کوئی لفظ کھٹکے تو مجھے نہ لکھیے آپ اسے خود درست کر دیجیے۔ فوجی اخبار "ہلال" میں اس کا اعلان کیا کہ میرے مرنے کے بعد پہلے میری تمام تحریریں بلفظہٖ شائع کی جائیں، پھر میرے خاص احباب اور بالخصوص...... ماہرالقادری جس تحریر کو چاہیں رہنے دیں اور جس کو نہ چاہیں اُسے خارج کر دیں۔ دلی کے بلند پایہ مستند ادیب کا یہ خراجِ تحسین، مجھ کم سواد دیہاتی کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات ہے۔ "فاران" کا ایک ایک مضمون اور بالخصوص راقم الحروف کی تحریریں بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے۔ "فاران" وقت پر نہ ملتا تو شکایتی خط بھیجتے۔

ملا واحدی مرحوم کی تحریروں نے بڑی بڑی شخصیتوں کو متاثر کیا ہے، وہ عوام و خواص کے محبوب ادیب تھے، اردو کی مشہور و مقبول کتاب "آوازِ دوست" کے فاضل مصنف جناب مختار مسعود نے اپنی اس کتاب میں مستقل ایک باب واحدی صاحب کی شخصیت پر لکھا ہے۔ ایک بار میں واحدی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ مختار مسعود صاحب ملنے کے لیے تشریف لائے تھے، اللہ تعالیٰ نے شاید میرے علاج کے لیے انہیں محکمہ صحت کا سیکرٹری بنایا ہے۔ جناح ہسپتال کے خاص وارڈ میں مختار مسعود صاحب نے میرے

علاج معالجہ کا انتظام و اہتمام کیا ہے مگر مُلّا واحدی ڈیڑھ دو دن سے زائد ہسپتال میں نہ رہ سکے۔ اُن کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا تھی لیکن ہسپتالوں میں کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں۔ گھر جیسی آزادی اور بے تکلفی کہاں میسر آسکتی ہے۔

دینداری اور مذہبیت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، دلّی سے کراچی آنے کے بعد ڈاڑھی بھی رکھ لی، جس نے اُن کے چہرے مہرے کو پُرنور بنا دیا تھا اور وجاہت بھی پیدا کر دی۔ صوم وصلوٰۃ کے انتہائی پابند، ملتِ اسلامیہ اور پاکستان کے خیر خواہ! اور پاکستان میں دینی و اخلاقی معاشرے اور اسلامی نظامِ حکومت دیکھنے کے آرزومند! فالج گرنے کے بعد لکڑی ٹیکتے ہوئے باتھ روم میں جاتے اور وضو کر کے نماز ادا کرتے! بیماری میں کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ فالج گرنے کے بعد کئی برس تک مسلسل گھنٹوں کام کیا اور اب ان کا قلم قرآنِ کریم کی ترجمانی کے لیے وقف تھا کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی خدمت کے لیے زندہ رکھا ہے۔

ہر جمعہ کو تین چار بجے اُن کے یہاں چھ سات احباب کا اجتماع ہوتا تھا، مختلف موضوعات پر گفتگو کے دوران چائے نوشی بھی ہوتی! تقریباً ڈیڑھ برس سے وہ شدید ثقلِ سماعت، ضعفِ اعصاب اور سلسِ بول میں مبتلا تھے اخباروں اور کتابوں کا مطالعہ اور لکھنا پڑھنا قطعاً موقوف تھا۔ روز بروز کمزوری میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ جناب جلیل قدوائی کا بنگلہ واحدی صاحب کے مکان کے قریب تھا۔ میں قدوائی صاحب سے اُن کی خیریت پوچھتا رہتا، چار مہینے ہوئے جب جلیل قدوائی صاحب نے میرے خط کے جواب میں لکھا کہ اب ان سے ملنا جلنا بھی مشکل ہے، قوّتِ سامعہ جواب دے چکی ہے پوری طرح بول بھی نہیں سکتے۔ میں لندن میں تھا میرے چھوٹے بھائی مسرور کا وہاں خط پہنچا جس میں لکھا تھا:—

"مُلّا واحدی" بھی اللہ کو پیارے ہو گئے" خبر غیر متوقع نہ تھی مگر کس قدر غمناک تھی! اپنے مہربان دوست اور میزبان جناب عبدالرحمٰن بزمی کو یہ خبر سنائی تو ایسا لگا کہ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت و جامد ہو کر رہ گئے ہیں! مُلّا واحدی دلّی کے تمدّن و تہذیب کی شاید آخری یادگار تھے۔ وضعداری، مستقل مزاجی، اصول پسندی اور دینداری کی جیتی جاگتی تصویر! زبان وادب اور انشا کے شیخ المشائخ! کمزوریوں سے کون انسان خالی ہے مگر ان میں خوبیاں زیادہ تھیں! وہ ہنگامہ پسند نہیں سکون و آشتی کے چاہنے والے اور خیر پسند تھے۔ غفرلہٗ و نوّر اللہ مرقدہٗ

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۷۶ء)

مدیر "فاران" کے نام

(یادِ رفتگاں " میں اپنی یادداشت اور حافظہ کی حد تک وہی باتیں لکھتا ہوں، جو مجھے یاد ہوتی ہیں اور ان کی صحت پر میرا دل مطمئن ہوتا ہے مگر میں آخر انسان ہوں اور کوئی انسان سہو و نسیان سے محفوظ نہیں ہے۔ چنانچہ مجھ سے بھی واقعات بیان کرنے میں بعض اوقات بھول چوک ہو جاتی ہے ـــــ یہ خط جیسے میں لفظاً لفظاً درج کر رہا ہوں۔ مُلّا واحدی مرحوم کے چھوٹے بھائی سید محمد مرتضیٰ مرحوم کے حقیقی نواسے کا ہے۔ جن کے پاس مُلّا واحدی کے متعدد خطوط اور یادداشتیں محفوظ ہیں! ـــــ سید اوصاف علی (بی اے ، بی ایڈ) انشاء پردازی کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کے قدرشناس ہیں اور "فاران" کے تو شیدائی ہیں۔ اُن کا شکر گزار ہوں کہ میرے تسامحات کی تصحیح فرمادی۔ میری واقعی غلطیوں پر جو کوئی مجھے مطلع کرتا ہے اس کا احسان مانتا ہوں ـــــ)

(ماہرالقادری)

مکرمی و محترمی!

السلام علیکم!

"فاران" ملتے ہی سب سے پہلے میں نے "یادِ رفتگاں" پڑھا۔ بہت پُراثر ہے لیکن کچھ باتیں درست کر دیجیے تو تاریخی اعتبار سے مناسب ہوگا۔

(۱) صفحہ ۳۱ پر آپ نے واحدی صاحب کو میٹرک پاس لکھا ہے مگر یہ بات درست نہیں ہے وہ خود میرے نام اپنے ایک خط میں ایک جگہ "فاران" بابت ماہ اپریل ۱۹۶۹ء کے صفحہ ۲۹ میں لکھتے ہیں ـــــ "میں انٹرنس ہی پاس نہ کر سکا، بی اے کیا کرتا۔" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واحدی صاحب میٹرک پاس نہیں تھے ورنہ شاید ان کی زندگی کچھ اور ہوتی۔

(۲) سیرتِ رسول دو جلدوں میں نہیں تین جلدوں میں لکھی ہے اور دلی پر دو کتابیں ہیں ایک "میرے زمانے کی دلی" اور دوسری "ناقابلِ فراموش لوگ اور

"ناقابلِ فراموش باتیں" حسنِ اتفاق سے اس کتاب کو مرتب کرنے کا شرف مجھے حاصل ہے۔ ٹائپ شدہ چھپنے کی منتظر۔ تمام مضامین دلی کے گزشتہ تمدن کے آئینہ دار اردو زبان و بیان کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔

یہ واقعی مقامِ فخر کہ واحدی صاحب آپ کی رائے کو بڑی وقعت دیا کرتے تھے۔

مُلّا واحدی صاحب نے بے شمار چھوٹے بڑے خط لکھے ہیں اُن میں ایک خط آپ کے متعلق ہے۔ چنانچہ مجھے تحریر فرماتے ہیں:

"جس عبارت کو مولانا ماہر القادری نے پسند فرمایا ہے اُسے میں کیسے ناپسند کر سکتا ہوں وہ بہترین نقاد ہیں۔"

دلی کے ایک بلند پایہ انشاء پرداز کا یہ خراجِ تحسین میرے خیال میں کچھ کم سرمایۂ افتخار نہیں —— اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے!" ——

خیر طلب اور طالبِ دعا:

سید اوصاف علی

(۲ر نومبر سنہ ۶۶ء)

(ماہنامہ "فاران" فروری ۷۷ ۱۹ء)

سیّد وحید قیصر ندوی

سنہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے ڈھاکہ سے میرے پاس ایک خط آیا، بھیجنے والے کا نام "سیّد وحید قیصر ندوی" لکھا ہوا، طرحی مصرع پر غزل کہہ کر بھیجنے کی فرمائش اور پچاس روپے کی موعودہ پیشکش! میں نے دو تین دن میں غزل کہہ کر بھیج دی، وحید قیصر ندوی سے یہ میرا پہلا غائبانہ تعارف تھا، پھر چھ سات مہینے کے بعد میرا ڈھاکہ جانا ہوا، وہاں خاصے بڑے پیمانے پر مشاعرہ تھا سر فیروز خاں نون جو ان دنوں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے، مشاعرے کے صدر تھے جناب فضل کریم فضلی ڈھاکہ کے مشاعروں کی روحِ رواں تھے۔

ظریف جبلپوری مرحوم اور راقم الحروف نے ایک ہی ہوائی جہاز میں سفر کیا اور ڈھاکہ کے تاجر محمد حنیف صاحب کے یہاں ہم دونوں کو ٹھہرایا گیا۔ اس سفر کی یہ بات یاد رہے گی کہ ہم دونوں رات کے وقت اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے تھے، اتنے میں پلنگ ہلنے لگے۔ ہم کمرے سے گھبرا کر باہر چھت کے فرش پر آئے تو دیواریں بھی جنبش میں تھیں مگر زلزلہ بہت سے بہت آٹھ دس سیکنڈ رہا ہو گا۔ پھر سکون ہو گیا، مگر دل کئی منٹ تک دھک دھک کرتا رہا۔

سید وحید قیصر ندوی سے پہلی بار ڈھاکہ کے اسی مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ مرحوم ان دنوں انجمن ترقی اردو ڈھاکہ سے متعلق تھے، یہ تعلق اعزازی تھا یا ممکن ہے اس خدمت کا الاؤنس یا مشاہرہ ملتا ہو! طرحی غزل کا ڈھاکہ بھیجنا اور اس پر معاوضہ دیئے جانے کی پیشکش یہ بات پوری طرح میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی۔ قیام گاہ سے ایئرپورٹ روانہ ہونے سے کچھ دیر قبل باتوں باتوں میں معاوضے کا ذکر نکلا تو وحید قیصر ندوی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے جیسے انہیں بھی یہ واقعہ پوری طرح یاد نہ رہا ہو۔ ہم کار میں ایئرپورٹ پہنچے اور تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مرحوم سائیکل پر چلے آ رہے ہیں، آتے ہی پچاس روپے کے نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔

فضلی صاحب کا تو ڈھاکہ سے راولپنڈی تبادلہ ہو گیا۔ پھر کئی سال کے وقفہ کے بعد جناب حبیب انصاری کے زیرِ اہتمام مشاعرے ہونے لگے اور ہر مشاعرے میں سیّد

وحید قیصر ندوی صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کئی بار چاٹگام اور کھلنا کے مشاعروں میں شرکت کے لیے فوکر (چھوٹے ہوائی جہاز) میں ساتھ ساتھ سفر بھی کیا —— مرحوم بڑے باغ و بہار آدمی تھے، شاعر بھی، صحافی بھی، مقرر بھی! ندوہ کے تعلیم یافتہ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کے خویش، صوبہ بہار کے خانوادۂ سادات کے چشم و چراغ، مشرقی پاکستان میں روزنامہ جنگ کے نمائندے، سرکار دربار میں دُور تک پہنچ، فیلڈ مارشل ایوب خاں کا ذکر نکلتا تو ان سے نوک جھونک بھی ہو جاتی۔ وہ اُن کے مداح اور میں نقاد! پاکستان کے سابق صدر ایوب خاں کا ڈھاکہ جانا ہوتا تو قیصر ندوی کی مصروفیات کی حد نہایت نہ رہتی۔ ہر تقریب میں موجود، بڑے بڑے عہدیداروں سے جان پہچان بلکہ بعض سے بے تکلفی بھی!

مشرقی پاکستان میں اردو کے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی ہے اس المیہ اور سانحہ کی کچھ تفصیلات اُنہی کے "ریڈر ٹائمز" کے ذریعہ ملتی رہتیں۔ اس مسئلہ میں انہوں نے خاصی جرأت کا ثبوت دیا۔

سادات عام طور پر گورے ہوتے ہیں مگر وحید قیصر ندوی کا رنگ سیاہ تھا۔ سفید لباس کے شوقین، غالباً کسی بیماری کے سبب چھوٹی عمر ہی میں سر کے معاملے میں پوری طرح "فارغ البال" ہو گئے تھے۔ اپنے قلم اور ذہانت کی بدولت خاصی آرام اور بے فکری کی زندگی بسر کی۔ موٹر نشین تھے! تمام شاعروں سے گہری دوستی بلکہ بے تکلفی مگر کسی شاعر نے اُن کے دولت خانے کو نہیں دیکھا۔ اس کا سبب یا تو اُن کی گوناگوں مصروفیتیں تھیں یا پھر معیشت کے باب میں محتاط تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ مرنے سے ڈیڑھ مہینہ قبل مجھے خط لکھا کہ ماہنامہ "فاران" پابندی سے نہیں مل رہا ہے، شاید اس کا سبب رجسٹر میں پتے کا غلط اندراج ہو۔ میں نے کئی مہینے کے شمارے رجسٹری کے ذریعہ اُن کی خدمت میں بھیج دیے۔ بس پھر رسید کی بجائے اخبار کے ذریعہ اُن کی موت کی اطلاع ملی! اُن کی موت کا پُرسا اردو زبان کو ہی دیا جانا چاہیے، جو مشرقی پاکستان میں کراہ رہی ہے اور اُس کی داد فریاد کوئی نہیں سنتا —— دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رضوان مرحوم کو میسر آئے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" جنوری ۱۹۷۰ء)

سیّد وقار عظیم

پاکستان بننے سے پہلے سید وقار عظیم کے مضامین تو رسالوں میں نظر سے گزرتے تھے مگر اُن سے نیاز کراچی میں حاصل ہوا، ملنے میں اُن سے ملاقات ہوئی تو وہ ذہن میں محفوظ نہیں رہی! ۱۹۴۸ء میں مرحوم "ماہ نو" کے ایڈیٹر تھے۔ نیپیئر بارکس کے سرکاری بنگلے میں رہتے تھے، انھوں نے اپنے یہاں شعر شاعری کی نشست کا اہتمام کیا۔ کراچی کے منتخب شعراء بلائے گئے۔ سننے والوں میں سب لکھے پڑھے لوگ تھے۔ سید آلِ رضا کو میں نے سب سے پہلے اسی دعوت میں دیکھا انھوں نے اپنی معرکہ آرا غزل سنائی جس کا ایک شعر سنتے ہی یاد ہو گیا:

کہتے ہیں لوگ آپ کو مجھ سے ہے اک لگاؤ
یہ واقعہ بھی خوب ہے، تہمت بھی خوب ہے

شعر خوانی کے بعد چائے نوشی ہوئی جس کے ساتھ ذائقہ دار لوازمات تھے! مجھے یاد پڑتا ہے دو بار اور سید وقار عظیم کے یہاں شعر و سخن کی محفل برپا ہوئی۔

راقم الحروف ان دنوں پلازا سینما بندر روڈ کے قریب ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک دن سید وقار عظیم صاحب غریب خانے پر تشریف لائے اور ایک مشاعرے کی دعوت دی۔ میرے کانوں تک یہ بات پہنچی تھی کہ اس مشاعرے میں بعض مقامی شاعروں کو معاوضہ بھی دیا جا رہا ہے اور مشاعرے کی نوعیت نیم سرکاری سی ہے، فنڈ کی کمی نہیں ہے، میں نے سید صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ آپ کی کوئی ذاتی تقریب نہیں ہے یہ پبلک مشاعرہ ہے ایسے مشاعروں میں میری شرکت کے شرائط ہیں! سید وقار عظیم کی نگاہ میں راقم الحروف کے گھر بذاتِ خود آنے اور دعوت دینے کی بہت زیادہ اہمیت تھی اس لیے میرے جواب سے وہ خوش نہیں ہوئے۔

سید وقار عظیم دمہ کے مریض تھے، کراچی میں اُن کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اس لیے وہ کراچی سے لاہور چلے گئے۔ کراچی کی آب ہوا اگر اُن کی صحت کے لیے سازگار ہوتی تو وہ یہاں سے اور کہیں نہ جاتے! ترقی اردو بورڈ کے جلسوں اور دوسری تقریبات

بس اُن کا کراچی آنا ہوتا تو وہ ایسا محسوس کرتے کہ کراچی میں زیادہ دن رہنا ہو گیا تو ضیق النفس کی تکلیف میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے!

کراچی اور لاہور میں سید وقار عظیم مرحوم سے راقم الحروف کی دو چار برس کے وقفے سے ملاقات ہوتی رہتی۔ آداب و تسلیم میں خود تقدیم فرماتے! اس بات کو تین ساڑھے تین برس ہو رہے ہیں مولانا زکی کیفی مرحوم کے یہاں راقم الحروف مہمان تھا۔ انہوں نے میرے بہت کچھ منع کرنے کے باوجود ایک ادبی نشست اور دعوت کا اہتمام کر ڈالا۔ سید وقار عظیم کو بھی مدعو کیا گیا مگر عین وقت پر اُن کا فون آیا کہ لڑکا موٹر کار لے کر چلا گیا، میں سواری کے بغیر نہیں آ سکتا ۔۔۔ میں نے ماہنامہ افکار کے "احمد ندیم قاسمی نمبر" پر مفصل تبصرہ کیا اور وہ شمارہ اُن کی خدمت میں بھیجا، تو جواب آیا:

"آپ کے تبصرے سے میں نے استفادہ کیا۔ شکریہ...... !"

سید وقار عظیم اردو زبان و ادب کے بڑے بڑے اداروں کے رکنِ رکین تھے، کسی ادبی ادارے یا بورڈ سے اُن کی وابستگی اس ادارے کے لیے فخر اور اچھی شہرت کا باعث تھی! جدید و قدیم شعراء اور اہلِ قلم سب اُن کا احترام کرتے تھے وہ بے ہمہ و با ہمہ مسلک رکھتے تھے کسی خاص مکتبِ فکر سے اُن کی وابستگی نہ تھی اردو زبان و ادب سے انہیں عشق تھا اور اس کی ترقی و اشاعت کے لیے اُن کی توانائیاں وقف تھیں۔ وہ بلند پایہ نقاد اور اہلِ قلم تھے، اُن کی تحریریں شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتیں، اسلوبِ نگارش جاندار اور باوقار! پنجاب نے اُن کی بہت کچھ قدر کی مگر یہ صورتِ حال بھی پیش آئی کہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے ایک ادارے کی نظامت پر اُن کا تقرر کر دیا لیکن سید وقار عظیم کو اس عہدے کا چارج نہیں ملا! ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے ماحول میں اس طرح گھر گئے تھے کہ ناپسندیدہ باتوں پر جرح و تنقید اُن کے لیے دشوار ہو گئی تھی!

سید وقار عظیم معاشی طور پر ہمیشہ مطمئن اور خوش حال رہے تعلیمی نصاب کی متعدد کتابوں کے وہ مؤلف اور ٹیکسٹ بک کمیٹی کے رکن تھے، قلم ان کی آمدنی کا شریفانہ ذریعہ تھا، سمن آباد میں آرام دہ مکان تعمیر کیا۔ موتر نشین تھے اولاد کو صاحبِ روزگار اور تمام پسماندگان کو خوشحال چھوڑا! اُن کی موت سے علم و ادب کی فضا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا سب کو احساس ہے! اردو زبان و ادب کی تاریخ سید وقار عظیم کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۷۷ء)

ڈاکٹر ہادی حسن

علی گڑھ نمائش جب یاد آتی ہے تو نہ جانے کتنی چوٹیں ابھر آتی ہیں اور کتنے واقعات فلمی مناظر کی طرح نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ ہاں تو سنہ ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ نمائش میں مشاعرہ تھا۔ جناب عبدالمجید قرشی پروفیسر شعبہ ریاضیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے مجھے خط لکھا۔ مشاعرے کے صدر پروفیسر عبدالعزیز پوڈری مرحوم تھے۔ مسٹر ابوطالب نقوی ان دنوں علی گڑھ کے کلکٹر تھے اور مسٹر ایم۔ بی۔ احمد سشن جج تھے۔ مشاعرے کے بعد کئی دن علی گڑھ ٹھیرنا ہوا۔ شام کو کلکٹر صاحب کے خیمہ میں پروفیسروں، عہدیداروں اور اہلِ علم کا جماؤ ہوتا تھا۔ وہیں ڈاکٹر ہادی حسن سے میری ملاقات ہوئی۔ نام تو ان کا حیدرآباد کے زمانۂ قیام ہی سے سن رکھا تھا مگر اب تک ملنے کا موقع نہیں آیا تھا، دوسری یا تیسری ملاقات میں وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ کل آپ مسلم یونیورسٹی آئیں ضرور آئیں۔

ابھی وہ بات پوری بھی نہ کرنے پائے تھے کہ میں جھٹ سے بول پڑا ——— میں اس طرح "وقتی مشاعروں" میں شریک نہیں ہوا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب اس پر بولے ——— نہیں! عام مشاعرہ نہیں ہوگا، اس سے آپ بے فکر رہیں، مگر آئیے ضرور!

میں دوسرے دن مسلم یونیورسٹی پہنچا، ڈاکٹر صاحب میرے منتظر تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کلاس میں لے گئے، اور کلاس کے دروازے بند کر دیے، وہاں گنتی کے چند طلبا تھے۔ پھر ان کے اصرار پر میں نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد انہوں نے میری شاعری پر مختصر سی تقریر کر ڈالی۔ عبارت خاصی مسجع اور مقفیٰ تھی اور عربی فارسی کی بعض ترکیبیں خاصی نامانوس تھیں۔ انھوں نے ایک یہ جملہ بھی فرمایا جس کا مفہوم و مراد نہ میں اس وقت سمجھا اور اب سوچتا ہوں تو بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر ہادی حسن نے یہ بات کیوں کہی! وہ میرے لیے کیا کرنا چاہتے تھے۔ فرمایا:

> "سنہ ۱۹۴۰ء میں ماہرالقادری کے لیے ہادی حسن کچھ نہیں کر سکتا، تو کیا آئندہ بھی کچھ نہ کر سکے گا۔"

اس کے بعد اُن سے دو چار بار اور ملنا ہوا اور پھر آخری ملاقات مدراس میں ہوئی۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ وہاں کے اسلامیہ کالج کی سلور جوبلی تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق[له] مرحوم اس کے پرنسپل تھے، انہوں نے بمبئی سے مجھے تار دے کر بلایا۔ میں مشاعرے کے دن مغرب کے بعد مدراس پہنچا۔ اس دن شام کو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا لیکچر تھا۔ گورنر مدراس جلسہ کے صدر تھے۔ ان کی تقریر بہت زیادہ کامیاب رہی۔ میں جب ان سے ملا ہوں تو جلسہ گاہ سے تقریر کر کے آئے ہوئے انہیں چند منٹ ہوئے تھے۔ تحسین و ستائش کا نشہ بڑا تیز ہوتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر ہادی حسن کو بہت زیادہ خوش اور شگفتہ پایا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے انگریزی میں بولے:

"Mahir – you have missed a good lecture "

میں نے کہا آپ کی تقریر کے پروگرام کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی میں تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا تار ملتے ہی بمبئی سے چل پڑا۔

اس کے بعد ڈاکٹر ہادی حسن سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد اس کی اطلاع اور خیر خبر نہیں ملی کہ وہ کہاں ہیں! یہاں تک کہ ایک مہینہ ہوا، جب اخباروں میں ان کی موت کی خبر پڑھی۔ یہاں کے اخبار نویسوں کی بے خبری کا یہ عالم کہ ڈاکٹر ہادی حسن کے انتقال کی خبر کو ذرا بھی نمایاں کر کے نہیں چھاپا۔

ڈاکٹر ہادی حسن نواب محسن الملک کے چھوٹے بھائی مولوی امیر حسن کے فرزند تھے۔ یہ پورا گھرانا ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈیوں کا گھرانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب برسوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر رہے، طلبا میں وہ بہت مقبول بلکہ محبوب تھے۔ شعبۂ فارسی کے علاوہ شعبۂ نباتیات کی صدارت پر بھی وہ فائز رہے۔ بلا کے ذہین اور طباع تھے، خاص طور سے ان کا حافظہ بڑا قوی تھا، تقریروں میں انگریزی مصنفین کے صفحے کے صفحے ان کے ناموں کے حوالے کے بغیر سنا دیتے! ان کی والدہ ایرانی تھیں اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فارسی ان کی مادری زبان تھی۔

له بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نہیں، یہ مدراس کے ڈاکٹر عبدالحق تھے۔

ان کی زندگی کا یہ واقعہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ کہ ایک بار سخت بیمار پڑ گئے۔ یہاں تک کہ ہسپتال میں کافی دنوں تک رہنا پڑا۔ وہاں ایک نرس نے ان کی بڑی خدمت اور ٹہل کی، جب وہ ہسپتال سے اچھے ہو کر جانے لگے تو اس نرس سے انہوں نے کہا کہ میں تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں، اپنی کسی پسندیدہ چیز کا انتخاب کرکے مجھے بتاؤ۔ نرس بڑی باوفا اور مزاج شناس تھی بولی۔ "میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔" اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس سے شادی کر لی۔

میں نے علی گڑھ میں ان کی بیوی کو دیکھا ہے۔ دونوں کی عمروں کے علاوہ ان کی رنگت صورت اور ناک نقشہ میں بھی خاصا تفاوت تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی بیوی سے ہر حیثیت سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ انھوں نے کس خوشدلی کے ساتھ اس تعلقِ زوجیت کو نباہا۔ ڈاکٹر صاحب کے مرنے کے بعد جو ان کے خالات اخبارات میں نظر سے گزرے ان سے پتا چلا کہ چند سال ہوئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور اس صدمہ کو انہوں نے بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

ڈاکٹر ہادی حسن کی شخصیت اور ان کی باتوں میں بڑی کشش تھی۔ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے لیے طوفانی دورہ کیا اور تیس لاکھ روپے کے قریب چندہ جمع کرکے دم لیا! ان کی موت سے علمی دنیا میں کوئی شک نہیں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے!

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۶۳ء)

متفرق مضامین
جو پہلی جلد میں شامل نہ ہو سکے

ابنِ انشا

اب سے تقریباً ۲۳-۲۴ برس کی بات ہے جب ابنِ انشا کا نام راقم الحروف نے اس تقریب و عنوان سے سُنا تھا کہ اردو کالج کراچی کے مجلّہ کے وہ ایڈیٹر ہیں اور نہایت ذہین و ممتاز طالب علم ہیں، پھر رسالوں میں اُن کے چند مضامین بھی نظر سے گزرے، یہ مضامین لکھنے والے کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر رہے تھے! ابنِ انشا سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ کسی نیم سرکاری ادارے سے متعلق تھے اور جناب حفیظؔ جالندھری کے ماتحت کام کرتے تھے میرا اُن سے ملنا ملانا اور بہت زیادہ ملنا نہیں تھا اس لیے میں اُن کے حالات سے باخبر نہیں رہا۔ میرے ہم زُلف ڈاکٹر ضیاء اللہ خاں لودی مرحوم کا اقبال ٹاؤن میں بنگلہ تھا اُن کے اہلِ خانہ کی زبانی ایک دن معلوم ہوا کہ ابنِ انشا اُن کے پڑوس ہی میں رہتے ہیں۔

ابنِ انشا مرحوم سے سال دو سال میں ایک دو بار ملاقات کسی نہ کسی دعوت یا ادبی نشست میں ضرور ہو جاتی۔ ملنے جلنے میں وہ حفظِ مراتب کا خیال رکھتے، عام مشاعروں میں وہ شریک ہونے سے گریز کرتے، پرائیویٹ محفلوں میں بھی وہ بڑے اصرار کے بعد اپنا کلام سناتے، شعر پڑھنے کا انداز سادہ تھا جس میں کسی قسم کے تکلف کو دخل نہ تھا۔ شاعری میں ابنِ انشا کا اپنا آہنگ اور رنگ تھا، اُن کی کئی غزلیں ریڈیو سے نشر ہو کر خواص و عوام میں مقبول ہوئیں مگر اُن کی نثر کی بلندی کے مقابلہ میں اُن کی شاعری چھپی چھپی اور دبی دبی سی رہی۔ شاعری اُن کے آرٹ کا ثانوی روپ تھی۔

روزنامہ "جنگ" میں ابنِ انشا کے افکار و مضامین ہر طبقہ میں پسند کیے جاتے اور

محفلوں میں اُن کا چرچا رہتا، نثر میں اُن کا انداز بہت سادہ تھا مگر ساتھ ہی پرکاری بھی۔ قدرت نے ان کو طنز کا خاص سلیقہ ودیعت کیا تھا، وہ نشتر نہیں چبھوتے تھے، چٹکیاں لیتے تھے، اُن کی تحریر شعلہ نہیں تھی، دھیمی آنچ کی مانند تھی، قلم کی بدولت انہوں نے عزت، شہرت اور دولت حاصل کی۔ ایوب خاں کے دورِ آمریت میں اُن کا قلم اس قدر محتاط رہا کہ وہ ہرگز نذر سے محفوظ رہے، مسٹر بھٹو کے کرتوتوں سے وہ بے خبر نہیں تھے مگر طنز سے گریز کیا۔ پھر لندن میں اتنا بڑا عہدہ مسٹر بھٹو کے حکم سے انہیں دیا گیا کہ اُن کے نام کے ساتھ "منسٹر" لکھا جانے لگا یہ زمانہ ہر اعتبار سے اُن کے لیے سنہری زمانہ تھا۔

شعر و ادب میں ابن انشا کا "ترقی پسند" گروپ سے تعلق تھا، عقائد و افکار کے اعتبار سے وہ مذہبی آدمی نہیں تھے۔ مگر اُن کی تحریریں دینی طبقوں کے لیے دل آزار نہیں ہوتی تھیں، آدابِ شائستگی کے حدود کا وہ خیال رکھتے، ان کے مضامین میں زبان و مزاح کی چاشنی لطف پیدا کر دیتی۔

انگلستان لوگ صحت مند ہونے کے لیے جاتے ہیں مگر مقدر کی بات ہے کہ ابنِ انشا مرحوم وہاں جا کر کینسر میں مبتلا ہو گئے عہدے کی غیر معمولی ترقی اور لندن کی رہائش انہیں راس نہ آسکی، پاکستان سے وہاں جانے کے بعد چند مہینے وہ ٹھیک ٹھاک رہے، مگر پھر بیمار رہنے لگے، علاج بہت معقول ہوا لیکن موت کسی دوا دارو اور علاج معالجہ سے نہیں ٹل سکتی، اُن کی جسمانی صحت مرض کی مقاومت نہ کر سکی۔ بیماری بڑھتی اور شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ اخباروں میں پہلے اُن کی بیماری کی خبر چھپی اور پھر موت کی المناک اطلاع! لندن سے میت کراچی ہوائی جہاز سے آئی اور پاپوش نگر کے قبرستان میں دفنائی گئی ادیبوں اور شاعروں کا اتنا بڑا مجمع اور کسی اہلِ قلم کے جنازے اور تدفین میں نہیں دیکھا گیا۔

اخبارات نے ابنِ انشا مرحوم کی وفات حسرت آیات پر غم انگیز اداریے لکھے اور بڑے بڑے لوگوں نے تعزیت کی۔ ادب و انشاء کا یہ خلا ابنِ انشا کے اٹھ جانے کے بعد المیہ بن کر رہ گیا ہے۔

(ماہنامہ "فاران" فروری ۱۹۷۸ء)

جگر مراد آبادی

حضرت جگر مراد آبادی ہی کی غزل کا مطلع ہے:

دور جا کر دیکھتے نزدیک آ کر دیکھتے
ہم سے ہو سکتا تو ہم اُن کو برابر دیکھتے

جگر مرحوم کو تو اپنے محبوب کو دور و نزدیک سے مسلسل دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی، مگر میں نے جگر کو دور سے بھی دیکھا ہے اور نزدیک سے بھی دیکھا ہے، میں ان کی جلوتوں ہی میں نہیں، خلوتوں میں بھی شریک رہا ہوں۔ مجھے سفر اور حضر میں اُن کی طویل معیت کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں نے اُن کے ساتھ رمی اور برج بھی کھیلا ہے۔ گانا بھی سنا ہے اور نمازیں بھی پڑھی ہیں، میں نے جتنا انہیں دیکھا ہے، سمجھا ہے، جانا ہے اور پڑھا ہے کم لوگوں کو اس کا موقع ملا ہو گا اور شاید نہ بھی ملا ہو اور کسی کو یہ موقع مل بھی گیا ہو تو سیرتوں کو پڑھنے اور کرداروں کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہر شخص میں کہاں ہوتی ہے، بہت سے لوگ شخصیتوں اور سیرتوں کے قریب سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ کوئی عقیدت کے جذبات میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، کسی کی نگاہ صرف "محاسن نگر" ہوتی ہے اور کوئی عیب بیں ہوتا ہے۔ کرداروں کا مطالعہ کرنے کی یہ دونوں انتہائیں غلط ہیں! نگاہ وہ معتبر ہے جو تصویر کے دونوں رُخ دیکھ سکے ——— آئینہ کی طرح، جو وہی بتاتا ہے، جو کچھ وہ دیکھتا ہے، اسی لیے تو کسی آزمودہ کار شاعر نے نصیحت کی ہے ؎

آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا

میں نے ہوش سنبھالا تو اقبال، اکبر الٰہ آبادی، عزیز لکھنوی اور فانی بدایونی کے نام اور کلام سے آشنا ہوا، یہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے، حضرت جگر اُس وقت تک زیادہ مشہور نہ ہوئے تھے، یا یوں سمجھیے کہ اُن کی شہرت کا یہ دور آغاز تھا۔ کچھ دن کے بعد جگر کے نام کی بھی کانوں میں بھنک پڑی، پھر رسالوں میں ان کی چند غزلیں بھی نگاہ سے گزریں۔ میں آٹھویں یا نویں کلاس میں پڑھتا تھا، ان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں کوئی مشاعرہ ہوا، ایک صاحب جو میرے گاؤں کے قریب قصبہ ڈبائی کے رہنے والے تھے، وہ مجھے ریلوے اسٹیشن پر مل گئے، انہوں نے کہا کہ میں اس مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ جگرؔ مرادآبادی نے بڑے معرکے کی غزل سنائی، ان کی غزل کا مطلع تھا:

نالہ پابندِ نفس ہے دلِ ناشاد نہیں
یہ تو فریاد کی توہین ہے، فریاد نہیں

اس شعر کو سن کر میں بے اختیار جھومنے لگا اور کئی دن تک اسی شعر کو گنگناتا رہا کبھی تصور میں شاعر کی خیالی تصویر مرتب کرتا اور کبھی دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی کہ کاش! ایسے شعر ہم بھی کہہ سکتے اس دن کے بعد سے حضرت جگرؔ کی غزلیں رسالوں میں تلاش کر کے بڑے شوق سے پڑھتا اور اُن کے کلام کے واسطے سے اُن سے قریب ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد دکن جانا ہوا تو وہاں ایک صاحب کی بیاض میں جگرؔ صاحب کی متعدد غزلیں درج تھیں۔ انہوں نے لاہور میں بارہا جگرؔ صاحب کو سُنا تھا۔ وہ اُنہی کی دُھن میں غزلیں سناتے اور ساتھ ہی جگرؔ صاحب کے عالمِ سرخوشی کے قصے بلکہ آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کرتے۔ اس طرح جگرؔ صاحب کی ذات سے اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔

حیدرآباد دکن میں میرے "پہلے قیام" کی مدت پانچ سال کے قریب ہے ۱۹۳۲ء کے آخر میں حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر بجنور چلا آیا، اور یہاں روزنامہ "مدینہ" کی ادارت سے وابستہ ہو گیا۔ بجنور سے اپنے وطن (کسیر کلاں ضلع بلند شہر) آتے جاتے مرادآباد پہ گاڑی ضرور تبدیل کرنی پڑتی، ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی مسلم مسافر خانہ تھا، اس میں دو چار گھنٹے قیام رہتا اور بڑا آرام ملتا۔ ایک بار جو میں وطن سے واپس ہوا اور اس مسافر خانے میں پہنچا، تو مسافر خانے کے مہتمم مقبول احمد صاحب سیوہاروی کا آمنا سامنا ہو گیا۔ پوری طرح علیک سلیک بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ فرفر بولنے لگے:

"بھائی ماہرؔ! ابھی ابھی یہاں جگرؔ صاحب تشریف فرما تھے، اپنی غزلیں لہک لہک کر سناتے رہے! تم ذرا پہلے آجاتے تو جگرؔ صاحب سے تمہاری ملاقات ہو جاتی......"

میں نے اس پر کہا کہ:

"بجنور کے لیے ریل گاڑی تو کئی گھنٹے بعد جائے گی، چلیے شہر میں چل کر تلاش

کریں، وہ مل گئے تو انہیں دیکھنے کی تمنا پوری ہو جائے گی.....!!

مقبول احمد صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ جگر صاحب کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں، کوئی خاص قیام گاہ نہیں، انہیں تلاش آخر کہاں کیا جائے؟ شام کہیں ہوتے ہیں، رات کہیں بسر فرماتے ہیں اور صبح کسی نئی جگہ عقیدت مندوں کے ہجوم میں شعر پڑھتے ہوتے ہیں، وہ جو اس مسافر خانے سے اٹھ کر گئے ہیں، تو اس ہیئت سے گئے ہیں کہ اُن کی ٹوپی کسی کے ہاتھ میں تھی اور شیروانی دوسرا آدمی اپنے ہاتھ پر ڈالے ہوئے تھا، دو تین ٹکٹ چیکر جگر صاحب کو سنبھالے ہوئے تھے.....!

مجھے حضرت جگر سے نہ ملنے کا بڑا ملال رہا اور دل ہی دل میں غریب اور بے گناہ ریل گاڑی کو کوستا رہا کہ یہ ظالم ذرا پہلے مراد آباد پہنچ جاتی تو حضرت جگر سے ملنے کی تمنا پوری ہو جاتی، مقبول احمد صاحب نے میری طبیعت کے اس ملال کو دیکھ کر کہا کہ جگر صاحب سے ملانے کا میں ذمہ لیتا ہوں، نشاطِ خاطر رکھو، تمہاری یہ آرزو پوری ہو کر رہے گی۔

میں مراد آباد سے بجنور چلا آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا، میری صحافتی زندگی کا آغاز تھا، روزنامہ "مدینہ" نیا نیا نکلنا شروع ہوا تھا، کم سے کم دس گھنٹے مسلسل کام کرنا پڑتا، جوانی کا زمانہ تھا کام کرنے اور آگے بڑھنے کا شوق تھا، محنت کر کے طبیعت اور خوش ہوتی تھی! ایک دن شام کے وقت میں اپنے گھر میں لیٹا تھا کہ دفتر کے ملازم نے دروازے پر دستک دے کر، چلا کر کہا:

"علی سکندر اور مقبول احمد آئے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں!"

میں پلنگ سے اٹھا یہ سمجھ کر کے کہ شہر کے کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں، اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ مقبول احمد سیوہاردی اپنا وعدہ وفا کرنے کے لیے حضرت علی سکندر جگر کو مراد آباد سے ہمراہ لے کر تشریف لائے ہیں اور پیاسا کنوئیں کے پاس نہیں گیا بلکہ کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس آیا ہے!

دفتر مدینہ کے بالاخانے پر پہلے مقبول احمد سیوہاردی پر نگاہ پڑی اور پھر جگر صاحب پر! ان کے حلیہ اور وضع قطع کو دیکھ کر ہی پہچان گیا کہ یہ وہی صاحب ہونے چاہئیں، جن کی غزل کا یہ مقطع ہے:

سب کو مارا جگر کے شعروں نے ۔۔۔ اور جگر کو شراب نے مارا

وہ ان کے بالوں کی بکھری ہوئی لٹیں، ان پر ٹوپی عجیب انداز سے رکھی ہوئی۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، ململ کی قمیص جس کے دامن پر پان کے ہلکے ہلکے دھبے بھی تھے۔ تنگ مہری کا پاجامہ، سیاہ پمپ جس کی پالش اور خاص طور سے فیتہ اپنے پہننے والے کے الھڑ پن اور بے نیازی کی زبانِ حال سے شکایت کر رہا تھا، جگر صاحب بڑی گرمجوشی سے ملے، ان کی محبت، تواضع اور التفات کو دیکھ کر، احساسِ فخر و محبت کے بار سے جھکا جا رہا تھا۔

جگر مرحوم تین دن بجنور میں رہے، شعر خوانی کی مسلسل محفلیں رہیں، یہ تینوں دن جگر صاحب کے لیے خشک گزرے، ان کی تواضع دہی کی لسّی اور دودھ کے شربت سے کی جاتی۔ ایک دن گھٹا چھائی ہوئی تھی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، جگر صاحب کی آنکھوں میں سرخ ڈورے آ گئے تھے، مگر ملک نصراللہ خان عزیز، مولانا حامد الانصاری غازی (مدیرانِ "مدینہ") اور میں، ہم میں سے کسی نے بھی جگر صاحب کی تشنہ لبی پر ترس نہیں کھایا، اور انہیں اپنی طبیعت پر جبر کر کے دودھ کا شربت ہی پینا پڑا، وہ بھی سوچتے ہوں گے اور شاید پچھتاتے بھی ہوں کہ کن ملاؤں میں آن کر پھنس گیا ہوں کہ بھری برسات میں بھی "تر" نہیں ہونے دیتے۔

ایک رات دفتر مدینہ میں چھوٹا سا مشاعرہ بھی ہوا، سو کے قریب سننے والوں کی تعداد ہو گی۔ ۱۹۳۳ء میں جگر صاحب کی خاصی شہرت ہو گئی تھی مگر ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ ان کی شعر خوانی کی خبر سن کر سارا شہر امنڈ آئے۔ ہر باکمال اور فن کار کو مشہور اور مقبول ہوتے ہوتے زمانہ لگتا ہے! میرے کہنے پر جگر صاحب مرحوم نے اپنی تازہ غزل لکھ کر دی، مطلع تھا:

جواب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
تو پھر ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا

میں غزل کو پڑھنے لگا، تو نیم طنز آمیز لہجہ میں بولے:۔

"آپ چاہیں تو بھرتی کے شعر چھانٹ دیں"۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت! جتنے شعر آپ نے لکھ دیے ہیں، وہ سب کے سب اخبار میں چھپیں گے۔ میری یہ مجال کہاں کہ آپ کی غزل سے شعر نکال دوں۔

حضرت جگر سے اس پہلی ملاقات میں بے تکلفی تو نہیں ہوئی مگر اجنبیت باقی نہیں رہی، اُن کے دل کا جو حال رہا ہو، یہ تو وہ جانیں، میں نے اپنے کو اُن سے بہت زیادہ قریب پایا۔

اس کے بعد پھر کوئی چار پانچ سال تک حضرت جگر سے کہیں ملاقات نہیں ہوئی پہلی ملاقات کے بعد اتنا طویل خلا ایسا تھا کہ وہ مجھے بھول جاتے تو ان سے کوئی شکایت نہ رہتی۔ میری ملاقات نے حضرتؒ جگر کے دل و دماغ پر کوئی منقش چھوڑ دیا ہو، اس کی میں امید رکھتا تو بہت بڑی غلط فہمی اور خود فریبی کا ثبوت دیتا مگر جے پور کے آل انڈیا مشاعرے میں (غالباً ۱۹۳۷ء تھا) جو ملنا ہوا تو اس محبت سے ملے، جیسے میں انہیں اچھی طرح یاد ہوں اور وہ اپنی طبیعت کی بے نیازی اور عالم بیخودی و سرشاری کے باوجود مجھ خاک نشین کو بھول نہیں سکے۔ جے پور کا یہ مشاعرہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ اس سے پہلے شاید ہی کہیں ہندوستان میں ایسا مشاعرہ ہوا ہو، مشاہیر شعراء میں شاید ہی کوئی شاعر چھوٹا ہو مجھ جیسے چھٹ بھیئے شاعر تک وہاں موجود تھے۔ باسط بسوانی مرحوم کا آج کوئی نام تک نہیں جانتا وہ تک اس مشاعرے میں شریک تھے۔ حکیم الشعراء حضرت امجد حیدر آبادی دکن سے باہر کسی مشاعرے میں نہیں گئے، مگر اس مشاعرے میں انہیں دیکھا گیا۔ یادگار ہوٹل میں شاعروں کے قیام و طعام کا انتظام تھا، حضرت جگر بار بار میرے کمرے میں تشریف لاتے تھے اور چلے جاتے تھے، ایک صاحب سے میرا تعارف ان لفظوں میں کرایا ——— "کریٹک (C R T I C) ہیں کریٹک ۔"

بات کرنے میں جگر صاحب کی زبان اُلجھ رہی تھی مگر میں اسی میں خوش ہو گیا کہ جگر صاحب کا مجھ ہیچ مداں کو "کریٹک" فرما دینا ہی بہت بڑی بات ہے۔

ایک شاعر نے میرے پاس آکر بڑے رازدارانہ انداز میں کہا کہ یہ جگر صاحب جو تمہارے کمرے میں بار بار آتے ہیں اس کا سبب تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا، پھر اُن کی تشنہ لبی کی طرف اشارہ کیا، مگر میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ پیش نہیں آیا۔ سر تیج بہادر سپرو کے داماد رائے بہادر امرناتھ اٹل ریاست جے پور میں وزیر تھے، وہی مشاعرے کے صدر تھے بلکہ اس کے محرک، بانی اور روح رواں بھی تھے۔ ان کی شاندار کوٹھی میں شب میں شعراء کی نشست تھی، جام و مینا کا بھی اہتمام تھا، جگر صاحب وہاں آئے اور آئے کیا یوں کہیے لائے گئے، مگر اس حال میں کہ انہیں سر پیر کا ہوش نہ تھا۔ پوری طرح مست و سرشار، اس عالم میں ایک ہی بات اُن کی زبان سے بار بار نکلتی تھی ——— وہ یہ کہ ——— "اُن کے لیے تُنیدری چاہیے ......"

یہ وہ زمانہ ہے جب مین پوری میں ان کا زیادہ تر قیام رہتا تھا، اُن کے مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" کی بہت سی غزلیں اُسی دورِ محبت و سرشاری کی یادگار ہیں، جس نے "مجاز" کو "قنطرۃ الحقیقت" کہا ہے، اس نے تجربہ کے بعد ہی کہا ہے۔ اس مشاعرے کے سال ڈیڑھ سال بعد ریاست ٹونک میں جگر مرحوم سے ملاقات ہوئی، احسان مرادآبادی اور راز مرادآبادی اُن کے ساتھ تھے اور وہ راز صاحب ہی کے کسی عزیز کے مکان میں قیام فرما تھے، باقی شعراء سرکاری مہمان تھے۔ دن میں نواب صاحب کے خاص محل میں طرحی مشاعرے کی نشست ہوئی، فرشی نشست! تمام درباری اور سامعین قرینے سے چاندنی پر بیٹھے ہوئے، نواب صاحب کی مسند وسط میں تھی، ابھی وہ آئے نہیں تھے، اُن کا انتظار ہو رہا تھا۔ اُن کی مسند کے آس پاس زیادہ جگہ نہ تھی مگر حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی وہاں گھس کر اور بھینچ کر بیٹھے۔ ہز ہائی نس نواب سعادت علی خان مرحوم والی ٹونک کے آتے پر مشاعرہ کا آغاز ہوا، حضرت جگر نواب صاحب سے خاصی دور پر تشریف فرما تھے، مشاعرے کے بعد نواب صاحب تیر کی طرح تیز قدموں کے ساتھ سیدھے جگر صاحب کے پاس پہنچے اور بڑی محبت کیساتھ فرمایا:۔

"جگر صاحب ہاتھ تو ملایئے"

ایک والیٔ ریاست اور شہنشاہِ تغزل کے مصافحہ کا یہ منظر دیدنی تھا، پھر نواب صاحب مجھ سے ملاقاتی ہوئے اور تحسین آمیز الفاظ فرمائے۔

ایک دن شب میں نواب صاحب کے ولی عہد کے یہاں ڈنر تھا، سب لوگ کھانا کھا چکے تو ہز ہائی نس تشریف لائے، آتے ہی جگر صاحب کو دریافت کیا، انہیں بتایا گیا کہ جگر صاحب دوسرے عالم میں ہیں، یہاں آنے کے قابل ہی نہیں ہیں، اس پر وہ بولے:

"جگر کی شراب میں چھڑا دوں گا ..... میں ....." حالانکہ وہ خود نشہ میں دھت تھے، ہاتھوں میں رعشہ تھا اور پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔

مقصودِ گزارش یہ ہے کہ اُس تہی دستی کے زمانے میں بھی جگر مرحوم کو یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ ایک اسٹیٹ کا فرمانروا اُن سے متاثر ہے اور اس کی ذات سے مالی منفعت اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے، ایسے "زرین مواقع" کی جگر نے کبھی پروا نہیں کی، وہ ہر دور میں خود اپنی طبیعت کے بادشاہ رہے۔

جس دن میں ٹونک سے روانہ ہو رہا ہوں، اس دن ڈاک بنگلے میں تشریف لائے۔ شام کا وقت تھا، مجھ سے کہا، اپنی کوئی غزل سناؤ، میں نے غزل سنائی اور یہ شعر سن کر :-

الجھیں تیرے رخسار سے گستاخ نگاہیں ۔۔۔ تو اور ہو مجروحِ تماشا مرے آگے
دیکھی ہے مری آنکھ نے کلیوں کی تباہی ۔۔۔ اٹھا ہے تبسم کا جنازا مرے آگے

اتنے روئے، اتنے روئے کہ ہچکی بندھ گئی! گریہ وزاری کے اس عالم میں کلیجہ پکڑ کر آہ کرتے اور "اللہ" منہ سے نکلتا۔

حضرت جگر کا یہ دورِ سرشاری خاصا طویل رہا ہے، اُن کی میکشی کسی ضابطہ اور حد کی پابند نہ تھی۔ بلور کے پیمانے میں قیمتی شراب ہو یا مٹی کے کورے سکورے میں دیسی کچی ہوئی، سچ مچ بلانوش اور دُرد آشام! کئی کئی دن تک مسلسل یہی شغل، دنیا جہان کیا خود اپنے سے بے خبر، اُن کے کپڑوں کی کھانے پینے اور رہنے سہنے کی دوسرے دل کو فکر رہتی تھی، انہیں کچھ ہوش نہ رہتا۔ یہ واقعات بھی شاید شعر و ادب کی تاریخ میں یادگار رہیں گے کہ وہ زاہدانِ متقشف جو جامِ شراب کو چھونے تک کو معصیت سمجھتے تھے، اُن تک نے جگر کی خاطر شراب کا اہتمام کیا ہے لالچ یہ کہ اس عالم میں جگر کے تغزل اور نغمگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں گے۔ ایک تو جگر کی شاعری، پھر اس پر قیامت اُن کی آواز، وہ جہاں بھی بیٹھ جاتے، ذرا سی دیر میں وہاں اچھی خاصی محفل جم جاتی —— "انجمن ساز شاعر" اور خود اپنی ذات سے انجمن بھی!

اس دورِ سرشاری میں مشاعروں میں اس ہیئت سے پہنچتے —— بال بکھرے ہوئے، تیوری چڑھی ہوئی، پاؤں میں لغزش، اُن کو دیکھتے ہی مشاعرے میں دھوم مچ جاتی، انگلیاں اٹھنے لگتیں اور اشارے ہوتے، کسی کسی کی تو جوشِ مسرت سے چیخ نکل جاتی۔ مشاعرے میں بیٹھ کر جگر صاحب اچھے شعر پر داد بھی دیتے اور بُرے شعر پر سرِ محفل ٹوک بھی دیتے۔ گھٹیا شعر سن کر وہ اپنے وجدان کی ناگواری کو ظاہر کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اُن کی اس بے جھجک کھلی ہوئی تنقید سے اچھے اچھے شاعر گھبراتے تھے! کسی دن نشہ زیادہ ہوتا تو دو تین آدمیوں کے سہارے اسٹیج تک پہنچتے، جھوم جھوم کر شعر پڑھتے، سارے مشاعرے پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا، کبھی کبھی یہ عالم بھی دیکھا گیا کہ انہوں نے ——

" اے محتسب نہ پھینک "

ترنم سے پڑھا اور تھوڑی دیر کے لیے غافل ہو گئے، مصرع کا باقی حصہ مشاعرے والوں نے دہرایا کہ

مرے محتسب نہ پھینک "

اس کے بعد ذرا سے چونکے، اور مصرع ثانی:

؎ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

اسی والہانہ انداز میں پڑھا اور مشاعرے پر شراب سی برسادی۔ کئی منٹ تک یہی شعر مشاعرے میں گونجتا رہا، بڑے بڑے خشک مولویوں کی زبان سے " ارے ظالم شراب ہے " کی تکرار سنی گئی۔

ایک بار کوئی صاحب انہیں دلی کے کسی بڑے رئیس کے یہاں لے کر گئے۔ وہ صاحب بڑے ہی کروفر سے مسند پر متمکن تھے اور انداز امیرانہ سا تھا، جگر صاحب مرحوم اس تبختر کو بھلا کہاں برداشت کرنے والے تھے، بے ساختہ بولے:

میاں چلو! یہ کس مرغ زریں کے پاس تم مجھے لے آئے۔"

وہ رئیس اور ان کے حالی موالی بس دیکھتے ہی رہ گئے اور جگر صاحب یہ جا وہ جا! اس عالم میں ان کا سمند ناز کسی کے روکے رکتا کب تھا۔

حضرت جگر کے دن سید ھے تھے اور ان کی عاقبت کو بخیر ہونا تھا کہ وہ تو کسی نہ کسی طرح اس عہد مستی کو نباہ کر اس چکر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گئے، مگر جو کوئی شاعر جگر کی زندگی کے اس دور کی تقلید کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا۔ کمزوریاں چاہے وہ کتنے ہی بڑے آدمی کی کمزوریاں کیوں نہ ہوں لائق تقلید نہیں بلکہ مستحق ترک و اجتناب ہوتی ہیں۔

۱۹۴۳ء میں بنگلور میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا، اس میں دوسرے شعراء کے علاوہ جگر اور اختر شیرانی مرحوم بھی تھے، یہ شخص شراب نوش نہیں بلا نوش تھا، دن رات یہی شغل! مشاعرے میں ان کی باری آئی تو نشہ کی تیزی کے سبب شعر تک ٹھیک سے نہ پڑھے جاتے تھے۔ اختر شیرانی نے احسان دانش سے اپنے شعر پڑھنے کے لیے کہا وہ

لہ حافظہ کو اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی دوسرے صاحب ہوں مگر گمانِ غالب یہی ہے (م۔ق)

انجان ہو گئے، روش صدیقی سے التماس کیا تو انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا، مجھ سے کہا تو میں نے اُن کی کئی غزلیں پوری قوت سے پڑھیں، شاید اپنی غزلیں بھی اس اہتمام سے نہ سناتا، مشاعرے میں اختر شیرانی کو خاصی داد ملی۔ مشاعرے کے بعد وہ آبدیدہ ہو کر بولے کہ:

"جگر خود تو نکل گئے مگر مجھے اس دلدل میں پھنسا گئے۔"

جگر صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو بولے:

"وہ خود شراب کا رسیا ہے، میں اسے اس راہ پر کب سے کو ڈالتا۔"

یہ واقعہ ہے کہ جگر صاحب نے کسی دوسرے کو شراب کا چسکا نہیں لگایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی نے اُن کی دیکھا دیکھی خود ہی اپنے شوق سے شراب شروع کر دی ہو! وہ دوسرے شعراء ہیں جنھوں نے دانستہ نوخیز شاعروں کے کردار کو بگاڑا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو تباہ کیا ہے۔

حضرت جگر نے اپنی رندی و میکشی پر کبھی فخر نہیں کیا بلکہ اس پر ہمیشہ ندامت ہی محسوس کی، ان کا ضمیر ہر آن چٹکیاں لیتا رہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟؟ انہوں نے اس عادت کو اپنے نفس کی کمزوری ہی سے سدا تعبیر کیا۔ یہی احساسِ ندامت اُنہیں گھنٹوں رلاتا تھا اور وہ اپنے اللہ سے عفو و مغفرت طلب کرتے تھے۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ میں شعرگوئی کو بہت مقدس سمجھتا ہوں اس لیے میں نے شراب پی کر کبھی شعر نہیں کہا! یہی احساسِ ندامت تھا، جو انہیں توبہ و انابت تک لے گیا یہاں تک کہ جس کی جیب میں شراب کی بوتل رہتی تھی، وہ اب نماز پڑھنے کے لیے مُصلّا ساتھ رکھتا تھا اور میکدوں کے چکر لگانے والے کو طوافِ کعبہ اور زیارتِ روضۂ رسولؐ کی سعادت نصیب ہوئی۔

میں نے حضرت جگر کی سرشاری کا تھوڑا سا زمانہ دیکھا ہے، میرے اور اُن کے درمیان روابط کا آغاز اُن کی ترکِ مے نوشی کے بعد ہوا ہے، اگر خدانخواستہ وہی عالم تھا تو یہ رفاقت دیر تک نہ چل سکتی، دوستی اور روابط کے لیے طبیعتوں کی مناسبت اور مشرب کی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔

جو کہتا ہے غلط کہتا ہے کہ ترکِ میکشی کے بعد جگر مرحوم کی شاعری میں کیف نہیں رہا، خشکی پیدا ہو گئی، جو کوئی بھی جگر کی شاعری کے بارے میں ایسا خیال رکھتا ہے وہ بے ذوق

ہے، جگر کی شاعری کا یہی دور تو بہترین دور ہے، پہلے کے مقابلہ میں ان کی فکر کس قدر نکھر گئی ہے، ان کے کلام میں کس قدر پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ کتنے نازک مسائل انہوں نے غزل کی زبان میں ادا کیے ہیں، تغزل کا کتنا رچاؤ ہے، زبان کا کیا چٹخارہ ہے، واردات و محاکات کی کس قدر صحیح عکاسی ہے، جو کوئی جگر کے اس قسم کے شعروں کے سبب۔

؎ توبہ کو توڑ تاڑ کے لہرا کے پی گیا

جگر سے متاثر ہے، اس نے جگر کو سمجھا ہی نہیں، جگر کی اصل شاعری تو یہ ہے:

جو کوئی سن سکے تو نکہتِ گُل   شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

جمال اس کا چھپائے گی کیا بہارِ چمن   گلوں سے دب نہ سکی جس کی بوئے پیراہن

اب لفظ و بیاں سب ختم ہوئے اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا، اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

یہ میخانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے   یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے
شکستِ دل، شکستِ غم نہیں ہے   مجھے یہ بھی سہارا کم نہیں ہے

تغزل کا یہ وہ کیف ہے، جس پر ہزاروں میخانے بے دریغ قربان کیے جا سکتے ہیں "شعلۂ طور" کی گرمیٔ جلوہ اپنی جگہ مسلم مگر آتشِ گل کی دہک نے تو اردو غزل کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ لوگ وہسکی اور شیمپین کی مستی سے شاعری کے کیف کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر شاعری کی اور توہین کیا ہو سکتی ہے! شاعری خود اپنی جگہ بوئے گل بھی ہے اور موجِ صہبا بھی ہے، اسے کسی "مصنوعی مستی" کے سہارے کی کیا ضرورت ہے۔

جگر مرحوم سے عقیدت و محبت کے ساتھ، جو بے تکلفی اس نیاز مند کو حاصل تھی، اس کا دور کے لوگوں کو شاید یقین بھی نہ آئے ——— میں ان کی شاعری اور ان کی زندگی پر جس آزادی کے ساتھ خود انہی کے سامنے جیسی تنقید کرتا رہا ہوں، کسی دوسرے کو اس کی ہمت ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ ان کی نوازش اور عالی ظرفی تھی کہ میری کسی بات کا وہ برا

نہیں مانتے تھے۔ بعض اوقات اُن پر تنقید کرکے خود سوچتا تھا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا؟ اس

بات کو اس طرح کہنا نہیں چاہیے تھا، میرے اور ان کے درمیان کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی، حضرت جگرؔ حقیقی شاعر، غزل گو کو سمجھتے تھے۔ وہ شاعری میں تفصیل کے نہیں اجمالُ اشاریت کے قائل تھے، نظم کہنے والے کو "وہ ناظم" کہتے تھے، اس موضوع پر میری اُن کی نہ جانے کتنی بار شدید بحثیں ہوئی ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی شاعری بھی بارہا معرضِ بحث میں آئی ہے، اس معاملے میں اُن کے اور میرے نقطۂ نگاہ میں خاصا اختلاف تھا لیکن ہماری کوئی بحث ناگواری پر ختم نہیں ہوئی، وہ اپنے موقف پر جمے رہے، میں اپنی بات پر قائم رہا۔

میرے سوا حضرت جگرؔ مرحوم کے کسی دوسرے دوست اور شناسا کی کب مجال ہو سکتی تھی کہ وہ اُن کے ہاتھ سے رمی کھیلتے میں تاش کے پتے چھین کر کہے کہ اس خرافات کو اب بند کیجیے، اس پر اُن کی پیشانی پر تھوڑی دیر کے لیے شکنیں تو ضرور ابھریں مگر ذرا سی دیر میں یہ سطح ہموار ہوگئی اور وہ مسکرا کر پاس بیٹھنے والوں سے کہنے لگے:

" ان ماہرؔ صاحب کو ہمارے دوست فانیؔ بدایونی " ماہر دُ " کہا کرتے تھے، ان کے ناز ہمیں بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں ......"

میں نے اُن کی غزل سُن کر یہ تک کہا ہے کہ فلاں شعر غزل میں نہ رہے تو زیادہ اچھا ہے، اس طرح تمام اشعار ہموار ہو جائیں گے۔

اب سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے کہ جگرؔ صاحب اور میں کلکتہ کی سیر کرتے ہوئے کھڑک پور کے مشاعرے سے واپس ہو رہے تھے، اس زمانے میں وہ یہ غزل کہہ رہے تھے۔

جہاں سے گزریں گے سرفروشانہ کارنامے سُنا کریں گے
وہ اپنے دل کو ہزار روکیں مری محبت کو کیا کریں گے

اُن کی نئی غزل کا یہ مطلع سُن کر میں نے عرض کیا مصرعِ اولیٰ کو بدلیے، یہ مصرعِ ثانی کے جوڑ کا نہیں ہے۔ اس پر قدرے طنز آمیز انداز میں فرمایا:

" پہلا مصرع آپ فرما دیجیے، خدا کی قسم میں قبول کر لوں گا۔

میں نے ایک بار ان کا شعر یوں گنگنایا:

ترکِ الفت بجا سہی ناصح
اور[1] اُن تک اگر یہ بات گئی

---

[1] جگرؔ مرحوم کا مصرع ہے — لیکن اُن تک اگر یہ بات گئی۔

اس پر جگر مرحوم نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا — میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں کیا کروں مجھے دوسرے شاعروں کے بعض اشعار ترقی یافتہ صورت میں یاد رہتے ہیں!

اب سے تقریباً تین سال پہلے کی بات ہے، ملتان کے ایک مشاعرے میں اُن کا ساتھ ہوگیا، صابر دہلوی صاحب کے یہاں قیام تھا، وہاں انھوں نے اپنی تازہ غزل سنائی، جس کے دو تین شعر ملتان ہی میں کہے تھے، میں نے عرض کیا اس غزل کے دو تین شعر کمزور ہیں، یہ نہ رہیں تو اچھا ہے، میری مشورت پر چہرے کا رنگ ذرا سا متغیر ہوا، مگر میری بات مان لی، اور وہ شعر قلمزد کر دیے۔

کراچی ہی میں کسی صاحب کے یہاں دعوت تھی، کھانے کے بعد شعر و شاعری ہوئی، حضرت جگر مرحوم نے ایک خاصی طویل غزل سنائی، میں نے کہا کہ "حضرت! آپ غزل سناتے ہیں، تو اپنی غزل کا ایک شعر بھی نہیں چھوڑتے۔"

جگر مرحوم "اضطراب" کی "ط" اور "التفات" کی "ت" کو فتحہ کے اعلان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے ٹوکا کہ یا تو "ط" اور "ت" کو بالکسر پڑھنا چاہیے — یا پھر اس طرح کہ زیر اور زبر دونوں کا اظہار نہ ہو۔

حضرت جگر مرحوم نے زیارتِ حرمین سے واپس آکر، نہایت اثر انگیز اور پُرجوش فارسی نعت کہی، جس کا مطلع ہے:

اے از لبِ صادقت شنیدہ نادیدہ خدا، خدائے دیدہ

اس نعتیہ غزل کا ایک شعر یوں تھا:

رحمت بہ اشارۂ تو رقصاں جنّت بہ نگاہت آرمیدہ

میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے پر "رقصاں" ہونا بہت کچھ کھٹکتا ہے۔ اس سے تو "جُنبیاں" اچھا ہے، کئی دن کے بعد یہ نعت انھوں نے سنائی تو "رقصاں" کی جگہ "جوشاں" پڑھا۔

ایک بار مجھ سے بولے، نہ جانے کیوں حرمِ کعبہ میں میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے تھے، میں نے برجستہ جواب دیا۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ شیطان

کو جس مقام پر نیکی کے جس کام میں اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ بندہ کو خیر و ثواب کا زیادہ سے زیادہ حصہ ملے گا، وہاں اس کا حملہ بھی شدید تر ہوا کرتا ہے۔

حضرت جگرؔ مرحوم کا ایک شعر اُن کی زبان سے سُن کر میں نے کہا کہ مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوا، اس میں کچھ الجھاؤ رہ گیا ہے، اس پر وہ بولے، تو میں کیا

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے تیری گائے بنائی

جیسے پھیکا نہ اور سپاٹ شعر کہا کروں۔

ایک دن مجھ سے شکایت کے انداز میں فرمانے لگے کہ دعوتوں کی وہ بھرمار ہے کہ آرام کرنے کو ترس گیا ہوں۔ پھر اُس پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی طبیعت کا بھی عجب رنگ ہے، لوگ نہ ہوں تو آپ کو تنہائی کھلتی ہے اور عقیدت مندوں کا مجمع ہو تو وہ گراں گزرتا ہے۔

ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ جنت میں جب ہر طرح کا عیش و آرام ملے گا اور کوئی طلب و جستجو ہی نہ ہوگی تو آدمی بے عمل اور نکما ہو کر رہ جائے گا، میں نے اس کے جواب میں طویل تقریر کر ڈالی، بہت توجہ سے سنتے رہے، میں نے آخر میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی تمنا جنت میں بھی رہے گی اور تسبیح و تہلیل سے جو اہل جنت کی زبانیں تر رہا کریں گی، یہ خود اپنی جگہ ایک "شغل" ہے! پھر دوزخیوں کے عذاب کو دیکھ کر جنت والوں پر حمد و شکر کی جو کیفیت طاری ہوگی، اس کی ہما ہمی اور ولولہ انگیزی کا کیا پوچھنا!

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حضرت جگرؔ مرحوم کو "ڈاکٹریٹ" کا اعزاز ملنے کی خبر جب اخباروں میں چھپی، تو میں نے اُن کو خط لکھا،

"اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی، مگر میں آپ کو "ڈاکٹر جگرؔ" لکھ کر اپنی بد مذاقی کا ثبوت نہیں دوں گا ۔۔۔۔۔"

کھڑگ پور کے مشاعرے کا ابھی ابھی ذکر آچکا ہے، اُس کے بعد میں نے جگرؔ صاحب سے کہا کہ یہاں سے کلکتہ بہت قریب ہے، جب یہاں آنا ہوا ہے تو کلکتہ کی بھی سیر کیوں نہ کی جائے، جگرؔ کئی بار کلکتہ دیکھ چکے تھے مگر صرف میری دلدہی کے لیے تیار ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ کلکتہ میں کسی جاننے والے سے ملیں گے جُلیں گے نہیں، اجنبیوں کی

طرح کلکتہ کی سیر کریں گے۔ مدرسہ عالیہ کے قریب ایک گمنام شاعر کے یہاں ٹھہرے اور تین چار دن تک کلکتہ کی سیر کرتے رہے۔ جس دن وہاں سے روانہ ہو رہے ہیں، اس دن اتفاق سے راستے میں حضرت وحشتؔ مرحوم سے ملاقات ہو گئی۔

جگرؔ صاحب کو لکھنؤ جانا تھا اور مجھے دہلی، راستے میں بنارس پڑتا تھا، میں نے جگرؔ صاحب سے عرض کیا کہ ایک دو دن کے لیے بنارس اتر دوں گا، وہاں کی "صبح" کی بچپن سے تعریف سن رکھی ہے۔ بولے بنارس میں میرے ایک مخلص دوست ہیں، میں انہیں خط لکھے دیتا ہوں، تم اُن کے یہاں ٹھہرنا وہ تمہیں سیر بھی کرا دیں گے اور اُن کے یہاں قیام میں تمہیں ہر طرح کا آرام بھی ملے گا ——— میں بنارس میں حضرت جگرؔ کی معیت کا متمنی تھا اللہ تعالیٰ نے ایک بات سُجھا دی، تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے عرض کیا۔

"حضرت! میں اس طرح اجنبی لوگوں کے یہاں تعارفی خط لے کر مہمان بننے اور ٹھہرنے کا عادی نہیں ہوں، میں تو وہاں کے کسی ہوٹل میں قیام کروں گا ..... مگر میں نے سُنا ہے کہ بنارس کے ہوٹلوں میں بڑے عیش ہوتے ہیں، مجھ سے کوئی لغزش ہو گئی، تو.....!"

اس پر جگرؔ صاحب نے اپنے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے قدرے تامل فرمایا اور پھر بولے، اچھا بھئی! میں بھی تمہارے ساتھ بنارس اتر دوں گا، مگر تمہیں میرے ساتھ ہی ٹھہرنا ہوگا۔

بنارس میں نذیرؔ بنارسی کے بڑے بھائی کے یہاں، جو طبابت کا پیشہ کرتے تھے، ہم نے کئی دن قیام کیا، وہاں دعوتیں بھی رہیں، شعر و سخن کی محفلیں بھی جمیں، کشتی میں سوار ہو کر بنارس کی صبح بھی دیکھی اور شام کا بھی نظارہ کیا۔

کراچی میں ایک صاحب کے یہاں کھانے کے بعد شعر خوانی کا سلسلہ شروع ہوا، عورتیں پردے میں بیٹھی تھیں، میں غزل پڑھ چکا، تو میں نے حضرت جگرؔ سے کہا آپ کوئی صوفیانہ قسم کی غزل سُنا دیجیے، اس پر انہوں نے مزاحاً فرمایا :۔

"جی نہیں! میں آپ سے کم بد معاش نہیں ہوں۔"

میرے یہاں جگرؔ صاحب کے اعزاز میں دعوت تھی، بے تکلف احباب کا جمگھٹا تھا، انہوں نے اپنی تازہ غزل سنائی، جس کا مطلع ہے :

آدمی آدمی سے ملتا ہے   دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

جب وہ غزل سنا چکے، تو میں نے کہا کہ اس غزل کا ایک شعر تو چھوٹ ہی گیا۔ میں نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

جو جگر سے کبھی نہیں ملتا ــــ ماہر القادری سے ملتا ہے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا، اور جگر صاحب نے خاص طور سے لطف لیا، دوسرے دن صبح کو جب میں اُن سے ملنے کے لیے گیا، تو بٹوے سے پچاس روپے نکالے، اور مجھے دینے لگے۔

"یہ کیا ہے؟ ــــ میں نے دریافت کیا

"یہ تمہارے رسالہ "فاران" کا چندہ ہے" ــــ بڑی سادگی سے فرمایا،

میں سمجھ گیا کہ رات جو اُن کی دعوت میرے یہاں تھی، اُس کے مصارف کا بار ہلکا کرنے کے لیے یہ مہربانی فرمائی جا رہی ہے۔ میں نے تند لہجے میں کہا:

"یہ نوازشیں آپ دوسروں پر ہی کیا کیجیے، میرے اور آپ کے درمیان ایسی باتوں کا ذکر تک نہ آنا چاہیے، بس! ان نوٹوں کو آپ اپنے بٹوے ہی میں رہنے دیجیے۔"

انہوں نے نوٹ تو بٹوے میں رکھ لیے مگر شرما سے گئے، ہونٹوں پر مضمحل سی مسکراہٹ اور تیور پر ہلکی سی شکن بھی!

بمبئی میں ایک دن شام کو میں نے کہا کہ فلاں صاحب نے موٹر کار بھیجی ہے، چلیے میرن ڈرائیو چلیں، اس پر جگر صاحب بولے:

"ماہر! تم بڑے مناظر پرست واقع ہوئے ہو، سیر سپاٹے کا بہت شوق ہے میاں! شاعر تو وہ ہے کہ خود مناظر اس کا طواف کرنے کے لیے آتے ہیں، وہ مناظر کے پیچھے نہیں دوڑتا۔"

اُن کے اس کہنے پر میں اٹھ بیٹھا اور جاتے ہوئے بولا:

"میں تو چلا، آپ شوق سے یہیں رہیے، اب کوئی دم میں مناظر آپ کا طواف کرنے کے لیے آیا ہی چاہتے ہیں ــ"

مجھے جاتا دیکھ کر روک لیا، خاص انداز میں فرمایا:

"میرا یہ مقصد نہیں تھا ــــ وہ ایک تاثر ہوتا ہے ــــ زندگی کی

نفسیاتی کیفیت ...... (پاس بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے)
جی ہاں! یہی کیفیت...... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، مگر تم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو......"

پھر وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گئے اور ہم کار میں بہت دیر تک بمبئی کے ساحل کی سیر کرتے رہے۔

ایک بار جگر صاحب سے دلی میں ملاقات ہو گئی، وہ کسی مشاعرے سے آئے تھے، اور محلہ بلیماراں میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کے دو تین عقیدت مند بھی ان کے ساتھ تھے، وہ پیدل کہیں جا رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی بولے "بھئی! تم خوب مل گئے، تمہارے ساتھ کسی ہوٹل میں ناشتہ کرنے کو جی چاہتا ہے، اس کا بار تمہاری جیب پر پڑے گا!" میں نے عرض کیا میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں! اب انہوں نے یہ کیا کہ جو کوئی جاننے والا راہ میں ملا، اسے اپنے ساتھ لے لیا یہاں تک کہ ہوٹل پہنچتے پہنچتے ساتھیوں کی یا یوں کہیے "ناگہانی مہمانوں" کی تعداد دس بارہ کے قریب ہو گئی۔ ہر آدمی کے اضافے پر وہ میرے چہرے کی رنگت کو دیکھ دیکھ کر لطف لیتے جا رہے تھے۔ فراش خانہ کے قریب ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا، اس میں یہ قافلہ داخل ہوا، جس کے امیر حضرت جگر مرادآبادی تھے اور مجھ سے اس کی رسد کی فراہمی کا انتظام متعلق تھا! جگر صاحب نے سب سے پوچھا کہ کیا منگایا جائے؟ اس پر آرڈر دینے شروع ہوئے، بسکٹ چلے آ رہے ہیں، شامی کبابوں کی پلیٹ آئی اور ذرا سی دیر میں صاف ہو گئی، کوئی صاحب فرنی انگلی سے چاٹ رہے ہیں کسی کے ایک ہاتھ میں سنبوسہ ہے اور اس نے دوسرے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑ رکھی ہے۔ جگر صاحب بار بار مجھے دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہیں، کبھی ہنس بھی دیتے ہیں، آخر میں "بل" آیا، بارہ تیرہ روپے کے قریب! میں نے بل کی رقم چکائی، وہاں سے اٹھتے ہوئے بولے:

"ماہر صاحب! آج آپ کو ستانے کو جی چاہتا تھا، چھیڑ مقصود تھی، اور اس چھیڑ نے بڑا لطف دیا......"

میں نے بھی ایک بار جگر صاحب کے ساتھ چھیڑ کی "فاران" کا خاص نمبر نکل رہا تھا، اس کے لیے نظم دینے کا وہ کراچی میں زبانی وعدہ فرما چکے تھے، میں نے گونڈے کے پتے پر انہیں دو تین خط لکھے مگر جواب نہیں آیا، آخر جھنجلا کر میں نے انہیں ایک اور

خط لکھا کہ یہاں کراچی میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہو رہا ہے، اتنی رقم آپ کی خدمت میں پیش کی جائے گی، کیا آپ آسکیں گے! میرے اس خط کا جواب انہوں نے برقت دیا اس پر میں نے جگر صاحب مرحوم کو لکھا کہ یہاں کوئی مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو رہا ہے آپ کا اس طرح امتحان لینا اور چھیڑ مقصود تھی، مخلص احباب کے خطوں کے جواب دینے میں اب سے تساہل نہ برتا کیجیے!

حضرت جگر وضع کے بہت پابند تھے، جس سے جیسے تعلقات تھے اُن کو اسی طرح نباہتے۔ کسی دوست کے یہاں بچوں کو انہوں نے ایک بار دس روپے دے دیے، تو اب جب بھی اُس دوست کے یہاں جاتے یہ رقم بچوں کو ضرور دیتے! نہ جانے اُن کا کتنا روپیہ اس وضعداری کی نذر ہو جاتا۔

یار لوگ اُن کے بٹوے سے، جیب سے اور صندوق سے روپے چُرا لیتے، [illegible] غائب کر دیتے۔ دعوتوں میں بڑے آدمیوں اور افسروں کو بُلا کر جگر صاحب کی شخصیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے۔ اس چیز نے اُن کی طبیعت میں بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا کر دی تھی، اس لیے بعض وقت اُن کی بدگمانی "وہم" بھی ثابت ہو جاتی اور طبیعتوں کو کھٹکتی، اگر آزمائے ہوئے دوستوں اور شناساؤں سے بدگمان نہیں ہوتے تھے۔

جگر مرحوم کی ذات اور شخصیت میں بڑی محبوبیت اور دلکشی پائی جاتی تھی، یہی سبب تھا کہ جس شہر میں بھی جاتے لوگ انھیں سچ مچ آنکھوں پہ بٹھاتے اور ان کی قیام گاہ پر میلہ سا لگا رہتا، کراچی میں انہوں نے مہینوں قیام کیا۔ مگر دعوتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، کسی کے یہاں شام کو چائے، کہیں ڈنر، کسی جگہ صبح کا ناشتہ، کسی کے گھر پہ نہاری کی دعوت، کہیں کباب اور ریڈیو کا پروگرام! اُن کی طبیعت کا یہ رنگ تھا کہ ملنے والوں سے اکتا بھی جاتے اور جب اتفاق سے کوئی ملنے کو نہ آتا اور تنہائی ہوتی تو بھی اُن کا جی گھبراتا! جگر صاحب کے مشتاقانِ دید کا یہ عالم تھا کہ جگر صاحب تاش کھیل رہے ہیں، دو دو گھنٹے تک کسی آنے جانے والے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، مگر یار لوگ ہیں کہ انہیں گھیرے بیٹھے ہیں، اور اس طرح گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی نہیں اکتاتے اور جگر صاحب سے بددل نہیں ہوتے۔

میں نے ایک بار اپنی نظم سنائی، جس کا مطلع ہے:

قصرِ استبداد کی بنیاد ڈھا سکتا ہوں میں
ظلم کے شعلوں کو پھونکوں سے بجھا سکتا ہوں میں

اس پر جگرؔ صاحب مرحوم بولے:

"یہ "ہو سکتا ہوں میں" کیا بات ہوئی، جب ایسا کر سکتے ہو تو کر کیوں نہیں دیتے، آج کل شاعری میں عجیب رواج چل گیا ہے، کوئی صاحب فرماتے ہیں "...... کر کے چھوڑوں گا" کوئی صاحب کہتے ہیں "...... یہ کر کے رہوں گا" ـــــ میں کہتا ہوں کہ جو تمہارے امکان میں ہے، اُسے کر کیوں نہیں گزرتے"

جناب جوشؔ ملیح آبادی نے ایک محفل میں نظم بڑے طمطراق سے پڑھی، طویل نظم تھی، اور بھاری بھرکم ترکیبیں، محفل ختم ہونے کے بعد جگرؔ صاحب نے فرمایا:

"یہ شاعری کیا ہوئی، مُگدر ہلانا ہوا"

عورتوں کی شعر گوئی کے مخالف تھے، کہا کرتے تھے کہ "عورت" تو خود شعر کا موضوع ہے، اس پر شعر کہا جاتا ہے نہ کہ وہ دوسروں پر شعر کہے ......!

اُن کی غزل کا مطلع ہے:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی، کہاں گزرے

کسی مشاعرے یا دعوت میں پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ ہوتیں تو اس شعر میں "زہرہ جبینوں کی جگہ" "ماہ جبینوں" پڑھتے۔

حضرت جگرؔ ذائقہ دار کھانوں کا شوق رکھتے تھے، سُنا ہے کہ اپنے گھر پر خاصے اہتمام سے کھانا کھلاتے تھے، مجھ سے بارہا فرمایا کہ کبھی گونڈے آؤ گے تو "ماش کی دال" خاص طور سے تمہیں کھلاؤں گا، مگر اس سعادت کا مجھے موقع ہی نہیں مل سکا۔

حضرت جگرؔ ایسی دعوتوں میں جا کر خوش نہیں ہوتے تھے جہاں شعر خوانی لازمی ہو کہ اس سے کسی طرح مفر ہی نہ ہو سکے، خاص طور سے ایسی صحبتوں کو وہ بہت زیادہ پسند کرتے تھے، جہاں شاعروں کو چائے کی ایک ایک پیالی پلا کر، گھنٹوں اُن کا کلام سُنا جائے! ایک دعوت میں صاحبِ خانہ نے شعر خوانی کا مطالبہ نہیں کیا، اس پر جگرؔ صاحب خوش ہو کر بولے:

"آپ (میزبان سے مخاطب ہو کر) بڑے اچھے آدمی ہیں، نہایت اچھے! شاعروں کے صحیح قدردان ...... آپ نے شعر خوانی کا اپنی طرف سے مطالبہ نہیں کیا، مگر اب ہم اپنی خوشی سے شعر سنائیں گے۔"

چنانچہ جگر صاحب اور دوسرے شاعروں نے اپنا کلام سنایا اور جگر صاحب اس محفل سے خوش ہو کر اٹھے۔

اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا، بڑے قرینے سے لباس تبدیل کرتے، مگر دو چار گھنٹے کے بعد لباس ملگجا سا ہو جاتا، یہی میری حالت ہے کہ دوپہر کو بدلے ہوئے کپڑے شام ہوتے ہوتے میلے ہو جاتے ہیں! جگر صاحب کپڑا اور جوتا مول لینے کی بڑی پرکھ رکھتے تھے، موزوں کا خاص طور سے شوق تھا۔ بعض وقت ایک ایک درجن موزے جمع ہو جاتے! رومالوں کی یہ کثرت کہ ایک ہفتے میں کئی کئی رومال کھو دیتے۔

مجھے سفر میں سب سے زیادہ الجھن بستر کھولنے اور باندھنے میں ہوتی ہے ایک سفر میں جگر صاحب نے دیکھا کہ مجھ سے ٹھیک ٹھیک طرح بستر سنبھل نہیں رہا ہے، وہ مسکرا کر بڑھے اور اپنے ہاتھ سے میرے بستر کو باندھا۔

حضرت جگر کے سہو و نسیان کا یہ منظر بھی بارہا دیکھا ہے کہ کنجیوں کے گچھے کے لیے پریشان ہیں، ڈھونڈ رہے ہیں، جھنجلا رہے ہیں.... مگر وہ ان کے پاجامے کے ازار بند ہی میں نکل آیا، یا تکیے کے نیچے سے برآمد ہوا۔

شعر خوانی ہو، برج ہو، رمی ہو، شطرنج یا فلش یا بلیرڈ ہو وہ کسی بات میں کسی دوسرے سے پیچھے رہنا گوارا نہ کرتے، ان میں مسابقت کا خاصا شدید جذبہ پایا جاتا تھا، تاش کھیلنے میں ہارنے لگتے تو جھنجلا جاتے، کسی نے غلط پتا پھینکا اور اس پر خفا ہونے لگے، تاش کے پتوں کو بار بار شفل (Shuffle) کرتے، ساتھیوں کی نشستیں بدلواتے اور تاش کے پتے بانٹنے میں ایک آدھ پتا ادھر ادھر کر دیتے! ہر کھیل بڑے انہماک سے کھیلتے پوری طرح ڈوب کر۔

سنا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی قدرے لحن سے شعر پڑھتے تھے، ڈاکٹر اقبال جب اپنی نظمیں حمایت اسلام کے جلسوں میں سنایا کرتے تھے، تو ان کی شعر خوانی بھی نیم مترنم ہوتی تھی، اردو شاعری میں بھرپور ترنم کا آغاز غالباً سائل دہلوی سے ہوا ہے مگر حضرت

جگر کے ترنم نے تو شعر خوانی کی "دنیا ہی بدل دی" ان کی آواز میں کس قدر رس اور اُن کے گلے میں کتنا نور تھا، اُن کی شعر خوانی کی یہ خصوصیت تھی کہ ترنم اور موسیقی کے فرق کو باقی رکھا اور شعر پڑھنے کو "گانا" نہیں بننے دیا، شعر پڑھنے میں کہیں کہیں ایسا کھٹکا بھی لگا دیتے کہ سننے والے دل پکڑ کر رہ جاتے۔ وہ شاعر نہ ہوتے تو اسحٰق موصلی کی طرح بہت بڑے موسیقار اور نغمہ ساز ہوتے۔

تیرا تصور شب ہمہ شب

اپنی اس غزل کو جگر صاحب جب پڑھتے تو "شب" کے "ش" اور "ب" کے درمیان لہجے کو نیم افقی اور نیم عمودی بنا دیتے۔ جس سے نغمگی کا حسن دوبالا ہو جاتا! پاکستان اور ہندوستان کے نوے فیصدی شعراء ترنم میں جگر کی تقلید کرتے ہیں، اسی لیے جگر صاحب دُھنیں بدلتے رہتے تھے، مگر بعض غزلیں وہ دوسروں کی دھنوں میں کچھ دن سے پڑھنے لگے تھے ــــ مثلاً وہ اپنی غزل ــــ

مگر بنتا ہے اب خنجر بکف ساغر شکن ساقی

اپنی نکالی ہوئی دُھن میں نہیں پڑھتے تھے

جگر صاحب ناک نقشہ اور رنگ کے اعتبار سے خوب صورت کیا قبول صورت بھی نہیں تھے، مگر شعر پڑھتے میں حسین نظر آتے، ہائے! شعریت و نغمگی کا یہ حسین امتزاج اب کہاں دیکھنے میں آئے گا۔

حضرت جگر کو جو قبولِ عام، شہرت، محبوبیت اور عام پسندیدگی حاصل تھی، اس کی مثال دنیائے شاعری میں بہت کم ملے گی، طوائفوں کے بالاخانوں اور ایکٹرسوں کے شبستانوں سے لے کر قصر و ایوان اور مدرسہ و خانقاہ تک اُن کے کلام کی دھوم مچی ہوئی ہے، اُن کی شاعری ہر طبقے میں پسند کی جاتی ہے! اُن کے شعروں کو لوگ تبرک کی طرح ایک دوسرے کے پاس لے جاتے ہیں!

اُن کی غزلوں کا یہ عالم رہا ہے کہ

جواب بھی نہ تکلیف فرمایئے گا   تو پھر ہاتھ ملتے ہی رہ جایئے گا

سال دو سال ہندوستان میں گونجتی رہی، اور اس پر سینکڑوں غزلیں کہی گئیں اس کے بعد:-

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی ہر نقشِ ماسوا کا مٹاتی چلی گئی

اس غزل نے دھوم مچادی اور اس پر سینکڑوں شاعروں نے طبع آزمائی کی۔ اس طرح اُن کی ایک ایک غزل شہر شہر اور قصبہ قصبہ مہینوں موضوعِ گفتگو اور عنوانِ لطف و کیف بنی رہی ہے۔

میں نے بڑے درجہ کے قومی لیڈروں، صوفیوں، عالموں، گورنروں، وزیروں، ہائی کورٹ کے ججوں، نوابوں، رئیسوں اور اعلیٰ عہدیداروں کو جگر صاحب مرحوم سے عقیدت کیساتھ پیش آتے دیکھا ہے، مشاعروں کی تو وہ جان اور رونق و آبرو تھے، تین سال ہوئے جب وہ کوئٹہ کے مشاعرے سے کراچی واپس ہو رہے تھے، تو نہ جانے ریلوے جنکشنوں پر اُن کے وہاں سے گزرنے کی کیسے خبر پہنچ گئی کہ اُن کے دیکھنے کے لیے لوگوں کا خاصا جمگھٹا ہو گیا۔

اُن کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بمبئی کے ایک بہت بڑے ودوان سادھو اور مہنت (غالباً دکشت جی نام تھا) نے، حضرت جگر مرحوم کو اپنی پاٹھ شالہ میں بلایا، اور اُن کی خدمت میں "مان پتر" (اور کیسہ زر پیش کیا۔

خواجہ ناظم الدین صاحب جن دنوں پاکستان کے گورنر جنرل تھے، تو گورنر جنرل ہاؤس میں دوبار محفلِ مشاعرہ حضرت جگر کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ گورنر جنرل سے لے کر وزیروں، سیکرٹریوں اور دوسرے اعلیٰ عہدیداروں تک، سب کے سب جگر ہی کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب کی تمنا تھی کہ جگر صاحب پاکستان میں مستقل طور پر اقامت اختیار کرلیں، ایک ہزار روپے ماہوار کی آمدنی اور ساز و سامان سے لیس مکان (Furnished House) کی پیشکش کی گئی مگر حضرت جگر ترکِ وطن کے لیے آمادہ نہیں ہوئے لیکن ساتھ ہی ارضِ پاک سے اُن کی دلچسپی کا یہ عالم بھی تھا کہ آٹھ آٹھ مہینے مسلسل یہاں قیام کیا ہے۔

بمبئی میں فلم کمپنی کے ایک ڈائرکٹر نے جگر صاحب سے فلمی گانے لکھنے کے لیے بہت اصرار کیا تو نیم راضی ہو گئے، اس نے پانچ ہزار روپے بھی پیشگی دے دیئے، جگر مرحوم اور میں رام پور نمائش کے مشاعرے سے فارغ ہو کر لائل پور جا رہے تھے، مراد آباد میں رام گنگا کے پل پر بس جو ٹھہری، تو ہم دونوں بس سے نیچے اتر گئے، مجھ سے بولے میں فلمی گانوں کے لیے پیشگی رقم لے چکا ہوں، تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے خیالات سے تو آپ واقف ہیں کہ ہر قسم کے عیش و تفریح اور مالی

منفعت کے باوجود فلمی ماحول سے بھاگ کھڑا ہوا، بولے میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میں غلاظت کرید رہا ہوں، اس طرح مجھے تنبیہہ فرمائی گئی ہے کہ میں اس کام میں ہاتھ نہ ڈالوں۔ پھر انہوں نے بمبئی جاکر پانچ ہزار کی رقم واپس کر دی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس ردِ منکر کا یہ بدلہ دیا کہ نواب معظم جاہ بہادر کے مجموعۂ کلام پر نظرِ ثانی کا انہیں بمبئی ہی میں خاصا معقول معاوضہ مل گیا۔

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم خود شاعر تھے، فلسفی تھے، اچھی خاصی علمی شہرت رکھتے تھے، علامہ اقبالؒ کی ہم نشینی کا بھی انہیں شرف حاصل تھا، اس لیے شاعروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ایک بار انہوں نے اپنی تقریر میں شاعروں پر طنز کی۔ دورانِ تقریر میں اُن کی نظر جگر صاحب پر پڑ گئی تو چونک کر بولے:

"میں شاعرہ باز شاعروں کا ذکر کر رہا تھا، جگر صاحب تو ایسے شاعر ہیں کہ جو بات کئی کئی صفحوں میں کہی جاتی ہے، اُسے یہ ایک مصرع میں کہہ دیتے ہیں!"

انجمن ترقی اردو پاکستان کے ایک مشاعرے میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا:

"یہ مشاعرہ جگر صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ ہر مشاعرہ جگر صاحب ہی کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ میں جب دلی میں تھا تو جگر صاحب انجمن کے دفتر میں تشریف لاتے، ادھر ادھر دیکھتے اور چپکے سے ایک رقم انجمن کے لیے مجھے دے دیتے۔"

اتنی بڑی شخصیت اور اس شہرت کے باوجود مشاعرے میں کسی خوش الحان شاعر کو داد مل جاتی، تو جگر صاحب اُس شاعر سے متاثر بھی ہو جاتے۔ ایک بار کراچی کے مشاعرے میں ایک شاعر کو بہت داد ملی، جگر صاحب نے دوسرے دن اُن شاعر صاحب کی تعریف کی اور ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا، میں نے کہا:

"جگر صاحب! آپ بھی مشاعرے کی داد کا اثر قبول فرماتے ہیں، اسی شاعر نے یہی غزلیں علی پور کے مشاعرے میں سنائی تھیں، وہاں اس کو داد نہیں ملی، تو آپ نے ان غزلوں کا ذرہ برابر نوٹس تک نہیں لیا پھر یہی شاعر صاحب گھنٹوں آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے کوئی توجہ

نہیں فرمائی.....“

اس پر جگر صاحب نیم فلسفیانہ انداز میں دو تین جملے فرما کر، آئے ہوئے لوگوں سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مجھ ناچیز کے ساتھ اُن کی محبت و شفقت کا یہ معاملہ رہا ہے کہ میں اُن سے ملنے کے لیے پہنچا، خوش ہو کر مجھے دیکھتے ہی فرمایا:

”بھئی خوب وقت پر آئے، ہاں! آج شب میں ایک نہایت اچھے شخص کے یہاں دعوت ہے (دعوتوں کے آپ بادشاہ نہیں شہنشاہ ہیں، روز ہی آپ کی دعوت رہتی ہے —— میں بیچ میں بول پڑا) میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو بھی اُس میں چلنا ہوگا۔ (دیکھئے جگر صاحب میں اس دعوت میں ہرگز نہیں جاؤں گا، آپ نے اُن سے میرے لیے کہا ہوگا، وہ خود میرے پاس کیوں نہیں آئے —— میں نے جواب میں کہا) میں بھلا تمہاری ذرا سی بھی سُبکی گوارا کر سکتا ہوں، ایک چیز ہوتی ہے اخلاص، دلی تعلق، شرافت مروت کا احساس، وہاں چند دوست ہوں گے، مخلص اور بے تکلف...“

بہرحال اُن کے اصرار کرنے پر میں نے دعوت میں چلنے کی ہامی بھر لی، اور اُن کو اور زیادہ شگفتہ بنانے کے لیے مزاحًا اُن سے پوچھا:

”یہ تو فرمائیے، کچھ جادوے بھی ہوں گے، وہاں........“

اس پر جگر صاحب پاس بیٹھے ہوؤں کی طرف مخاطب ہو کر بولے:

”ان مولینا ماہر کی مذہبیت مصنوعی ہے، اصل مزاج رنگین اور رندانہ ہے۔“

کراچی کے بعض مشاعروں میں لوگ اُن کو دعوت دینے کے لیے گئے، تو سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ ”کیا ماہر..... بھی اس مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں۔“ میری شرکت کا حال سُن کر وہ نیم راضی تو اُسی وقت ہو گئے!

ایک بار غریب خانہ پر دن کے ایک بجے سے رات کے نو بجے تک رہے، دوپہر کا کھانا، اُن کی فرمائش کے مطابق بالکل سادہ تھا، شب میں چند احباب کی دعوت تھی، ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں میرے ساتھ پڑھیں، شب میں بولے ——

”آج کا دن بہت ہی خوب گزرا۔“

سفر میں مُصلا جگر مرحوم کے ساتھ رہتا تھا، جب بھی اللہ تعالیٰ توفیق دیتا نماز پڑھتے تو بڑی توجہ اور یکسوئی کے ساتھ پڑھتے، رکوع و سجود اور قعود و قیام میں خشیت جھلکتی ہوئی۔

حضرت جگر (اعلی اللہ مقامہٗ) شروع شروع میں شیعہ تھے، پھر اپنی ذاتی تحقیق سے اس مسلک کو ترک کیا، اپنے اس چھوڑے ہوئے مسلک سے بیزاری میں وہ بہت شدید تھے۔

شخصیتوں کے بارے میں، حضرت جگر مرحوم اور میرے درمیان اکثر اتفاقِ رائے، اتحادِ خیال بلکہ یوں کہیے "توارد" ہو جاتا، اب سے چند سال قبل میں نے فاران میں مولانا ابوالکلام آزاد پر جو مضمون (پردہ اٹھتا ہے) لکھا تھا، اُسے بہت زیادہ پسند کیا اور بہت سوں کو پڑھنے کے لیے دیا، زمانہ ساز صوفیوں اور پیروں سے وہ سخت بیزار تھے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے علماء حق سے جگر صاحب کو بڑی عقیدت تھی، اُن کی فارسی غزل پر، جس کا مطلع ہے:

بہ سرِ تو ساقیٔ مستِ من، بہ سرورِ بے طلبی خوشم
اگرم شراب نمی دہی بہ خمارِ تشنہ لبی خوشم

مولانا تھانوی نے ایک یا دو شعر کہہ دیے تھے، اس کا اظہار بڑے فخر و مسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

لاہور میں جگر مرحوم کا قیام تھا، میں بھی کسی مشاعرے سے ہوتا ہوا اُدھر آنکلا، مجھ سے بولے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملنا چاہتا ہوں! میں نے کہا، مولانا موصوف سے ملاقات بڑی آسانی سے ہو سکتی ہے، میں ٹیلیفون کر کے اُن سے وقت لیے لیتا ہوں، دن اور وقت مقرر ہوا، جگر صاحب اور میں مولانا کی قیام گاہ پر پہنچے، آدھ گھنٹہ تک ملاقات رہی، چائے کا دَور بھی چلا، جگر مرحوم مولانا کی متانت و سنجیدگی اور عالمانہ وقار سے خاصے متاثر ہوئے۔

مجھ سے آخری ملاقات بمبئی کے "جشنِ میر تقی میر" کے مشاعرے میں ہوئی تھی، بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملے، نخشب صاحب جارچوی اس جشن کے بانی تھے۔ انھی نے سمندر کے کنارے جوہو کے ایک شاندار بنگلے میں رہنے کا انتظام کیا تھا، ایک شب وہاں

گزاری، یہ رات بہت دنوں تک یاد رہے گی، پھر ایک ایسی رات بھی دیکھی کہ خلافت ہاؤس کے ڈنر کے بعد موسیقی کی ایک محفل میں جگر مرحوم پر دل کا دورہ پڑا، اور حالت بہت زیادہ غیر ہو گئی، اُن کی ناسازیٔ طبع کے سبب ساری محفل ہی درہم برہم ہو گئی۔ برف کی مانند سرد بدن سے بے تحاشا پسینہ چھوٹ رہا تھا، ڈاکٹر آئے، انجکشن لگے، دوا پلائی گئی، تب جاکر اُنہیں افاقہ ہوا، تیسرے دن طبیعت سنبھل چکی تھی، مجھ سے بولے، دو چار دن کے لیے بمبئی رُک جاؤ، جو ہو کے اُسی بنگلے میں جاکر رہیں گے، یہ شام کا وقت تھا دفاتر بند ہو چکے تھے، میرے ویزا کی میعاد میں صرف ایک دن رہ گیا تھا، دوسرے دن گیارہ بجے ہوائی جہاز سے میری روانگی تھی، صبح سویرے میری قیام گاہ پر اپنا آدمی دوڑایا اور پیغام بھجوایا، کہ جس طرح ہو سکے تم ضرور رُک جاؤ! مگر ویزا میں توسیع کا اتنے تنگ وقت میں انتظام ممکن نہ تھا، میں تلملاتا ہوا بمبئی سے روانہ ہو گیا۔

حضرت جگر مرحوم نے "آتشِ گل" (ہندوستانی ایڈیشن) کا انتساب اپنے جن چند بزرگوں اور مخلص دوستوں کے نام کیا ہے، اُن میں ایک نام اس نیاز مند کا بھی ہے، یہ کتاب گونڈہ سے بھجوائی، اپنے قلمِ خاص[1] سے یہ عبارت لکھی۔

"ہدیۂ مخلصانہ، اپنے دیرینہ عزیز و مخلص دوست الحاج .... ماہر القادری صاحب کے لیے۔"

جگر مراد آبادی، گونڈہ، ۱۶ مارچ ۱۹۵۹ء

پھر کتاب کی پشت پر انگریزی میں تحریر فرمایا:

Presented to

Mahirul Qadri Saheb

by

Jigar Moradabadi 15.3.59

بیماری کے زمانہ میں کئی خط مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجے، افسوس ہے کہ مجھ

---

[1] حضرت جگر مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ، پختہ، دلکش اور جاذبِ نظر تھا، قلم ہاتھ میں ہوتا تو کاغذ پر پھول پتیاں بنا کر ذرا سی دیر میں ایک مرقع تیار کر دیتے۔

کم بخت نے جگر صاحب ہی کے نہیں دوسرے اکابر اور مشاہیر کے خط بھی ضائع کر دیے، مجھے اپنی طبیعت کے اس لاابالی پن پر بعض وقت خود غصہ آتا ہے! جب لکھنے کی سکت نہ رہی تو یہ کرتے کہ خط تو دوسروں سے لکھواتے اور آخر میں دستخط ثبت فرما دیتے! جب حالت اور زیادہ غیر ہو گئی تو اُن کے بعض احباب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے "خیریت نامے" آنے لگے، حضرت جگر مرحوم کے عزیز ترین دوست جناب تسکین قریشی، میرٹھ سے اُن کی بیماری کی کیفیت لکھ کر بھیجتے رہتے۔

جگر مرحوم کو شہرت، قبولِ عام اور عزت و اکرام کی تمام بلندیاں میسر تھیں، مالی طور پر بھی اُن کو کوئی فکر نہ تھی، مگر اک اندرونی خلش تھی جو اُنھیں بے چین رکھتی تھی اور ایک ذہنی اضطراب تھا جو اُن کی آسودگی کا حریف تھا، ان کا یہ شعر:

صد آرزوئے خوشگوار و سرگراں لیے ہوئے
پھرا کرے گی زندگی کہاں کہاں لیے ہوئے

اُن کے حالات کی تھوڑی بہت ترجمانی کرتا تھا۔

خانگی زندگی کی الجھنوں سے دور رہ کر، اگر وہ کسی دوسرے مقام پر رہتے تو کیا عجب تھا، دو چار برس اور کھنچ جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے جس جان کے لیے جو آخری ساعت مقرر فرما دی ہے وہ بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتی، آخر کار وہ اپنے لاکھوں عقیدتمندوں اور چاہنے والوں کو غمزدہ اور سوگوار چھوڑ کر دنیا سے چل بسے، ان کی موت کا کسے پُرسا دیجیے کہ ہم خود اپنے کو پُرسے کا مستحق سمجھتے ہیں۔

جگر کی موت پر پاکستان اور ہندوستان میں جو کہرام برپا ہوا ہے، اس کی نظیر کسی ادیب شاعر کے سانحۂ رحلت میں نہیں ملتی، چند دن کے اندر سینکڑوں نظمیں اور مضامین ان پر لکھے جا چکے ہیں اور شہر شہر اور قصبہ قصبہ اُن کے تعزیتی جلسے منعقد ہوتے ہیں، ان کے احباب کا یہ عالم ہے کہ جناب فضل کریم فضلی جو اپنے چھوٹے بھائی کی موت کے غم کو سہار گئے تھے، حضرت جگر کے تعزیتی جلسوں میں ہونٹوں کو دانتوں سے دبانے پر بھی آنسوؤں کو نہ روک سکے۔

جس نے لاکھوں دلوں میں جگرؔ کی محبت ڈال دی ہے، اُسی کی رحمت، مرنے والے کو اپنی آغوش میں لے کر قبر سے لے کر یوم الحساب تک کی ہر منزل کو آسان بنا دے گی! (آمین)

(ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۶۰ء)

پی آئی اے کا خونیں حادثہ

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

مئی ۶۵ء کو قاہرہ کے ہوائی اڈے سے چند میل کے فاصلہ پر پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن (P.I.A) کے ہوائی جہاز کو جو المناک خونیں حادثہ پیش آیا اور اس میں جتنی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں ان پر خون کے آنسو رو کر بھی تعزیت کا تھوڑا سا حق ادا نہیں ہو سکتا، اس روح فرسا خبر نے پورے پاکستان کو ماتم کدہ بنا دیا تھا، ملک گیر المیہ، کئی دن تک افق پر رنج و الم کی دھند چھائی رہی۔ پائیلٹ سے لے کر ایئر ہوسٹیس تک پی، آئی، اے کا بہترین تجربہ کار اسٹاف اس خاص فلائٹ اور نئے خطِ پرواز کے لیے منتخب کیا گیا تھا، اس جہاز میں بعض ایسے صحافی بھی تھے جن کا بیرون ملک کے لیے یہ پہلا سفر تھا۔ کس چاؤ اور ارمانوں کے ساتھ انہوں نے کراچی سے پرواز کی تھی۔ سیر و سیاحت کی کیسی کیسی امنگیں اُن کے دلوں میں انگڑائیاں لے رہی تھیں، قاہرہ کے شاندار ہوٹلوں میں ان کے لیے کمرے پہلے سے محفوظ کرا دیے گئے تھے۔ مگر اس پرواز پر کارکنانِ قضا و قدر نے "آخری سفر" کی مہر لگا دی تھی، یہ لوگ قاہرہ کے راستے دراصل ملکِ عدم کی طرف جا رہے تھے یہ اُن کا سفر آخرت تھا!

پی آئی اے کا شاندار، پرشکوہ اور آرام دہ طیارہ ہواؤں سے اٹھکھیلیاں کرتا ہوا قاہرہ ایئرپورٹ پر چند منٹ میں اترنے والا تھا، مسافر قاہرہ کے جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ اتنے میں شدید دھماکہ ہوا اور جہاز میں آگ لگ گئی — بس پھر آگ، لہو، چیخیں، ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں، جلے ہوئے چہرے، جھلسے ہوئے بدن، موت کے فرشتے کو خدا معلوم کتنی بہت سی روحیں بیک وقت قبض کرنی پڑیں۔ ہوائی جہاز کے دھماکے نے نہ جانے کس مسافر کے جسم اور ہڈی پسلیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور آگ کے خوفناک شعلوں میں کس کی جان کس طرح نکلی، یا اللہ تیری پناہ! اور تیری شانِ بے نیازی

کو سجدے! اے حیات و موت کے مالک، تیرے نام کی تکبیر! بے شک ہر جاندار کی چوٹی تیرے دستِ قدرت میں ہے! جس کے لیے جو وقت اور جس طرح کی بھی موت لکھ دی گئی ہے اُس سے بال برابر تجاوز نہیں ہو سکتا:

کیا بھروسا ہے زندگانی کا　　آدمی بلبلہ ہے پانی کا!!

مگر یہ بلبلہ، کتنا سرکش اور خودنگر واقع ہوا ہے، موت کو بھولا ہوا، آخرت سے غافل سر سے پاؤں تک اور دل سے نگاہ تک دنیا کے مکروہات میں غرق و مدہوش!

جن خبر رساں ایجنسیوں نے اس المناک حادثہ کی اطلاع دی تھی وہی اس المیہ بلکہ "خونخواریہ" کے بھی ذمہ دار ہیں کہ ایک طرف ہوائی جہاز کے شعلوں میں لوگ جل رہے تھے، کچھ سسک رہے تھے اور دم توڑ رہے تھے اور بعض کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں کہ اتنے میں مصر کے فلاحین کی ایک ٹولی نے وہاں آکر لوٹ مار شروع کر دی! یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی سنگدلی، خونخواری، کمینگی اور دنائت کے آگے شیطان بھی کان ٹیکتا ہے۔

مجھے ۲۱ مئی کو دن کے گیارہ بجے میرے ایک عزیز نے ٹیلی فون کے ذریعہ اس حادثہ کی اطلاع دی، خبر سنتے ہی میں نے گھبراکر کہا خالد تو ان دنوں چین کی فلائٹ پر مامور ہے جواب ملا، "ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے"! تین بجے کے قریب دل میں کھٹک سی پیدا ہوئی۔ میں نے پی، آئی، اے کے مرکزی دفتر سے دریافت کیا کہ اس ہوائی جہاز پر نیویگیٹر کون تھا! قدرے توقف کے بعد جواب میں کہا گیا —— "لودی" اس نام کو سن کر دھچکا لگا۔ میں سوچ میں پڑ گیا، دل ہی دل میں کہا ایک محکمہ میں "لودی" نام کے ایک سے زاید آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس تاویل پر میں زیادہ دیر تک مطمئن اور قانع نہیں رہ سکا، تیزی کے ساتھ ٹیلیفون کا ڈائل گھمایا، گھنٹی بجنے لگی، اُدھر سے ایک خاتون نے "P.I.A" پوری طرح کہا بھی نہ تھا کہ میں جلدی سے بول پڑا، نیوی گیٹر کا پورا نام بتلایئے، آپ کے یہاں خالد ضیا لودی بھی تو ہیں، خاتون نے قدرے توقف کے بعد غمگین لہجے میں کہا، جی ہاں! کے، زیڈ لودی ہی اس فلائٹ پر گئے تھے۔ میں نے بیوی کو یہ غمناک خبر سنائی۔ یہ ان کے حقیقی بھانجے کے حادثہ کی خبر تھی۔ وہ برسوں سے بیمار بلکہ صاحبِ فراش ہیں، اس خبر کو سن کر ان کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا جیسے کسی نے آناً فاناً اُن کے بدن سے لہو کھینچ لیا۔ خبر انتہائی دہشت ناک اور جاں گداز تھی مگر ابھی آس باقی تھی۔ ہوائی حادثہ میں لوگ بچ بھی

تو جاتے ہیں؟ بیوی وضو کرکے دعا کے لیے سجدے میں گر پڑیں۔ میں نیری کے ساتھ اپنے فلیٹ سے ——— اتر کر نیچے گلی میں آیا، سواری کی اور اپنے ہم زلف کے یہاں پہنچا ان کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا، خالد مرحوم کی ماں کا بُرا حال تھا، ان کی دلدوز چیخیں سن کر دل ہلے جاتے تھے وہ جو ایک کمزور سی آس لگی ہوئی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ بھی تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئی۔ یعنی اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ جو چار پانچ آدمی زندہ بچے ہیں ان میں خالد ضیا لودی نہیں ہیں۔

خالد وجیہہ و تندرست خوبرو نوجوان، عمر ۳۱ سال سے بھی کچھ مہینے کم تھی، ماں باپ کا فرمانبردار بیٹا، پی آئی اے کا آزمودہ کار نویگیٹر، ماہانہ تنخواہ الاؤنس کے ساتھ مل کر تین ہزار سے بھی زائد تھی۔ نیا بنگلہ، نئی موٹر، بیاہ رچائے ہوئے گیارہ مہینے ہوئے تھے۔ گھر پر سچ مچ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، راحت و آسودگی کی وہ جمی جمائی بساط ہی الٹ گئی، گھرانے کا روشن مستقبل ہی دھندلا گیا، نوجوان بیوی کا سہاگ لٹا، بھائیوں کی قوتِ بازو جاتا رہا اور ماں باپ کے جگر کا ٹکڑا آگ کے شعلوں کی نذر ہوگیا، نہ میت کا آخری دیدار نہ جنازہ اٹھا نہ قبر بنی۔

جلنے اور ملنے والوں میں حضرت مولانا امین احسنؒ اصلاحی کے بڑے صاحبزادے ابو صالح[1] اصلاحی بھی اس حادثہ کا شکار ہوئے، وہ کئی سال تک روزنامہ کوہستان کی ادارت سے وابستہ رہے اور اپنی صحافتی قابلیت کے نقش قائم کردیے۔ تقریباً تین سال سے روزنامہ "مشرق" کے مدیر اعلیٰ تھے، پریس ٹرسٹ سے تعلق کے سبب اُن کی صحافتی حیثیت تو آزاد نہ رہی تھی مگر تنخواہ ڈیڑھ ہزار سے کچھ زائد ہی ہوگی، موٹر نشین تھے، بنگلے میں رہتے تھے، گھریلو زندگی بہت زیادہ خوش گوار تھی۔ مجھ سے آخری ملاقات پنڈی میں ہوئی تھی، پشاور تک ہوائی جہاز میں ساتھ رہا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی شریکِ سفر تھے یہ اب سے تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کوہِ الم کو مومنانہ شان اور صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا۔ مولانا موصوف پر مرحوم بیٹے کی یتیم اولاد کی ذمہ داری آن پڑی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کی رفاقت فرمائے (آمین)۔

---

[1] جون کے "فاران" میں جو اداریہ (نقشِ اوّل) شائع ہوا ہے وہ اس حادثہ سے قبل لکھا جا چکا تھا، مولانا موصوف کی خدمت میں راقم الحروف نے تعزیت نامہ بھیجا تھا! سنا ہے مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی صاحب کے غمکدے پر جاکر تعزیت کی تھی۔

"حلقہ ادب اسلامی" جب کراچی میں قائم تھا، تو سبط فاروق فریدی اس میں شریک ہوا کرتے تھے، اُن کا تعلق انگریزی صحافت سے تھا مگر اردو میں اُن کے مقالے بڑے جاندار ہوتے۔ مذاکرہ میں کوئی ان پر سخت سے سخت لفظوں میں تنقید کرتا، تو بھی برا نہ مانتے، ان کے افکار میں سنجیدگی کے ساتھ دین کی اسپرٹ نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی۔

سبط فاروق مرحوم کا روزنامہ "ڈان" سے برسوں تعلق رہا اس کے بعد وہ مارننگ نیوز سے متعلق ہو گئے اور اپنی صحافتی قابلیت کی بدولت نیوز ایڈیٹر بن گئے! ان کے چھوٹے بھائی کا ایک حادثہ میں دو سال پہلے انتقال ہوا تھا، اُن کے چھ بچوں کے وہ کفیل اور سرپرست تھے۔ سبط فاروق مرحوم نے بھی چھ بچے چھوڑے ہیں، اتنا بڑا ٹبر اور نمک کی کنکری تک کا بظاہر سہارا اور بندوبست نہیں! مگر اللہ تعالیٰ کی شانِ رزاقی کا اعجاز ایسے ہی نازک موقعوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ واللہ خیر الرازقین!

پروفیسر خورشید احمد کے چھوٹے بھائی ممتاز طارق بہت سے بہت تیس سال کے ہوں گے، نہایت ذہین، بارسوخ اور سمجھ بوجھ والے! دس گیارہ سال سے انگریزی صحافت سے منسلک تھے اپنی ذہانت اور حسنِ تدبیر کی بدولت کویتی سفارت خانہ کے پریس اتاشی ہو گئے۔ دو تین سال سے ان کے معاشی حالات میں بڑی آسودگی پیدا ہو گئی تھی اور مستقبل اور زیادہ روشن امکانات سے تابناک نظر آتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا دانہ پانی اٹھ چکا تھا، دودھ پیتا بچہ، جوان بیوہ اور سوگوار بھائیوں کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے پھر کوئی اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتا۔

معجز منصور روزنامہ "حریت" کے "قطعہ نگار شاعر" اور اس کے حلقہ ادارت سے وابستہ تھے بعض مشاعروں میں اُن کی زبان سے نظمیں بھی سنیں، راقم الحروف سے جب بھی کسی مشاعرے یا دعوت میں ملاقات ہوتی نیاز مندانہ انداز میں ملتے، ان کی شاعری میں جمہوریت اور دین و اخلاق کی جھلک پائی جاتی تھی آمریت اور مطلق العنانی پر انہوں نے بڑی بڑی چوٹیں کی ہیں۔ ان کی شاعری اور شخصیت کی نمود کا اب وقت آیا تھا کہ قاہرہ کا ہوائی سفر اُن کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔

پی آئی اے کا ہوائی جہاز کسی ٹیلے سے ٹکرا گیا؟ انجن میں خرابی پیدا ہو گئی؟ مشین کے کسی کل پرزے پر کام کرنے والوں کا غلط ہاتھ پڑ گیا؟ یا کسی سازش کا اس کی تباہی

میں ہاتھ تھا ؟ ـــــــ بس اب عقلی تیر تکے ہی لڑاتے رہیے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

بہار آئی اور آتی رہے گی
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

اس حادثے کے بعد سے دل کا یہ عالم ہے کہ ہوائی جہاز کی آواز سن کر طبیعت کو عجیب سی وحشت ہونے لگتی ہے مگر وقت کی رفتار کے ساتھ یہ تاثر دھیما پڑتا جا رہا ہے۔ آدمی حادثوں اور سانحوں ہی کے فکر و غم میں ڈوب کر رہ جائے تو دنیا کے کاروبار چوپٹ ہو جائیں، جہاں سے جراحتیں ملتی ہیں وہیں سے مرہم بھی تو ملتا ہے۔

ہم موت اور اس کے تصور سے کتنا ہی گریز کریں مگر موت ایک نہ ایک دن آ کر ہی رہے گی۔ یہ دن تو ہر کسی کو دیکھنا ہے! اللہ تعالیٰ اس حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کی مغفرت[1] فرمائے۔ (آمین)۔

(ماہنامہ "فاران" جولائی ۱۹۶۵ء)

---

[1] غیر مسلم متوفین کو جن میں قادیانی بھی شامل ہیں۔ اہلِ ایمان "مرحوم" نہیں "آنجہانی" لکھتے ہیں اور مغفرت کی دعا مسلمان ہی کے لیے کی جاتی ہے۔

مولانا ماہرالقادریؒ ہندوپاک کے معتبر ادیب وناقد اور ہر دل عزیز شاعر تھے۔

اصل نام منظور حسین صدیقی تھا لیکن قلمی نام ماہرالقادری اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام دب کر رہ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اپنے آبائی وطن کسیر کلاں، بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ شعری ذوق انہیں اپنے بزرگ ومحب رسولؐ والد حضرت معشوق علی ظریف سے ورثے میں ملا تھا۔ کم عمری سے ہی شعر گوئی فرمانے لگے تھے، والد محترم کی وفات کے بعد سلسلۂ تعلیم ترک کر کے کچھ دنوں اپنے پیرومرشد حضرت مولانا عبدالقدیر بدایونیؒ کے پاس بدایوں میں قیام کیا۔ پھر مولانا ہی کی معیت میں حیدرآباد چلے گئے، وہاں چند برس گزارنے کے بعد کچھ دنوں "مدینہ" بجنور سے منسلک رہے، اس کے بعد دہلی آئے اور "الجمعیۃ" سے وابستہ ہوگئے۔ تقسیم وطن کے بعد کراچی چلے گئے "فاران" جاری کیا۔ فاران نے ہندوپاک کے اہل علم وفن کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا اور ہر حلقۂ فکر میں مقبولیت حاصل کی۔

مرحوم نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ دونوں ہی اصناف میں ان کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ مثلاً درِ یتیم، کاروانِ حجاز، مے خانے، کانچ ہاؤس، نقش توحید، نغماتِ ماہر، محسوساتِ ماہر، فردوس، ذکر جمیل، سیاحت نامہ ماہر (مرتب: طالب الہاشمی) سنت یا بدعت (مرتب: تابش مہدی)، یادِ رفتگاں (دو حصے) اور اندھیرے اجالے وغیرہ۔

ماہرالقادری اپنے ابتدائی دور میں خانقاہی نظام سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں اوران کی برپا کردہ تحریک "جماعت اسلامی" سے متاثر ہوئے تو اپنی تمام شعری اور نثری صلاحیتیں اقامتِ دین کے لیے وقف کردیں اور پوری زندگی قلمی جہاد کرتے رہے۔ موصوف ہندوپاک کے علاوہ یورپ، امریکہ، افریقہ، عرب، عراق اور دوسرے ملکوں میں بحیثیت شاعر مدعو کیے گئے اور ہر جگہ شعروادب کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ مئی ۱۹۷۸ء میں جدہ کے ایک مشاعرے میں تشریف لے گئے۔ اسٹیج ہی پر اسلامی اقدار کا مذاق اڑانے والے ایک شعر کے خلاف کلمۂ احتجاج بلند کرتے ہوئے اپنے رب سے جاملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ——— (ناشر)

خدا الکتب بلی
MMIP

MMI PUBLISHERS, NEW DELHI-25